مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 چینی، نکتہ چینی — مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

12 شعلہ زن — روبینہ رشید
ایک سادہ و معصوم نازک اندام
دوشیزہ کی سنسنی خیز داستان

45 جنون — اعتزاز سلیم وصلی
معصوم و نازک پھولوں کے
مانند بچوں کا دل دوز قصہ

57 فریبِ ذات — شہناز احمد
ہنستی مسکراتی تتلیوں کی شوخیاں......
جنہیں قاتل چھین لینا چاہتا تھا......

73 حوصلہ مند — حسام بٹ
ایک فرض شناس پولیس افسر
کی حکمتِ عملی کا جارحانہ ثبوت

83 مضبوط عورت — تنویر ریاض
اس عورت کا قصہ جسے وقت
نے قاتل کے مدِمقابل کھڑا کر دیا تھا

92 اناگیر — امجد جاوید
صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ
ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

131 ممتا — محمد سلیم کرد
دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے
والی ایک دل گداز تحریر......

137 لبِ خاموش — نجمہ مودی
فیصلہ کن قدم اٹھانے والے ایک
جذباتی شخص کی محبت کا انداز

جلد 51 • شمارہ 07 • جولائی 2021 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

147
چوہے کی دم
انجم فاروق ساحلی
اچانک بھڑک اٹھنے والی چنگاری کا انجام.....

151
شناسا
عمران قریشی
شناسائی کے مراحل سے گزرنے والے ایک اجنبی کا احوال.....

162
الاؤ
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

195
شکستِ فاش
عاطر شاہین
ہار اور جیت کی بازی میں شکستِ فاش ان کا مقدر ٹھہری.....

212
بے احتیاطی
سیرینا راض
احتیاط سے معاملات دل نبھانے والے غافل کی آخری بے احتیاطی

221
اعتراف
فرحت جبین
ایک ہی تیر سے دو شکار کرنے والے شکاری کا کھیل.....

224
نقاب چہرے
مظہر سلیم ہاشمی
چہرہ در چہرہ جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل تھے

253
کشتۂ احسان
غلام قادر
ایک محسن کے احسانات..... وقت کی گردشوں نے اسے اپنے محسن کے سامنے کھڑا کر دیا

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلامُ علیکم!

جولائی کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اسی ماہ عید قرباں بھی ہے۔ تمام مسلمانوں کو عید الاضحیٰ بہت بہت مبارک ہو۔ کچھ دنوں سے وحشت ناک خبریں آرہی ہیں۔ لاہور میں ایک پالتو شیر نے بچے پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا۔ لاڑکانہ میں آوارہ کتّوں نے 26 شہریوں کو کاٹ کر زخمی کر دیا اور پھر کراچی کے خوش حال علاقے ڈیفنس میں دو پالتو کتّوں نے ایک معمر وکیل پر حملہ کر کے اسے بری طرح زخمی کر دیا۔ المیہ یہ ہوا کہ کتوں کے رکھوالوں یا مالکان نے لہولہان وکیل پر کوئی توجہ نہیں دی، بس کتوں کو سنبھال کر لے گئے۔ پچھلے چند برسوں میں وحشی جانوروں کو پالنے کا شوق تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ جس کی روک تھام ضروری ہے۔ ایسے جانوروں کا کسی بھی وقت بھڑک کر مالکان یا دوسروں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ لوگ اپنے شوق میں خطرات کی پرورش سے گریز کریں گے۔ آیئے اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہاں کون کون، کس کس شوق میں مبتلا ہے۔

چنیوٹ سے کنول کی نکتہ چینی ”جون کا شمارہ گیارہ تاریخ کو ملا۔ سرورق بس گزارے لائق تھا۔ بائیں کونے میں موجود آثارِ قدیمہ یا آسیب زدہ حویلی ٹائپ کی عمارت دلچسپ لگ رہی تھی۔ اداریے میں شجرکاری کی اہمیت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی جس کی آج کے وقت میں جتنی ضرورت ہے، اتنی شاید کبھی بھی نہیں تھی۔ چینی نکتہ چینی میں سب سے پہلا تبصرہ ہماری جانی مانی ایمانے زارا شاہ کا تھا جو کچھ ناراض ناراض لگ رہی تھیں۔ ایمانے تعریف کا شکریہ اور مجھے جو تبصرے اچھے لگتے یا جن میں کچھ جواب کے لائق ہوتا ہے، ان کا ذکر میں کر دیتی ہوں۔ ویسے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں ٹوک جھوک ٹائپ کی ہوں نہیں خاص طور پر کسی کی ذات پر بات کرنے سے ہچکچاتی ہوں ہاں رویوں پر کھل کر بات کرتی ہوں۔ آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار ہے۔ ملتان سے انوشے ملک پہلی بار چینی نکتہ چینی کا حصہ بنیں، خوش آمدید۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ کبیر عباسی کی تحریر دوسرا رخ حنان سیریز میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوئی۔ ایک اچھا سبق دیتی ہوئی تحریر کہ ہمیں دوسروں کے بارے میں رائے قائم کرنے یا ان کی ذاتی زندگیوں پر تبصرے کرنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ اول تو ہمارا حق نہیں اور دوم اگر حقیقت بعد میں کچھ اور ثابت ہوئی تو شرمندگی آپ کو ہی ہوتی ہے۔ شاکر لطیف کی ماسٹر مائنڈ بھی اچھی تحریر تھی۔ دولت کی ہوس میں سوتیلے بیٹے نے ہی الزبتھ کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اور اتنا پیچیدہ طریقہ اختیار کرنے کے باوجود ایک ذرا سی غفلت اور بری عادت نے انجام تک پہنچا ہی دیا۔ تحریر پسند آئی۔ حسام بٹ کی قرار واقعی کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ اے آر راجپوت کی تحریر بدگمانی دو دوستوں کے بیچ پیدا ہو جانے والی بدگمانی کی کہانی تھی۔ سچ کہا کسی نے پیسے کے معاملے میں لوگ اپنے باپ پر بھی بھروسا نہ کریں۔ یہاں بھی دولت کے لالچ میں پیدا ہوئی بدگمانی نے ایک دوست کو زندگی سے ہی محروم کر دیا۔ اچھی تحریر تھی۔ تنویر واسطی کی تحریر اعتراف لکھاریوں کی دنیا کی ہی کہانی ثابت ہوئی۔ اپنی کہانیوں کے بارے میں انتہائی حساس امیلڈا نے کہانیاں ریجیکٹ ہونے پر پبلشرز کو ہی قتل کرنا شروع کر دیا۔ کہانی ایوریج تھی۔ عمران قریشی کی تحریر تریاق بھی مناسب ثابت ہوئی۔ ہم انابیہ اور ڈاکٹر کو منفی کردار سمجھتے رہے کہ ایک معصوم انسان کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں آخر میں جناب جواد صاحب کی اصلیت جان کر احساس ہوا کہ ان سے دو ہاتھ آگے تو وہی تھا۔ تنویر ریاض کی تحریر اپنے دام میں بھی ایک ایوریج تحریر ہی ثابت ہوئی۔ رقابت در رقابت کے پرانے قصے۔ کچھ نیا نہیں تھا۔ محمد فاروق انجم کی تحریر حدِ فاصل کافی سے بھی زیادہ عجیب و غریب تحریر لگی۔ مطلب کوئی بھی لڑکی جتنی بھی حسینۂ عالم ہو ایسا بھی کیا کہ جو مرد دیکھے اس کے لیے پاگل ہو جائے اور اچھے برے کی تمیز بھول کر بس اسی کے حصول کے خواب دیکھنے لگے۔ پھر نمیرہ کا اتنی آسانی سے اپنی محبت یا پسند چھوڑ دینا صرف اس وجہ سے کہ اس نے فلمی ہیروز کی طرح مصنوعی بہادری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ نارمل انسان تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پھر تعلق ختم کرتے ہی ظفر سے ایسے نفرت کا اظہار کرنا اور دوسری طرف سے بھی یہی رویہ تو بھائی اس سب میں محبت کہاں تھی؟ بہت ہی عجیب کہانی لگی۔ احمد سلیم سلیمی کی عشق جنوں خیز کافی درد بھری، عبرت انگیز اور ہمارے معاشرے میں خواتین کی حالتِ زار کو بیان کرتی تحریر ثابت ہوئی۔ شاملہ کی زندگی مردوں کے ہاتھ میں کھلونا بنی رہی۔ پہلے بھائی، پھر باپ، پھر شوہر پھر شوہر کے بھائی اور آخر میں خود ساختہ محبوب کے ہاتھوں۔ مطلب ایک لڑکی خود کیا چاہتی ہے، اس کی ہمارے معاشرے یا ہمارے پیاروں کی نظر میں ایک ذرّہ برابر بھی اہمیت نہیں ہوتی۔ پھر بھی پتا نہیں ہم عورتیں انہیں اپنا اور پیارا کس خوش فہمی میں سمجھتی رہتی ہیں۔ ایک خوب صورت تحریر۔ شبنم شفیق کی کہانی سراغ اس بار اپنے دوسرے حصے کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ کہانی کا پلاٹ بہت اچھا تھا۔ کہانی کے کردار اچھے تخلیق کیے گئے تھے لیکن کہانی لکھنے میں ابھی ناپختگی نظر آئی۔ کہانی کے بیان کرنے کو مزید بہتر کرنے

کی ضرورت ہے۔اوورآل کہانی ٹھیک تھی۔''(بہت شکریہ)

رحیم یار خان سے ماورا عالمگیر کا شکایت نامہ''جاسوسی حسبِ معمول بہت ہی زیادہ دیر سے یعنی چھ جون کو ملا۔اپنے تبصروں پر کاٹ پیٹ کی وجہ سے میرا ارادہ تھا کہ میں خط نہیں لکھا کروں گی مگر تبصروں میں قارئین نے جس طرح مجھ سے یکجہتی کا اظہار کیا ہے، یقین کریں اگر آپ میرے تبصروں پر کٹوتی نہ کرتے تو میرے عزیز ہم وطنوں نے رورو کے دریا بہا دیے تھے اور پھر ہماری پانی کی کمی بھی پوری ہو جاتی۔ریاست خان اگر میری بات شاعری لگ رہی ہے آپ کو تو اگر میں شاعری بھیج دوں تب کیا ہوگا؟ ایمانے آپ کو میرے پیچھے کوئی اور شخصیت لگ رہی ہے مگر یہ میں ہوں اور میرے پیچھے بھی میں ہوں۔اس نام کے ساتھ میرا آئی ڈی کارڈ بھی موجود ہے اور تمام سوشل میڈیا پر اکاؤنٹس بھی۔کہانیوں کا رخ کرتے ہیں۔کبیر عباسی کی کہانی بہت دلچسپ اور حقیقت پر مبنی تھی۔شبنم شفیق نے کہانی کا اختتام بالکل غلط کیا ہے ایسے کیسے انہوں نے شمروز کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینکا ہے؟ وہ ایسا بالکل نہیں تھا جس طرح سے رائٹر نے اس کو اینڈ میں شو کیا ہے۔اس سے بہتر تھا کہ شبنم اس کا انتقال فرما دیتیں۔طاہر جاوید مغل اس دفعہ پھر غیر حاضر ہیں ان کی غیر حاضری مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔

داؤدخیل، میانوالی سے ریاست خان کی بادشاہی''جون کی گرمی نے حال بُرا کر رکھا ہے، ایسے میں جاسوسی کی آمد نے دل میں تھوڑی سی ٹھنڈک پہنچادی۔سرورق بہترین تھا حسینہ اس مرتبہ خود ہی پستول تھام کر مردوں پر چھائی ہوئی تھی۔شبنم شفیق کا ابتدائی صفحات پر سراغ کی دوسری آمد کا انتظار تھا۔کمال کی اسٹوری لکھی۔شانزہ، حماد اور شمروز کے کردار بہت پسند آئے۔میری خواہش تھی کہ شانزہ کی شادی شمروز سے ہو جائے لیکن پھر آخر میں جس طرح حماد نے شانزہ کے لیے کیا، اس سے سارا رجحان حماد کی طرف ہو گیا۔ثنا منظر امام کی پرانے انداز میں لکھی گئی تحریر تھی۔احمر ندیم جو اتفاق سے رائٹر بھی ہے کی زندگی بے رنگ ہے پھر اس کی زندگی میں مہوش آتی ہے لیکن وہ نئے انداز میں جینا چاہتی ہے اس کو احمر کے پرانے خیالات کی ضرورت نہیں، تلخ لیکن کڑوا سچ۔عمران قریشی کی کہانی تریاق لاجواب تحریر تھی پیسے کی ہوس لوگوں کو کیا کیا کراتی ہے۔الاؤ کی بیسویں قسط جس کی ایک ایک سطر لاجواب جا رہی ہے سیف کی آخر طارق سے ملاقات ہو گئی لیکن رومی کا کوئی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے سیف اور طارق مل کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں سب سے پہلے وہ شنکر چانکیہ کو شادی کی رات اغوا کر لیتے ہیں لیکن آخر میں رچنا ان کا شکار ان سے چھین کر بھاگ جاتی ہے۔اے آر راجپوت کی بدگمانی اچھی کہانی تھی۔وہی لالچ، ہوس اور عورت ذات پر اندھا اعتبار کرنے کی کہانی۔کبیر عباسی کی دوسرا رخ، کیا کہانی تھی حنین اور سارہ کی جوڑی جس نے قتل کا مقدمہ حل کرنے میں پولیس کی مدد کی۔سرورق کی پہلی کہانی عشق خوں ریز لاجواب تحریر تھی۔شاہ نواز نے شاملہ کو حاصل کرنے کے لیے کتنے قتل کیے، ڈاکے ڈالے کتنے گھر اجاڑے بظاہر تو وہ اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے یہ کر رہا تھا اور اس نے شاملہ کو حاصل بھی کر لیا تھا لیکن آخر میں شاملہ کو جب ساری حقیقت کا علم ہوتا ہے تو وہ شادی کی رات اسے قتل کر ڈالتی ہے اور یوں دل میں کتنے ارمان بسائے وہ مر جاتا ہے۔حدِ فاصل آخری کہانی کمال تھی۔نمیرہ اور ظفر کی محبت بھری داستان۔دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے پھر نمیرہ کو دولت کی ہوس لگ جاتی ہے۔اس لیے وہ ظفر کو نظر انداز کر دیتی ہے اور اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے لیکن آخر میں وہی محبت اسے قبول کرنا پڑتی ہے شاندار اختتام۔تبصرہ نگاروں میں ایمانے کی عرصے بعد واپسی ان کو میرے خیال میں کچھ زیادہ ہی گرمی لگتی ہے یا گھر میں مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔سب کے تبصرے بہت اچھے اور جامع تھے۔''

اسلام آباد سے بینا راجپوت کی تبصرہ نگاری''اس بار تو جاسوسی بمشکل ہی دستیاب ہوا۔پچھلے مہینے ڈائجسٹ جلدی ملنے کی میں نے جو خوشیاں منائی تھیں، لگتا ہے نظر لگ گئی۔سرورق پر پستول بردار حسینہ کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ سرورق کہانیوں پر وومن پاور کی حکمرانی ہو گی اور کافی حد تک اندازہ ٹھیک بھی تھا۔سب سے پہلے میری پڑوسن ایمانے نے زارا شاہ کو دھماکے دار واپسی اور کرسیٔ صدارت کی مبارک باد۔ہمیشہ کی طرح طویل اور خوب صورت تجزیہ۔ایمانے جی! آپ کے کہنے سے پہلے ہی کہانیوں پر طبع آزمائی کر چکی ہوں۔گلابی جوڑا کی صورت میں ایک ادنیٰ سی کاوش جون میں جے ڈی پی کا حصہ بنی۔ریاست خان صاحب کے تبصرے کی مجھے بھی سمجھ نہیں آتی۔تبصرہ طویل تو ہوتا ہی ہے مگر تبصرہ کم ڈائجسٹ کا خلاصہ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ان کو شاید لگتا ہے کہ قارئین پچھلے مہینے کی کہانیاں بھول گئے ہیں۔خیر چھینی نکتہ چینی سے آگے بڑھیں تو سب سے پہلے شبنم شفیق جی کی کہانی سراغ پڑھی۔منظر نگاری میں لباس اور کھانے کی غیر ضروری تفصیلات اور روایتی سی رومانوی کہانی کی طرح کا اختتام، جس میں بالآخر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔کہانی مجموعی طور پر اچھی تھی لیکن اس میں گھسا پٹا رومانوی کہانیوں والا رنگ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔محمد فاروق انجم کی حدِ فاصل نے بہت مایوس کیا۔کہانی نمیرہ کے اغوا سے شروع ہوئی اور پھر ظفر......راحیل اور زاہد سے گھومتی ہوئی نیلوفر کے بھائی اور پھر شوہر پر پہنچی اور آخر میں اغوا کار نمیرہ کا ماموں نکلا۔کہانی میں بہت سے جھول تھے۔شاید اس کی وجہ کرداروں کی تعداد کا زیادہ ہونا تھا۔احمد سلیم سلیمی کی عشقِ خوں ریز اچھی کہانی تھی۔شاہ فراز کے خوں ریز عشق کا بدلہ شاملہ نے اس کو اسی کے خون میں رنگ دیا۔کبیر عباسی نے دوسرا رخ تھوڑا مغربی انداز میں بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ بِک ویلوٹ کی کہانیوں کے انداز میں لکھنے کی کوشش کی۔لیکن اس کو ہم صرف اچھی کوشش ہی کہہ سکتے ہیں۔سراغ رسانی پر لکھنا آسان کام

نہیں۔ قرار واقعی میں حسام بٹ نے کافی اختصار سے کام لیا اگر کہانی تھوڑی طویل ہوتی تو زیادہ مزہ آتا۔ افریقہ سے آیا اکیلا فرہاد بغیر کسی رکاوٹ، غلطی اور ہڑبونگ کے..... بھتا مافیا کے ڈان کو قتل کر کے کامیابی سے واپس چلا جاتا ہے۔ یہ سب اتنا سیدھا اور آسان نہیں ہو سکتا جتنا کہانی میں بتایا گیا ہے۔ اے آر ارجیوت کی بدگمانی کافی دلچسپ تھی۔ عورت ذات ہمیشہ اپنی بدگمانی اور شکی طبیعت کی وجہ سے کہیں نہ کہیں مردوں کے لیے پریشانی کا باعث بنتی۔ اگر زہرہ، بابر کے لالچ کے بارے میں بلاوجہ راشد کے کان نہ بھرتی تو سچویشن یقیناً مختلف ہوتی۔ زہرہ کے ہوس زر اور بدگمانی سے نہ صرف بابر بے چارہ اپنی جان سے گیا بلکہ وہ دونوں ہاتھ آئی دولت سے محروم ہونے کے ساتھ پولیس کی حراست میں بھی آ گئے۔ تنویر واسطی کی اعتراف کہانی کاروں کی تحریروں میں پچھی مختلف تحریروں پر ایک خوب صورت کہانی۔ جو ایک قاتل سے اعترافِ جرم کروانے کا باعث بنی۔ عمران قریشی کی تریاق کافی پسند آئی۔ مسیحائی کے شعبے سے منسلک لوگ ہی جب ستم قاتل کا کردار ادا کرنے لگیں تو انسان مسیحائی کی توقع کس سے رکھے؟ منظر امام کی سناٹا جدید دور کے تقاضوں اور معاشرتی رویّوں پر ایک دلگداز اور پُر درد کہانی۔ نرم و نازک احساسات وجذبات کے زمانے شاید اب بیت گئے ہیں۔ آج کی نوجوان نسل خالی خولی وعدوں اور لفاظی سے نہیں بہلتی۔ ان کو ہر کام عملی طور پر کرنا ہے پھر چاہے وہ محبت ہی کیوں نہ ہو۔ تنویر ریاض کی کہانی اپنے دام میں ایک ایسے سراغرساں کی کہانی جو اپنی ذہنی کمزوری کی وجہ سے کوئی بات مختلف نہیں رکھ سکتا۔ تھوڑی منفرد اور دلچسپ کہانی تھی۔ شاکر لطیف کی ماسٹر مائنڈ اس شمارے کی سب سے دلچسپ کہانی تھی۔ ہم بعض اوقات کچھ مخصوص عادات لاشعوری طور پر اپنائے ہوتے ہیں۔ جن کے بارے میں ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ راک بھی اپنی تھوکنے کی عادت کی وجہ سے پکڑا گیا۔ عمدہ تحریر ویلڈن شاکر صاحب۔ باقی قسط وار سلسلوں کو پڑھنے والوں کو میر اسلام ہے جو اگلی قسط کے انتظار میں پورا مہینہ صبر سے گزارتے ہیں۔''

ساہیوال سے محمد عثمان ذوالفقار لکھتے ہیں ''اس بار جیسے ہی جون کا جاسوسی ہاتھ آیا تو سب سے پہلے سرورق پر نظر دوڑائی۔ تو ایک حسینہ پستول تھامے ہوئے تھی۔ ایک کونے پر ایک قلعہ نما عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سرورق پلٹا تا کہ فہرست کا نظارہ کر سکیں۔ سرورق پلٹتے ہی پہلے صفحے پر جاسوسی گولڈن جوبلی کا اشتہار تھا اور بہترین قلم کاروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ یہ تو صرف دکھا کر ترسانے والی بات ہوئی نا۔ جلدی سے اسے منظرِ عام پر لائیں۔ اس کا انتظار ہے کہ کب اپنا دیدار کرواتا ہے۔ اس کے بعد فہرست کو ایک نظر دیکھا تو جانے پہچانے نام نظر آئے۔ امجد رئیس صاحب کا انتظار ہے کہ وہ کب اپنی شاہکار تحریر کے ساتھ ابتدائی صفحات پر نمودار ہوتے ہیں۔ اور ہمارے دل و دماغ کو اپنے سحر میں جکڑتے ہیں۔ میں نے ایک مختصر کہانی بھیجی ہے۔ اس بارے میں بھی جواب دیجیے گا۔ خیر فہرست کو اسی حالت میں چھوڑ کر محفلِ یاراں کی طرف بڑھے۔ اداریہ پڑھا جس میں ماحولیاتی تغیرات کے بارے میں بات کی گئی تھی۔ اور ہمارے وسائل..... آہستہ آہستہ انحطاط کا شکار ہیں اور اس انحطاط کو ختم کرنے کے لیے ہم سب کو انفرادی طور پر اس بارے میں کوشش کرنی چاہیے۔ خصوصاً شجر کاری میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ اگر ہم انفرادی طور یہ کام کریں گے تو پھر یہ رویہ اجتماعی سوچ اختیار کر لے گا۔ جو کہ ہم سب کے لیے اچھا ہے۔ کرسی صدارت اس بار اسلام آباد کی شعلہ جواں ایمانے زرا شاہ نے سنبھالی ہوئی تھی۔ اور اپنی شعلہ بیانی سے مارچ اور اپریل دونوں شماروں کے تبصرہ نگاروں اور کہانیوں پر گرج برس رہی تھیں۔ شکر ہے ہم بچ گئے اس گولا باری سے۔ محمد اسحاق انجم اور انور یوسف زئی صاحب نے مختصر تبصروں کے ساتھ اپنی حاضری لگوائی تھی اور ہمارے پیارے دوست عامر مشتاق کا مختصر تبصرہ بھی اس بار جاسوسی کی زینت بنا ہوا تھا لیکن بہت مختصر تھا۔ اس کے بعد ریاست خان اور بینا راجپوت نے تفصیلی تبصرہ لکھے ہوئے تھے۔ اسلام آباد سے ابوحسان ابرار احسان مندی کے ساتھ شامل تھے۔ اب کچھ کہانیوں کے بارے میں اپنی بے فضول سی رائے دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ (بسر و چشم) امجد جاوید کی انا گیر بہترین جا رہی ہے۔ اس بار تو علی نے حیران کر دیا۔ اتنی تیزی سے اتنے بڑے بندوں کا صفایا۔ سندیپ سوڈھی اور بلراج سنگھ کو ان کی حفاظت کے باوجود باری باری اس دنیا فانی سے رخصت کیا۔ بندہ اے کہ جن۔ تھوڑا بریک تے پیر رکھو۔ سرورق کا پہلا رنگ احمد سلیم سلیمی کا عشق خوں ریز تھا۔ اچھا لکھا گیا ہے۔ عشق بڑے لوگوں کی جان لیتا ہے شاہ فراز نے اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیچاری شاملہ کو دو بار بیوہ کیا۔ اور خود شادی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن شمشیر خان نے انکشاف نے سب تباہ کر دیا۔ دوسرا رنگ محمد فاروق انجم کا حد فاصل تھا۔ نمیرہ کو اغوا کروا کے مصنف نے بہت سسپنس پھیلانے کی کوشش کی تھی اور تقریباً اس میں کامیاب بھی رہا۔ ظفر پر تو پہلے ہی میرا شک نہیں تھا۔ اس کے دوست زاہد پر تھوڑا بہت شک تھا۔ لیکن آخر میں انسپکٹر عثمان نے جس طرح سارا کچا چٹھا کھول کر بیان کر دیا۔ کیونکہ وہ میرا ہم نام بلکہ اب تو مجھے لگ رہا ہے وہ میں ہی تھا۔ (ہاہاہا یقیناً) منظر امام کی سناٹا اس شمارے کی چند بہترین کہانیوں میں سے ایک تھی۔ مصنف نے بڑی خوب صورتی اور مہارت سے معاشرے کی ایک نہ جھٹلانے والی حقیقت کو بیان کیا تھا۔ جو دل پہ ٹھاہ کر کے لگی۔ ''عورت قرب چاہتی ہے۔ لفظی یا دنیٰ نہیں بلکہ حقیقی'' اور یہی حقیقت ہے۔ کتابیں پڑھنے سے علم تو حاصل ہو جاتا ہے مگر تجربہ دوسروں کے کاموں سے یا خود کر کے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ عمران قریشی کی تریاق بھی بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر مالک نے بہت چالاکی سے جواد کی جائداد ہتھیانے کی کوشش کی لیکن جائداد حاصل کرنے کے بعد بھی وہ کچھ نہ حاصل کر سکا۔ آخر میں عمران قریشی نے ایک جھٹکا لگانے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ وہ جائداد تو گروی رکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس

سارے چکر میں جواد کا ہی فائدہ ہوا کہ اسے مفت میں ایک خوب صورت ڈاکٹر بیوی مل گئی۔ اے آر راجپوت کی بدگمانی بھی اچھی تھی۔ راشد نے بدگمان ہو کے بیچارے بابر کی جان لے لی۔ مصنف مختصر کہانیاں اچھی لکھتے ہیں۔ لیکن قسط وار میں اتنا مزہ نہیں آتا۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ان کو مختصر کہانیوں کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ شاکر لطیف کی ماسٹر مائنڈ بھی ایک بہترین کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی اپنے دام میں بس ٹھیک تھی۔ کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ کبیر عباسی دوسرے رخ کے ساتھ آئے تھے۔ اور اپنے جاسوسی کردار حنان کی ایک اور کہانی ہمیں پڑھنے کو دی۔ کہانی وقاص اور کرن کے قتل کی تھی... جو اس کے بھائی نے کرن کے منگیتر سے کروایا تھا۔ اور آخر میں انکشاف کیا کہ کرن اور وقاص دونوں بہن بھائی تھے۔ جبکہ دوسرے لوگ ان کے تعلق کو کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے.... اللہ تعالیٰ نے زیادہ گمانوں سے بچنے کا حکم دیا ہے کہ بعض گمان کرنے سے انسان کو گناہ ملتا ہے اور اس کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اس لئے ہمیں بغیر تحقیق کے کسی کے متعلق کوئی برا گمان نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آپ کو کوئی رات کے اندھیرے میں کہیں جاتا ہوا ملے تو ضروری نہیں کہ وہ چوری یا کسی کا قتل کر کے ہی آیا ہو۔ وہ مسجد بھی جاسکتا ہے۔ وہ کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے بھی جاسکتا ہے۔ حسام بٹ کی قرار واقعی بہت پسند آئی۔ نوشاد نے بڑے اچھے طریقے اور مہارت سے بُنے گئے جال کے ذریعے اپنے دشمنوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں ہی انجام پہنچا دیا اور خود سے اسلحہ نہ چلانے کی بات بھی پوری کر دی۔ تنویر واسطی کی پیش کردہ کہانی بہترین تھی۔ ایک رائٹر نے بڑی حیران کن اور مضبوط پلاننگ کی اور تقریباً کامیاب بھی ہو گئی تھی۔ لیکن قسمت سے کون لڑسکتا ہے۔ اس بار کے لیے اتنا ہی۔ اگلی بار حاضر ہونے تک اجازت چاہتا ہوں۔"

برمنگھم، یو کے سے ساجد محمود کی شمولیت "امید تھی کہ مئی کا ڈائجسٹ وقت پر مل جائے گا لیکن قسمت کی دیوی شاید ناراض تھی۔ اتفاق دیکھیے کہ پاکستان سے فیملی واپس آ رہی تھی اور وہ جون کا جاسوسی بھی ساتھ لے آئے لیکن اپنے ساتھ اسے بھی لندن ہوٹل میں قرنطینہ میں رکھنا پڑا۔ جب انتظار کرتے کرتے بے حال ہو چکا تب کل ہی اس کا دیدار...... ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ سرورق کی حسینہ ہاتھ میں پسٹل تو پکڑے ہوئے ہے لیکن اس کی نازک انگلیاں شاید ٹریگر پر رکھنے کی عادی نہیں۔ اداریے میں چینی کم اور نکتے زیادہ دکھائی دیے۔ واقعی ماحولیاتی تبدیلیوں کے باعث زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔ درخت لگانا ویسے بھی صدقہ جاریہ ہے اس لیے شجرکاری میں ہر ایک کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہوگا۔ یہ نہ صرف ہماری بہتری کے لیے ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی۔ محفل میں کرسیٔ صدارت اس بار ایمانے زارا کے ہاتھوں میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ کافی دنوں سے وہ غائب تھیں۔ دیر آید درست آید کے مصداق ان کا ڈبل تبصرہ بہت بہترین رہا جس پر بلاشبہ وہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ مکھن سے بھرپور تبصرہ میری شاگرد خاص بینا راجپوت کا رہا جو مسلسل پانچ چھ ماہ سے جاسوسی میں شرکت کر رہی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شبنم شفیق کی سراغ پڑھی۔ عمر کے اس حصے میں اب رومانی کہانیاں ہضم نہیں ہوتیں۔ خیر پھر بھی عمدہ کاوش تھی۔ محمد فاروق انجم حدِ فاصل کے ساتھ نظر آئے لیکن کہانی میں اتنے کرداروں کی وجہ سے اتنا مزہ نہ آیا۔ کبیرہ کے اغوا میں ماموں کا ملوث ہونا خاصا ڈرامائی لگا۔ کہانی مجھے تو ایوریج درجے کی محسوس ہوئی۔ احمد سلیم سلیمی کا عشقِ خوں ریز کافی خون ریز ثابت ہوا۔ شمالہ نے خوب بدلہ لیا۔ کبیر عباسی کا دوسرا رخ اچھی کوشش تھی۔ اے آر راجپوت کی بدگمانی بہت مزیدار لگی۔ حوا کی بیٹی اکثر بدگمانی اور شکی طبیعت کی وجہ سے نہ صرف مردوں کے لیے پریشانی کا باعث بنتی ہے بلکہ اپنی صنف کو بھی نہیں بخشتی۔ حالات شاید مختلف ہوتے اگر زہرہ بابر کے لالچ کے بارے میں بلاوجہ راشد کے کان نہ بھرتی۔ زہرہ کا لالچی پن برے انجام کا باعث بن گیا۔ حسام بٹ کی قرار واقعی کافی مختصر تحریر ثابت ہوئی۔ جرم کی اتنی آسان اور کامیاب وارداتیں اب حلق سے نہیں اترتیں۔ اگر اس کو مزید پھیلایا جاتا تو یقیناً ایک مزیدار کہانی تخلیق ہوتی۔ تنویر واسطی کا اعتراف ایک عمدہ واقعہ۔ ایک قاتل کے اعترافِ جرم کے بارے میں بہترین ماجرا۔ عمران قریشی تریاق کے ساتھ نظر آئے۔ ڈاکٹر ہی اگر پیشہ ور قاتل نظر آئیں تو پھر اعتبار کس کا کیا جائے۔ انجام بہترین رہا۔ منظر امام کی سناٹا ایک دلگداز تحریر تھی۔ آج کی نوجوان نسل صرف الفاظ سے نہیں بہلائی جاسکتی۔ تنویر ریاض اپنے دام میں کے ساتھ نظر آئے لیکن ابھی تک اسے پڑھنا باقی ہے۔ سلسلے وار کہانیاں پڑھنے کا وقت نہیں ہوتا۔ جب کافی سارے شمارے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ایک ہی بار پڑھ لیتا ہوں۔ جون کا شمارہ مجموعی طور پر ایوریج لگا۔ امید ہے جولائی کا شمارہ اپنے وقت پر مل جائے گا۔" (انشاءاللہ)

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کا استفسار "جون کا جاسوسی ڈائجسٹ تو ہمیں تحفتاً ملا! اس لیے کافی دن صبر سے اس کے موصول ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جمالی صاحب نے تبصرہ جات کی لسٹ پہلے ہی شیئر کر دی تھی اس لیے کرسیٔ صدارت پر نام دیکھ کر خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ واہ ایمانے آفٹر آلانگ ٹائم، ایم ٹاپ آف دالسٹ! یعنی مسلسل دو بار تبصرہ غائب ہونے کے بعد بالآخر چھپ ہی گیا۔ اس پر کیا کہیں۔ سرورق کافی عرصے بعد اتنا حسین لگا اور صرف عورت راج نظر آیا۔ ریاست خان اس بار پھر تبصرہ کرنا بھول گئے۔ لگتا ہے ان کے لیے فری کلاسز کا اختتام کرنا پڑے گا، ورنہ انہوں نے ہماری ناک میں دم کر دینا ہے۔ ایک مرتبہ ہم خود ڈائجسٹ پڑھتے ہیں۔ دوسری مرتبہ ان کی زبانی پڑھتے ہیں۔ کمال ہے! بینا راجپوت یہ شبنم جی کی سراغ پچھلے ماہ بھی تھی؟ کیا میں نے غصے میں مس کر دی تھی؟ احسان ابرار کا تبصرہ اچھا تھا، اور احسان کی بات سے متفق، کتنے ہی ہینڈسم مرد ہوتے ہیں۔ ان کا بھی برابر کا حق ہے سرورق کی زینت بننا۔ کیا کبھی ایسا کوئی شمارہ ہوگا؟ سسر انکل نے بھی ہمارے غائب ہونے کو ہلکا لیا۔ میں دیکھ رہی ہوں آپ کے کرتوت! باز آ جائیں ورنہ

حیدرآباد آکر کلاس لوں گی۔ انوشے ملک اور مبشر ہمدانی کو خوش آمدید۔ ویسے آپ کون سی اسٹیٹ کے پرنس ہیں؟ جسٹ آسکنگ، طلعت مسعود اور روزیہ کنول کو مس کیا۔ شبنم شفیق میں پروگریسو خاتون لکھاری کی جھلک نظر آئی۔ شانزے کی بہادری نے اٹریکٹ کیا۔ مگر یادداشت کھونے والا ڈراما آؤٹ آف ڈیٹڈ ہو چکا ہے گو کہ ہم جانتے ہیں میڈیکلی یہ ممکن ہے، لیکن ایسے اُلو بنانا نہیں۔ حماد صاحب کی کیا ہی بات ہے جناب۔ کبھی اکھڑتے ہیں، کبھی لڑتے ہیں، کبھی انتہائی حساس سچویشن میں لڑکی کو گیٹ پر ہی اتار کر رفو چکر ہو جاتے ہیں اور پھر اسی کے لیے دیوداس بنتے ہیں۔ ویسے شمارے کی باقی کہانیوں سے بہت اچھی رہی۔ روبینہ رشید اور اسما قادری کو مس کر رہے ہم۔ احمد سلیم سلیمی کو مبارک باد۔ ان کا رنگ جس پس منظر میں لکھا گیا، اس حساب سے زبردست رہا۔ ایسی جنونیت سے خوف آتا ہے۔ اور یہاں کیا کوئی قانون بھی نہیں چلتا؟ توبہ ہے۔ حسام بٹ کی قرار واقعی بورنگ لگی۔ حسام صاحب کے ہیروز انتہائی نامساعد حالات میں بھی پُرسکون رہ کر پہلیاں بجھوا رہے ہوتے ہیں۔ تریاق تو نرا مذاق تھا ہمارے جذبات کے ساتھ۔ عمران قریشی کا زخمی دل ابھی تک بھولے تو نہیں ہم۔ کچھ رحم کیجیے میڈیکل سائنس پر۔ ''دوسرا رخ'' حسام بٹ پارٹ ٹو لگی۔ سوری ٹو سے یہ ہیرو کچھ زیادہ ہی خود پسند ہے۔ بات بات پر کہانی کا حوالہ دینا کوفت میں مبتلا کر گیا۔ اب آخر میں بہ حیثیت قاری ایک سوال ہے۔ امید ہے سوال پبلش کیا جائے گا۔ قینچی کی نذر نہیں ہوگا۔ ہم ہمیشہ سے استاد کے بعد لکھاریوں کو آئیڈیالائز کرتے آئے ہیں، خاص کر لکھاریوں کو تو ہم یہ سمجھتے ہیں جو وہ لکھتے ہیں، وہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ جو وہ لکھتے ہیں، جن مورل ویلیوز کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں، ان سے ان کا دور دور تک تعلق نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا لکھنا صرف نام کمانے کے لیے ہے......؟ جس طرح ایک استاد اگر خود جن باتوں پر عمل نہ کرتا ہو، وہ اپنے شاگردوں کو اتنا ہی بہتر انداز میں سکھا سکتا ہے نہیں نا۔ اسی طرح کسی کے رنگ، نسل، زبان و پیشے کا مذاق اُڑاتے لکھاری، بھلا پھر ہمیں ان باتوں کا درس کہانیوں میں کیسے دے سکتے ہیں۔ کیا یہ قلم کی توہین نہیں ہے؟ تمام پڑھے لکھے سمجھدار باشعور لوگ اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ ہم منتظر رہیں گے۔''

بورے والا سے عبدالجبار رومی انصاری کی بے اختیاری ''لڑکی کمال ہے، کیا حسن و جمال ہے، پسٹل تھامے اک ادا سے چلی نخریلی چال ہے، پُراسرار حویلی جا کر، بچی وہ بال بال ہے۔ عمدہ سرورق اچھا لگا اور بقائے حیات کے لیے درخت بے حد ضروری ہیں۔ اسکول کے زمانے میں جب ہفتہ شجرکاری منایا جاتا تو تمام طالب علموں کو کہا جاتا کہ وہ اسکول میں لگانے کے لیے ایک ایک پودا لے کے آئیں اور پھر طالب علموں میں اتنا جوش و خروش ہوتا کہ پورا ہفتہ وہ پودے اٹھائے چلے آتے اور اسکول میں پہلے سے زیادہ سرسبز و شادابی اُمڈ آتی۔ ایسے ہی علاقائی سطح پر لوگوں کو کمیٹیاں بنانی چاہئیں اور ہر وہ جگہ جہاں درختوں کی ضرورت ہے، ضرور لگائیں۔ اپنی نکتہ چینی کی محفل میں پیدائشی مشکل پسند ایمانے زارا نہ جانے کون سی ناراضی لے کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کہیں وہ ..... ناراض ہو کر پیا گھر تو نہیں سدھاریں ..... تبصرہ اچھا لگا۔ محمد اسحاق انجم کی مدح سرائی اور انور یوسف زئی کی اختیار نویسی اچھی لگی۔ مختصراً عامر مشتاق کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ ریاست خان کی حکمرانی ماننی پڑے گی اور بھائی اگر کسی کو تعریف ہضم نہیں ہوتی تو نہ ہوا کرے، تعریف و تنقید تو ہونی ہی ہے، آپ کا بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ مینا راجپوت نے بھی ٹائم نکال کے عمدہ تبصرہ نگاری کی۔ ابو حسان ابرار نے حسبِ ذائقہ نمک لگا کر اچھا تبصرہ کیا، پرویز احمد لانگا کو توچوں چوں کے مربے سے عشق ہونے لگا تھا اور بیگم نے باز رکھ لیا پھر تو حسینہ سے کنی کترا کے رہن دے رہن دے کر کے تبصرے کو درہم برہم کر دیا۔ سچی ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی۔ انوشے ملک نے تو آتے ہی حساب مانگ لیا، شکر ہے تبصرہ کر لیا ورنہ خاموش قاری رہ کر گھٹ گھٹ کے رہ جاتیں، ویلکم عمدہ تبصرہ۔ پرنس مبشر ہمدانی کی خیال آرائی بھی ٹھیک رہی۔ پہلی کہانی سراغ میں شانزے کی اداکاری خوب رہی۔ بعدازاں اسے مہنگی بھی پڑی۔ شبنم شفیق کی کہانی زبردست رہی۔ خس کم جہاں پاک۔ امتیاز بابو عرف نوشاد نے مجیب شاہ سے اپنے بھائی کی موت کا خوب بدلہ لیا۔ شطرنج کی چال بچھا کر اسے اور اس کے پولیس والے سمیت گہرا گھاؤ دے کر سامنے آتے ہی ٹپکا دیا۔ حسام بٹ کی قرار واقعی عمدہ کہانی تھی۔ دولت کے لیے دو دوستوں کی بدگمانی جو ہوتی سو ہوتی، زہرہ نے راشد کو بابر سے کچھ زیادہ ہی بدگمان کر دیا او پھر بابر جان سے گیا تو زہرہ اور راشد اوسان سے گئے۔ عبدالرب بھٹی کی بدگمانی لالچ بری بلا ہے کا سبق دیتی کہانی اچھی لگی۔ ماسٹر مائنڈ، ڈین نے دولت کی خاطر اپنی سوتیلی ماں کا قتل کرا دیا اور قانون کی آنکھوں میں خوب دھول جھونکنا چاہی۔ جاسوسی کی دنیا میں ایسے پیچیدہ کیس بھی ہوتے ہیں۔ عمدہ کہانی۔ حدِ فاصل میں بھی خوب تانے بانے بُنے گئے۔ انا گیر میں راج ویر نے بل میں چھپے جسوال گروپ کے باقیوں کو تھوڑا سا ہاتھ دکھایا تو وہ بھی فین ہو گئے۔ سوڈھی گروپ کے سندیپ اور نذر انصاری کو بھی ٹپکا دیا۔ بوڑھے میکت رام کے دشمن بلراج کو اس کے گھر پر ٹھکانے لگا دیا ادت کی باری آتی تو اس نے خود راج کو حیرت میں ڈال دیا۔ محترم امجد جاوید کی تحریر زبردست جاری ہے۔ دوسرا رخ، دیکھے بغیر اندازے سے یقین نہ کرو، بھائی بہن وقاص اور کرن کو ایسے ہی مار دیا گیا سو خوش دل اور کرن نے جو کیا انہیں سزا تو ملنی ہی تھی۔ بے چارہ عمران اپنی بائیک اور وگ کی وجہ سے خواہ مخواہ پھنس گیا، کہانی اچھی تھی۔ منظر امام کا سناٹا اچھی تھی۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

شاہ زیب، پشاور۔ شاہین اقبال، کراچی۔ ظہیر احمد، لاہور۔ محمد احسن زمان، وزیرآباد۔ انور یوسف زئی، اسلام آباد۔

شعلہ زن

روبینہ رشید

وہ شعلہ زن تھی یا جوالا مکھی... اس کے وجود میں ایک آتش فشاں دہک رہا تھا... اپنوں کی خود غرضی، دھوکے اور دل و جاں پر گزر جانے والی ناگہانی اس کے وجود کو تہ و بالا کر دینے والے لاوے کے مانند رقصاں تھی... رسوائی کی موت کو اس کا انجام ٹھہرایا گیا مگر مقدر اسے اپنے ساتھ لے اڑا... اس کے راستے میں رکاوٹوں اور دشواریوں کے ہمالیہ حائل تھے مگر وہ حاتم طائی کی طرح زندگی کی حسن آرا کے مشکل سوالات کے جواب تلاشتی رہی... ہر قیامت نے اس کے حوصلے کو مہمیز کیا... ہر افتاد اسے مضبوط بناتی گئی... پناہ اور بقا کی تلاش اسے مسلسل دوڑا رہی تھی... موت روپ بدل بدل کر اس کے تعاقب میں تھی... وہ اپنی طاقت سے خود ناآشنا تھی... راہ میں آنے والے ہر پتھر کو وہ اپنے راستے سے ہٹا رہی تھی... اس کے باوجود اس بار آنے والا طوفان شدید تھا... اس میں ناکامی قیامت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی... ایک ایسی قیامت جو کروڑوں افراد کے قدموں سے زمین کھینچ لیتی ہے...

ایک سادہ و معصوم نازک اندام دوشیزہ

کی سنسنی خیز داستان.....

وہ منظر انتہائی خوب صورت تھا۔

سبزے سے ڈھکا اونچا پہاڑ، لمبے لمبے درخت اور نیچے بہتا تیز رفتار دریا.....

وہ گویا ایک مکمل، زبردست اور دلفریب لینڈ اسکیپ تھا۔ قدرت کے باکمال مصور کا ششدر کر دینے والا شاہکار..... مگر میرے پاس اس منظر سے لطف اندوز ہونا تو ایک طرف اس کی جانب دیکھنے تک کا وقت نہیں تھا۔ وہ دلکش مناظر میری نظروں کے سامنے سے کسی تیز رفتار سلائڈ شو کے مانند گزرتے جا رہے تھے۔ جان کے لالے پڑے ہوں تو ہر چیز اپنی کشش کھو بیٹھتی ہے۔ اس چڑھائی پر اتنی تیزی سے بھاگنا آسان کام نہیں تھا مگر مجبوری ہر دور میں کوشش کی والدہ محترمہ قرار پاتی ہیں لہٰذا میں جسم و جان کی ساری توانائیوں کے ساتھ بس دوڑے جا رہی تھی۔ چھوٹے بڑے کنکر، پتھر جوتوں کو پار کرتے ہوئے میرے پیروں کو زخمی کر رہے تھے..... میری سانسیں سینے میں نہیں سما رہی تھیں، دل کسی ڈھول کی طرح بج رہا تھا۔ میری سماعت میرے پیچھے دور کہیں سے آتے بہت سے لوگوں کے دوڑنے اور چیخنے کی آوازوں کا تعاقب کر رہی تھی۔ میرا دماغ مسلسل ایک ہی حکم نشر کر رہا تھا۔

''بھاگو..... جان بچانا ہے تو بھاگو یہاں سے.....''

میرا پورا وجود اس حکم کی بجا آوری میں مصروف تھا۔ یکلخت بھاگتے بھاگتے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی جو ایک زبردست غلطی ثابت ہوئی۔ پیچھے تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا لیکن میں اپنی جھونک میں پوری طاقت سے سامنے موجود درخت سے ٹکرا گئی۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ میں اچھل کر چار قدم پیچھے جا کر گری۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے ناچ رہے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے اب میں کبھی دوبارہ کھڑی نہیں ہو پاؤں گی..... پھر جیسے ہی میرے حواس بحال ہوئے میں نے ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں بمشکل اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ میرے ہاتھوں پیروں بلکہ پورے جسم پر خراشیں اور چوٹیں لگ چکی تھیں۔ پیشانی پر ایک گومڑ سا ابھر آیا تھا..... مگر میرے پاس رک کر اپنی حالت کا جائزہ لینے کی مہلت نہیں تھی۔ وہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں انہیں قدرے صاف سن پا رہی تھی۔ انسانی آوازوں کے ساتھ ساتھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ میں لرز کر رہ گئی۔ یہ شکاری کتے انسان کو بھنبھوڑ ڈالنے کے لیے مشہور تھے۔ اگر میں غلطی سے بھی ان کے نشانے پر آجاتی تو یقیناً ایک تکلیف دہ موت میرا مقدر بنتی..... میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا تھا.....؟

میں کیوں بھاگ رہی تھی.....؟

میرے پیچھے آنے والے لوگ کون تھے.....؟

اور وہ کیوں مجھے صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے لیے اس قدر بے تاب تھے؟

میرے پاس ان سوالوں کا فی الحال کوئی جواب نہیں تھا اور نہ ہی ان پر غور کرنے کا وقت تھا۔ مجھے کسی بھی طرح ان کی دسترس سے باہر نکلنا تھا۔

درختوں کا سلسلہ اب ختم ہوتا نظر آ رہا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اب مجھے دور سے بھی دیکھا جا سکتا تھا یعنی اب مجھے مزید تیز دوڑنا تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ زمین تنگ پڑ جانے کا محاورہ میں نے پہلے بھی سن رکھا تھا مگر وہ اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ آج میری سمجھ میں آیا تھا۔

میں پہاڑ کے آخری سرے پر پہنچ چکی تھی جس کے نیچے، کافی نیچے تیز رفتار دریا پورے زور و شور کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا اور لرز کر پیچھے ہٹ گئی۔ واپس جانے کا سوال نہیں تھا اور آگے جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ عجیب سی بے بسی نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا، ابھی میں مخمصے میں پڑی سوچ ہی رہی تھی کہ ایک نئی مصیبت نازل ہو گئی۔

ہلکی سی دبی دبی غراہٹ نے مجھے مڑنے پر مجبور کیا اور پھر میں ساکت سی ہو کر رہ گئی۔ وہ سیاہ رنگ کا بڑا سا شکاری کتا تھا، اس کی سرخ انگارا آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا بڑا سا منہ کھلا ہوا تھا اور سرخ زبان کسی خاکستر کر دینے والے شعلے کی طرح لپک رہی تھی۔ اس کے نکیلے دانت خنجر کی طرح چمک رہے تھے۔ میرا دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا..... اب میں کیا کروں؟ یہ سوال گویا آسمان بن کر مجھ پر محیط ہو گیا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس کتے کے پیچھے آنے والے بھی اب نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔

میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر تن بہ تقدیر ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

میرے حرکت کرتے ہی اس بھیانک کتے نے بھی دوڑ لگائی مگر وہ کنارے پر آ کر رک گیا جبکہ میں ایک چھپاکے کے ساتھ دریا میں جا گری۔ کافی اوپر سے گرنے کی وجہ سے میں یک دم گہرائی میں چلی گئی۔ خاصی اچھی تیراک ہونے کے باوجود اس وقت یہی لگ رہا تھا کہ میں پانی کی تیز رفتار اور چیر پھاڑ دینے والی لہروں کا مقابلہ نہیں کر پاؤں گی مگر چند لمحوں کی شقت بہر حال مجھے سطح پر لے آئی۔ میں نے سر باہر نکال کر آکسیجن کو چکھا ہی تھا کہ کسی نے گویا مجھے تیزی سے تہ کی جانب کھینچا، میں نے اپنے پیروں کو جھٹکا دے کر اوپر آنے کی کوشش کی مگر وہ بُری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ اگلا جھٹکا مجھے پانی کے اندر واپس لے گیا..... تبھی میں نے اسے دیکھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا سیاہ رنگ میں ملفوف تھا، لبادہ اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ اس کے چہرے پر بھی وہی سیاہ رنگ منڈھا ہوا تھا حتیٰ کہ آنکھوں کی جگہ بھی کوئی سوراخ نہیں تھا۔ اس کے وجود میں کچھ ایسی دہشت تھی جو میری ہڈیوں تک میں اترتی چلی گئی۔

یوگا کی مشقوں نے مجھے کچھ دیر سانس روکنے کے قابل ضرور بنا رکھا تھا مگر اس کے بعد کیا ہو گا۔ یہ میں سوچ بھی نہیں پا رہی تھی۔ بالآخر مجھے حرکت کرنے کا موقع ملا۔ اس کی گرفت کے ہلکے سے کمزور پڑتے ہی میں نے گھوم کر مچھلی کے مانند اس کے ہاتھ سے پھسل جانے کی کوشش کی مگر

مجھے یہ کوشش خاصی مہنگی پڑی۔ میں ایک لمحے کو اس کی گرفت سے آزاد بھی ہوگئی اور میرے پیر اس کے ہاتھوں سے نکل گئے مگر گھومنے کی وجہ سے میرے بال اس کے ہاتھوں میں آگئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے سر کو دبوچ لیا اور پانی میں نیچے اور نیچے کی جانب دبانے لگا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہاتھ پیر مارے مگر پھر میری برداشت جواب دے گئی۔ نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے بمشکل ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے پر منڈھے سیاہ رنگ کو نوچ ڈالا۔ وہ کوئی کپڑا ہرگز نہیں تھا بس باریک کھال نما کوئی چیز تھی جو غلاف کی طرح اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہی تھی، وہ میرے بدترین تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انسانی جسم اور گردن پر موجود وہ ایک بہت بڑے ناگ کا بھاری بھرکم پھن تھا جس کی زہریلی آنکھیں انتہائی نفرت سے مجھے گھور رہی تھیں۔ میرے حلق سے بے اختیار چیخ برآمد ہوئی۔ عین اسی لمحے اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں تیزی سے دریا کی گہرائی میں اترتی جارہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اب مجھ میں ہاتھ پیر ہلانے تک کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ ہلکورے لیتا وہ دریا مجھے نگلتا جارہا تھا۔ تو یہ تھا انجام......؟ میں نے سوچا۔ دنیا سے دور گہرے پانیوں میں ایسی بھیانک موت۔

''بابا۔'' یہ نام میرے ڈوبتے ذہن میں گونج رہا تھا۔ میں مرنے سے پہلے ان سے ملنا چاہتی تھی۔ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں ان سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ مگر اب یہ ممکن نظر نہیں آرہا تھا کریم، علی...... جانے ان سب کو بھی میرے ساتھ گزرنے والی اس قیامت کا علم بھی ہو پائے گا یا نہیں؟ میں نے افسوس سے سوچا...... میرا دل ڈوبتا جارہا تھا، سانس لینے کے لیے بھی مجھے محنت کرنا پڑ رہی تھی۔

''میڈم...... میڈم......''

''میڈم پلیز ہوش میں آیئے...... کیا ہوا ہے آپ کو؟'' سماعت کی لہروں پر تیرتی آوازیں آہستہ آہستہ مجھے موت کے سمندر سے باہر کھینچ رہی تھیں...... اور پھر میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ زمین اب بھی میرے پیروں کے نیچے ہلکورے لے رہی تھی۔ کئی لمحوں بعد میں اپنے ہوش و حواس میں واپس آسکی۔

میں اپنے چارٹرڈ جہاز میں تھی۔ میری سیکریٹری صدف اور دونوں باڈی گارڈ میرے قریب کھڑے مجھے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''پانی...... پانی دو مجھے......'' وہ ناقابلِ بیان دہشت اب بھی میرے رگ و پے کو لرزا رہی تھی۔

''کیا ہو گیا تھا آپ کو......؟ اب ٹھیک ہیں نا آپ......؟'' صدف مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں...... ٹھیک ہوں...... تم لوگ بھی اس طرح پریشان شکلیں بنا کر مجھے گھورنا بند کرو اور بیٹھو اپنی اپنی جگہ پر۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں گلاس واپس کرتے ہوئے پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

''مگر ہوا کیا تھا......؟'' صدف کے اصرار پر میں نے اسے گھورا۔

''کچھ نہیں...... صرف ایک بُرا خواب...... اور کچھ بھی نہیں۔'' اب میں خود کو سنبھال چکی تھی۔

''بُرے خواب کبھی کبھی غیبی اشارہ ہوتے ہیں باس!'' میرا باڈی گارڈ الیگزینڈر دی گریٹ خوف زدہ انداز میں بولا۔

اس کے انداز پر مجھے ہنسی آگئی۔ الیگزینڈر کا اصل نام سکندر خان تھا۔ بہت دلیر اور جی دار، وہ باکسنگ اور ویٹ لفٹنگ کا نیشنل چیمپئن رہ چکا تھا۔ دس بارہ لوگوں کے لیے وہ اکیلا ہی کافی ہوتا تھا۔ ہتھیار اس کے لیے ثقافت کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا شوق بھی تھے اور نتیجہ یہ تھا کہ سکندر کا نشانہ اندھیرے میں بھی خطا نہیں ہوتا تھا۔ مضحکہ خیز صورتِ حال اس وقت ہوتی جب چھ فٹ چار انچ کا وہ لمبا چوڑا پٹھان جن بھوت، پریت، بدروح کا نام سنتے ہی لرزنے لگ جاتا۔ ایسے میں غالب کی بن آتی۔ غالب میرے دوسرے باڈی گارڈ کا نام تھا۔ درحقیقت غالب ہمارا کک کم ڈرائیور تھا مگر الیگزینڈر کے مقابلے میں وہ خود کو نہ صرف باڈی گارڈ کہتا بلکہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ وہ دبلی پتلی جسامت کا مالک تھا اور اس کا قد 5 فٹ 2 انچ سے زیادہ نہیں تھا مگر اس چھوٹی پیکنگ میں بھی وہ کم خطرناک نہیں تھا۔ وہ کراٹے کا ماسٹر تھا، اس کی چھٹی حس کمال کی تھی اور اس سب کے ساتھ ساتھ وہ کھانا بھی غضب کا بناتا تھا۔ اس کا اصل نام سلمان تھا مگر اس کی شاعری کی لت کی بنا پر اسے سب غالب ہی کہا کرتے تھے۔ بقول صدف اس کی کوکنگ سے زیادہ تباہ کن اس کی غزل تھی اور آزاد نظم تو کسی ایٹمی دھماکے سے کم نہیں ہوتی تھی۔

اور صدف...... وہ میری پی اے، ڈریس ڈیزائنر، استاد اور کسی حد تک دوست بھی تھی۔ وہ تعلیم اور شعبے کے حوالے سے کمپیوٹر ایکسپرٹ تھی۔ آئی ٹی اور کمپیوٹر وغیرہ میں

میری مہارت اور انگریزی پر میرے عبور کی وجہ وہی تھی۔
بابا نے میرے لیے صلاحیتوں کے میدان سے چنیدہ افراد تلاش کیے تھے۔ ان کے ہنر کو چمکایا تھا پھر اُن پر وفاداری اور فرض شناسی کی قلعی کر کے انہیں مکمل بھروسے کے قابل بنا کر میرے حوالے کیا تھا۔ بابا کا خیال ایک مطمئن اور محبت بھری مسکراہٹ بن کر میرے ہونٹوں پر پھیل گیا۔ ان کی نظر قیامت کی تھی جو ہیرے کو کوئلے کی کان سے ڈھونڈ نکالنے کا ہنر جانتے تھے۔
میں آج جو کچھ بھی تھی انہی کی وجہ سے تھی۔ یہ شان و شوکت، یہ عزت، ڈائمنڈ جیولری کا اتنا بڑا کاروبار، یہ مقام...... وہ سب کچھ جو میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی...... یہ سب ان کی مہربانی اور شفقت کا نتیجہ ہی تو تھا۔ ورنہ میں کیا تھی؟ شاید کچھ بھی نہیں۔
ایک مشتِ خاک......
ایک آنسو......
اپنوں اور غیروں کے دیے ہوئے زخموں سے بننے والا ناسور......
تکلیف واذیت سے بھری ایک چیخ......
بقا کی جنگ میں مصروف محض ایک کمزور لڑکی جس کے لیے زندہ رہ پانا ہی بہت بڑا ہنر ٹھہرا تھا۔ نہ جانے مجھے سب کچھ اس قدر شدت سے کیوں یاد آرہا تھا۔ میں نے آرام دہ نشست کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔
سوچیں یادوں کا روپ دھار کر مجھے اپنی بانہوں میں اٹھائے سفرِ معکوس کر رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت نے حال کا لبادہ اتار پھینکا۔ زندگی میرے سامنے فاسٹ فارورڈ میں ریوائنڈ ہو رہی تھی۔ مناظر تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔
روشنی حد سے بڑھ جائے تب بھی آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ مجھے بھی کچھ صاف نظر نہیں آرہا تھا کہ ایک مہربان اندھیرے نے مجھے ماں کی طرح اپنی گود میں چھپا لیا پھر یہ اندھیرا دھندلکے میں اور دھندلکا روشن دن میں تبدیل ہو گیا۔ منظر کا حصہ ہوتے ہوئے بھی میں گویا پس منظر میں کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی...... حیران ہو رہی تھی...... وقت گویا تھم سا گیا تھا اور مقدر کہیں دور کھڑا شاہانہ انداز میں مجھے تک رہا تھا۔
☆☆☆
میں ریل کی پٹری پر چلی جا رہی تھی۔
میرا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔
ریل کی پٹریاں روزانہ سیکڑوں ہزاروں لوگوں کو ان کی منزل تک پہنچاتی ہیں مگر میرے سامنے نہ تو کوئی منزل تھی اور نہ ہی زادِ راہ...... صرف آنسو تھے جو بار بار سب کچھ دھندلا رہے تھے...... میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟
کیا کوئی اس حد تک بھی گر سکتا ہے؟
کیا رشتے اتنے بے معنی ہوتے ہیں؟
کیا زندگی اتنی اہم ہوتی ہے کہ اسے بچانے کے لیے انسان ہر حد سے گزر جائے؟
اور یہ کہ اگر ایسا سب کچھ ہوتا بھی ہے تو آخر میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے جس کی مجھے سزا مل رہی ہے؟
اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کیسے جیوں؟
ڈھیر سارے سوالیہ نشان میرے اردگرد رقص کر رہے تھے، میرا منہ چڑا رہے تھے۔ مجھے چیلنج کر رہے تھے کہ کر سکتی ہو تو ہمیں حل کر کے دکھاؤ......
میری ہر امید، ہر خوشی، ہر یقین اور ہر سہارا گویا برسوں پہلے بڑی آپا اور سہیلیوں کے ساتھ دیکھے ایک پرانے باکسنگ میچ کے دوران بجنے والے گانے ''کیچ می اِف یو کین'' کی دُھن پر رقصاں تھے۔ انہیں پکڑ نا یا ان تک پہنچنا تو ایک طرف، مجھ میں تو اب نظریں اٹھا کر ان کی سمت دیکھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ دل کے چُور چُور ہو جانے، جذبوں کی شکست اور رشتوں پر سے یقین اٹھ جانے کے بعد زندگی کسی بوجھ سے کم نہیں تھی مگر میں اس طرح بہر حال مرنا نہیں چاہتی تھی۔ جبلت مجھے نادیدہ منزل کی جانب کھینچے لیے جا رہی تھی۔ میرے کانوں میں مسلسل وہ آوازیں گونج رہی تھیں جنہوں نے میری سماعت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ میرے دل پر ایسی خراشیں لگائی تھیں کہ وہ زخم لمحوں میں ناسور بن گیا تھا اور اب شاید کبھی بھی اس پر کھرنڈ نہیں آسکتا تھا۔
''کیا ہو گیا ہے پُتر...... تو اتنا اُلجھا ہوا لگ رہا ہے، آخر بات کیا ہے؟ جلدی سے بتا، مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ اتنی رازداری کی بات ہے کیا آخر؟'' ابا کی تیز اور پریشان آواز نے ہی میرے قدم روکے تھے ورنہ میں اُس روز بہت جلدی میں تھی۔ میری سب سے اچھی دوست سلمٰی کی شادی جو ہو رہی تھی۔ آج اس کی مہندی اور ڈھولکی تھی اور میں جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتی تھی مگر گھر کا کام نمٹانا بھی ضروری تھا۔ سارا کام کرنے کے بعد اب میں اکرم بھائی

کے آنے کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ وہ توے سے اترتی گرما گرم روٹی کھانے کا عادی تھا۔ اماں کے گھٹنوں میں چوبیس گھنٹے درد رہتا تھا۔ یوں میں روٹی پکائے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔ بالآخر بھائی آ گیا مگر وہ میرے سوال کا جواب دیے بغیر ابا اور اماں کو لے کر بڑے کمرے میں جا گھسا تھا۔

وہ ہم پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ ہم لوگ گاؤں کے بڑے تو نہیں مگر قدرے بہتر زمیندار تھے۔ گاؤں میں موجود چند پکے گھروں میں سے ایک ہمارا تھا۔ گھر میں سب کچھ تھا۔ مجھ سے بڑی چار بہنوں کے بعد بھائی پیدا ہوا تھا۔ دادی بتاتی تھیں کہ بھائی کے پیدا ہونے کی خوشی میں گھر میں سات دن تک دعوتیں ہوتی رہی تھیں۔ خاص لنگر کا بندوبست کیا گیا تھا، دوسرے گاؤں سے میراثنیں بلائی گئی تھیں۔ غرض عقیقے تک خوب جشن منایا گیا تھا۔ وہ اماں اور ابا کی آنکھ کا تارا تھا۔ بچپن سے ہی اس کی ہر بات ماننا وہ دونوں اپنا فرض سمجھتے تھے۔ سب سے بڑی آپا ہو، چھوٹی آپا یا باجی سب کو اس کے اشاروں پر چلنا پڑتا۔ پھر میں تو یوں بھی اس سے دو سال چھوٹی تھی، مجھ پر تو وہ بہت ہی حکم چلایا کرتا۔

اول تو اس کی ہر خواہش اور آرزو مانگنے سے پہلے ہی پوری کر دی جاتی تھی مگر اس کے باوجود بچپن میں وہ ہمیشہ مجھے مار پیٹ کر میری ٹافیاں، آئس کریم اور جو اس کا دل چاہتا چھین کر کھا جایا کرتا، میری گڑیوں کے ٹکڑے کر کے قہقہے لگاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار اس نے مجھے ستانے کے لیے میرے چھوٹے سے چوزے کی گردن کاٹ دی تھی۔ ابا اس کی حرکت پر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ان کے خیال میں یہ ان کے بیٹے کی جی داری تھی کہ وہ چھوٹی سی عمر میں چوزہ حلال کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں گھبرایا تھا۔ میں اس دوران چیخ چیخ کر روتی رہی تھی۔ آخر اماں نے میری پیٹھ پر دھموکے لگا کر مجھے آپا کے پاس بھیج دیا تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی تب ہی سے رویّے کے اس فرق کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں اکثر آپا سے پوچھتی کہ ابا، بھائی سے ہی اتنا پیار کیوں کرتے ہیں؟ ہر بار وہی میلے میں کیوں جاتا ہے؟ اس کی ہر بات کیوں مانی جاتی ہے؟ ماں سب سے پہلے اسے کھانا کیوں دیتی ہیں اور وہ مجھے مارتا ہے تو اسے مار کیوں نہیں پڑتی؟ میرے ہر سوال کے جواب میں وہ اکثر خاموش ہو جاتیں۔

''وہ تم سے بڑا جو ہے۔'' جب میں نہیں مانتی تو تھک ہار کر یہی جواب اُن کے پاس ہوتا۔

''مگر پھر تم بھی تو اس سے بڑی ہو.....؟'' مجھے صبح ہی اس کے آپا کو مارے ہوئے مُکّے یاد آ جاتے۔

''وہ لڑکا ہے نا اس لیے.....'' چھوٹی آپا کا صاف جواب مجھے پتنگے لگا دیا کرتا۔

''تو اس میں اس کا کیا کمال ہے..... لڑکا ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ جو مرضی آئے کرتا پھرے.....''

''تو چپ کر سارہ..... اماں نے سنا تو تیری شامت آ جائے گی، بس کہہ دیا نا کہ وہ تجھ سے بڑا ہے اور ویسے بھی اماں کہتی ہیں نا کہ بھائی چھوٹا ہو یا بڑا..... بڑا ہی ہوتا ہے کیونکہ اس پر بہنوں کی حفاظت فرض ہوتی ہے۔'' آپا مجھے سمجھا دیتیں۔

میں تو سمجھ جاتی تھی مگر اس بے جا لاڈ پیار نے بھائی کو بچپن ہی سے غصہ ور، ضدی اور لڑاکا بنا دیا تھا۔ مار پیٹ، لڑائی جھگڑا، گالم گلوچ اس کا روز کا معمول تھا۔ لوگ کتنا بھی سمجھاتے مگر اماں اور ابا کو اس کی کوئی غلطی کبھی نظر نہیں آتی تھی۔ یوں عمر کے ساتھ ساتھ اس کی ضد اور غصہ بڑھتا چلا گیا۔ ابا کو اسے پڑھانے کا بڑا شوق تھا مگر اسکول والے ابا کی تمام تر نوازشات کے باوجود ہر تھوڑے دن بعد اسے فارغ کر دیتے، خود اسے بھی پڑھائی سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ بالآخر ابا نے اسے زمینوں پر لگانے میں ہی عافیت سمجھی۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ مجھ سے بڑی چاروں بہنوں میں سے کوئی بھی دوسری تیسری سے آگے نہیں پڑھ پائی تھی مگر میری خوش قسمتی تھی کہ ان دنوں اسکول میں ایک بہت اچھی استانی آ گئی تھی جس کی ابا بھی بہت عزت کرتے تھے یوں مجھے پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ میری چاروں بہنیں اب اپنے اپنے گھروں کی تھیں اور میں دسویں کا امتحان دے چکی تھی۔ آگے پڑھنے کی لاکھ خواہش کے باوجود میں جانتی تھی کہ یہ ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے اس خواب کو آنکھوں سے نوچ پھینکا تھا۔ اب ایک ایک کر کے میری سہیلیوں کی شادیاں ہو رہی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ جلد ہی میری بھی بات پکی کر دی جائے گی۔ نئی زندگی کے خواب کبھی دل کو خوشیوں سے بھر دیتے تو کبھی وسوسے گھبراہٹ کے بیج بوتے۔ ان ہی کھٹی میٹھی سوچوں میں وقت گزر رہا تھا۔

بھائی کو آئے پانچ چھ منٹ گزر گئے تھے۔ مجھے جلدی تھی اسی لیے میں اماں سے کھانے کا پوچھنے آئی مگر ابا کی آواز میں اتنی پریشانی تھی کہ ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔

''ابا بتانے کے لیے ہی تو اندر لایا ہوں۔'' بھائی کی

آواز اُبھری۔

''پر ایسا ہوا کیا ہے پُتر..... کچھ مجھ بھی تو پتا چلے۔''

اماں نے پوچھا۔

''بتا رہا ہوں اماں..... صبر سے کام تو لے..... وہ وحید ہے نا ساجد چاچا کا بیٹا.....''

''ہاں ہاں..... جو شہر کے کالج میں پڑھتا ہے..... وہی نا؟ تو اسے کیا ہوا؟''

''وہی..... چار جماعتیں کیا پڑھ لیں خود کو ملک کا وزیر اعظم سمجھنے لگا ہے..... مجھے سمجھانے کی کوشش کرے گا.....؟ پہلے بھی دو چار بار منہ ماری ہو چکی ہے اس سے میری..... اپنی اوقات بھول گیا تھا..... اس کا باپ ہماری زمین پر کام کرتا آیا ہے اور وہ مجھے بات کرنے کی تمیز سکھا رہا تھا۔'' بھائی رعونت سے بولا۔

''پھر کیا ہوا؟ تو نے اس سے جھگڑا کیا؟'' اماں نے پوچھا۔

''وہ تو ہونا ہی تھا نا اماں..... اتنی بکواس کر رہا تھا کہ مجھے بھی غصہ آ گیا..... سامنے ہی انور کی کلہاڑی پڑی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اٹھا کر ماری اُلو کے پٹھے کے سر میں..... دو منٹ میں دم نکل گیا سالے کا.....'' بھائی کے لہجے میں شرمساری تھی نہ خوف۔

''ہائے میرے ربا..... تو..... تو نے اسے مار ڈالا..... یہ تو نے کیا کیا اکرم.....؟'' اماں رونے لگیں۔

''اب کیا ہوگا؟ پولیس نہیں چھوڑے گی تجھے..... ہمارا کیا ہو گا.....؟ کیسے جئیں گے تیرے بغیر.....؟ تو نے سوچا کیوں نہیں.....؟''

''یہ سب ہوا کیسے.....؟'' ابا نے کہا۔ ''اور تو دو منٹ چپ تو کر نیک بخت..... میں بات کر رہا ہوں نا..... مجھے سمجھنے تو دے کہ ہوا کیا ہے اور بچت کیسے ہو سکتی ہے۔'' ابا نے اماں کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔

''ابا اصل میں میں تنور والے مامے کو جھاڑ رہا تھا، کل میرے دوستوں کو اس نے جلی ہوئی روٹیاں دی تھیں اور الزام یہ لگایا کہ وہ اتنا شور شرابا کر رہے تھے کہ روٹیاں جل گئیں..... تو میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اکرم کے دوستوں سے ایسی بات کرنے والے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ ابھی صرف چار چھتر ہی مارے تھے کہ یہ لاٹ صاب کا بیٹا آ گیا..... تھوڑی منہ ماری ہوئی..... ہم تو وہیں اس کو ٹھیک کر دیتے مگر اس کا باپ بیچ میں آ گیا اور لے گیا اسے بچا کر..... آج میں زمین پر تھا تو وہ وہاں چلا آیا..... مجھے تمیز سکھا رہا تھا۔ ادب احترام کا درس دے رہا تھا۔ میں نے اسے کہا بھی کہ اپنے کام سے کام رکھے..... میرا مقابلہ خراب نہ کرے مگر وہ نہیں مانا..... اور پھر بات بڑھتی ہی چلی گئی۔''

''وہاں کون کون تھا.....؟'' ابا کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''سب ہی تھے اپنے مزارع..... ماسٹر کا لڑکا بھی گزرا تھا۔''

''قیامت کر دی تو نے اکرم..... یعنی سب کو معلوم ہے اور گواہ بھی مل جائیں گے.....'' ابا کے منہ سے چیخ سی نکلی۔

''اب کیا ہوگا اکرم کے ابا.....؟'' اماں گویا ڈھے سی گئیں۔ میرے اپنے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ یہ کیسی مصیبت آ گئی تھی۔ مجھے ہمیشہ سے یہی ڈر تھا کہ بھائی کا غصہ کسی دن کوئی بڑی پریشانی کھڑی کر دے گا اور وہ پریشانی آ گئی تھی۔

''اکرم..... اب میں کیا کروں..... ساجد کا وہ ایک ہی پُتر تھا۔ وہ تجھے اس کا خون بھی معاف نہیں کرے گا اور تو عدالت میں بھی بچ نہیں پائے گا۔ کتنا سمجھایا تھا تجھے کہ ہر وقت کا غصہ اچھا نہیں ہوتا.....'' ابا نے مایوسی سے کہا۔

''اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا، وہ جو کہتے ہیں نا کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔''

''تو کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا..... میرا بچہ نہیں بچ سکتا۔ اکرم کے ابا کچھ کرو.....'' اماں روئے جا رہی تھیں۔

''تو میری بات تو سن اماں..... میں اس مسئلے کا حل بھی نکال کر لایا ہوں۔'' بھائی کی آواز میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔

''حل..... کیسا حل..... کیا بچنے کا کوئی راستہ ہے؟''

''اماں میں وہاں سے سیدھا اپنے دوست شوکت کی طرف گیا تھا، وہ پولیس میں کانسٹیبل ہے۔ میں نے سوچا کہ وہی مجھے بچنے کا کوئی راستہ بتا سکتا ہے۔''

''پھر..... اس نے کچھ بتایا.....؟'' ابا نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں ابا..... اگر تم اور اماں مان جاؤ تو میں بچ سکتا ہوں۔''

''میں اور تیری اماں..... بیٹا تجھے بچانے کے لیے تو ہم اپنی جان بھی دے سکتے ہیں، تو بتا کیا طریقہ ہے..... پیسا مانگ رہا ہے وہ.....؟'' ابا نے پوچھا۔

''پیسا تو لگے گا ہی ابا لیکن.....''

''لیکن کیا..... بولتا کیوں نہیں؟''

''اماں وہ کہہ رہا تھا کہ یہ قتل چھپ نہیں سکتا، گواہ موجود ہیں۔ اب اس سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میں اس قتل کو قبول کر لوں..... خود ہی تھانے جا کر گرفتاری دے دوں.....''

''کیا الٹی بات کر رہا ہے تو.....'' ابا غصے سے بولے۔

''اور وہ تیرا دوست ہے یا دشمن..... جب تو خود ہی قبول لے گا تو پھر سزا ہونی ہی ہوتی ہے۔''

''ابا وہ کہتا ہے کہ اگر میں قتل کا اعتراف کر لوں اور یہ کہوں کہ میں نے اسے غیرت کی وجہ سے قتل کیا ہے تو مشکل سے سال دو سال کی سزا ہو گی ورنہ پھانسی یا عمر قید تو لازم ہے۔''

''کیا کہہ رہا ہے تُو..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''اماں تم سمجھ نہیں رہی ہو.....'' وہ بولا۔

''تو تو سمجھا مجھے..... صاف صاف بات کر بیٹا.....''

''اماں..... شوکت نے کہا ہے کہ اس کے لیے مجھے اس معاملے کو غیرت کا معاملہ بنانا ہو گا..... ہم سب کو یہی کہنا ہو گا کہ وحید اور سارہ کے آپس میں تعلقات تھے، مجھے معلوم ہو گیا اور میں نے غیرت میں آ کر ان دونوں کو مار ڈالا۔''

''تعلقات.....؟ دونوں کو مار ڈالا.....؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے اکرم؟'' اماں چیخ پڑیں۔ ''تیرا دماغ تو جگہ پر ہے نا؟''

مجبوری ہے اماں..... اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے، اگر تم دونوں اس کام میں میرا ساتھ نہیں دے سکتے تو پھر مجھ پر فاتحہ پڑھ لو..... کیونکہ دوسری صورت میں مجھے پھانسی کی سزا ہی ہو گی۔'' وہ بولا۔

''تو..... سارہ کو مار دے گا؟'' ابا کی آواز لرز رہی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ غیرت میں تو نے وحید کو مار دیا اور سارہ کو نہیں مار پایا.....''

''نہیں ابا..... اس طرح کیس نہیں بنے گا۔ میں اگر سارہ کو مار کر تھانے میں خود پیش ہو جاؤں تو شوکت مجھے بچا لے گا۔'' اکرم ملتجیانہ انداز میں بولا۔ ''ابا کوئی راستہ ہوتا تو میں خود سو چتا مگر اب میں پھنس گیا ہوں اور اس سے نکلنے کے لیے ہمیں یہ کرنا ہی پڑے گا۔''

''مگر سارہ..... وہ بھی تو میری بیٹی ہے۔''

''ہاں اکرم..... اس سب میں اس کا کیا دوش..... پھر ایسا الزام لگے گا تو کتنی بدنامی ہو گی؟'' اماں نے بھی کہا۔

''تو پھر رو لینا مجھ پر.....'' اکرم بھڑک اٹھا۔ ''دیکھ اماں! اب تو سوچ لے..... بیٹیاں تو تیری چار اور بھی ہیں پر بیٹا تو ایک ہی ہے نا..... اگر میں مر گیا تو.....''

''ایسا مت کہہ اکرم..... ہول آتے ہیں مجھے..... اللہ تجھے سلامت رکھے۔''

''بس تو پھر فیصلہ کر و جلدی..... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے..... میں وہ کلہاڑی ساتھ لایا ہوں۔''

اندر لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی مگر مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے کانوں میں بم پھٹ رہے ہوں۔ میرا بھائی..... میرا سگا بھائی مجھ پر جھوٹی تہمت لگا کر قتل کرنا چاہتا تھا۔ میری موت اس کے لیے زندگی کی نوید بن رہی تھی اور وہ اتنی آسانی سے سب کچھ طے کر کے آلۂ قتل تک اپنے ساتھ لے آیا تھا، جیسے اسے پہلے ہی اپنے منصوبے کی کامیابی کا سو فیصد یقین ہو مگر میں جانتی تھی کہ اماں اور ابا اس کو اس عمل کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے اور نتیجے میں بہت بڑا فساد کھڑا ہو گا۔ بھائی آسانی سے ماننے والوں میں سے نہیں تھا اور یہ تو اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اگر اس نے غلطی کی ہے تو اسے خود ہی اس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار ہونا چاہیے۔

میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ اماں کی آواز نے میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرکا کر مجھے معلق کر دیا۔

''میں یہ کیسے برداشت کروں گی اکرم..... تجھے بچاتی ہوں تو سارہ مرتی ہے اور سارہ کو بچاتی ہوں تو تُو ہاتھ سے جاتا ہے۔'' وہ روئے جا رہی تھیں۔ ''یہ تو نے کیا کر ڈالا، کس عذاب میں ڈال دیا مجھے..... میں یہ سب ہوتے نہیں دیکھ سکتی..... میں کلثوم کے گھر جا رہی ہوں، اب جو اللہ کی مرضی..... بس میری بیٹی کو زیادہ تکلیف نہ ہو۔''

اماں کی بات سن کر میرا دماغ بھک کر کے اُڑ گیا..... میری ماں نے میرے بھائی کو میرے قتل کی اجازت دے دی تھی۔

موت..... وہ بھی ایک ایسے شرمناک الزام کے ساتھ..... اور اپنے ہی ماں جائے کے ہاتھوں سے..... میں پوری جان سے لرز رہی تھی۔ اب میری ساری امیدیں ابا سے وابستہ تھیں۔

''میں بھی تیرے ساتھ چل رہا ہوں اکرم کی ماں..... جب میں کچھ کر نہیں سکتا تو یہاں اکیلا رک کر کیا کروں گا۔'' ابا کی مایوس آواز میرے لیے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوئی۔ میں نے خود کو بمشکل گرنے سے بچایا..... یہ سب سچ تو نہیں ہو سکتا۔ یقیناً میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔

میں نے اپنے بازو میں چٹکی کاٹی۔ میری شدید تمنا بھی حقیقت کو خواب میں تبدیل نہیں کر سکی۔

جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب سچ تھا..... شرمناک اور بھیانک سچ.....

موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے، یہ تو میرا کچا ذہن بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اگر کبھی ابا، اماں یا اکرم بھائی کے لیے مجھے اپنی جان دینا پڑتی تو میں شاید ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتی مگر اس طرح..... اس الزام کے ساتھ استعمال ہونا میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

میرے دل و دماغ میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔ میرے پیر میرا وزن اٹھانے سے انکاری ہو رہے تھے اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس حالت میں بھی یہ تو میں جانتی ہی تھی کہ مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا ورنہ مجھے اکرم بھائی کے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں تھا۔ مجھے ان تینوں کے کمرے سے نکلنے سے پہلے یہاں سے کہیں دور جانا تھا جہاں اکرم بھائی مجھے ڈھونڈ نہ پاتے۔

میں دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے تیزی سے گھر سے باہر نکل گئی۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو سلمٰی کے گھر کے باہر کھڑا پایا۔ میں آنسو پونچھ کر تیزی سے اندر گھس گئی۔ وہاں کافی عورتیں صحن میں موجود تھیں۔ اتنے لوگوں کو اپنے اردگرد پا کر میرے خوف میں قدرے کمی ہوئی تھی۔ ہاں احساس میں لگی آگ کی تپش اسی طرح جوالا بنی ہوئی تھی۔ اس میں تو شاید کبھی بھی کمی نہیں ہو سکتی تھی۔

سلمٰی مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ میری دوست تھی۔ ہم نے بچپن ساتھ گزارا تھا اور ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے مگر اس وقت میری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ کسی کے لیے کچھ بھی سمجھ لینا ممکن تھا۔

''ہوا کیا ہے تجھے.....؟ کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے..... بول نا؟'' اس نے مجھے کوٹھری میں لے جا کر تفتیش شروع کر دی۔

میں چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ میری آنکھوں سے پھر آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

''بول نا..... سارہ بتا کیا ہوا ہے؟ بھائی سے جھگڑا ہو گیا؟ بتاتی کیوں نہیں؟'' وہ الجھ کر پوچھے جا رہی تھی۔ اس کے جھنجھوڑنے پر میں گویا ہوش میں آ گئی اور تڑپ کر اس کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔

''سارہ سب خیر ہے نا..... خالہ، خالو ٹھیک ہیں نا.....؟''

''سب ٹھیک ہیں سلمٰی بس خیر نہیں ہے۔'' میں بمشکل بولی۔

''کیوں.....؟ کیا ہوا ہے؟''

میں اسے کس طرح بتاتی کہ کیا ہو گیا ہے۔ جو کچھ مجھ پر بیتی تھی اس کو الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل تھا مگر پھر بھی مجھے اسے سب بتانا تھا اور وہ میں نے بتا دیا۔ سلمٰی منہ کھولے سب سنتی رہی۔

''یا میرے اللہ..... یہ سب کیا ہو گیا؟ اب کیا ہو گا؟ مگر تُو یہ بتا کہ تو یہاں کیوں آئی ہے.....؟'' وہ بولی۔

میں اسے دیکھتی رہ گئی..... یہ ایک دن میری ساری زندگی کی محبتوں اور رشتوں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے طلوع ہوا تھا۔

''تو میرے آنے سے ناراض ہے.....؟'' میں نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''تیری تقریب خراب نہ ہو جائے اس بات کا ڈر ہے تجھے.....؟'' یہ میرے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا۔ ''مشکل پڑی تو..... تُو نے بھی منہ پھیر لیا..... تو تو میری دوست ہے۔''

''تب ہی تو کہہ رہی ہوں جھلی کہ تُو یہاں کیوں آئی ہے؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''یہاں تم سب ہو..... یہاں اکرم بھائی کچھ نہیں کر سکتا اور میں کہاں جاتی.....؟ آپا کا گھر دور ہے اور وہاں ابا اور اماں جا رہے ہیں۔'' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔

''دیکھ سارہ جب وہ دیکھے گا کہ تُو گھر میں نہیں ہے تو وہ تجھے ڈھونڈنے سیدھے یہاں آئے گا..... اور یہاں موجود اتنے سارے لوگ..... یہ کیا کریں گے..... یہ تو اکرم کے حق میں اور اچھا ہو گا۔ وہ غیرت مندی کا ناٹک کرتا ہوا سب کے سامنے تجھے مار دے گا اور تھانے میں پیش ہو جائے گا۔ یہ سب اس کے گواہ ہوں گے۔ جو کھیل وہ کھیلنا چاہتا ہے اس کا تو مقصد ہی یہ ہے نا..... تو یہاں آ کر خود نشانے پر آ گئی ہے..... یہاں سے بھاگ جا میری بہن، کہیں دور چلی جا..... جہاں یہ لوگ پہنچ نہ سکیں۔ بھول کر بھی اپنی بہنوں کے گھر جانے کی غلطی مت کرنا۔ وہ بھی تجھے نہیں بچا سکیں گی..... یہاں سے کہیں دور چلی جا.....'' وہ روئے جا رہی تھی۔

میں حیرت سے منہ کھولے اُسے دیکھ رہی تھی، یہ تو میں

نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ ایک ''بدکردار'' بہن کے بھیجے ہوئے ''غیرت مند'' بھائی کے لیے یہ بہترین جگہ اور موقع تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی روک پاتا، وہ سب کچھ کر گزرتا اور پھر ان سب کو اپنا گواہ بنا لیتا۔ مجھ سے نہ تو کوئی کچھ پوچھ پاتا اور نہ ہی مجھے کچھ بتانے کا موقع ملتا اور اگر مل بھی جاتا تو میری بات پر کس نے یقین کرنا تھا۔

میرے دماغ میں سرسراہٹ سی ہو رہی تھی اور جسم سن ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی بہت بڑے بھنور میں پھنس گئی ہوں اور وہ مجھے اپنی پوری طاقت کے ساتھ گھمائے لیے جا رہا تھا۔ بچت کا کوئی راستہ اور پناہ کی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ زندگی اچانک ہی کسی ہولناک جنگل کا سفر بن گئی تھی جہاں ہر موڑ پر موت پہرے دے رہی تھی۔ مجھے پہلی بار خطرے کا اتنا شدید احساس ہوا تھا۔ اب تک تو میں خوف سے زیادہ صدمے کا شکار تھی مگر اب میری تمام حسیات جاگ اٹھی تھیں۔ مجھے خود کو بچانا تھا۔

کسی بھی طرح..... یہاں سے دور جانا تھا..... اتنی دور کہ جہاں اکرم بھائی مجھ تک نہ پہنچ سکے۔

میں ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور تیزی سے کوٹھری کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں رکی پھر بجلی کی سی رفتار سے لپک کر سلمٰی کے پاس آئی اور اُسے گلے سے لگا لیا۔

''تو اپنا خیال رکھنا..... اور میری وجہ سے اپنی خوشیوں کو خراب مت ہونے دینا۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہے تو سارہ..... تُو اتنی مشکل میں ہے اور میں خوشیاں مناؤں؟ تو میری فکر چھوڑ..... اپنا خیال رکھنا، ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا..... اللہ تیرا مددگار رہے۔ میں ہمیشہ تیرے لیے دعا کرتی رہوں گی۔ اکرم بھائی یا تیرے گھر سے کوئی بھی آیا تو میں یہی بتاؤں گی کہ تو چھوٹی آپا کی طرف گئی ہے، وہ یہاں سے چار گھنٹے کے فاصلے پر ہے جب تک وہ تجھے تلاش کریں گے تو یہاں سے کافی دور جا چکی ہو گی۔'' وہ مجھے گلے سے لگائے روتے روتے کہے جا رہی تھی۔

میں نے اس کا سر تھپتھپایا اور چہرہ صاف کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔ سلمٰی کے ساتھ گزارے ہوئے ان لمحوں نے میری ساری زندگی بدل ڈالی تھی۔

میں تیز تیز چلتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ گئی۔ پٹری پر چلتے ہوئے گزری ہوئی زندگی کسی فلم کے مانند میری نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھی اور آنسو میرا چہرہ بھگوتے جا رہے تھے۔

ہمارے گاؤں کے باہر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا جہاں کچھ ٹرینیں رکتی تھیں جبکہ اکثر بغیر رکے گزر جاتی تھیں۔ اسٹیشن پر اس وقت قدرے چہل پہل تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹرین جلد آنے والی ہے۔ میں نے چادر کو پھیلا کر سر اور جسم پر اوڑھ رکھا تھا تاکہ اگر کوئی جاننے والا آ بھی جائے تو مجھے آسانی سے پہچان نہ سکے۔ اسٹیشن والے بابو یا کسی اور سے کچھ پوچھنے میں پہچان لیے جانے کا خدشہ تھا اس لیے میں ایک ستون کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ مجھے اب ٹرین کا انتظار تھا..... اور پھر ٹرین آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ یہاں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں رکے گی، اسی وجہ سے ٹرین کے رکتے ہی میں سامنے نظر آنے والے پہلے ڈبے میں سوار ہو گئی۔ میرے چڑھتے ہی ٹرین کی سیٹی بجی اور پھر اس نے آگے کی جانب کھسکنا شروع کر دیا۔ میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی حسرت سے باہر دیکھ رہی تھی۔

وہ گاؤں..... جہاں میں پیدا ہوئی، میں نے ہوش سنبھالا، جہاں کھیل کود کر جوان ہوئی لمحہ بہ لمحہ میری نظروں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ میرا سب کچھ مجھ سے بچھڑ رہا تھا اور وہ بھی یوں کہ واپسی کی کوئی سبیل، کوئی امید نہیں تھی..... پھر مسافر واپس جاتا بھی تو کس کے لیے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جنہیں میں ہاتھوں کی پشت سے رگڑ کر گالوں تک پہنچنے سے روک رہی تھی۔ اب مجھے رونا نہیں تھا مگر روئے بنا رہا بھی نہیں جا رہا تھا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ مجھے اب تک یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

ٹرین گاؤں کی حدود سے باہر نکل گئی تو میں بھی اندر جانے کے لیے مڑی مگر اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں غلطی سے مردانہ ڈبے میں سوار ہو گئی تھی جہاں کوئی عورت نہیں تھی۔ ٹرین میں زیادہ رش نہیں تھا مگر ساری نشستیں بھری ہوئی ضرور تھیں۔

''اوہو..... غلطی سے چڑھ گئی ہو بٹیا.....'' ایک قدرے ادھیڑ عمر کا آدمی مجھے ہچکچاتا دیکھ کر مسکرایا۔

''جی چاچا..... میں آدھے چہرے تک دوپٹا جماتے ہوئے بولی۔

''تو پھر اب یہاں آ جاؤ..... اگلے اسٹیشن تک تو یہیں رکنا ہو گا۔'' انہوں نے خود کو سمیٹتے ہوئے جگہ بنائی۔

''شکریہ..... میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا خاک ٹھیک ہو..... اب کیا اگلے اسٹیشن تک کھڑے ہی رہنا ہے، یہ ٹرین ہے کوئی بس نہیں کہ پانچ منٹ بعد دوسرا اسٹاپ آجائے۔'' وہ ہنس کر بولے۔

اُن کے اصرار پر میں سیٹ کے کونے پر ٹک گئی۔

''کہاں جارہی ہو؟ کوئی ساتھ میں ہے؟ سامان تو کوئی ہے نہیں تمہارے ساتھ.....'' انہوں نے پُرتشویش نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہے نا..... اماں ساتھ ہے..... وہ اصل میں پچھلے ڈبے میں تھے ہم لوگ..... میں تو چائے کا پوچھنے اتری تھی کہ ٹرین اچانک چل پڑی اس لیے بھاگ کر یہاں چڑھنا پڑا۔'' میرے ذہن نے فی البدیہہ کہانی گھڑلی تھی۔

''اوہو..... پھر تو تمہاری اماں بہت پریشان ہورہی ہوں گی..... تم کہو تو زنجیر کھینچ دوں.....؟''

''نہیں نہیں..... ٹرین چلتے ہی جب میں بھاگی تو اماں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اشارہ کردیا تھا کہ یہاں چڑھ رہی ہوں، اگلے اسٹیشن پر اتر کر چلی جاؤں گی۔''

''ہاں، ہاں تب تک آرام سے بیٹھو.....'' وہ مسکرائے۔ اردگرد موجود لوگ ترحم آمیز دلچسپی سے میری بات سن رہے تھے۔

میں خاموشی سے اپنی جگہ پر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرین جا کہاں رہی ہے۔ گزری ہوئی زندگی میری آنکھوں کو جل تھل کررہی تھی تو آنے والے دنوں کا خوف مجھے لرزا رہا تھا۔ اگر ان لوگوں کو شک بھی ہوجاتا کہ میں گھر سے بھاگ کر جارہی ہوں تو نہ جانے ان کا رویہ کیسا ہوتا؟ خدا جانے وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتے؟ چاچاجی نے درمیان میں مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر غلطی ہو جانے کے ڈر سے میں نے ہوں ہاں کرکے ٹال دیا جس کے بعد وہ آپس میں گپیں لگانے لگے تھے۔

اسٹیشن آنے میں ابھی کچھ دیر تھی مگر اس سے قبل ہی ٹی ٹی بابو کی آمد ہوگئی۔ یہ ایک قدرے کرخت چہرے والا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ میں اپنی سوچوں میں اتنی مگن تھی کہ مجھے اس کی آمد کی خبر اس وقت ہوئی جب اس نے مجھ سے ٹکٹ طلب کیا۔ جواب میں، میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

''کیا بات ہے بی بی..... کیا اردو نہیں سمجھتیں یا ٹکٹ کا مطلب معلوم نہیں ہے؟'' وہ مجھے گھور کر بولا۔

''ارے بھائی..... بچی غلطی سے اس ڈبے میں چڑھ گئی ہے۔'' چاچاجی یہاں بھی میری مدد کو آئے۔ ''اس کی اماں پیچھے کسی ڈبے میں ہیں۔ یہ اسٹیشن پر اتری اور گاڑی چل پڑی تو یہاں سوار ہوگئی۔'' انہوں نے اسے پوری کہانی سنائی۔

''کس ڈبے میں ہیں اماں؟'' ٹی ٹی نے مجھے مشکوک انداز میں گھورا۔

''پیچھے ہیں؟'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''جھوٹ تو نہیں بول رہی نا..... میں تو آدھے سے زیادہ زنانہ ڈبوں میں ہوآیا ہوں، کسی نے مجھے کسی لڑکی کے رہ جانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''اماں ہیں..... ٹکٹ اُن کے پاس ہیں۔'' میں نے طوطے کی طرح سبق دہرایا۔ ٹی ٹی کے چہرے سے صاف نظر آرہا تھا کہ اسے مجھ پر یقین نہیں ہے۔ ڈر کے مارے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''ارے ٹی ٹی صاحب! ڈرا دیا ہے آپ نے بچی کو..... بتا تو رہی ہے کہ ٹکٹ اماں کے پاس ہیں..... اب کوئی اسٹیشن پر چائے لینے کے لیے اترتے ہوئے ٹکٹ تو نہیں لے کر اترتا نا.....'' چاچاجی میرے آنسوؤں کو دیکھ کر خفگی سے بولے۔

''ہاں بھئی..... مجرموں کو آپ لوگ چھوڑ دیتے ہیں اور عام لوگوں کا جینا محال ہے۔'' ایک اور صاحب نے بھی قدرے اونچی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ ان سب کی باتوں سے گویا مجبور سا ہوگیا۔ ''میں جارہا ہوں مگر اسٹیشن پر آؤں گا.....'' وہ گویا دھمکی دے کر گیا تھا۔ میں حد سے زیادہ خوف زدہ تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ بغیر ٹکٹ سفر کرنا باقاعدہ جرم ہے جس کی سزا میں جیل جانا پڑتا ہے، اس خیال نے ہی مجھ پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔

''ڈرو مت بیٹا..... ان لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے اس طرح بات کرنے کی.....'' چاچاجی مجھے تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''اسٹیشن بھی آنے کو ہی ہے..... تم گھبراؤ مت، میں تمہیں تمہارے ڈبے تک چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں چاچاجی! میں خود چلی جاؤں گی۔'' میں اس نئی اُفتاد پر گھبرا گئی۔ وہ اتنے اچھے انسان تھے کہ اُن سے جھوٹ بولنے پر میں دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہورہی تھی۔

''نہیں بیٹا! اگر تمہیں ڈبا نہ ملا تو پریشان ہوتی پھرو گی۔'' انہوں نے گویا میری بات اَن سنی کردی تھی۔

اسٹیشن کے آثار نظر آتے ہی میں کھڑی ہوگئی۔

چاچاجی تو مجھے چھوڑ کر آنے پر مُصر تھے ہی مزید کسر ٹی ٹی کی آمد نے پوری کر دی۔

''آیئے..... میں آپ کی اماں کو تلاش کرنے میں آپ کی مدد کر دیتا ہوں۔'' اس کے الفاظ اس کی نگاہوں کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

''میں انہیں ان کے ڈبے تک پہنچانے ہی جا رہا ہوں۔'' چاچاجی نے کہا۔

''آپ کیوں زحمت کرتے ہیں، میں تو جا ہی رہا ہوں ساتھ..... میری تو ڈیوٹی ہے۔'' ٹی ٹی نے ان سے کہا اور پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ ''چلیے جلدی سے آجایئے۔''

میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہ رہی تھی مگر اس سے زیادہ میں یہ بھی چاہتی تھی کہ چاچاجی پر میرا جھوٹ نہ کھلے سو میں مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق ٹرین سے اتر آئی۔ مجھے اس ٹی ٹی سے خوف سا آ رہا تھا۔ ٹکٹ کا معاملہ اپنی جگہ مگر وہ جیسی حقارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا، اس سے مجھے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

''ہاں تو کس ڈبے میں ہیں آپ کی والدہ.....؟''

''آگے جانا ہے.....'' میں نے دھیرے سے کہا۔

''دیکھو لڑکی، میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' وہ میرے ساتھ آخری روتک چلتا ہوا بولا۔ ''جس کی ٹکٹ اسٹیشن پر رہ جاتی ہے، وہ ماں بیٹھ کر اسٹیشن کے آنے کا انتظار نہیں کرتی۔ اب تو جاہل سے جاہل آدمی بھی جانتا ہے کہ زنجیر کھینچ کر گاڑی رکوائی جا سکتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اور میں تمہیں بتاؤں کہ میں ان معاملات کا ایکسپرٹ ہوں۔''

''میں ڈھونڈ لوں گی اپنی اماں کو..... آپ جایئے.....'' میں مڑتے ہوئے بولی۔

''مجھے اصل بات بتاؤ..... گھر سے بھاگ کر آئی ہو نا؟'' وہ میرا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بتا دو گی تو فائدے میں رہو گی۔''

''وہ رہی اماں.....'' میں اپنا بازو چھڑا کے زور سے چلّائی اور پھر تیزی سے عورتوں سے بھرے ڈبے کی طرف بھاگی۔ ٹی ٹی بھی میرے پیچھے آیا تھا۔

میں تیزی سے اس بھرے ہوئے ڈبے میں گھس گئی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔ ٹی ٹی کو عورتوں کے رش سے گزرنے میں قدرے وقت لگ رہا تھا، اس دوران میں ڈبے سے گزر کر دوسری جانب بنے دروازے سے نیچے اتر گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ چند لمحوں بعد وہ ٹی ٹی بھی باہر آجائے گا اور اب اس سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا۔ مجھے ان چند لمحوں میں ہی کوئی نہ کوئی جائے پناہ تلاش کرنی تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھی، دو ڈبوں کے بعد ایک کمپارٹمنٹ نظر آیا۔ عین اسی وقت سیٹی بجی، میں لپک کر اس ڈبے میں چڑھ گئی۔ وہ ڈبا ٹرین کے عام ڈبوں سے مختلف تھا، یہاں ایک لمبی سے گلی بنی ہوئی تھی جس میں کئی کمرے موجود تھے جن کے دروازے بند تھے۔ میں تیزی سے آگے بڑھی، تیسرے نمبر والے کمرے کا دروازہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسکا ہوا تھا۔ میں نے اس درز سے اندر جھانکا، وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا، میں لپک کر کمرے میں گھس گئی اور میں نے دروازے کو کھینچ کر بند کر دیا۔

اندر کا منظر دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ یہ ٹرین کے ڈبے کی جگہ ایک چھوٹا سا کمرا لگ رہا تھا جہاں آمنے سامنے اوپر نیچے دو آرام دہ گدوں والی سیٹیں لگی تھیں۔ بند کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹی سی الماری نما میز تھی جس پر کھانے پینے کی چیزیں رکھی تھیں۔ اندر ایک اور چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ جو اس وقت بند تھا۔ کمرے میں چھپنے کی جگہ کے علاوہ سب کچھ موجود تھا۔ پھر مجھے سیٹ کے ایک جانب دروازے کے قریب دو سوٹ کیس نظر آئے۔ مجھے اور کچھ سجھ نہیں آیا تو میں ان کے پیچھے دبک گئی۔ وہاں زیادہ دیر چھپنا ممکن نہیں تھا مگر فوری طور پر وہی جگہ میسر تھی۔

شام اب رات میں ڈھل رہی تھی۔ ہر طرف سے بند ہونے کے باوجود کمرے میں اچھی خاصی ٹھنڈ سی محسوس ہو رہی تھی۔ ٹرین اب چلنا شروع ہو گئی تھی۔ چند لمحوں بعد کمرے میں موجود دروازہ کھلا اور ایک خاصا موٹا سا چھوٹے قد کا آدمی باہر آیا۔ یہ مجھے تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ وہ غسل خانہ تھا۔ وہ باہر آ کر سامنے رکھی سیٹ پر گر سا پڑا تھا۔ اس کے جسم پر آرام دہ کرتہ شلوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی موٹی سی بیڑی تھی۔ میں نے کبھی اتنی موٹی بیڑی یا سگریٹ نہیں دیکھا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اسے سگار کہتے ہیں۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد حقے کی طرح اس کا کش لے رہا تھا۔

میں سوٹ کیس کے پیچھے چھپی اسے چوکنا نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جب تک وہ بیٹھا تھا تب تک کی تو خیر تھی مگر جب وہ کھڑا ہو کر ذرا سی بھی توجہ دیتا تو میرا چھپا رہنا ناممکن تھا۔

وہ جس طرح پڑا ہوا تھا اس سے مجھے یہ امید ہو رہی تھی کہ شاید وہ جلد سو جائے..... اور اگر ایسا ہو جاتا تو میرے

لیے آسانی پیدا ہو سکتی تھی۔ ایک غلطی میں خود کر چکی تھی۔ اگر میں دروازے کو کھلا رہنے دیتی تو موقع ملتے ہی کمرے سے نکل سکتی تھی مگر اب اس دروازے کو بغیر آواز کے کھسکانا ناممکن تھا۔ اچانک میری سانس جیسے رک سی گئی۔ وہ نشست سے کھڑا ہو گیا تھا، اب اس کا رخ اس چھوٹی سی میز نما الماری کی طرف تھا۔ وہ وہاں رکھے دو رنگا رنگ ڈبے اٹھا کر واپس سیٹ پر آ بیٹھا۔ ڈبے کے کھلتے ہی چھوٹا سا کمرا بھنے ہوئے قیمے کی اشتہا انگیز مہک سے بھر گیا۔ دوسرے ڈبے میں غالباً روٹیاں تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے صبح کسی کے گلاس کے ساتھ لی گئی ایک روٹی کے علاوہ کچھ نہیں کھایا تھا۔ شدید پریشانی اور بے سروسامانی کے ان بدترین حالات میں بھی میری بھوک نے خوشبو محسوس کرتے ہی اپنی موجودگی کا اظہار کر دیا تھا۔ بھنا قیمہ یوں بھی میری کمزوری تھی۔ اماں بہت اچھا بھنا قیمہ بناتی تھیں۔ اماں کا خیال آتے ہی میری آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے۔ دل میں اٹھنے والے درد کی شدید چبھن نے بھوک اور اس کے احساس کو نگل لیا۔

وہ نہایت اطمینان اور بے فکری کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا جیسے اُس کے پاس دنیا میں اور کچھ کرنے کو نہ ہو۔ کھانا ختم کر کے وہ باتھ روم میں گیا اور فوراً ہی نکل بھی آیا۔ میں سوٹ کیس کے پیچھے ڈبے کی دیوار اور زمین سے چپکی بیٹھی تھی۔ اچانک دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ 'اب میرا چھپنا ناممکن ہے۔' میں نے مایوسی سے سوچا۔ اب نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ اس دوران اس نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے دروازے کو کھسکا کر تھوڑا سا کھول لیا۔

''کون.....؟'' اس نے قدرے غصے سے پوچھا۔

''سر! میں ریلوے کی طرف سے ہوں، صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو کچھ درکار تو نہیں..... اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں ٹکٹ بھی چیک کر لوں.....'' اس آواز نے مجھے چونکا دیا تھا۔ یہ اسی ٹی ٹی کی آواز تھی فرق صرف یہ تھا کہ اس وقت اس کے لہجے میں شہد گھلا ہوا تھا۔

''گڈ تو اب تم اسپیشل اے سی سلیپر کے مہمانوں کے ٹکٹ بھی چیک کرو گے؟'' موٹے نے سختی سے پوچھا۔

''نو سر..... جسٹ اے فارمیلٹی..... اگر آپ نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں.....'' وہ گھبرا گیا۔

''نہیں اب تم آ ہی گئے ہو تو چیک کر لو۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔ ''یہ لو، دیکھ لو اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ کراچی تک مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔''

''جی سر..... بالکل سر.....! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔''

''میں پریشان نہیں ہوا کرتا لیکن اگر اب کسی نے مجھے ڈسٹرب کیا تو وہ بہت پریشان ہوگا، انڈر اسٹینڈ؟'' وہ غرایا۔

''جی سر.....'' ٹی ٹی کی سٹی گم ہو گئی۔

موٹے نے اس دوران دروازہ بند کیا اور دوبارہ سیٹ پر آرام سے لیٹ گیا۔

میں سانس روکے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس سارے چکر میں اس کی نظر سوٹ کیس کی طرف نہیں پڑی۔ شاید اس کی ایک وجہ ڈبے میں لگے بلب کی مدھم روشنی تھی یا پھر وہ واقعی بہت تھکا ہوا تھا اور صرف آرام کرنا چاہ رہا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو بہرحال میرے لیے بچت کا سامان ہو گیا تھا۔ میں نے تھوڑا سا مطمئن ہو کر سر کی پوزیشن تبدیل کی تو اچانک میری نظر اس پر پڑی۔

سوٹ کیس سے ذرا اوپر ڈبے کی دیوار پر چپکی ہوئی وہ چھپکلی میری نظروں کے عین سامنے تھی اور غالباً میری ہی طرح گھبرا کر مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں اتنی دیر سے ایک طرف سر نہوڑائے بیٹھی تھی جس کی وجہ سے میں اسے دیکھ نہیں پائی تھی۔ اب جب میں نے پہلو بدلا تو وہ میرے بالکل سامنے تھی۔

چھپکلی سے میں بچپن سے ہی بہت زیادہ ڈرتی آئی تھی حالانکہ گاؤں میں تو کبھی کبھار سانپ سے بھی پالا پڑ جاتا تھا۔ میں نے خود دو سانپوں کو مارا تھا۔ مضبوط کاٹھی اور صحت مند ہاتھ پیروں کی وجہ سے میری سہیلیاں ہمیشہ ایسی کسی مشکل میں مجھے ہی آواز دیا کرتیں۔ میں ان کی طرح چوہے یا کاکروچ وغیرہ سے بھی نہیں ڈرتی تھی، ہاں چھپکلی سے میری جان جاتی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی چھپکلی کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی بے اختیار میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں تیزی سے سوٹ کیس کے پیچھے سے برآمد ہو گئی۔

میری چیخ پر موٹے کا ردِعمل اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ وہ سیٹ پر پڑے پڑے ایک دم اچھل سا گیا اور جب اچھلنے کے بعد نیچے آیا تو مڑ کر میری جانب دیکھنے کی کوشش میں سیٹ کے بجائے زمین پر دھڑام سے گر پڑا۔ تیزی سے دوبارہ کھڑے ہونے کی کوشش میں وہیں دوبارہ پھسل کر گرا اور پھر بالآخر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

میں اس دوران ہونقوں کی طرح منہ کھولے اُسے دیکھتی رہی۔

''کک...... کون ہو تم؟ یہاں کیسے آئیں......؟ کیا چاہتی ہو؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں......؟'' وہ مسلسل سوال پر سوال کیے جارہا تھا۔ اس کی سانس بُری طرح پھولی ہوئی تھی اور اس کی توند تیزی سے اندر باہر ہورہی تھی۔

''مم...... میں...... وہ......'' میں نے ہاتھ بڑھا کر دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

''وہاں...... وہاں کیا ہے......؟'' وہ غرایا۔

میں نے مڑ کر دیوار کی طرف دیکھا۔ اس تمام شرانگیزی کے دوران وہ دہشت گرد چھپکلی نہ جانے کب اور کہاں غائب ہوگئی تھی۔

''وہاں چھپکلی تھی......'' میں نے بمشکل کہا۔

''وہاں چھپکلی تو تھی مگر تم یہاں کیوں ہو؟ ہو کون تم؟'' اب وہ خود کو سنبھال چکا تھا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے گھورے جارہا تھا۔

''مم...... میں سارہ ہوں......'' میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ درحقیقت میرے پاس کچھ کہنے کو تھا ہی نہیں۔ کسی کے بند کمرے سے اس طرح برآمد ہونے کی مجبوری چاہے کتنی بھی شدید کیوں نہ ہو مگر خود کو صحیح ثابت کرتے ہوئے اسے بیان کرنا بہرحال آسان کام نہیں تھا۔

''ہلو گی نہیں یہاں سے...... کھڑی رہو اسی طرح......'' مجھے حکم دے کر وہ لڑکھڑاتا ہوا میز کی طرف بڑھا اور تھرماس سے گلاس میں پانی بھر کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔

مجھے پانی پیے نہ جانے کتنی دیر ہوگئی تھی۔ میرا منہ، ہونٹ، زبان اور گلا خشک چمڑے کی طرح ہورہے تھے۔

میں خاموشی سے اپنی جگہ کھڑی اس کے ہاتھ میں موجود پانی کے گلاس کو دیکھ رہی تھی۔ دو گلاس پانی پینے کے بعد اس نے سگار۔ پھر سلگا لیا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہوئے اس کے منہ سے نکلنے والی کراہوں کا یقینی مطلب یہ تھا کہ اسے اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔

''اب بتاؤ...... تم کون ہو؟ یہاں کیسے آئیں اور مقصد کیا ہے تمہارا؟ یاد رکھو مجھ سے صرف سچ بولنا ورنہ میں دوبارہ پوچھوں گا بھی نہیں...... تمہیں ابھی ریلوے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ ہاں تو سچ بولنے کا ارادہ ہے یا نہیں......؟'' اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''جی......'' میں نے گردن ہلائی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

''پھر شروع ہو جاؤ...... کب سے ہو یہاں......؟''

''جب اسٹیشن پر گاڑی رکی تھی تب...... میں یہاں نہیں تھی مگر وہ ٹی ٹی میرے پیچھے پڑا تھا...... وہ اچھا آدمی نہیں تھا چاچا جی......''

''اے...... اے...... خبردار جو مجھے چاچا، ماما کہا۔ میں تمہیں اتنا بوڑھا نظر آتا ہوں اور دوسری بات یہ کہ میں تمہارا کوئی رشتے دار نہیں ہوں۔ اگر بالکل جاہل نہیں ہو تو سر کہہ سکتی ہو......''

''جی سر...... میں نے دسویں کا امتحان دیا ہے سر، پڑھی لکھی ہوں۔'' میں نے قدرے فخریہ انداز میں بتایا۔

''اونہہ، دسویں کا امتحان اور پڑھی لکھی...... فی الحال تو ایک چور ہو۔''

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 20,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 19,000 روپے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

''نہیں جی..... اللہ کی قسم، رسول جی کی قسم..... میں نے کبھی چوری نہیں کی..... یہاں بھی نہیں.....'' میں رو پڑی۔

''پھر ٹی ٹی تمہارے پیچھے کیوں پڑا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا.....'' میں نے آہستگی سے بتایا۔

''اور تم چور نہیں ہو؟'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''دسویں پڑھی ہو تو یہ بھی پتا ہوگا کہ بغیر ٹکٹ سفر کرنا جرم ہوتا ہے اور تم جا کہاں رہی ہو؟''

''پتا نہیں سر.....'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''کیا مطلب.....؟'' وہ چونک کر بولا۔ ''تم ٹرین میں بیٹھی ہو، وہ بھی بغیر ٹکٹ اور تمہیں یہ بھی پتا نہیں کہ تم کہاں جا رہی ہو؟''

''جی..... آپ شاید یقین نہیں کریں گے مگر مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ یہ ٹرین کہاں جا رہی ہے؟ معلوم کرنے کا وقت اور موقع ہی نہیں ملا۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''کیوں.....؟'' اس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس کیوں کا جواب تو میری زندگی کی ہر خوشی، ہر بے فکری کو نگل گیا تھا، اسے دہرانا آسان نہیں تھا مگر اب میں جھوٹ بولنے یا بات چھپانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے ساری کہانی سنا دی۔

''تو تمہارے ماں باپ، تمہارے بھائی کی اس سازش میں پارٹنر بننے کو تیار ہو گئے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں..... وہ بھائی کو ہر صورت بچانا چاہتے تھے۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

''خود اپنی عزت اور بیٹی کی جان کو داؤ پر لگا کر..... حد ہے۔'' وہ بولا۔ میں جواب میں خاموش رہی۔

''میں تم سے ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم اس کا جواب سوچ کر اور بالکل سچ دینا۔''

''جی.....''

''جو کچھ تم نے ابھی کہا ہے، وہ سب سچ ہے؟''

''جی ہاں..... آپ کا شک درست ہے، اب تک مجھے خود بھی یقین نہیں آیا کہ یہ سب میرے ساتھ ہو گیا ہے۔ اب بھی یہی لگتا ہے جیسے یہ سب کوئی بھیانک خواب ہے اور جب میری آنکھ کھلے گی تو میں اپنی چارپائی پر ہوں گی..... کاش ایسا ہو سکتا..... کاش یہ سب خواب ہوتا۔'' میں رو پڑی۔

وہ چند لمحے مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''تو اب تم کیا کرو گی؟''

''میں یہاں سے چلی جاؤں گی..... آپ کو میں نے تکلیف دی..... آپ مجھے معاف کر دیجیے۔'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تکلیف تو تم نے دی..... مگر سوال یہ ہے کہ اس وقت اندھیرے میں اس چلتی ٹرین سے تم کہاں جاؤ گی..... اگر کسی اسٹیشن پر اترتی ہو تو وہاں کیا کرو گی؟ کہاں جاؤ گی؟ کیسے خود کو بچاؤ گی؟ اس ٹی ٹی جیسے بہت لوگ ملیں گے تمہیں جو تمہاری مجبوری سے اپنی جیب بھرنا چاہیں گے۔''

''پتا نہیں جی.....'' میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں، میں تو بس اکرم بھائی سے بچنا چاہ رہی تھی..... موت سے بچنے کے لیے ٹرین میں بیٹھنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ رہا ہوں۔'' وہ سگار کا لمبا سا کش لے کر بولا۔ ''تم سب سے پہلے اس باتھ روم میں جا کر منہ دھو آؤ..... میں اتنی دیر سوچتا ہوں۔''

''میں ٹھیک ہوں جی.....'' میں جھجک کر بولی۔

''تم ٹھیک ہو گی پر مجھے ایسے چہرے دیکھنا پسند نہیں ہے..... جا کر منہ دھو آؤ۔'' وہ تحکم آمیز انداز میں بولا۔

میں نے مجبور ہو کر ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا..... اور اندر جا کر بند کر لیا۔ مجھے گھنٹوں بعد غسل خانے میں جانے کا موقع ملا تھا، وہاں چھوٹا سا واش بیسن اور شیشہ بھی موجود تھا۔ منہ دھونے سے پہلے میری نظریں شیشے میں نظر آنے والے اپنے چہرے پر جم گئیں۔ میں ان چند گھنٹوں میں اتنا رو چکی تھی جتنا شاید ساری عمر میں نہیں روئی ہوں گی۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ دھول اور گرد و غبار نے چہرے کو ملگجا سا کر دیا تھا۔ میں خود کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ شکلی اور میری سب سہیلیاں مجھے مدھو بالا کہا کرتی تھیں۔

''یوں لگتا ہے کہ تجھے رب نے بڑی فرصت سے بنایا ہے۔ ایک بھی داغ دھبا تک نہیں..... اتنی اچھی بڑی بڑی کالی آنکھیں کہ سرمہ کاجل کے بغیر ہی تیار لگتی ہے، یہ پیاری سی ناک اور ایسے چمک دار گلابی ہونٹ..... سچ تو تو بنی بنائی پری ہے پری۔'' شکلی اکثر کہا کرتی۔ ''میں اگر لڑکا ہوتی تو تجھ سے ہی شادی کرتی یا پھر ایک بڑا بھائی ہوتا تا تو تجھے اپنی بھابی بنا لیتی.....''

شکلی کا خیال بیک وقت میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی لے آیا تھا۔ میں نے خیالات کو جھٹکتے

ہوئے منہ دھونا شروع کر دیا۔ موٹے نے سچ ہی کہا تھا۔ منہ دھونے کے بعد میں نے خود کو بہت اچھا، تروتازہ محسوس کیا۔ پیاس کی شدت کی وجہ سے میں نے دو اوک پانی بھی پی لیا تھا، پانی کی کڑواہٹ کی وجہ سے اس سے زیادہ پی نہیں پائی تھی۔

میں دوپٹے سے منہ پونچھ کر باہر نکلی تو وہ وہیں اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر مسکرا دیا۔

''کچھ کھانا پینا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں جواب میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ سچی بات یہ تھی کہ بھوک تو مجھے اتنی نہیں لگ رہی تھی مگر پیاس کی شدت میں کڑوے پانی نے اضافہ کر دیا تھا۔

''پانی...... اگر مل جائے......'' میں نے بمشکل کہا۔

''ہاں لو...... پی لو......'' اس نے تھرماس کی جانب اشارہ کیا۔

میں صدیوں کے پیاسے کے مانند تھرماس پر ٹوٹ پڑی۔ اس میں بلا مبالغہ تین گلاس پانی ضرور موجود تھا جو میں نے سانس لیے بغیر پی لیا۔ پروردگار نے ہمیں بے حد و حساب نعمتوں سے نوازا ہے، انسان ان کے شکر کا حق بھی ادا نہیں کر پاتا اور مزید طلب کی ہوس ختم نہیں ہو پاتی۔ ہزاروں نعمتیں تو ایسی ہیں جن کی اہمیت اور عظمت کا ہمیں احساس تک نہیں ہو پاتا...... ہاں جب وہ ہمارے پاس نہ رہیں تب پتا چلتا ہے کہ ان کے بغیر تو ایک لمحہ بھی گزارنا ناممکن ہے، پانی پیتے ہوئے میں فلسفیوں کی طرح سوچ رہی تھی۔ اگر دنیا میں ہوا نہ رہے یا ہوا میں آکسیجن نہ ہو تو شاید ہم ایک لمحہ بھی جی نہ پائیں، میں سوچ کر ہی لرز کر رہ گئی۔

اسی طرح پانی...... دھوپ...... بارش اور بے شمار نعمتیں جن کا ہر سانس کے ساتھ بھی شکر ادا کیا جائے تو کم ہے، میں نے دل ہی دل میں اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے ہوئے رب کا شکر ادا کیا اور تھرماس رکھ کر گہری سانس لی۔

وہ اپنی جگہ بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔

''بیٹھو یہاں۔'' اس نے سامنے موجود سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''اب بتاؤ کیا سوچا تم نے...... کیا کرو گی؟''

''مجھے معلوم نہیں......'' واقعی میں اس بارے میں کچھ بھی سوچ نہیں پا رہی تھی۔ حالات نے مجھے گھر، گاؤں، علاقے سے نکال...... دیا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ زادِ راہ کے طور پر میرے پاس کانوں میں موجود چاندی کی بالیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ٹرین کے اس ڈبے سے نکل کر میں کہاں جاؤں گی؟ احساسِ بے بسی نے میری سوچ کو مفلوج کر دیا تھا۔

''کمال ہے دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔ ''خیر اچھا ہی ہے اگر تم جیسے لوگ نہ ہوں تو ہم جیسے لوگوں کا کام کیسے چلے؟''

''جی...... کیا مطلب......؟'' میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''مطلب بھی سمجھا دیں گے اتنی جلدی کیا ہے۔ یہ ٹرین صبح ساڑھے آٹھ بجے کراچی پہنچے گی یعنی ہمارے پاس پوری رات ہے۔'' وہ آنکھ دبا کر مسکرایا۔

میں اچانک شدید گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ موٹے کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی۔

''پھر...... کیا سوچا ہے تم نے......؟'' وہ اپنا سوال دہراتے ہوئے بولا۔ ''کیا کرو گی؟''

''میں...... میں کوئی نوکری کر لوں گی......'' میں نے سوچ کر کہا۔

''ہاہاہا......'' وہ منہ کھول کر ہنسا اور کافی دیر تک ہنستا چلا گیا۔ ''یعنی اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی نوکری تمہارے سامنے حاضر ہو جائے گی اور پھر وہ اسی وقت تمہارے ہاتھوں میں اتنے پیسے بھی رکھ دے گی کہ تم کھانا، پینا، گھربار سب کر لو گی...... کمال ہے لڑکی...... اچھا لطیفہ سنایا تم نے...... تم سے پہلے وہاں ہزاروں لوگ اسی نوکری نامی لیلیٰ

سزا

ٹریفک انسپکٹر نے ایک تیز رفتار کار کو روک لیا اور ڈرائیونگ کرنے والے شخص سے لائسنس اور دوسرے کاغذات طلب کیے۔ اچانک پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت نے چلانا شروع کر دیا۔ ''میں زندگی بھر یہی کہتی رہی ہوں کہ تم ایک غیر ذمے دار، بے پروا اور نالائق انسان ہو، تمہاری ہر ہر حرکت اس امر کی دلیل ہے۔''

ٹریفک پولیس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''یہ خاتون کون ہے؟''

ڈرائیور نے بتایا۔ ''میری بیوی ہے۔''

انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آج کے لیے میرا خیال ہے اتنی ہی سزا کافی ہے، اب تم جا سکتے ہو۔''

خیر پور سے احمد رضا کی مجبوری

کے دیوانے بنے گھوم رہے ہیں۔ پلّے سے خرچ کر کے پڑھتے لکھتے ہیں پھر ہاتھوں میں ڈگریوں کا بوجھ اٹھا کر اپنے خرچ پر در در گھومتے ہیں اور پھر بھی انجام..... ناکامی..... تو تم میں ایسے کیا ہیرے جڑے ہیں کہ تمہیں فوراً نوکری مل جائے گی؟'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

''مجھے کوئی بڑی نوکری نہیں چاہیے، بس گھر کا کام کاج، کھانا پکانا، صفائی.....'' میں نے وضاحت کی۔

''اور جب تک نہیں ملتی کیا کرو گی؟ کہاں رہو گی؟ کیا کھاؤ گی.....؟ پھر گھر کا کام کوئی ایسے نہیں دے دیتا..... سب کو اعتماد کا بندہ چاہیے ہوتا ہے..... کسی کو جانتی ہو؟ کسی کی سفارش ہے؟ پہلے کہاں کام کیا ہے؟ سب پوچھتے ہیں لوگ..... پھر تم جیسی جوان لڑکی کو رکھتے ہوئے تو ہزاروں باتیں پوچھی جاتی ہیں۔''

اس کے انداز کی وجہ سے میرے وجود میں غصہ اور مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر ان سوالوں کا میں کیا جواب دے سکتی تھی۔

''صبر، قسمت میں جو لکھا ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

''یہی تو سب سے بڑی احمقانہ سوچ ہے، ابھی سوچو..... ابھی بارہ گھنٹے ہیں اسٹیشن آنے میں..... ابھی سوچو کہ کل تمہیں کیا کرنا ہے۔ بہت پتے کی بات ہے جو مفت بتا دی ہے میں نے تمہیں۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔

''آپ..... آپ بڑے آدمی ہیں، وہاں رہتے ہیں سب کو جانتے ہوں گے..... آپ میری مدد کریں گے؟'' میں نے اسے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

''کیوں.....؟ میں کیوں مدد کروں گا؟'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کر سکتا ہوں بالکل..... مگر کیوں؟ ظاہر ہے کہ میرے پاس بھی تو اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیے..... اس مدد کے عوض کیا دے سکتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں..... میرے پاس ان چاندی کی بالیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' میں نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہے تو بہت کچھ..... اگر تم سمجھو.....'' اس نے سگار کا کش لے کر دھواں مجھ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ میں چھوٹی عمر سے لکڑیوں کا چولہا جلاتی آئی تھی۔ دھوئیں کا ذائقہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا مگر یہ دھواں الگ ہی تھا۔ یوں لگا جیسے میرے حلق میں مرچیں سی بھر گئی ہوں۔ مجھے اچھو سا لگا.....

وہ سکون اور نہایت بے حسی سے اپنی جگہ بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری حالت سنبھلنے میں چند لمحے لگ گئے۔

''اس میں کیا ہے؟ اس قدر بُرا اور کڑوا دھواں تھا۔'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''یہ کیوبا کے مہنگے سگاروں میں سے ایک ہے..... شروع میں کڑوا لگتا ہے..... بعد میں یہ کڑواہٹ ایسی عادت بن جاتی ہے کہ اس کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''اس کڑواہٹ کی عادت ڈالنی ہوگی تمہیں۔''

''نہیں، میں یہ نہیں پی سکتی.....'' میں نے سر ہلا کر کہا۔

''احمق لڑکی..... میں زندگی کی بات کر رہا ہوں۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں..... اور تمہیں اپنے پاس رکھ بھی سکتا ہوں..... تمہیں وہ زندگی دے سکتا ہوں جو تم نے خواب میں بھی نہیں سوچی ہوگی مگر اس کے لیے تمہیں میری ہر بات ماننی ہوگی.....'' وہ اٹھ کر میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم میرے کام آؤ گی اور میں تمہارے..... اس سے دونوں کا فائدہ ہوگا..... یہی دنیا کا طریقہ بھی ہے۔''

میں احمقوں کی طرح ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ میں اس کی باتوں اور باتوں کے اندر چھپی گھاتوں کو سمجھ پا رہی تھی یا نہیں یہ تو الگ بات ہے مگر قدرت نے ہر لڑکی کے وجود میں از خود ایک فطری پیمانہ فٹ کر رکھا ہوتا ہے جو اسے نظروں کی پرکھ سکھا دیتا ہے۔ کس نظر میں محبت ہے، کون سی نظر ہوس سے بھری ہے، کون عزت دینا چاہتا ہے اور کون سی نگاہ عزت کے درپے ہے..... یہ سمجھنے، جاننے اور پرکھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس یا کسی ڈگری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''تم سن اور سمجھ رہی ہو نا.....'' وہ میری خاموشی سے نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ ''میں ٹھیکے دار ہوں۔ سڑکیں، پُل، عمارتیں سب بناتا ہوں۔ اس شعبے میں دس سالوں میں، میں نے پہلے سے موجود لوگوں کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ترقی کی ہے اور اس کے لیے سب کچھ کیا ہے۔ اس کام نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ دنیا میں سب کچھ بکتا ہے، ہر انسان کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے، کوئی روپے کے لیے بکتا ہے تو کوئی کسی اور چیز کے لیے..... اور بہت سے ایسے ہیں جن سے کام نکلوانے کے لیے تم جیسے خوب صورت چہروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ تمہیں اس وقت کام اور پناہ کی ضرورت ہے اور وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں مگر مفت میں نہیں..... اگر

تم تیار ہو تو تمہاری نوکری ابھی سے شروع ہوتی ہے اور تمہاری ٹریننگ میں خود کروں گا۔'' اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ مجھے اس کی شکل دیکھتے ہوئے بھی گھن آرہی تھی۔

''تم کبھی جہاز میں بیٹھی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں.....'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''میرے ساتھ چلنا۔'' وہ اپنی ترنگ میں بولے جارہا تھا۔ ''اگلے ہفتے میں سنگاپور جانے والا ہوں، تمہیں بھی لے جاؤں گا۔'' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ کامیاب وہ اس لیے نہیں ہوسکا کہ میں اس کا ہاتھ لگتے ہی تیزی سے کھڑی ہوگئی۔

''مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا..... نہ ہی مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اوہ.....'' وہ ایک لمحہ غور سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیل گئی۔

''شاید تمہیں اپنی پوزیشن کا صحیح اندازہ نہیں ہو پایا ہے؟'' وہ سگار کا کش لے کر بولا۔ ''اب تمہیں میری مدد چاہیے یا نہیں مگر مجھے جو چاہیے وہ میں ہر صورت حاصل کر کے رہوں گا۔'' اس کا لہجہ سخت نہیں تھا مگر انداز کچھ ایسا تھا کہ میں لرز کر رہ گئی..... وہ میری طرف بڑھا تو میں نے تیزی سے باتھ روم میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا۔

''اُف..... وہی لوئر مڈل کلاس ڈراما..... لڑکی باہر آجاؤ..... ان سب باتوں کا فائدہ کیا ہے؟ تم کب تک اندر بند رہ سکتی ہو.....'' وہ گویا چڑ کر بولا۔

''صبح تک۔'' میں نے اندر سے جواب دیا۔ ''اسٹیشن آنے کے بعد میں باہر چلی جاؤں گی۔''

''خوب..... اچھی پلاننگ ہے مگر میرے پاس اس سے بھی اچھا ایک آئیڈیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں ٹی ٹی کو بلا رہا ہوں اور اسے بتاؤں گا کہ یہ لڑکی میرے ڈبے میں چوری کی نیت سے گھسی ہے، وہ تمہیں لے جائے گا اور جس سودے میں تم آرام و آسائش کی زندگی پاسکتی ہو، وہ تمہیں مفت میں کرنا پڑے گا اور وہ بھی نہ جانے کتنے لوگوں کے ساتھ، سوچ لو..... میں زبردستی اور دھوکے کا قائل نہیں ہوں اس معاملے میں..... تم نہ سہی اور سہی مگر تمہارا کیا ہوگا، اس پر سوچ لو۔ تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں۔ میں ٹھیک پانچ منٹ بعد ٹی ٹی کو بلالوں گا۔'' وہ غرایا۔

میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکی تھی۔ ''اب کیا کروں؟'' یہ سوال ٹرین کی چھک چھک کے ساتھ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

جو وہ کہہ رہا تھا، وہ سولہ آنے سچ تھا اور اس کا چھوٹا سا مظاہرہ میں دیکھ ہی چکی تھی۔

اگر وہ مجھے ان لوگوں کے حوالے کر دیتا تو یقیناً میرے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں ہونا تھا.....

کم سے کم بھی جیل جانے کا خطرہ تو موجود تھا ہی۔

میرے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا۔ زندگی ایک دم اتنی سخت، اتنی مشکل اور اتنی بھیانک ہوگئی تھی۔

''ایک مشکل سے نکلنے نہیں پاتی تھی کہ دوسری سامنے آکر مسکرانے لگ جاتی..... میں چند لمحے کھڑی سوچتی رہی۔

کہتے ہیں نا کہ وقت سب سے بڑا استاد ہوتا ہے اور حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں۔ سر پر پڑ جائے تو بندہ سب کچھ کر جاتا ہے۔

یہ میرے لیے زندگی کی جنگ تھی جو مجھے خود ہی لڑنا تھی۔ آنکھیں بند کرنا یا کسی دروازے کے پیچھے چھپ جانا اس کا حل نہیں تھا۔ مجھے اب ہر برائی، مشکل، دشواری اور تکلیف کا سامنا کرنا تھا تب ہی شاید میں زندگی کے پُل صراط پر آگے بڑھ سکتی تھی۔ مجھے عقل سے کام لینا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ جو چاہ رہا تھا، وہ کسی بھی صورت میں ممکن نہیں تھا اور میں بہرحال اتنی بھی کمزور نہیں تھی کہ اس کی باتوں سے ڈر کر اس حد تک جھک جاتی۔ وہ تو دل پر لگے گھاؤ نے مجھے عجیب انداز میں گھائل کر رکھا تھا ورنہ میں کسی بھی مشکل سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ میری استانی، گرلز گائیڈ والی مس سب مجھے جنگجو کہا کرتی تھیں۔ مگر یہاں کام طاقت سے نہیں نکل سکتا تھا، مجھے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

میں لاکھ بے سروسامان اور تباہ حال سہی مگر اللہ تو میرے ساتھ بھی ہے، میں نے سوچا اور بندہ اس کا نام لے کر کوشش کرے تو کامیابی ضرور ملتی ہے۔ جس کا رب راکھا اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اپنے پیارے رب کے شہ رگ سے قریب ہونے کے احساس نے مجھے گویا دوبارہ زندہ کر دیا۔ بندے کا اصل اور حقیقی رشتہ تو بس اس کے رب سے ہی ہے باقی سارے رشتے اسی کی عطا ہیں اسی لیے سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں مگر اللہ اپنے بندے کو تنہا نہیں چھوڑتا۔

'پھر میں کیوں مایوس ہوں۔' میرے دل نے سوال کیا۔ 'اسی نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے بچانے والا ہے۔'

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ

دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ مجھے باہر آتا دیکھ کر اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر رعونت بھری مسکراہٹ آ گئی۔

''سمجھ میں آ گئی بات.....'' اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''آ گئی عقل ٹھکانے..... جو میں کہہ رہا ہوں، تمہیں اب وہی کرنا ہوگا..... بدلے میں تمہیں بھی بہت کچھ ملے گا لیکن جب کبھی غداری کا سوچو گی تو پھر جی نہیں پاؤ گی..... اور نہ ہی مر پاؤ گی۔ سمجھ رہی ہو نا؟'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

میں نے جواب میں دھیرے سے سر ہلایا۔

''اب یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔'' وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری خوش قسمتی ہے کہ مجھ سے ملاقات ہو گئی اور جلد ہی تم یہ بات خود مانو گی۔'' وہ جیب سے ایک چپٹی سی بوتل نکال کر منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔

''پیو گی.....؟'' اس نے چند گھونٹ پی کر بوتل میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں..... یہ کیا ہے؟''

''ارے یہ.....'' وہ ہنسا۔ ''یہ تو جینے کا مزہ ہے، پرانی انگریزی شراب ہے۔'' وہ بوتل کو پھر منہ سے لگاتے ہوئے بولا۔

''اوہ.....'' مجھے اس کی بُو سے ابکائی سی محسوس ہوئی۔ اس کی مکروہ نظریں میرے وجود پر پھسل رہی تھیں۔ شراب فوراً ہی اس کے سر پر چڑھ گئی تھی۔

''آؤ یہاں آ جاؤ، کب تک وہاں کھڑی رہو گی؟''

''مجھے..... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' وقت گزارنے کے لیے مجھے اور کچھ نہیں سوجھا تھا۔

''اچھا..... اچھا ٹھیک ہے..... وہاں رکھا ہے کھانا..... کھا لو..... تب تک میں اپنے شربت سے دل بہلاتا ہوں۔'' وہ خوش دلی سے مسکرایا اور لڑھکتا ہوا سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے ڈبے کھول کر کھانا نکالا اور کھانا شروع کر دیا۔ لقمے حلق سے واپس آ رہے تھے۔ ایک تو اس قدر مشکل نے بھوک کو یکسر ختم کر دیا تھا دوسرے وہ اس شخص کا ڈبا تھا جس سے اس وقت مجھے سخت نفرت اور کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

'نہ جانے اس نے میرے جیسی کتنی لڑکیوں کی مجبوریاں خریدی ہوں گی۔' میں نے سوچا مگر آج جیت کسی بھی حال میں اس کے حصے میں نہیں آئے گی۔ زندگی اللہ کا تحفہ تھی اور میں اتنی بزدل ہرگز نہیں تھی کہ مشکلات کا سامنا کرنے کے بجائے موت کے دامن میں منہ چھپا لیتی۔ اگر میں ہار گئی تو مجھے یہی کرنا تھا..... میں یہ فیصلہ کر چکی تھی اور اب خدا کی مدد کی منتظر تھی۔

''کھا لو..... کھا لو۔'' وہ گنگنایا۔ ''کوئی جلدی نہیں ہے۔'' وہ کسی بھاری بھرکم مگرمچھ کی طرح سیٹ کے گدے پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا انداز میں بند تھیں مگر میں محسوس کر سکتی تھی کہ وہ پوری طرح چوکنا ہے۔ میں کھانے کے ڈبے بند کرتی ہوئی وہاں موجود سامان کو جانچنے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہاں دو تین ڈبے تھے جن میں کھانا گرم رہتا تھا۔ ایک طرف گلاس، پلیٹ اور چمچ تھے دوسری طرف تھرماس اور پلاسٹک کی باسکٹ رکھی تھی۔ میں نے ڈبے بند کر کے باسکٹ میں رکھنے کے بہانے باسکٹ کا ڈھکن کھولا۔ اندر جھانکتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ باسکٹ میں چار پانچ سیب اور ایک چاقو موجود تھا۔ یہ چاقو میرے کام آ سکتا تھا۔ میں نے برتن رکھتے ہوئے اسے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر میز پر ڈال دیا۔ میں چند لمحے وہاں کھڑی رہی پھر غسل خانے کی طرف چل پڑی۔ اس نے ایک آنکھ کھول کر مجھے دیکھا اور پھر سر ہلا کر قیلولہ کرنے لگا۔ غسل خانے میں داخل ہوتے ہی میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا۔ چھوٹے سے غسل خانے کے دروازے کے پیچھے ایک کھونٹی لگی ہوئی تھی جس پر ایک سوٹ لٹک رہا تھا۔ میں نے تیزی سے کوٹ اتار کر ہینگر باہر نکالا، میری امید کے مطابق وہ لوہے کا ہینگر تھا جس کے کندھے خاصے چوڑے بنائے گئے تھے۔ میں نے اسے ہاتھ میں پکڑ کر ہوا میں گھمایا، یہ یقیناً میرے کام آ سکتا تھا۔ یعنی خدا کی مدد آ گئی تھی۔ میں نے سوچا بس اب مجھے اس طرح باہر نکلنا تھا کہ وہ ہینگر کو نہ دیکھ پائے۔ یہ قدرے مشکل کام تھا مگر دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

میں نے ہینگر کو ایک ہاتھ میں پکڑ کر اپنی پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا اور ٹیڑھی ہو کر غسل خانے سے باہر نکلی۔ میرا بڑا سا دوپٹا اسے چھپانے میں بہت مددگار ثابت ہوا تھا۔

''اب آ بھی جاؤ یار..... یہاں آ کر بیٹھو..... تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' مجھے باہر نکلتا دیکھ کر موٹا اٹھ بیٹھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں کی نرمی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہاں ہوس کے ہولناک الاؤ بھڑکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''سارہ.....'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا نام ہے تمہارا..... مختصر سا..... میں تمہیں چمکتا ہوا ہیرا بنا دوں گا..... لوگ تمہارے اشاروں پر ناچیں

گے۔''

وہ مجھے مغلوب سمجھ کر میری طرف سے بالکل بے فکر اور مست نظر آرہا تھا۔ یہ مجھے بہت بعد میں سمجھ میں آیا کہ کسی خوب رو عورت یا لڑکی کو اپنی آسان دسترس میں پاکر سانڈ جیسے شہ زور مرد بھی یوں ہی ریشہ خطمی ہوجاتے ہیں۔

''مگر پہلے خود آپ تو بچ جاؤ سر.....'' میں نے غصے اور نفرت سے کہا اور ہینگر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوری طاقت سے اس کے سر پر دے مارا۔

''اوہ.....اُف.....تو نے یہ کیا کیا؟'' وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ڈکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ ''اب تو نہیں بچے گی.....کیا سمجھا ہے تو نے شکور احمد کو.....'' وہ اندھوں کی طرح لہراتا ہوا آگے بڑھا میں نے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ کر اسے جھکائی دی اور ہینگر کو دوبارہ اسی طاقت سے گھما کر اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگایا۔

اس بار وہ کھڑا نہیں رہ پایا تھا، اس کا ہاتھ سر کی طرف بڑھا.....اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

اس نے مڑ کر مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا، ان میں اتنا غصہ اور نفرت تھی کہ اگر وہ بے ہوش نہ ہوتا تو یقیناً مجھے مار ڈالتا۔ میں جی جان سے لرز رہی تھی۔ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ اس ایک ہینگر کی مدد سے اس بھاری بھرکم گینڈے پر

یہی کمرا میرے لیے بہترین پناہ گاہ ہوسکتا تھا۔ میرے ذہن میں موٹے کے کیے گئے سارے سوال موجود تھے.....اور نیون سائن کی روشنیوں کے مانند میری آنکھوں کے سامنے جگمگا رہے تھے۔

میں کیا کروں گی.....؟ کہاں جاؤں گی.....؟ گھر بار، ٹھکانا، کھانا پینا سب کیسے ہوگا؟ اب مجھے ان تمام سوالوں کے جواب یہیں اس کمرے اور موٹے کے سامان سے لینے تھے۔

میں نے اس کی جیب کی تلاشی لی۔ جیب سے اس کی طرح موٹا سا بٹوا برآمد ہوا۔ اس میں کارڈ اور کاغذات کے علاوہ کافی سارے بڑے نوٹ موجود تھے۔ میں نے وہ نوٹ نکال لیے، اب کم از کم ایک بڑا مسئلہ تو حل ہوگیا تھا، پھر میں اس کے سوٹ کیس کی طرف بڑھی، سوٹ کیس کو میں نے احتیاط سے اپنی طرف کھینچا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ چھپکلی اب بھی وہاں موجود نہ ہو مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔

سوٹ کیس میں کپڑے اور کچھ کاغذات تھے، دوسرے قدرے چھوٹے سوٹ کیس میں ایک چادر، تولیا بھی موجود تھا۔ میں نے اس سوٹ کیس کو خالی کیا صرف چادر اور تولیا اس میں رکھا۔ موٹے کے بٹوے سے نکلنے والے نوٹوں کو سوٹ کیس کی اندرونی جیبوں میں ڈال دیا

گے۔''

وہ مجھے مغلوب سمجھ کر میری طرف سے بالکل بے فکر اور مست نظر آرہا تھا۔ یہ مجھے بہت بعد میں سمجھ میں آیا کہ کسی خوب رو عورت یا لڑکی کو اپنی آسان دسترس میں پا کر سانڈ جیسے شہ زور مرد بھی یوں ہی ریشہ خطمی ہوجاتے ہیں۔

''مگر پہلے خود آپ تو بچ جاؤ سر.....'' میں نے غصے اور نفرت سے کہا اور ہینگر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوری طاقت سے اس کے سر پر دے مارا۔

''اوہ.....اُف.....تو نے یہ کیا کیا؟'' وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ڈکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔''اب تو نہیں بچے گی.....کیا سمجھا ہے تو نے شکور احمد کو.....'' وہ اندھوں کی طرح لہراتا ہوا آگے بڑھا میں نے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ کر اسے جھکائی دی اور ہینگر کو دوبارہ اسی طاقت سے گھما کر اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگایا۔

اس بار وہ کھڑا نہیں رہ پایا تھا، اس کا ہاتھ سر کی طرف بڑھا.....اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

اس نے مڑ کر مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا، ان میں اتنا غصہ اور نفرت تھی کہ اگر وہ بے ہوش نہ ہوتا تو یقیناً مجھے مار ڈالتا۔ میں جی جان سے لرز رہی تھی۔ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ اس ایک ہینگر کی مدد سے اس بھاری بھرکم گینڈے پر قابو پالوں گی مگر اب وہ میرے سامنے بے ہوش پڑا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس چوٹ کی وجہ سے وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہ سکتا تھا؟ اگر اسے ہوش آجاتا تو پھر اس پر قابو پانا میرے لیے ناممکن ہوتا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اس پر سے کود کر غسل خانے کا رخ کیا۔ وہاں میں نے اس سوٹ کی ٹائی دیکھی تھی۔ میں وہ ٹائی لے کر آئی اور اللہ کا نام لے کر اس کے ہاتھ ٹائی سے باندھ دیے۔ اب مجھے اس کے پیر باندھنے کے لیے کوئی رسی درکار تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اس طرح نہ صرف اس کا مسئلہ حل ہوجاتا بلکہ ہوش میں آنے کے بعد موٹے کی نقل و حرکت میں تھوڑی مشکل پیش آتی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور اس کی شلوار سے ازار بند کھینچ کر نکال لیا۔ اس کے لیے مجھے اسے کئی بار ہلانا جلانا پڑا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ وہ کہیں ہوش میں نہ آجائے۔ اس لیے ہاتھ پیر باندھ کر میں نے ایک بار پھر ہینگر کو اس کے سر پر بجادیا۔ وہ ہوش میں آکر شور مچا سکتا تھا۔ کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے ڈبے سے تقریباً سارے ہی ٹشو پیپر نکال کر اس کے منہ میں حلق تک ٹھونس دیے۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اس وقت یہی کمرا میرے لیے بہترین پناہ گاہ ہوسکتا تھا۔ میرے ذہن میں موٹے کے کیے گئے سارے سوال موجود تھے.....اور نیون سائن کی روشنیوں کے مانند میری آنکھوں کے سامنے جگمگا رہے تھے۔

میں کیا کروں گی.....؟ کہاں جاؤں گی.....؟ گھر بار، ٹھکانا، کھانا پینا سب کیسے ہوگا؟ اب مجھے ان تمام سوالوں کے جواب یہیں اس کمرے اور موٹے کے سامان سے لینے تھے۔

میں نے اس کی جیب کی تلاشی لی۔ جیب سے اس کی طرح موٹا سا بٹوا برآمد ہوا۔ اس میں کارڈ اور کاغذات کے علاوہ کافی سارے بڑے نوٹ موجود تھے۔ میں نے وہ نوٹ نکال لیے، اب کم از کم ایک بڑا مسئلہ تو حل ہوگیا تھا، پھر میں اس کے سوٹ کیس کی طرف بڑھی، سوٹ کیس کو میں نے احتیاط سے اپنی طرف کھینچا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ چھپکلی اب بھی وہاں موجود نہ ہو مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔

سوٹ کیس میں کپڑے اور کچھ کاغذات تھے، دوسرے قدرے چھوٹے سوٹ کیس میں ایک چادر، تولیا بھی موجود تھا۔ میں نے اس سوٹ کیس کو خالی کیا صرف چادر اور تولیا اس میں رکھا۔ موٹے کے بٹوے سے نکلنے والے نوٹوں کو سوٹ کیس کی اندرونی جیبوں میں ڈال دیا صرف چند نوٹ اپنے پاس رکھے اور اسے بند کر کے دروازے کے پاس رکھ دیا۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں سامان کے بغیر کیسے سفر کررہی ہوں۔ سوٹ کیس تیار کر کے میں سیٹ پر آبیٹھی۔ موٹے کی طرف سے میں مطمئن تھی کہ اب وہ جلدی ہوش میں نہیں آئے گا۔ مجھے ڈر صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھوں وہ خبیث موٹا مارا نہ گیا ہو۔

ہمارے اسکول میں گرلز گائیڈ کی تربیت کے دوران فوری طبی امداد کے طریقے وغیرہ بھی سکھائے گئے تھے۔ اس کا خیال آتے ہی میں کھڑی ہوئی اور اپنا ہاتھ موٹے کی گردن پر رکھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ میرے دل سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ میں نے جن گرہوں سے اس کے ہاتھ پیر باندھے تھے وہ بھی میں نے گرلز گائیڈ کی تربیت میں سیکھی تھیں۔ وہ اب حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس کی طرف سے مطمئن ہوکر میں سیٹ پر دراز ہو گئی۔ صبح سے گھر کے کام اور پھر افتاد پر افتاد نے مجھے سانس لینے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ میری کمر تختہ ہورہی تھی اور جسم میں بے حد درد محسوس ہورہا تھا۔ ابھی صبح ہونے میں بہت وقت تھا بقول موٹے کے پوری رات باقی تھی۔ اگلے دن

مجھے نہ جانے کس کس محاذ پر کون کون سی جنگیں لڑنی تھیں اس لیے کچھ دیر آرام ضروری تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ آدھی رات کے بعد میں ٹرین رکتے ہی کسی بڑے اسٹیشن پر اتر جاؤں گی۔ وہاں سے باقاعدہ ٹکٹ لے کر دوسری ٹرین میں سوار ہوجاؤں گی۔

''اگر میں صرف دو گھنٹے کی نیند بھی لے لیتی تو تازہ دم ہوسکتی تھی۔ یوں بھی میں ایک گاؤں کی رہنے والی تھی۔ مجھے صبح چار بجے اٹھنے کی عادت تھی۔ یہی سب سوچ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

مگر آنکھیں بند کرنے سے نہ تو مصیبتیں بھاگتی ہیں اور نہ ہی نیند آتی ہے۔ کبھی کبھی تو بند آنکھیں حقیقی زندگی سے زیادہ سنگین مناظر سجادیتی ہیں۔

پچھلے چند گھنٹوں میں کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ کسی غیر مرئی ہاتھ نے گویا میری زندگی کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔

نہ جانے گھر میں کیا ہورہا ہوگا؟ یقیناً اکرم بھائی غصے سے پاگل ہورہا ہوگا اور اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہوگی۔ اماں کیا کررہی ہوں گی؟ شاید مجھے کوس رہی ہوں۔ میں نے دل مسوس کر سوچا۔ ابا کا کیا حال ہوگا؟ لوگ کیا کہہ رہے ہوں گے؟ میرے بارے میں گاؤں میں کیا کیا باتیں ہورہی ہوں گی؟

سب کے سب یقیناً مجھے لعنت ملامت کررہے ہوں گے۔ کانوں کو ہاتھ لگائے جارہے ہوں گے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل کر میرے بالوں میں جاچھپے۔

کس کے ساتھ کیا، کیوں اور کیسے ہورہا ہے اس سے نہ تو لوگوں کو کوئی خاص مطلب ہوتا ہے اور نہ دلچسپی۔ انہیں تو بس سنسنی خیز خبروں اور تماش بینی سے مطلب ہوتا ہے۔ میں سوچے جارہی تھی۔

میں کہاں آ کھڑی ہوئی تھی؟ کیا کررہی تھی؟ ان چند گھنٹوں نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ پہلے خود اپنے بھائی کی جانب سے لگائی گئی تہمت..... پھر فرار..... اور اب میں چور اور مجرم بھی بن چکی تھی۔

ذرا سی فرصت نے خیالات کا پنڈورا باکس کھول دیا تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور طے کیا کہ نیند نہیں آتی تو نہ آئے مگر میں اب کچھ نہیں سوچوں گی..... کچھ بھی نہیں، کسی یاد، خیال یا سوچ کو اپنے دل میں جگہ نہیں بنانے دوں گی۔ اسی ایک بات کو دہراتے نہ جانے کب نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

میری آنکھ کسی مسلسل اور عجیب سی چیخ نما آواز سے کھلی تھی۔ اٹھنے کے چند لمحوں کے بعد تک تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ہوں کہاں؟ گہری نیند سے اچانک جاگنا یوں بھی فلیش لائٹ کے تیز جھماکے کے مانند ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ یہاں آنکھوں کے بجائے دماغ چندھیایا ہوا محسوس ہوتا ہے پھر جیسے ہی میں اپنے حواس میں آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈبے میں وہی ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ٹرین چھک چھک کرتی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

''پھر یہ آواز.....'' وہ آواز میرے اٹھ کر بیٹھتے ہی بند ہوگئی تھی۔

میں نے جھک کر نیچے پڑے موٹے کی طرف نظر گھمائی، وہ اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ میں اچھل کر کھڑی ہوگئی۔

وہ نہ جانے کب ہوش میں آگیا تھا اور ہاتھ پیروں کے جکڑے ہونے کے باوجود کھسکتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا تھا اور غالباً مدد کے لیے آوازیں نکال رہا تھا۔ منہ میں ٹھنسا ہوا ٹشو پیپر نمی پاکر نرم ہوگیا تھا۔ کچھ اس نے ڈبے کے فرش پر تھوک دیا، کچھ بدستور منہ میں تھا اور شاید کچھ اس نے نگل لیا تھا۔ مجھے اٹھ کر بیٹھتا دیکھ کر وہ یک دم خاموش ہوگیا۔ میں نے سیٹ پر پڑا ہوا ہینگر اٹھایا اور تیزی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔

''دیکھو..... دیکھو..... تم اس طرح بچ نہیں سکتیں، پولیس تمہیں پکڑ ہی لے گی۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' وہ ٹشو پیپر تھوکتے ہوئے تلایا۔

اس کی آنکھیں خون کے مانند سرخ ہورہی تھیں۔

مجھے اس سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے اسے گھورا۔

''دیکھو لڑکی..... اچھا میں سمجھ گیا ہوں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ اب بالکل خاموش رہوں گا۔'' وہ مجھے ہینگر اوپر کرتے ہوئے دیکھ کر گھگیایا۔ اس کی خباثت اور تکبّر سے بھری آنکھیں اس وقت ملتجیانہ انداز میں میری جانب دیکھ رہی تھیں مگر میں اس پر رحم نہیں کھا سکتی تھی کیونکہ اس پر رحم کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ وہ کسی بھی وقت موقع پاتے ہی کچھ بھی کرسکتا تھا اور یہ تو طے تھا کہ میں جسمانی طور پر اس سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ یہ تو قسمت نے یاوری کی تھی، کچھ اس کا اپنے آپ پر بے جا غرور تھا اور باقی اللہ کی مدد تھی جو میں اسے اس طرح قابو کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

میں نے اسے جواب دیے بغیر ہینگر بلند کیا۔ اسے دوبارہ بے ہوش کرکے میں اسے پیروں سے گھسیٹ کر بمشکل ڈبے کے درمیان سیٹ کے قریب تک لائی پھر اس کے

کپڑوں میں سے ایک بنیان تلاش کر کے پھاڑی۔ اس کا کچھ حصہ موٹے کے منہ میں ٹھونسا اور اس کی ایک پٹی مضبوطی سے اس کے منہ پر باندھ دی۔ باندھتے ہوئے میں نے اس کی ناک کے کھلے رہنے کا خیال رکھا تھا۔

میں ہانپتے ہوئے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کا وزن ہماری بڑی والی بھوری بھینس سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ کبھی کبھار وہ اڑیل ہو کر اپنی جگہ جم جاتی تو اسے گھسیٹتے ہوئے بھی میں اسی طرح ہانپ جاتی تھی۔ ''پھر وہی.....'' میں نے اپنی بے اختیار سوچ پر خود کو ڈانٹا..... مجھے فی الحال کچھ یاد نہیں کرنا تھا۔

نہ جانے کیا وقت ہو چکا تھا۔ باہر اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے موٹے کے ہاتھ پر بندھی گھڑی کو دیکھا، رات کے دو بجنے والے تھے۔

''بس اب مجھے تیار رہنا چاہیے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔

مجھے اب آنے والے کسی بڑے ... اسٹیشن پر اتر جانا تھا جہاں سے مجھے اگلی ٹرین مل جاتی۔ میں نے تیزی سے غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھویا، بال بنائے، چادر نما دوپٹے کو سلیقے سے اوڑھا۔ موٹے کے چھوٹے جدید انداز کے پہیوں والے سوٹ کیس کو قریب کیا اور اسٹیشن کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے موٹے کے ہاتھ سے گھڑی اتار لی۔ اس کی مدد سے مجھے وقت کا اندازہ رہتا۔ وہ گھڑی میں نے سوٹ کیس میں ڈال دی۔ مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس کوئی چھوٹا بیگ نہیں تھا جسے میں ہاتھ میں پکڑ سکتی۔ فی الحال مجھے ایسے ہی گزارا کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی مگر وہاں چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ ہمارے گاؤں کی طرز کا کوئی اسٹیشن تھا۔ ٹرین کچھ دیر بعد ہی وہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔

پونے تین بجے ٹرین دوبارہ رکی۔ کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود اسٹیشن کے مخصوص شور اور ہنگامے سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے یہیں اترنا ہے۔ کھڑکی کھولنے میں خطرہ تھا کہ کوئی اندر کا منظر نہ دیکھ لے اور ایک بار کمرے سے نکل کر اسے بند کر دینے کے بعد واپس آنا تقریباً ناممکن تھا۔ بہرحال میں نے ہمت کر کے تھوڑی سی کھڑکی کھسکائی اور باہر کا جائزہ لیا۔

باہر ہر طرف روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں جیسے دن نکلا ہوا ہو۔ اسٹیشن پر زندگی بھرپور انداز میں جگمگا رہی تھی۔ اسٹالز..... خوانچہ فروش سب موجود تھے۔ لوگ سیٹوں اور سامان پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

''بس..... مجھے یہیں اتر جانا چاہیے۔'' میں نے مطمئن ہو کر سوچا اور سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں واپس مڑی۔ موٹے کی گردن پر ہاتھ رکھا، وہ زندہ تھا۔

میں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ اس اندیشے کا قلع قمع کرنا ضروری تھا ورنہ یہ خوف وسوسہ بن کر مجھے ڈستا رہتا کہ شاید میں نے اسے مار دیا ہے۔ میں نے اس کے منہ پر سختی سے بندھے بنیان کو کچھ ڈھیلا کر دیا۔ اب وہ ہوش میں آنے کے بعد گردن کو ایک دو جھٹکے دے کر اسے کھول سکتا تھا۔

اب میں اطمینان سے جا سکتی تھی۔ میں نے سوٹ کیس کو کھینچا اور باہر نکل کر دروازے کو مضبوطی سے بند کر دیا۔

اس کمپارٹمنٹ کی راہداری اسی طرح سنسان پڑی تھی جہاں میں نے نیچے اترنے کے لیے دروازہ کھولا اور سوٹ کیس کھینچتی کمپارٹمنٹ سے نیچے اتر گئی۔ مجھے سب سے پہلے ٹکٹ لینا تھا۔

رات کے اس پہر اسٹیشن سے ایک لڑکی کا تنہا سفر کرنا اور ٹکٹ خریدنا سب مشکوک اور خاصے مخدوش کام تھے مگر بہرحال مجھے اس آزمائش سے گزرنا ہی تھا۔

موٹے کے بٹوے سے نکلنے والے نوٹوں میں سے ہزار کے تین نوٹ میں نے اپنی مٹھی میں دبا لیے تھے باقی نوٹ سوٹ کیس میں بند تھے جسے بار بار نہیں کھولا جا سکتا تھا۔

''قلی بھائی۔'' میں نے پلیٹ فارم کے درمیان پہنچنے کے بعد سامنے سے گزرتے قلی کو پکارا۔ میری کوشش یہی تھی کہ اسے کم از کم یہ اندازہ نہ ہو کہ میں اس ٹرین سے ہی اتری ہوں۔

''جی بی بی.....'' وہ کام ملنے کی امید میں فوراً رک گیا۔

''قلی بھائی یہاں کراچی کی اگلی ٹرین کب آئے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ..... یہ جو آئی ہے..... یہ بھی کراچی جا رہی ہے۔'' وہ بولا۔

''نہیں، مجھے اگلی ٹرین سے جانا ہے۔''

''وہ ایک گھنٹے بعد آئے گی..... کیوں بی بی، کیا کسی کا انتظار کرنا ہے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''بکواس مت کرو۔'' غصہ یک دم میرے سر پر

چڑھ گیا تھا۔ ''یہ بتاؤ کہ ٹرین کب آئے گی ورنہ میں دوسرا فلی کرتی ہوں۔''

''میں نے بتایا تو جی ایک گھنٹے میں.....'' اس کا لہجہ بدل گیا۔

''میری خالہ بیمار ہیں ان کے لیے ایک دوا لے کر جارہی ہوں۔ ایک آدمی یہیں دوا لے کر آئے گا۔'' میں نے فی البدیہہ بات بنائی۔

''اچھا جی..... معافی چاہتا ہوں..... یہاں اصل میں روز یہ سب دیکھتے ہیں نا جی..... فلمیں دیکھ دیکھ کر لڑکیاں ہوں یا منڈے سب ہی خود کو کرینہ اور شاہد کپور سمجھ لیتے ہیں۔'' وہ بے ڈھنگی ہنسی ہنس کر بولا۔ ''آپ آجاؤ باجی..... آپ کو کراچی جانا ہے..... ٹکٹ بابو بتا رہا تھا کہ کراچی کی اگلی گاڑی لیٹ بھی نہیں ہے، ٹیم پر آئے گی۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے کہا۔ ''میں تو ایمرجنسی میں جارہی ہوں، مجھے ٹکٹ بھی چاہیے اور بیٹھنے کے لیے سیٹ بھی..... مل جائے گی؟''

''کیسے نہیں ملے گی جی..... بالکل..... بالکل مل جائے گی۔ ٹکٹ تو مل جائے گا اور سیٹ آپ کو صرف بالا ہی دلا سکتا ہے۔ بس باجی الگ سے سو روپے خرچ ہوں گے اب آپ پریشانی میں ہو اچھا تو نہیں لگتا مگر مجبوری ہے۔'' وہ سر کھجا کر بولا۔

''ٹھیک ہے، میں دوں گی۔'' اس کی زبان بھی کسی لمبی ریل گاڑی کی طرح مسلسل چلنے کی عادی لگ رہی تھی۔

''سو روپے یہ اور پچاس سوار ہونے کے بعد الگ دوں گی مگر مجھے ٹرین تک چڑھانے اور بٹھانے کا کام تمہارا..... ٹھیک ہے؟''

''بالکل..... سو فیصد باجی..... بسم اللہ سو بسم اللہ۔'' وہ خوش ہوگیا۔ ''ٹکٹ کون سی کلاس کا چاہیے؟''

''بس عورتوں کا ڈبا ہونا چاہیے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... آیئے جی.....'' وہ عادت کے تحت میرا ہلکا سا سوٹ کیس سر پر رکھ کر تابعداری سے میرے ساتھ ہولیا۔ میں اسے ہزار کا نوٹ دینے کی غلطی نہیں کرسکتی تھی اگر وہ نوٹ لے کر غائب ہو جاتا تو میں اسے کہاں ڈھونڈتی پھرتی۔

ٹکٹ لینے کے بعد میں نے اسے سیٹ کے لیے اضافی سو روپے دیے اور وہ خوش ہوگیا۔ ٹکٹ لے کر نکلتے ہوئے میری نظر ایک اسٹال پر پڑی۔ وہ گوٹے لگے کڑھائی والے پرس نما بیگ بیچ رہا تھا۔ مجھے اس کی اس وقت سخت ضرورت تھی۔ میں نے اس سے ایک خوب صورت بیگ خریدا اور کندھے پر لٹکا لیا۔ مٹھی میں دبے پیسے کھونے کے خوف سے میں خاصی پریشان تھی۔ بیگ کو بھرنے کے خیال سے میں نے ایک رسالہ..... بسکٹ کے چند پیکٹ..... چپس اور نمکو خرید لیا۔ یوں راستے کا سامان بھی ہوگیا اور بیگ بھی بھر گیا۔

پلیٹ فارم پر خاصا رش تھا۔ رات کے اس پہر بھی اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔ اپنے پیاروں کو چھوڑنے اور لینے کے لیے آنے والوں کا ہجوم ہر طرف موجود تھا۔ میں نے بیٹھنے کے لیے سیٹ کی تلاش میں نظریں گھمائیں۔

''باجی..... آپ یہاں بیٹھنے کے بجائے ویٹنگ روم میں بیٹھ جائیں۔'' بالا نے مشورہ دیا۔

''نہیں..... میں یہیں بیٹھوں گی..... خالہ کی دوا لے کر آنے والا یہیں آئے گا نا.....'' میں نے ایک سیٹ پر دو عورتوں کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سچی بات یہ تھی کہ میں کبھی ویٹنگ روم میں نہیں بیٹھی تھی بلکہ میں نے تو کبھی ویٹنگ روم دیکھا تک نہیں تھا۔ میں نے بڑا اسٹیشن بھی صرف ایک بار ہی دیکھا تھا جب ہم سب لاہور گئے تھے اور یہ بھی کئی سال پہلے کی بات تھی پھر خدا جانے ویٹنگ روم میں کون ہو..... یا نہ ہو..... یہ فلی جانتا تھا کہ میں اکیلی ہوں اگر وہ سامان کی چوری کے لیے بھی کوئی الٹا سیدھا چکر چلا دیتا..... اسی خوف کی وجہ سے میں نے پلیٹ فارم پر بیٹھنا ہی بہتر سمجھا۔ مجھے اب کسی پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔

''ٹھیک ہے باجی پھر تو آپ یہیں بیٹھو جی..... جیسے ہی ٹرین آئے گی میں آجاؤں گا۔'' وہ سوٹ کیس کو میرے برابر میں کھڑا کر کے رخصت ہوگیا۔

میں نے دوپٹا اچھی طرح لپیٹ کر اس طرح لے رکھا تھا کہ میرا آدھے سے زیادہ چہرہ چھپا ہوا تھا ویسے بھی اکرم بھائی یا ہمارے گاؤں کے کسی شخص کا اتنی دور پہنچنا ناممکن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سلمٰی نے ان سب کو میرے چھوٹی آپا کے گاؤں جانے کی خبر دی ہوگی۔ وہاں جانے اور آنے میں کافی وقت لگا ہوگا۔ اس کے بعد اگر وہ میرے پیچھے نکلتے تو ابھی وہیں علاقے میں ہی ہوتے۔ یوں بھی بھائی تو شاید اب تک پولیس کی پکڑ میں آگیا ہوگا، اس کے بعد کون اتنی بھاگ دوڑ کرتا۔ جو کہانی بھائی بنانا چاہتا تھا، وہ تو ہو ہی گیا تھا اس کا مقصد بہرحال پورا ہو ہی گیا تھا۔ میرے گھر چھوڑ کر

بھاگ جانے سے میری جان بچ گئی تھی مگر بدنامی کا ٹھپا یقیناً زیادہ گہرائی اور پکے رنگ سے لگایا جاچکا ہوگا۔ یہ میں اچھی طرح سے سمجھ سکتی تھی۔ اب بھی واپسی تو کیا شاید وہاں کے بارے میں سوچنا بھی ناممکن تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

اچانک میرے برابر بیٹھی خاتون کی دہاڑ نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ وہ اپنے بچے کو ڈانٹ رہی تھی اس کے ساتھ بیٹھی دوسری عورت بھی حسبِ موقع اور حسبِ حیثیت درمیان میں بول رہی تھی۔ وہ دونوں ہی کسی انجان زبان میں بات کررہی تھیں جو میں سمجھ نہیں پارہی تھی ہاں ان کی حرکات وسکنات سے اندازہ ہورہا تھا کہ بچے نے کھانے کی کوئی چیز گرادی ہے۔ ان کے بڑے بڑے گھیر دار برقعے گویا چھوٹے خیمے تھے جن میں وہ ایک ایک گود کے بچے کو لیے بیٹھی تھیں۔ ان کی دوسری جانب بہت سارے بڑے چھوٹے دیہاتی بکس، بستر بند، گٹھڑیاں اور تھیلے ... وغیرہ پڑے تھے۔ پانی کے دو بڑے کولر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس قدر سامان تھا کہ میں ششدر رہ گئی تھی کہ یہ دو عورتیں دو بچوں اور اتنے سامان کے ساتھ جا کہاں رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد ہی مجھے کم از کم میرے اس سوال کا جواب مل گیا۔

تین لمبے چوڑے آدمیوں کے ساتھ سات آٹھ بچوں کا جم غفیر شور مچاتا آپہنچا تھا۔ وہ سب ان بکسوں اور دیگر سامان پر پہلے آئے پہلے پائے کی بنیاد پر بیٹھ گئے۔ آمرانہ طبیعت والے کچھ بچوں نے پہلے بیٹھ جانے والے بچوں کا تختہ الٹنے کی کوشش بھی کی، جس کے نتیجے میں ان کے ساتھ موجود مردوں نے بڑکیں اور ایک دو ہاتھ گھما دیے اس کے بعد قدرے امن قائم ہوگیا۔ بکسوں سے کچھ فاصلے پر وہ مرد زمین پر ہی آرام سے بیٹھ گئے۔ وہ بچے اس قدر شور مچا رہے تھے کہ پلیٹ فارم کا ہنگامہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ سب کچھ نہ کچھ کھا پی رہے تھے۔ چائے کی مہک نے مجھے بھی بے چین کردیا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اسٹال سے چائے لے آؤں مگر پھر سوٹ کیس اور جگہ کے خیال کی وجہ سے میں نے اٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ چائے میں ٹرین میں بھی پی سکتی تھی میں نے خود کو تسلی دی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ ٹرین میں چائے اور کھانا وغیرہ مل جاتا ہے اور اب تو میرے پاس موٹے کی مہربانی سے پیسے بھی موجود تھے۔ میں نے اطمینان سے سوچا۔

روپے میں بھی کیا کرشماتی طاقت ہوتی ہے۔ کہنے کو ہاتھ کا میل مگر موجود نہ ہو تو اعتماد، یقین حتیٰ کہ رشتوں کا پٹھا بھی بیٹھ جاتا ہے۔ اچانک سیٹی کی تیز آواز نے پلیٹ فارم پر بھونچال سا برپا کردیا۔ میرے برابر میں خیموں میں بھی ہلچل سی مچ گئی۔

عورتیں چیخ چیخ کر بچوں اور سامان کو جمع کررہی تھیں۔ بچے اپنے معمولاتِ خورونوش میں اس دخل در معقولات پر شدید برہم تھے اور رو رو کر احتجاج کررہے تھے جبکہ مرد غالباً عورتوں کو ڈانٹ پھٹکار رہے تھے۔ اسی ہڑبونگ میں قلی صاحب آگئے۔

''باجی..... باجی ٹرین آگئی ہے۔'' اس نے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا۔ اس کے خیال میں مجھے سامنے رکتی ہوئی ٹرین نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

''چلو.....'' میں کھڑی ہوگئی۔

''آیئے جی.....'' اس نے میرا سوٹ کیس اٹھالیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں اسی رفتار سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی پرچی کو دیکھتے ہوئے دو کمپارٹمنٹ چھوڑ دیے اور تیسرے میں گھس گیا۔ اندر خاصا رش نظر آرہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھ گئی۔ بالا نے اس دوران میرے لیے ایک سیٹ قابو میں کرلی تھی۔

''آؤبی بی..... یہ رہی آپ کی سیٹ۔'' اس نے مجھے اشارہ کیا، میں لپک کر اس پر جا بیٹھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ سوٹ کیس اس نے میری سیٹ کے نیچے جما دیا تھا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اسے اس کے پیسے دیے۔ پیسے پکڑ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

ٹرین اس اسٹیشن پر خاصی دیر رکی رہنے کے بعد بالآخر چل پڑی۔ ڈبے میں تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ ٹرین کے اسٹیشن سے نکلتے ہی ایک دم ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر میں سب ہی رات کے سحر میں جکڑا ہونا شروع ہوگئے۔ ایک میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ میں اندھیرے میں کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے مناظر کے اندھے ہیولوں کو دیکھ رہی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے سب کچھ تیزی سے بھاگ رہا ہو۔ پیچھے چھوٹ رہا ہو..... جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

حقیقت اور سراب کا یہ کھیل ہمیشہ سے جاری تھا اور ہمیشہ جاری رہنے والا تھا۔

میں صبح اس ٹرین سے اترنے کے بعد کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟

کراچی جیسے بڑے شہر میں میرا کیا بنے گا؟

سوالات تیر کی طرح میرے دل میں کُھبے جارہے تھے اور ان میں سے کسی سوال کا میرے پاس فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔

اُس موٹے کا وہ جملہ میرے دماغ میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کل کی ابھی سوچو..... میں سوچنا چاہتی تھی مگر میری سوچ ایک حد سے آگے بڑھ ہی نہیں پارہی تھی۔ صرف ایک اطمینان تھا کہ اب میں بالکل خالی ہاتھ نہیں تھی۔ اس موٹے کے بٹوے سے سترہ ہزار روپے نکلے تھے جن میں سے کچھ خرچ ہو چکے تھے۔

ان پیسوں سے فی الحال میں کسی چھوٹے موٹے ہوٹل میں ٹھہر سکتی تھی..... مگر ہر جگہ میرا لڑکی ہونا میرے پیروں کی زنجیر تھا۔ خدا جانے ہوٹل والے اکیلی لڑکی کو کمرا دیتے بھی ہیں یا نہیں یا اگر دے دیتے تو میرے ساتھ کیا ہوتا۔

ملگجا اندھیرا رات کی تنہائی میں ہیولوں کی صورت امکانات کی بھیانک تصویریں بنا بنا کر میرے سامنے پیش کررہا تھا۔

''تم پریشان لگ رہی ہو بیٹی..... کیا بات ہے؟ کیا میں تمہاری کچھ مدد کرسکتی ہوں؟'' اس نرم آواز نے مجھے میرے خیالوں کے ازدحام سے نکالا۔

''جی.....'' میں نے چونک کر اپنے برابر میں دیکھا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ گوری رنگت اور نرم و نازک نقوش نے ان کے چہرے کو عجیب دلکش ملاحت بخشی ہوئی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں سوال..... شاید وہ کافی دیر سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''نہیں..... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان کے سوال کا کیا جواب دوں۔

''میں تمہیں دیکھ رہی تھی..... پتا نہیں کیوں لگا کہ تم مشکل میں ہو اس لیے پوچھ لیا۔ سب خیر ہے نا؟ بُرا مت ماننا..... مجھ سے رہا نہیں جاتا کسی کو پریشان دیکھ کر۔'' وہ بولیں۔

''جی سب ٹھیک ہے۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''اصل میں میری خالہ بیمار ہیں اس لیے تھوڑی پریشان ہوں۔'' میں اُن سے اور کیا کہتی۔

''ارے ارے اللہ انہیں صحت دے..... کہاں جارہی ہو؟''

''کراچی۔'' دل تو چاہ رہا تھا... کہوں کہ یہ ٹرین ٹمبکٹو تو جا نہیں رہی۔

''اکیلی جارہی ہو؟'' انہوں نے پھر سوال داغا۔

''جی..... میں نے بتایا نا کہ خالہ بیمار ہیں اس لیے اچانک جانا پڑا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا..... اللہ سب خیر کرے۔ ٹھیک ہو جائیں، وہ جلدی سے..... کہاں رہتی ہیں وہ کراچی میں؟''

یہ ایک بڑا حملہ تھا جس نے مجھے چاروں شانے چت کردیا تھا۔ میری زبان کو لاک لگا دیا تھا۔ میں تو کراچی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی، انہیں کیا بتاتی۔ اس لیے چند لمحے سوچتی رہی کہ انہیں جواب میں کیا کہوں۔

''ہاں ہاں..... کہاں رہتی ہیں وہ..... تمہاری خالہ.....؟'' وہ گویا تفتیش پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ پتا نہیں بعض لوگوں کو دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا اتنا شوق کیوں ہوتا ہے۔ میں نے سوچا۔

''مجھے جگہ کا نام یاد نہیں رہا.....'' میں نے بالآخر بے بسی سے کہا۔

''ارے تو پھر تم جاؤ گی کیسے؟'' وہ وکیلوں کو مات دے رہی تھیں۔

''کوئی آئے گا لینے.....'' مجھے بروقت جواب سوجھ گیا۔

''اچھا اچھا..... پھر ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن ہوگئیں۔

''دیکھو..... تم سوچ رہی ہوگی کہ یہ خالہ میرے پیچھے پڑ گئی ہیں اصل میں زمانہ اچھا نہیں ہے اکیلی لڑکی تو گویا آسان شکار ہوا..... بھئی اب لوگوں میں خوف خدا رہا ہی نہیں۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ مجھے تو اچھا لگا کہ آپ نے میری اتنی فکر کی۔'' میں واقعی اپنی تھوڑی دیر پہلے کی سوچ پر شرمندہ تھی۔

''کیسے نہ کرتی..... میری بھی تو دو بیٹیاں ہیں..... ویسے تمہاری ماں بڑی بہادر ہے..... اتنی دور اکیلے بھیج دیا اپنی چاندسی بیٹی کو..... میں ہوتی تو اتنی ہمت نہ کر پاتی۔ خزانہ جتنا قیمتی ہو اتنی ہی اس کی حفاظت بھی کرنی چاہیے۔'' وہ مجھے غور سے دیکھ کر بولیں۔

اماں کے ذکر پر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں انہیں کیا بتاتی کہ میری اماں تو اس سے بھی زیادہ بہادر نکلیں۔ انہوں تو اپنی چاندسی بیٹی کو اتنی دور بھیجنے کا پروگرام بنا لیا تھا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

''کیا ہوا.....؟ گھر یاد آگیا؟ اداس کیوں ہوتی ہو؟'' انہوں نے میرا چہرہ پڑھ لیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''سارہ.....'' میں نے بمشکل کہا۔ ان کی ہمدردی

میری آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔

''بڑا ہی اچھا نام ہے..... خیر اب تم فکر نہ کرو..... میں ہوں تمہارے ساتھ کراچی تک.....'' وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا دلاسا میرے لیے دھمکی سے کم نہیں تھا۔

''آپ اکیلی جارہی ہیں؟'' اس بار سوالات کی ذمے داری میں نے لے لی تھی یوں بھی اکیلے بیٹھ کر پریشان ہونے سے بہتر گفتگو ہی تھی۔

''ہاں..... کیا کروں..... دو بیٹیاں ہیں مگر دونوں اپنے گھر کی ہیں۔ ایک بیٹا دبئی میں رہتا ہے۔ ایک بیٹی پنجاب میں اور ایک کراچی میں..... تو کبھی یہاں اور کبھی وہاں آتی جاتی ہوں دل لگا رہتا ہے۔'' وہ بولیں۔ ''تنہائی بہت بڑا عذاب ہوتا ہے اور اسے وہ ہی جانتا ہے جو اس سے گزرتا ہے۔''

''اور آپ کے شوہر.....'' میں نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

''بڑے بے وفا نکلے وہ۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اٹھارہ برس قبل ہی مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر اوپر کی راہ لی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ بیوی بچے کیا کریں گے، کہاں جائیں گے..... بس پھر خود ہی ہمت کرنا پڑی۔ جب سر پر پڑتی ہے تو سب کرنا پڑتا ہے۔ یہ دنیا کسی کی مدد نہیں کرتی..... ہاں جو اپنی مدد آپ کی ٹھان لے اور رکھے دنیا کو ٹھوکر میں..... اس کے آگے جھک ہی جاتی ہے۔''

میری سمجھ میں چند لمحے بعد آیا کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔

''بہت افسوس ہوا۔'' میں نے رسماً کہا۔

''ہاں افسوس تو بہت ہوا..... کیا کرتے جینا تو پھر بھی پڑا..... جو راستہ ملا پکڑ کر چلتے رہے اور آج میرا اصول ہی یہ ہے کہ دوسروں کی مدد کرو۔'' وہ بولیں۔ ''اسی لیے کام کرتی ہوں..... تم یہ بتاؤ کچھ کھاؤ گی؟''

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میرے پاس آلو کا بھرتا اور پوریاں ہیں، بولو نکال دوں۔''

''ابھی واقعی دل نہیں چاہ رہا جب دل کرے گا مانگ لوں گی۔'' میں نے ان کے خلوص سے متاثر ہو کر کہا۔

''ہاں، ہاں تکلف مت کرنا..... سمجھو کہ میں تمہاری اماں کی طرح ہی ہوں۔'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو میں بے تاب ہو کر ان کے گلے لگ گئی۔ آنسوؤں کی باڑھ کو جو پچھلے دن سے میرے دل پر گر رہی تھی، ہمدردی کے چند بولوں نے بے قابو کر دیا تھا۔

''ارے ارے..... کیا ہو گیا بھئی، خیر تو ہے نا بچی..... کیا ہوا ہے..... کیوں رو رہی ہو؟'' وہ بوکھلا گئیں۔

''جی..... جی۔'' میں نے چند لمحوں بعد خود کو سنبھال لیا۔ ''اصل میں اماں یاد آ گئی تھیں۔''

''اے لو..... ابھی تو گھر سے آئی ہو تم..... چلو کوئی بات نہیں..... یہ لو پانی پیو..... میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ جانے کیا ہو گیا؟'' وہ بولیں۔

''تم پڑھتی ہو.....؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''جی..... دسویں کا امتحان دیا ہے۔''

''آگے کیا ارادہ ہے؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے دل کی سچائی سے کہا اور چپ ہو گئی۔ وہ اتنی اچھی، ہمدرد اور نیک دل تھیں کہ ان سے جھوٹ بولتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سچ بول نہیں سکتی تھی اس لیے کوشش کر رہی تھی کہ اس موضوع پر کم سے کم بات ہو۔

''اے لو..... یہ کیا بات ہوئی، کچھ تو سوچنا ہی چاہیے، خیر چلو..... اب تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ سویرا بھی ہونے ہی کو ہے پھر تو یہاں شور شرابا، غل غپاڑا مچنا شروع ہو جائے گا۔''

''جی..... ویسے یہ ٹرین کب پہنچے گی کراچی؟'' میں نے پوچھا۔

''دس بجے کہہ رہے ہیں اگر لیٹ نہ ہوئی۔ آج تو کمال یہ ہے کہ ٹرین ٹائم پر ہے حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے..... ریلوے خود اپنا ریکارڈ خراب کر رہی ہے۔'' وہ منہ دبا کر ہنسیں۔ ''اسی لیے لگتا ہے کہ وقت پر پہنچ ہی جائے گی۔ تمہاری خالہ کے گھر اطلاع کر دی ہوگی ٹرین کے نام وغیرہ کی.....؟''

''جی۔'' میں نے جواب دیا اور ان کے مشورے کے مطابق سیٹ کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس بار تصور کے پردے پر جھلملانے والی تصویر نے میرا دل دھڑکا دیا۔ وہ اکبر تھا۔

گاؤں کا سب سے ہونہار لڑکا جس کے چکنے چکنے پات بچپن میں ہی سب کی نظروں میں آ گئے تھے۔ اس کے ابا گاؤں کے پٹواری رہ چکے تھے، ابا سے ان کی اچھی دوستی تھی۔ وہ پڑھائی میں تو اول نمبر تھا ہی مگر اس جیسا بانکا گبرو

جوان پورے گاؤں میں کوئی نہیں تھا۔ گاؤں میں ہونے والے کشتی کے سارے مقابلے وہی جیتا کرتا۔ میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لیتے لیتے ہی اس کا قد چھ فٹ تک پہنچ گیا تھا۔ میں اسے اونٹ کہا کرتی جس کے جواب میں وہ مجھے گلی کہہ کر چھیڑتا حالانکہ میرا قد بھی کچھ ایسا کم نہیں تھا، اب یہ اور بات ہے کہ میں بمشکل اس کے کندھے تک آتی تھی۔

بچپن سے ہم ساتھ ہی کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ جوں جوں بچپن نے لڑکپن میں قدم رکھا، یہ دوستی پسندیدگی میں بدلتی چلی گئی۔ اس بارے میں ہم دونوں میں کھل کر کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر جن نظروں سے وہ مجھے دیکھتا تھا، وہ میں جانتی تھی اور میں ہی کیا میری ساری سہیلیاں جانتی تھیں۔ ان کے مطابق اکبر اور میرا ساتھ چاند سورج کی جوڑی سے کم نہیں تھا۔

انٹر میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی تھی اور پھر وہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ٹریننگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے والی رات میری اس سے ملاقات ہوئی تھی جس کا ایک ایک لفظ میرے دل پر لکھا تھا۔

''سارہ..... اب میں چھ سات ماہ تک گاؤں نہیں آسکوں گا مگر جب آؤں گا تو وردی میں ہوں گا۔'' اس نے فخر سے کہا تھا فوجی بننا اس کا بچپن کا خواب تھا اور اب اسے اس کی تعبیر ملنے جا رہی تھی۔

''چھ سات ماہ.....؟'' میرا دل چھ سات ماہ پر ہی گویا اٹک کر رہ گیا تھا۔

''ہاں، شروع میں چھٹی نہیں ملتی اور چھ سات ماہ ہوتے ہی کیا ہیں؟ پلک جھپکنے میں گزر جائیں گے، تو ان کے بارے میں مت سوچ..... سوچنا ہی ہے تو آگے کی فکر کر..... میں نے اماں سے بات کر لی ہے، وہ بھی بڑی خوش ہیں جب میں پکا ہو جاؤں گا تو وہ تیری اماں سے بات کر لیں گی۔'' وہ مسکرایا۔

''ہیں..... تو نے چاچی سے بات کر لی؟ شرم نہیں آئی تجھے..... اللہ وہ کیا سوچ رہی ہوں گی۔'' مجھے واقعی شرم آ گئی تھی۔

''سوچنا کیا ہے..... میں نے اُن سے کہہ دیا کہ آخر چاچا جی ابا کے دوست ہیں..... اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں اگر ہم نہیں سوچیں گے تو ان کی چپنی چپٹی ناک والی لڑاکا جھگڑالو بیٹی سے کون شادی کرے گا..... تو چل میں ہی قربانی دے دیتا ہوں۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔

''میں..... چپنی چپٹی ناک والی..... خود ہے اونٹ ورگا..... نہیں بات کر مجھ سے..... بڑا آیا مجھے اس طرح کہنے والا۔'' میرا منہ پھول گیا۔

''اچھا یہ لے دیکھ..... کان پکڑ لیے میں نے پر تو بھی تو عقل کو ہاتھ مار..... بھلا میں یہ کہہ سکتا ہوں اور وہ تیری وکیل یعنی میری اماں کہنے بھی دیں گی مجھے..... بس انہوں نے کہا کہ میرے سر پر سہرا دیکھنا ہے اور میں نے اپنی پسند بتا دی..... خوش ہیں وہ۔'' وہ بولا۔

''اور..... تو.....؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''میں..... میرا کیا ہے اب گلے میں پڑا ڈھول بجا لوں گا۔'' وہ شرارت سے بولا۔ ''تو اپنی سوچ، میری نوکری پکی ہوتے ہی تجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑے گا۔''

''دیکھیں گے..... اب یہ اتنا بھی آسان نہیں ہے۔'' میں نے اترا کر کہا۔ ''اماں ابا میری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ تھوڑی کر لیں گے اور کیا ضروری ہے کہ میں ہاں ہی کہوں.....؟''

''اچھا جی.....'' وہ اچھا کو کھینچتے ہوئے بولا۔

''ہاں اور کیا..... اب اگر تو چاہتا ہے کہ میں ہاں ہی کہوں تو تُو وعدہ کر کہ تو میری ہر بات مانے گا اور مجھے میلے سے موتیوں والا پراندہ، لشکنیوں والی چوڑیاں اور میک اَپ باکس لے کر دے گا اور.....''

''بس کر شیطان کی نانی..... ورنہ تیری لسٹ لمبی ہوتی چلی جائے گی اور میری کل صبح کی بس نکل جائے گی، لادوں گا سب جو بھی تو مانگے گی اور تیری ہر بات بھی مانوں گا..... تیری نہیں مانوں گا تو پھر جیوں گا کیسے..... سارہ؟'' اس کے لہجے اور انداز نے ایک لمحے کو مجھے گنگ سا کر دیا۔ ''بول کیا منوانا ہے تجھے.....؟''

''تو..... تو جلدی آجائے گا نا؟'' میں بمشکل بولی۔

''ہاں..... کام سے زیادہ ایک دن بھی نہیں لگاؤں گا وعدہ ہے میرا..... تو بس اپنا خیال رکھنا..... خوش رہنا، اکرم سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھی نا؟ بس خوش رہنا اور مجھے یاد کرتی رہنا۔''

''تو مجھے یاد کرے گا نا؟''

''ہر وقت..... ہر لمحہ..... میں تجھے یاد کروں گا اور تو بھی یاد رکھنا کہ تو ہی میری طاقت ہے..... تو خوش تو میں بھی خوش تو ٹھیک تو میں بھی ٹھیک..... سمجھ گئی نا؟'' اس نے میرے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

بچپن سے میں اُس کی اِس عادت سے بہت چڑتی تھی۔ ہماری اس چکر میں بڑی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ ایک بار

میں نے اُسے چپت مارنے کی وجہ سے ندی میں دھکا دے دیا تھا اس وقت پانی بھی زور میں تھا..... اکبر ڈوبتے ڈوبتے بچا تھا۔ اسے پانی میں الجھتا دیکھ کر میں خود بھی اس کے پیچھے کود گئی تھی پھر وہی مجھے نکال کر لایا تھا مگر آج اس کی یہ چپت مجھے دنیا کی ہر چیز سے اچھی لگی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

''ارے ناراض ہوگئی تو..... چل معاف کر دے، پرانی عادت ہے نا..... اب نہیں کروں گا تو رومت۔'' وہ میرے آنسو دیکھ کر پشیمان ہوگیا تھا۔

''کیوں نہیں کرے گا.....؟ کیا منع کیا ہے میں نے تجھے۔'' میں نے اسے گھورا۔

''تم لڑکیاں واقعی جلی ہی ہوتی ہو۔'' وہ زور سے ہنسا۔ ''پتا نہیں چلتا کہ کب کس بات پر ناراض ہو جاؤ اور کب اسی بات پر خوش ہو جاؤ..... چل اب میں اٹھ۔ تھوڑی پیکنگ شیکنگ کرتی ہے..... تو اپنا خیال رکھنا میرے لیے۔ میں جب واپس آؤں تو مجھے چنگی بھلی ہونا چاہیے۔ آج سے بھی زیادہ سوہنی..... ٹھیک ہے نا.....؟'' وہ مسکرایا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں بھی جواباً مسکرائی۔ ''مگر تو اور لمبا مت ہو جانا۔'' میں نے اسے گھورا تو وہ زور سے ہنستا ہوا واپسی کے لیے مڑ گیا۔ چند قدم آگے جا کر وہ مڑا اور اس نے مجھے فوجی انداز میں سیلوٹ کیا۔ میں اسے جاتا دیکھتی رہی تھی، میری آنکھیں جھل جھل تھیں مگر ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''اب..... اکبر جب لوٹ کر آئے گا تو.....؟'' اس سے آگے میں سوچنا نہیں چاہ رہی تھی۔

کیا وہ بھی سب کی باتوں پر یقین کر لے گا؟ مان جائے گا کہ میں ایسا کچھ کر سکتی ہوں؟ بے وفا ہو سکتی ہوں؟

خدا جانے وہ کیا کرے گا؟ کیا سوچے گا؟ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اس کی ٹریننگ کہاں تھی وہ کس جگہ رہتا تھا، یہ سب پوچھنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ ایک دن سب کچھ بدل جائے گا اور مجھے اس طرح بھاگنا ہوگا۔ سب کچھ چھوڑ کر..... اکبر میرے بارے میں کیا سوچے گا؟ یقیناً وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ اس خیال نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

''نہیں، نہیں ایسا نہیں ہوگا۔'' میں بڑبڑائی۔ ''سلمیٰ سب جانتی ہے جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، اکرم بھائی کا جرم، اماں ابا کا فیصلہ..... یقیناً وہ اکبر کو حقیقت بتا دے گی.....'' اس سوچ نے مجھے اطمینان بخشا مگر اگلا خیال اس سکون کو درہم برہم کر گیا۔ مانا کہ سلمیٰ اسے سب کچھ بتا دے گی تب بھی اب اس سے مجھے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ میں تو اس دنیا سے اس طرح نکل چکی تھی جیسے انسان زندگی سے موت کی وادی میں منتقل ہو جاتا ہے یوں بھی اس کی گاؤں واپسی میں پورے چار ماہ باقی تھے۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی اور آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔ صبح ہوتے ہی ڈبے میں یک دم شور ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ ہم سے دو سیٹ پیچھے نشستوں پر دو خواتین میں گھمسان کا رن پڑا تھا۔ وہ دونوں مسلسل بولے جا رہی تھیں اور چونکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی رکنے یا دوسرے کی بات سننے پر آمادہ نہیں تھی تو بات بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

''آخر ماجرا کیا ہے؟'' میرے ساتھ بیٹھی خالہ کسما کر اٹھ ہی گئیں۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ صبح ہوتے ہی ہنگامہ شروع ہو جائے گا۔''

''مگر ہوا کیا ہے؟'' میں نے سیٹ سے کھڑے ہو کر جھانکا۔ کافی عورتیں وہاں جمع تھیں اور ان دونوں کو شانت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ارے کبھی ٹرین میں بیٹھے نہیں ہیں یہ لوگ..... تب ہی تو کسی چیز کی تمیز نہیں ہے۔'' ایک چیختی ہوئی آواز آئی۔

''ہاں اور تمہارا تو پورا خاندان ٹرین میں ہی پیدا ہوا تھا نا اور وہ بھی فرسٹ کلاس میں..... باوا کیا ٹکٹ چیکر تھے؟'' دوسری خاتون چمک کر بولیں۔

''خاندان تک جاتی ہے میرے باپ کا نام لیتی ہے، تیری تو زبان ہی کاٹ کر پھینک دوں گی..... سمجھتی کیا ہے خود کو..... لاٹ صاحب کی اولاد۔'' پہلی خاتون دوسری کو مات دیتے ہوئے للکاریں۔

''ارے بس کرو..... کیا تماشا لگا رکھا ہے یہ۔'' آخر ڈبے کے کونے سے ایک دبنگ خاتون نمودار ہوئیں۔ بڑھاپے کے باوجود ان کی آواز کا دبدبہ سننے سے تعلق رکھتا تھا۔ ''آخر ایسا ہو کیا گیا ہے جس پر اس قدر جھگڑا ہو رہا ہے؟'' انہوں نے میرے دل میں اٹھنے والا سوال دہرایا۔

تحقیقات پر معلوم ہوا کہ سارا جھگڑا باتھ روم پر شروع ہوا تھا۔ پہلی خاتون کے بیٹے کو باتھ روم استعمال کرنا تھا جبکہ دوسری خاتون کا بچہ کافی دیر سے باتھ روم میں تھا۔ وہیں سے یہ بحث شروع ہوئی اور پھر جنگ کا روپ دھار گئی۔ عورتوں نے بہر حال بیچ بچاؤ کرا کے جھگڑا نمٹا دیا تھا مگر اب دونوں پارٹیاں آمنے سامنے بیٹھنے پر تیار نہیں تھیں کہ اس سے دوبارہ کسی بھی وقت فساد فی البدیہہ کا خطرہ موجود تھا۔ جس کا حل یہ نکالا گیا کہ ان سے پچھلی سیٹ والی خاتون نے

اعزازی طور پر اپنی جگہ بدل لی تھی۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے ہم لوگوں کو۔'' خالہ نے چائے والے کو چائے کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

''معمولی معمولی باتوں پر اس قدر طیش میں آجاتے ہیں۔ برداشت، رواداری تو پرانے سامان کی طرح متروک ہوتے جارہے ہیں۔ پورے معاشرے کے اعصاب تنے رہتے ہیں۔ ذرا سی کوئی بات ہوئی نہیں اور بات برداشت سے باہر نکل گئی بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے..... بھلا یہ بھی کوئی لڑائی کی وجہ ہوئی۔'' وہ کافی دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا، میری بے چینی بھی ہوا سے باتیں کرتی جارہی تھی۔ اسٹیشن پہنچ کر میں کیا کروں گی؟

ایک دل کہتا کہ میں اس مہربان خاتون سے دل کا سارا راز کہہ ڈالوں تو ہوسکتا ہے کہ وہ میری مدد کردیں۔ جو کچھ انہوں نے اب تک اپنے بارے میں بتایا تھا، اس سے تو یہ اندازہ ہورہا تھا کہ وہ وہاں تنہا رہتی تھیں۔ اگر وہ چاہتیں تو مجھے یقیناً پناہ دے سکتی تھیں اور آگے بھی میرے لیے کسی کام یا ملازمت کا بندوبست بھی کرسکتی تھیں۔

مگر دوسری طرف میں ڈر بھی رہی تھی کہ خدا جانے سب کچھ معلوم ہونے کے بعد وہ کیا سمجھیں۔

ہوسکتا ہے کہ انہیں میری بات کا یقین نہ آئے اور گھر سے بھاگی ہوئی ایک بے راہ رو لڑکی سمجھ کر وہ مجھے دھتکار دیں۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اسی شش و پنج میں تھی کہ کراچی کی آمد کے آثار نظر آنا شروع ہوگئے۔

''بھئی واہ..... ٹرین بالکل وقت پر ہے ہم ذرا سی دیر میں کراچی پہنچ جائیں گے۔'' خالہ خوش ہوکر بولیں۔

''جی۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم کیوں اتنی اُلجھی ہوئی نظر آرہی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟'' انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

''نہیں ٹھیک ہوں میں..... اصل میں پہلی بار اکیلے سفر کیا ہے نا..... تو شاید اسی لیے.....'' میں زبردستی مسکرائی۔

''لو..... اکیلی کہاں ہو تم..... ہم ہیں تو تمہارے ساتھ۔'' وہ گویا بُرا مان گئیں۔

''نہیں، نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا خالہ.....'' میں نے گھبرا کر صفائی پیش کی۔

''دیکھو مجھے میرے سب قریبی لوگ آپا جی کہتے ہیں، اگر تم چاہو تو تم بھی کہہ سکتی ہو۔'' وہ مسکرائیں۔

''آپا جی۔'' میں نے بھی مسکرا کر کہا۔ ''شاید آپ یقین نہ کریں لیکن آپ سے مجھے بہت حوصلہ ملا ہے، آپ بہت اچھی ہیں۔'' میں نے سچے دل سے کہا۔

''تم خود بہت اچھی ہو سارہ..... جب میرے میاں اللہ کو پیارے ہوئے تو بہت مشکل وقت دیکھا میں نے، نہ ہاتھ میں پیسا نہ تجربہ اور نہ ہی کوئی مددگار..... پھر یہی سیکھا کہ بندے کو خود مضبوط ہونا چاہیے اور جو آپ کے ساتھ غلط کرے اسے اس کی سزا دینی چاہیے یہی میں سبق بھی دیتی ہوں ہر ایک کو..... اگر بندہ اپنی قیمت کو خود نہ سمجھے تو لوگ تو اسے لوٹ کا مال ہی سمجھیں گے نا۔'' وہ بولتی رہیں، میں خاموشی سے سر ہلاتی رہی تھی۔ سچ بات یہ تھی کہ مجھے ان کی بات کی کچھ خاص سمجھ نہیں آئی تھی، میں تو خود اپنی پریشانی میں پڑی تھی کہ آنے والا وقت ایک انجان اندھیری اور خطرناک سرنگ کے مانند منہ کھولے قریب آتا جارہا تھا اور میں سوائے دہشت سے کانپنے کے اور کچھ نہیں کر پارہی تھی۔

ٹرین جونہی اسٹیشن میں داخل ہوئی، ایک ہڑبونگ سی مچ گئی ٹرین کو اب کافی دیر یہاں رکنا تھا۔ یہیں سے صفائی کے مراحل سے گزر کر دوبارہ جانے کے لیے تیار ہونا تھا مگر اس کے باوجود اترنے والے کچھ ایسی جلدی میں تھے جیسے ایک لمحے کی تاخیر انہیں پتھر کا بنا دے گی۔ قلی دروازے، کھڑکیوں سے سامان باہر نکال رہے تھے۔ لینے آنے والے بھی کھڑکیوں اور دروازوں پر رش لگائے کھڑے تھے۔

''چلو سارہ..... تم دیکھ لو کہ تمہیں کوئی لینے آیا ہے کہ نہیں؟'' آپا جی نے قلی کو آواز دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں تو جانتی تھی کہ کسی کو بھی مجھے لینے کے لیے آنا ہی نہیں تھا مگر ان کے اس جملے سے مجھے راستہ مل گیا، میں تھوڑی دیر تلاش کا ڈراما کر کے فی الحال ان کے ساتھ جا سکتی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں آپا جی۔''

''ہاں دیکھو..... میں یہیں ہوں۔ یہ قلی میاں سامان اتار لیں تو اتروں گی اور پھر یہیں تمہارا انتظار کروں گی۔ کوئی آجائے تو مجھے بتا کر جانا۔''

''بالکل..... میں ہر صورت آرہی ہوں۔'' میں نے ان کی طرف عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس تھوڑے سے وقت میں مجھے ان پر بڑا یقین ہوگیا تھا، ان کی باتیں، ان کا انداز سب مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ کتنی آسانی سے بندے کے دل کا راز جان لیتی تھیں اور پھر کتنی سادگی سے اس کا حل بھی بتا دیتی تھیں۔ ''یقیناً اللہ میاں نے انہیں میری

مدد کے لیے بھیجا تھا۔'' میں نے سوچا۔

انہیں دکھانے کے لیے مجھے ٹرین سے اترنا پڑا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی میں ہکا بکا رہ گئی۔ یہ ریلوے اسٹیشن تھا یا کوئی پورا شہر.....

کئی ٹرینیں برابر برابر کھڑی تھیں..... پلیٹ فارم اتنا بڑا تھا کہ ایک بار میں دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بے شمار لوگ پلیٹ فارم پر موجود تھے جیسے بہت بڑا میلہ لگا ہوا ہو۔ دکان دار، خوانچہ فروشوں کی آوازیں، لوگوں کی باتیں..... ہر طرف اتنا شور تھا کہ اپنے ہی کانوں کو خود اپنی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اسٹیشن کے اوپر پُل بنے ہوئے تھے جن پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ میں کسی معمول کی طرح آگے بڑھ رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے نئے زمانے کی ایلس اِن ونڈر لینڈ میں کھو گئی ہو..... اچانک ایک خیال نے میرے قدم روک لیے..... میں گویا ساکت سی کھڑی رہ گئی، میرا وہ چھوٹا سا سوٹ کیس جس میں موٹے سے چھپنے ہوئے روپے تھے وہ تو وہیں آپا جی کے پاس رہ گیا تھا، میں ان کے سوالوں سے بچنے کے چکر میں اسے وہیں بھول گئی تھی۔ اب کیا کروں میں.....؟ اس سوچ نے مجھے منجمد کر دیا۔ سارے شوق و ذوق پر خوف کی تہ چڑھ گئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا، میں واقعی کافی آگے نکل آئی تھی۔ لوگوں کا رش تو ویسے کا ویسا تھا مگر جہاں تک میری نظر دیکھ پا رہی تھی آپا جی کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔

میں تیزی سے پلٹی اور واپس جانے لگی۔ ہر طرف شور شرابا موجود تھا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ لوگوں کی آوازیں انسان کو تنہائی سے بچاتی ہیں دوسرا ہٹ اور تحفظ کے احساس کی وجہ بنتی ہیں مگر جب یہی آوازیں ایک بے حد شور میں بدل جائیں تو تحفظ کا احساس ختم ہونے لگتا ہے اور انسان ہجوم میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ میں بھی اس وسیع و عریض پلیٹ فارم پر سیکڑوں، ہزاروں افراد کی موجودگی میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہی تھی۔

میری آنکھیں دیوانوں کے مانند آپا جی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس اتنے بڑے اور اجنبی شہر میں صرف اُن کو جانتی تھی اور اب وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں تیزی سے ڈبوں میں جھانک رہی تھی۔ آگے پیچھے گھوم کر انہیں ڈھونڈ رہی تھی۔

یہ میں نے کیسی غلطی کر دی تھی۔ 'مجھے اُن کو چھوڑ کر جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔' میں نے سوچا۔ اب..... اب کیا ہوگا؟

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ کراچی

شمارہ جولائی 2021ء کی جھلکیاں

پابجولاں
اس شاعر کی زندگی جیل اور جلاوطنی میں گزری

مادر مہربان
غازی ارطغرل کی ماں جس کا تذکرہ تاریخ ساز ٹھہرا

عظیم فرار
وہ سب ناقابل تسخیر زندان سے فرار ہوئے تھے

سروں کی ملکہ
ملکہ ترنم نور جہاں کے وہ واقعات جو بہت کم لوگ جانتے ہیں

پل صراط
عورت کی زندگی غم و آلام ہے، دلچسپ سچ بیانی

اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے

اگر وہ مجھے نہ ملیں.....؟ اگر وہ اپنے گھر چلی گئی ہوں؟ آخر وہ ایک اجنبی ہی تو تھیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے سوچا ہو کہ میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ چلی جاؤں گی۔

اگر وہ چلی بھی گئی تھیں تب بھی اس میں ان کا تو بالکل کوئی قصور نہیں تھا۔ غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی۔ آخر میں نے انہیں سب کچھ کیوں نہ بتا دیا؟ اسی لیے تو جھوٹ کو برائی کی جڑ کہا جاتا ہے۔ اور پھر اوپر سے میں وہ سوٹ کیس بھی وہیں چھوڑ آئی۔ شاید میں ہوں ہی احمق.....

میں نے بمشکل آنسو روکے۔ میرا سارا پروگرام، سب منصوبے تہس نہس ہو گئے تھے۔ ابھی چند لمحے پہلے میں خاصی مطمئن تھی۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے شاید میں اب تب میں گر ہی پڑوں گی..... وہ رقم جس سے مجھے تھوڑا بہت اطمینان تھا وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ میرے کندھے پر موجود بیگ میں صرف دو ہزار روپے تھے۔

میں ایک بار پھر مکمل بے سروسامانی کی حالت پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں مگر یہاں اس ہجوم میں اس طرح آنسو بہانا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسوؤں کو بہنے سے قبل ہی پونچھ ڈالا۔ ناک کو دو انگلیوں میں پکڑ کر دبایا اور دوبارہ ٹرین کے پاس پہنچی۔

اب میں آخر سے ٹرین کے ساتھ چل کر دیکھتی جا رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ آپا جی میرے سامان کی وجہ سے شاید کہیں رکی ہوئی ہوں اور میرا انتظار کر رہی ہوں۔ ٹرین کے ساتھ تیز تیز چلتی میں پلیٹ فارم کے درمیان سے بھی آگے نکل گئی تھی مگر آپا جی وہاں سے بالکل غائب تھیں۔

میں اسی طرح ٹرین اور اس کے سامنے پلیٹ فارم پر ان کی تلاش میں منہمک تھی کہ اچانک کسی نے میری پشت پر ہلکی سی تھپکی دی۔

میں چونک کر پلٹی، مجھے امید تھی کہ شاید آپا جی نے مجھے دیکھ لیا ہے مگر وہاں ایک بالکل انجان شکل کو دیکھ کر میں دیکھتی ہی رہ گئی۔

وہ ایک بوڑھی سی عورت تھی۔ اس نے قدرے میلا سا لباس پہن رکھا تھا۔ پیروں میں گھسی ہوئی چپل تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے سر پر رکھی گٹھڑی کو تھام رکھا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر اَن گنت شکنیں تھیں مگر ہاتھ پیروں سے وہ اس قدر عمر رسیدہ محسوس نہیں ہوتی تھی یوں لگتا تھا جیسے زندگی نے اسے بُری طرح برتا ہو۔

''کک..... کون ہیں آپ.....؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھ سے کیا کام ہے آپ کو.....؟'' میرے سوال پر وہ مجھے چند لمحے دیکھتی رہی پھر اس نے ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میری نگاہیں اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کے تعاقب میں پلیٹ فارم پر لوگوں کی بھیڑ کی جانب اٹھیں۔

''وہاں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ پلیٹ فارم کے اس حصے میں بھی خاصا رش تھا۔ پھر مجھے یک دم خیال آیا کہ ہو نہ ہو اس عورت کو آپا جی نے ہی میرے پیچھے بھیجا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ میں انہیں نظر آ گئی ہوں۔ سامان کی وجہ سے وہ نہیں آ سکی ہوں اور انہوں نے اس عورت کو مجھے بلانے بھیج دیا ہو۔

''آپ کو کسی نے میرے پاس بھیجا ہے؟'' میں نے اس سے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ سر ہلا کر اشارے سے بولی۔ پھر ٹھیٹھ سندھی زبان میں کئی جملے بول گئی۔ اب میری سمجھ میں اس کی مسلسل خاموشی کی وجہ آئی۔ یقیناً اسے سندھی کے سوا کوئی زبان نہیں آتی تھی جبکہ میں سندھی بول تو کیا سمجھ بھی نہیں سکتی تھی۔

''کہاں.....؟ وہ کہاں ہیں؟' میں نے اشارے سے پوچھا۔

یہاں اس اسٹیشن پر بلکہ اس پورے شہر میں ایک آپا جی ہی مجھے بلا سکتی تھیں، اس احساس نے میرے دل کو سکون سے بھر دیا۔

''آؤ'' اس نے اشارے سے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آگے چل پڑی۔ ہم اسی طرح آگے پیچھے چلتے ہوئے پلیٹ فارم سے گزر کر باہر کی طرف جانے والے راستے تک پہنچ گئے..... وہاں ایک ستون کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔

''کہاں ہیں آپا جی.....؟ وہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں ہاتھ سے ستون کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں دیوار کے پاس ایک لمبے سے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے سرمئی رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ عجیب کھردرا سا تھا۔ پیشانی پر ایک لمبے سے پرانے زخم کا نشان بھی موجود تھا۔ وہ عورت اس کے اشارے پر واپسی کے لیے مڑنے لگی تو میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''رکو..... تم کہاں جا رہی ہو؟ آپا جی کہاں ہیں؟ وہ تو کہیں نظر نہیں آ رہیں؟'' میں زبان اور اشارے سے بیک

وقت اسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہیں ہم نے بلایا ہے۔'' اس لمبے سے کھردرے چہرے والے نے یکلخت مجھ سے کہا۔ اس کی آواز اس کی شخصیت کے مانند سرد اور سخت سی تھی۔

''تم نے؟ تم کون ہو؟ تم کو مجھ سے کیا کام ہے؟'' میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ شاید اکرم بھائی نے اپنے دوستوں کو متحرک کر دیا ہو یا ان کے پولیس والے دوست نے یہاں ان لوگوں کو میرے پیچھے لگا دیا ہو مگر سوال یہ تھا کہ انہیں یہ کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ میں کس ٹرین سے کہاں جا رہی ہوں اور ابھی اس وقت اسٹیشن پہنچوں گی۔

''تم سے کچھ حساب بے باق کرنا ہے اس لیے۔'' وہ سفاکانہ انداز میں مسکرایا۔ ''اس لیے بلایا ہے تمہیں..... اور تم اچھے بچوں کی طرح آ بھی گئیں..... چلو اب شرافت سے اِدھر آؤ اور میرے ساتھ چلو..... زیادہ شور شرابا مجھے پسند نہیں ہے اور تم..... تم کیوں یہاں جمی کھڑی ہو..... نکلو یہاں سے۔ تمہارے پیسے مل گئے نا تم کو۔'' اس نے آخری جملے اس بوڑھی عورت کو گھورتے ہوئے کہے۔ وہ چند لمحے سمجھنے نہ سمجھنے کی کیفیت میں کھڑی، ہم دونوں کو دیکھتی رہی پھر پلیٹ فارم کی جانب بڑھ گئی۔ میں بے بسی سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

''چلو۔'' اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''مگر کیوں.....؟ میں کیوں جاؤں تمہارے ساتھ..... اور اب میری طرف مت بڑھنا..... میں شور مچا دوں گی۔'' میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''اچھا۔'' وہ مسکرایا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سامنے کر دیا۔ لمحے بھر میں اس میں ایک تیز دھار چاقو چمکنے لگا تھا۔ ''اِسے دیکھ رہی ہو نا..... یہ شور مچانے والوں کو بالکل پسند نہیں کرتا اور خود بھی آواز نکالے بغیر سامنے والے کا صفایا کر دیتا ہے۔''

چاقو دیکھ کر میں لرز گئی تھی۔ یوں تو چھریاں اور بڑے چُھرے بھی میں نے خوب دیکھ رکھے تھے، عید بقر عید اور ویسے بھی بکروں کے ذبح میں، میں ابا کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ مرغی تو میں خود ہی ذبح کر لیا کرتی۔ چھوٹی آپا اور بڑی آپا تو خون دیکھ کر ڈر جاتی تھیں اور صائمہ کو یہ کام بالکل پسند نہیں تھا باقی بچا اکرم بھائی تو وہ موڈ کا بادشاہ تھا ایسے میں یہ سب میں ہی کیا کرتی..... مگر جس طرح اس لمبے آدمی نے چاقو کو کسی بٹن سے کھول کر لہرایا تھا اس سے میں ڈر گئی تھی۔

''مگر کیوں.....؟ آپ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے..... میں..... میں تو آپ کو جانتی تک نہیں ہوں۔'' میں نے بمشکل کہا۔

''مجھے تو جانتی ہو.....؟'' اس آواز نے مجھے دہلا دیا۔ میں نے غور سے لمبے آدمی کی طرف دیکھا۔ یہ اس کی آواز نہیں تھی۔ وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ لیے مجھے گھور رہا تھا پھر..... یہ آواز..... مگر یہ کیسے ممکن تھا، میں نے سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے کانوں کو دھوکا ہوا ہو..... مگر کانوں کا دھوکا اب آنکھوں دیکھی بن کر سامنے آ رہا تھا۔

جیسے ڈراموں میں اسٹیج پر سے نادیدہ ہاتھ آہستہ آہستہ پردہ سرکا دیتے ہیں اور ناظرین بدلتا منظر دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں بالکل اسی طرح وہ لمبا سا کھردرے چہرے والا شخص میرے سامنے سے ہٹتا جا رہا تھا اور اس کے پیچھے ستون سے ٹیک لگائے وہ کھڑا تھا۔

اسے دیکھ کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سر چکرانے لگا اور میرا دل میرے حلق تک آ گیا تھا۔ حیرت اور خوف کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین گھومنے لگی ہو۔

''کیوں.....؟ مجھے بھی نہیں پہچانتیں تم.....؟'' وہ پھر بولا۔ اس کے ہاتھ میں وہی سگار دبا ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی پیشانی پر میرے آخری وار سے ابھر آنے والا گومڑ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ٹرین والا موٹا ہی تھا اور مجھے خونیں نظروں سے گھور رہا تھا جیسے موقع ملتے ہی میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

''بولو..... جواب دو..... کچھ یاد آیا تمہیں؟'' وہ طنزیہ انداز میں ایک ایک لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا۔ ''آیا یاد کہ سب کچھ بھول گئیں..... تم کہاں سے کس کو کس حالت میں چھوڑ کر بھاگی تھیں؟'' وہ دو قدم چل کر میرے سامنے آ گیا۔ ''تم نے کیا سوچا تھا؟ بس کہانی ختم ہو گئی، تمہیں اپنے کیے کا کوئی حساب نہیں دینا پڑے گا؟ تم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے لڑکی جس کا تمہیں ساری عمر خمیازہ بھگتنا پڑے گا..... اگر تم زندہ رہیں.....''

''مگر آپ..... آپ یہاں کیسے پہنچے.....؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس ٹرین سے آؤں گی؟'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ہوں..... یہ کون سی مشکل بات تھی، پیسے لے کر بھاگنے والی بہر حال کسی نہ کسی ٹرین میں تو بیٹھتی ہی..... میں نے یہاں پہنچنے کے بعد باہر آتے ہی اپنے بندوں کو الرٹ کر دیا تھا..... یوں تو نہیں چھوڑ سکتا تھا تمہیں۔'' وہ سفاکی سے

بولا۔ ''جو میرے ساتھ ہاتھ کر جائے پھر وہ تو کمال کی چیز ہوئی نا..... تو ہم یہاں تمہارے استقبال کے لیے تیار تھے۔''

''آپ..... آپ مجھے معاف کر دیں پلیز۔'' میں گڑگڑائی۔ ''میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں..... میں آپ کے پیسے بھی واپس کر دوں گی۔''

''ارے پیسے سے زیادہ قیمتی تو تم ہو میرے لیے..... چلو اب شرافت سے باہر نکلو ورنہ یہ جو رفیق ہے نا..... یہ بس دیکھنے میں ہی انسان جیسا ہے۔'' وہ کھردرے چہرے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور غصے میں تو یہ بالکل ہی پاگل ہو جاتا ہے، پسند اسے چاقو ہے مگر ضرورت پڑ جائے تو یہ اپنی جیب میں رکھے پستول کو چلانے سے پہلے باہر نکالنے کی زحمت بھی نہیں کرتا۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولا۔

''نہیں..... میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' میں پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے مجھے مارنا ہی ڈالنا ہے تو یہیں مار دیجیے۔''

''تم نے صاب کی بات نہیں سنی؟'' رفیق شاید میرے حرکت کرنے کا ہی منتظر تھا، وہ بھی تیزی سے آگے آیا۔ موٹا اپنی جگہ پر کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔

''چلو۔'' رفیق نے میرا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو زور سے جھٹکتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اسے زوردار دھکا دیا اور پلٹ کر پوری طاقت سے پلیٹ فارم کی طرف دوڑی۔

اسے اس ساری گفتگو کے بعد مجھ سے اس انتہائی قدم کی ہرگز امید نہیں تھی۔ ان دونوں نے یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ ایک خوف زدہ اور تنہا لڑکی اس سب کے بعد یقیناً ڈھے جائے گی اور ہتھیار ڈال دے گی مگر قدرت نے بقول میری اماں کے میرے وجود میں ایک جنگجو روح کو اتارا تھا اور قدرت کے کام تو وہی بہتر جانتی ہے۔

آخری سانس تک جنگ کرنے کی یہ ہمت ہی میری اصل طاقت تھی۔ اگر میں حالات سے ہار ماننے والی ہوتی تو شاید اب تک گاؤں کے قبرستان میں بغیر نماز جنازہ کے دفن ہو چکی ہوتی اور میرے ماتھے پر ایک بدکردار لڑکی ہونے کا الزام ہمیشہ کے لیے چھپ گیا ہوتا۔ اس بے انتہا شدید دھچکے اور صدمے کے بعد کوئی اور مسئلہ یا تکلیف مجھے لمحوں کے لیے تو متاثر کر سکتا تھا مگر دل و دماغ کو اس طرح ماؤف نہیں کر سکتا تھا۔

میں تیزی سے پلیٹ فارم کے رش میں پہنچ گئی یہی میں چاہ رہی تھی۔ ایک بار ہجوم میں گھس کر غائب ہونا اس قدر مشکل نہیں تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے مجمع میں جگہ بنا رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے پیچھے ہوں گے اور اس سے بھی زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ انہوں نے اسٹیشن سے نکل کر باہر جانے کے راستوں پر نظر جمار کھی ہوگی۔

میں کیا کروں گی؟ کس طرح خود کو ان درندوں سے بچا پاؤں گی؟ اگر میں ان کی گرفت میں آ گئی تو وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے، یہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا..... اور یہاں تھا بھی کون جسے میری پروا ہوتی یا جو مجھے تلاش کرتا۔ میں اس اندھیری راہ میں گمنامی کی موت مر بھی جاتی تو شاید یہ خس کم جہاں پاک والا معاملہ ہوتا۔

میں سوچوں کے ازدحام میں پھنسی تیزی سے آگے بھاگ رہی تھی۔ تھکن اب میرے قدموں کو روک رہی تھی مگر رکنا، آرام کرپانا یا چین کی سانس لینا گویا میرے مقدر سے ہٹا دیا گیا تھا۔

''اے..... رکو.....'' پیچھے سے آنے والی للکار نئی قوت بن کر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہی ہوں بس میں کسی طرح ان کی پہنچ سے بچ نکلنا چاہتی تھی۔ چاروں طرف موجود لوگ اب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

یکلخت میں پوری قوت سے کسی چیز سے ٹکرا گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے..... تھکن، مایوسی، تکلیف، درد سب غالباً اسی کمزور لمحے کے منتظر تھے۔ سر پر لگنے والی چوٹ اتنی شدید تھی کہ پوری کوشش کے باوجود میں لڑکھڑا کر زمین پر جا گری۔ منظر لمحہ بہ لمحہ میری گم ہوتی بصارت کے ہاتھوں سے چھوٹ رہا تھا۔

میں بے بسی سے اپنے اردگرد چھاتے اندھیرے کو دیکھ رہی تھی۔

کیا یہ تاریکی مجھے نگل لے گی.....؟

میں اپنے پیچھے آنے والوں سے کیسے بچ پاؤں گی؟

کیا ہوگا..... اب کیا ہوگا.....؟ یہ سوال میری آخری سوچ بن کر میرے ذہن کی دیواروں سے ٹکرایا اور پھر خود فراموشی کی خاموشی میں غائب ہو گیا۔

بے بسی کے اندھیروں میں ڈوبتی لڑکی کی دردناک داستانِ حیات کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

جنون

اعتزاز سلیم وصلی

دوسرے کی خوشی میں خوش ہونا بھی ایک نیکی ہے... اس نیکی میں شامل ہونے میں بھی لوگ بخل سے کام لیتے ہیں... مغرب کی مادہ پرست تیز رفتار زندگی نے احساسات کو سُلا کے مشینی انداز میں ڈھال دیا ہے... وہ صرف اپنے بارے میں سوچنا... اور جینا پسند کرتے ہیں... اس خود پرستی نے انہیں بے درد... بے حس اور جنونی بنا دیا ہے۔ایک جنونی کا پاگل پن... جسے دوسروں کو خوش دیکھنا سخت ناپسند تھا....

معصوم و نازک پھولوں کے مانند بچوں کا دل دوز قصہ.....

پولیس کی گاڑی اُس کے گھر کے سامنے آکر رکی۔

''میتھیو..... گھر کے مالک کو باہر بلاؤ۔'' جورڈن نے اپنے ساتھی آفیسر کو اشارہ کیا۔ میتھیو گاڑی سے باہر نکل کر گھر کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے پچیس چھبیس سال عمر کا ایک نوجوان موجود تھا۔ خوب صورت نقوش کا مالک وہ شخص پولیس کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''کیا بات ہے آفیسر؟''

''آپ کے خلاف رپورٹ ہوئی ہے۔'' جورڈن نے

جواب دیا۔

''کیسی رپورٹ؟'' ابھی جورڈن نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اندر سے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی آئی۔

''کیا مسئلہ ہے؟ پولیس کیوں آئی ہے؟''

''ان کے خلاف رپورٹ ہوئی ہے۔'' جورڈن نے دوبارہ وضاحت کی۔ ''انہوں نے ایک بچے کو تھپڑ مارا ہے، اس کی ماں نے رپورٹ کی ہے۔''

''غلطی بچے کی تھی۔'' وہ شخص غرایا۔

''دیکھیں مسٹر سوشان..... تین چار سال کے بچے کی کیا غلطی ہوسکتی ہے؟'' میتھیو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہ اچانک میری گاڑی کے سامنے آگیا تھا۔''

''تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے تھپڑ ماردیں۔'' جورڈن نے گہری سانس لی۔ ''آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔'' پاس کھڑی پریت کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے سوشان کو دیکھا۔ وہ بھی پریشان دکھائی دیا۔

''جنوبی ایشیا کے لوگوں کو یہاں کے قوانین سمجھنے میں بہت دیر لگتی ہے۔'' میتھیو نے تبصرہ کیا۔ سوشان نے اس کی بات کو پسند نہیں کیا۔

''مسٹر آفیسر..... ہم یہیں جوان ہوئے ہیں، ہمیں قوانین کا اچھے سے پتا ہے، آپ اس طرح بات نہیں کرسکتے۔''

''میں معافی چاہتا ہوں، میرا مقصد آپ کے ممالک کی برائی نہیں۔'' میتھیو نے معذرت کی۔ کچھ دیر بعد وہ سوشان کو لے کر پولیس اسٹیشن چلے آئے۔ یہاں تھوڑی بحث کے بعد سوشان نے اپنا قصور مان لیا۔

کچھ دنوں بعد جب معاملہ ختم ہوا تب پریت نے سوشان کو سمجھایا۔ ''اپنے غصے کو قابو میں رکھا کریں..... بچے سب کے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھدار ہوتے ہیں۔ آپ کے بھی بچے ہیں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر اس کا غصہ کبھی بھی حد پار کر جاتا، پریت کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے بچوں پر بھی ہاتھ اٹھا دیتا تھا۔ سوشان سے اس کی شادی پسند کی تھی۔ اسے امید تھی وہ وقت کے ساتھ سنبھل جائے گا لیکن وقت گزرتا گیا اور سوشان کی طبیعت ویسی کی ویسی رہی۔ پریت ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ اسے خوش رکھ سکے۔ بچے بھی باپ سے لاڈ دکھاتے تھے مگر پھر بھی ہر مہینے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوجاتی جس سے سوشان کا موڈ بگڑ جاتا۔ شاید یہ سب ایسے ہی چلتا رہتا اگر وہ طوفان ان کی زندگی نہ بدل دیتا..... اخبارات میں خبریں پڑھتے ہوئے کئی ایسی خبریں نظروں کے سامنے سے گزرتی ہیں جن کو پڑھ کر ہمارا دل کانپ جاتا ہے لیکن اس تکلیف کو وہی محسوس کرسکتے ہیں جو ان خبروں کا حصہ ہوں، جن کی خبر لگی ہو..... سوشان اور پریت بھی اپنی زندگی کو مکمل سمجھتے تھے مگر قسمت جب وار کرتی ہے تب انسان کو اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔

☆☆☆

ٹورنٹو کے پڑوس میں موجود اس چھوٹے سے قصبے میں رفتہ رفتہ شام اپنے قدم جما رہی تھی۔ سورج کی روشنی اب تھک کر ختم ہونے کے قریب تھی۔ قصبے کے لوگ چھٹی کے بعد واپس اپنے گھر پہنچ چکے تھے۔ قصبے کے اکلوتے بار کی رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگان بنجامن نے بھی چند لمحے وہاں گاڑی روکی مگر کچھ سوچ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

''کورا انتظار کر رہی ہوگی۔'' وہ بڑبڑایا۔ اس نے بار میں رکنے کے بجائے گاڑی آگے بڑھالی۔ لوگان یارکویل میں کام کرتا تھا۔ یارکویل میں کام کرنے والے اکثر لوگوں کی طرح لوگان بھی کافی کما رہا تھا۔ اس کی بیوی کورا ایک پولیس آفیسر تھی۔ دونوں کی پسند کی شادی تھی۔

لوگان کیلیفورنیا سے آیا تھا۔ ٹورنٹو میں قدم رکھتے ہی اس نے ماضی کو بھول کر نئی زندگی کی شروعات کا فیصلہ کیا۔ وہ محنتی اور مستقل مزاج شخص تھا۔ یارکویل میں ہونے والی ایک چوری کی واردات کے سلسلے میں اس کی ملاقات کورا سے ہوئی۔ کورا نے اسے دیکھتے ہی پسند کرلیا۔ لوگان نرم مزاج اور خوب صورت شخصیت کا مالک شخص تھا۔ کورا اپنے فیصلے پر خوش تھی۔

ٹورنٹو کینیڈا ہی نہیں بلکہ دنیا کے چند محفوظ ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں آبادی زیادہ ہونے کے باوجود جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے کورا کی ڈیوٹی عام پولیس والوں کی طرح سخت نہیں تھی۔ لوگان جس نے اپنے ماضی کو بھلانے کے لیے اس شہر کا انتخاب کیا تھا، اپنے فیصلے پر بہت خوش تھا۔ ویرا کی پیدائش کے بعد ان کی زندگی مکمل ہوگئی۔ لوگان کو لگتا تھا جیسے کیلیفورنیا اس کے لیے جہنم اور ٹورنٹو زمینی جنت ہے۔

جیسے ہی اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی، آٹھ سال کی ویرا نے نعرہ لگایا۔ ''پاپا آگئے۔'' وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

''میری جان۔'' لوگان نے اسے بانہوں میں لے کر پیار کیا۔ ''ماما کہاں ہیں؟''

''کچن میں۔'' کورا نوکری کے ساتھ ساتھ اپنے گھریلو فرائض بھی پورے کرتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ پولیس اسٹیشن کے قریب شہر میں گھر لے مگر لوگان کو یہ چھوٹا سا قصبہ بہت پسند تھا۔ یہاں اکثر لوگ لوگان جیسے ہی تھے۔ یہ لوگ شام تک شہر میں کام کرتے اور شام ہوتے ہی اس پُرسکون علاقے میں لوٹ آتے تھے۔

''آ گئے آپ..... خوش آمدید۔'' اس نے جیسے ہی کچن میں قدم رکھا، ورا نی خوشگوار آواز سنائی دی۔ کورا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر لوگان نے اسے قریب کیا اور عملی طریقے سے اس کے خوش آمدید کا جواب دیا۔ ''کیا لیں گے؟''

''کولڈ ڈرنک..... کافی کا موڈ نہیں ہے۔'' دوپہر کی بارش کے بعد ڈھلتی شام کا موسم خوشگوار تھا۔ کورا نے اسے فریج سے کولڈ ڈرنک نکال دی۔ وہ کولڈ ڈرنک منہ سے لگائے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بیڈ پر ایک پرانا بیگ پڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگان چونکا۔ ''کورا۔'' اس نے پکارا۔

''ہاں۔'' اس کا جواب کچن سے آیا۔

''یہ بیگ کس نے نکالا ہے؟''

''ویرا صفائی کر رہی تھی پرانا سامان دیکھنے کی۔'' وہ کچن سے باہر آئی۔ اس نے لوگان کی آواز سے اندازہ لگایا کہ وہ غصے میں ہے۔

''میں نے منع کیا تھا کہ پرانے سامان کو باہر نہ نکالنا۔'' اس نے غصیلی نظروں سے کورا کی طرف دیکھا۔ کورا نے سر جھکا دیا۔ ''آئندہ میرے سامان کو کوئی ہاتھ نہ لگائے..... نہ ویرا..... نہ تم۔'' اسے شرمندگی سے سر جھکاتے دیکھ کر لوگان کا لہجہ نرم ہو گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

زندگی کے کئی سال لوگان کے ساتھ گزارنے کے باوجود وہ کبھی کبھی اسے بالکل اجنبی لگتا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ شادی سے پہلے لیا گیا لوگان کا وعدہ تھا۔ کورا اس وعدے پر قائم تھی..... وعدے کے مطابق اس نے کبھی لوگان سے اس کے ماضی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ کورا کو اندازہ تھا کہ کیلیفورنیا میں گزرا وقت لوگان کے لیے ہرگز خوشگوار نہیں۔ ماضی کی وجہ سے خود میں بھری تلخی کے باوجود لوگان نے ماضی کی نشانیوں پر مشتمل کچھ پرانا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس میں ایک بیگ شامل تھا..... چند کتابیں، چند تصویریں۔ کورا نے کبھی اس سامان کی تلاشی نہیں لی۔ وہ لوگان کی غیر موجودگی میں بھی اس سامان کی حفاظت کرتی تھی۔ آج ویرا کی ضد کی وجہ سے اس نے غلطی کر دی۔

کھانا کھاتے ہوئے لوگان نے اس سے اپنے سخت رویے کی معذرت کی جس کے جواب میں وہ مسکرا دی۔

''غلطی میری تھی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' لوگان نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

پریت کور اور سوشان سنگھ نے جب اس قصبے میں گھر خریدا تو دونوں بہت خوش تھے۔ سوشان کا کاروبار خوب چل رہا تھا اور پریت بھی نوکری کر رہی تھی۔ شادی کے دو سال بعد ان کے گھر بانی پیدا ہوئی۔ وہ بہت خوب صورت بچی تھی۔ بانی کے دو سال بعد مناو سنگھ کی پیدائش نے ان کا گھر مکمل کر دیا۔ پریت اور سوشان دونوں انڈیا سے تھے۔ ان دونوں کے خاندان انڈیا سے کینیڈا شفٹ ہوئے تھے۔ دونوں نے تعلیم ٹورنٹو یونیورسٹی میں مکمل کی۔ ان کی پسند کی شادی تھی۔ پریت اور سوشان کی پسند ناپسند ایک جیسی تھی۔ اس لیے سوشان نے جب خاندان سے الگ ہو کر اس قصبے میں گھر لینے کا فیصلہ کیا تو پریت بہت خوش ہوئی۔

بانی نے اسکول جانا شروع کیا تو پریت نے نوکری چھوڑ دی۔ اس کے خیال میں اب اس کے بچوں کو ماں کی زیادہ ضرورت تھی۔ آٹھ سال کی بانی اور چھ سال کا مناو ان کے گھر کی رونق تھے۔ ان کی اس جنت جیسی دنیا میں ایک دن ایک شیطان آ گیا۔

بانی گھر سے باہر کھیل رہی تھی۔ پریت نے اسے اندھیرا ہونے سے پہلے گھر واپس آنے کا کہا تھا۔ بانی اچھی بچی تھی اس لیے پریت اس کی طرف سے بے فکر ہو کر گھر کا کام کر رہی تھی کہ اچانک اسے خیال آیا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اس نے دیکھا..... مناو ٹی وی دیکھ رہا تھا مگر بانی وہاں نہیں تھی۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔

''مناو..... بانی کہاں ہے؟''

''باہر ہے۔'' مناو نے نظریں گھمائے بغیر جواب دیا۔ پریت تیز قدم اٹھاتی گیٹ سے باہر نکلی۔ بانی اور اس کی دوست وہاں موجود نہیں تھیں۔ وہ تیزی سے سامنے والے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ گھنٹی کے جواب میں الزبتھ کا چہرہ دکھائی دیا۔

''ہائے پریت..... کیسے آنا ہوا؟'' اس نے پریت کی طرف دیکھ کر خوشگوار لہجے میں کہا۔

''بانی آپ کے گھر ہے؟''

''نہیں۔'' پریت کا دل ڈوب گیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں اس نے آس پاس کے سارے گھر دیکھ لیے مگر بانی غائب تھی۔ تھک ہار کر اس نے سوشان کو کال کر کے صورتِ حال بتائی۔

''تم گھبراؤ مت..... پولیس کو کال کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' اس نے تسلی دی۔ پولیس کو کال کرنے کے بعد وہ واپس گھر آ گئی۔ ٹھیک دس منٹ بعد پولیس کی گاڑی دکھائی دی۔ پریت نے گیٹ کھولا تو سامنے ایک چالیس سال کے آس پاس عمر کا شخص کھڑا تھا۔

''میں ڈیوک ہوں..... پولیس آفیسر۔'' اس نے کارڈ دکھایا۔ ''مس پریت..... مجھے تفصیل بتائیں۔'' پریت نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات اسے بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد پولیس پارٹی اور قصبے کے کچھ جوان بانی کو تلاش کر رہے تھے۔ پریت اور سوشان بھی پولیس کی مدد کر رہے تھے۔

''سوشان..... اگر بانی نہ ملی تو.....'' پریت کی آواز میں مایوسی تھی۔ ''میں مر جاؤں گی۔''

''ہم اپنی بیٹی کو ضرور ڈھونڈ لیں گے۔'' سوشان نے اسے تسلی دی مگر اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ یہ ایک ماں کا دل تھا جو بیٹی کو صحیح سلامت دیکھے بغیر مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔

اس رات سوشان اور پریت کے علاوہ بہت سے لوگ جاگتے رہے۔ قصبے میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ یہ قصبہ شہر کے بالکل پاس تھا اس لیے یہاں بھی شہر کی طرح امن و سکون تھا مگر آج ایک بچی غائب ہو چکی تھی اور اس کا کوئی نشان نہیں مل رہا تھا۔

اگلی صبح ڈیوک، پریت اور سوشان کے سامنے بیٹھا انہیں ایک تصویر دکھا رہا تھا۔ تصویر میں بانی دکھائی دے رہی تھی اور ایک نامعلوم شخص اسے پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ یہ تصویر سیکیورٹی کیمرے سے بنائی گئی ویڈیو سے حاصل کی گئی تھی۔ ویڈیو اور تصویر میں موجود شخص نے سر پر ٹوپی پہن رکھی تھی اور اس کا منہ چھپا ہوا تھا۔

''آپ لوگ اسے پہچان سکتے ہیں؟'' ڈیوک کے سوال کے جواب میں دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میری بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے، کیا چاہتا ہے..... وہ ہم سے؟'' پریت نے خود سے پوچھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ ڈیوک کے کانوں تک پہنچ گئی۔

''امید کرتے ہیں یہ اغوا برائے تاوان کا کیس ہو۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''کیا مطلب؟'' سوشان نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مجھے کافی سال ہو گئے ہیں پولیس میں..... اگرچہ ٹورنٹو میں ایسے کیس کم ہیں مگر.....'' اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''مگر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ شخص اسے کسی اور نیت سے کھینچ رہا ہے..... یہ اغوا برائے تاوان کا کیس نہیں ہے، میرے الفاظ ذرا تلخ ہیں مگر یہ سچ ہے..... صرف میرا ہی نہیں بلکہ ساتھی آفیسرز کا بھی یہی اندازہ ہے۔'' وہ حقیقت بتانے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

''جنسی زیادتی۔'' سوشان کے الفاظ پریت کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوئے۔

''یہ..... یہ نہیں ہو سکتا..... یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں..... میں نہیں مانتی..... بانی.....'' وہ باہر بھاگی۔ سوشان نے اسے پکڑا۔

''خود کو سنبھالو پریت۔'' اس نے پریت کو پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا۔

''سوشان..... میری پریت کو واپس لاؤ۔''

''ہم ضرور اسے واپس لائیں گے۔'' سوشان نے اس کا ماتھا چوما۔ پریت کو تسلی دے کر وہ خاموش ہو گیا مگر اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ ڈیوک ان دونوں کو تسلی دے کر باہر آ گیا۔

☆☆☆

وہ سب بُری خبر کے لیے تیار تھے مگر دل میں ایک امید تھی۔ تین دن گزر گئے مگر بانی کا کچھ پتا نہ چلا۔ پریت کو لگتا تھا اس کی دنیا ختم ہو چکی ہے اور اس کی زندگی تب ہی شروع ہو گی جب بانی کہیں سے بھاگتے ہوئے آئے گی اور اس سے لپٹ جائے گی۔ سوشان پریت کی وجہ سے خود کو سنبھال رہا تھا مگر اس کے دل کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔ وہ اسے کھانا کھلانے کی کوشش کرتا مگر اس کوشش میں اسے اکثر ناکامی ہوتی تھی۔ ان تین دنوں میں اس کے حلق سے پانی کے چند گھونٹ ہی اترے تھے۔ چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ فون کی گھنٹی بجتی یا گیٹ کی..... ہر مرتبہ وہ چونک جاتی۔ دل میں امید، آنکھوں میں خوف لیے وہ ہر خبر کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

ٹورنٹو پولیس اور قصبے کے کئی نوجوان بانی کو مسلسل تلاش کر رہے تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے اسے زمین نگل گئی ہے یا آسمان کھا گیا ہے۔ ڈیوک اور آفیسر کورا روز ہی ان کے گھر

آتے تھے۔ انہیں یقین تھا بانی کو اغوا کرنے والے کا تعلق اسی قصبے سے ہے۔

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ پریت، سوشان کی گود میں سر رکھ کر رو رہی تھی۔ ''سوشان..... میری بیٹی ٹھیک تو ہوگی؟''

''اچھے کی امید رکھو پریت۔''

''آپ نے مام ڈیڈ کو اطلاع دی؟''

''نہیں..... وہ پریشان ہوں گے.....'' سوشان نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیا۔

''مجھے لگتا ہے..... بانی آجائے گی..... گیٹ کھولے گی اور مما کہہ کر بھاگتی ہوئی مجھ سے لپٹ جائے گی۔'' اس کی باتیں سن کر سوشان کو اپنا دل ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا محسوس ہوا۔

''پریت..... خود کو سنبھالو یار..... تم تو میرا حوصلہ ہو۔ پورے خاندان سے الگ ہو کر تمہارے سہارے ایک خوشگوار زندگی گزار رہا تھا..... تم ہمت ہار رہی ہو۔''

''بانی.....'' اس کے منہ سے بس ایک نام نکلا تھا۔ فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ پریت نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دماغ میں کئی خیالات ایک ساتھ اُبھرے۔ اس نے سوشان کی طرف دیکھا۔ سوشان اس کا ہاتھ تھپتھپا کر کھڑا ہوا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری طرف سے آفیسر ڈیوک بول رہا تھا۔ اس کے الفاظ ان سب کے بدترین خدشات کی تصدیق کر رہے تھے۔

''مسٹر سوشان..... مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے اطلاع دیتے ہوئے مگر ہماری مجبوری ہے..... آپ کی بیٹی کی لاش ملی ہے.....'' اس کے بعد ڈیوک نے کیا کہا..... سوشان کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ وہ شاید اسے جگہ کی تفصیل بتا رہا تھا۔ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ پریت نے اس پر نظریں جما رکھی تھیں..... ان نظروں میں سب کچھ تھا..... خوف، امید..... مگر سوشان کے تاثرات دیکھ کر امید کی روشنی ختم ہوگئی۔ پریت کے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ بھاگ کر سوشان سے لپٹ گئی۔

''بانی۔'' وہ بار بار بیٹی کا نام پکار رہی تھی مگر بانی اب کبھی واپس نہیں آسکتی تھی۔ پریت، سوشان کی بانہوں میں جھول گئی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پریت کی حالت کچھ سنبھل گئی مگر سوشان اور اس کا دماغ یہ صدمہ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بانی کی لاش ایک بیگ میں ملی تھی۔ لاش کی حالت ایسی ہرگز نہ تھی کہ کوئی نرم دل کا مالک شخص اسے دیکھ سکتا۔ اس کی لاش کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ایک بڑے بیگ میں رکھا گیا تھا۔ یہ بیگ اسی قصبے سے کچھ دور ملا تھا۔ ٹورنٹو کے اخبارات اور ٹی وی چینلز پر بانی کے قتل اور قتل کے طریقے کے متعلق مسلسل خبریں آرہی تھیں۔ سکیورٹی کیمرے سے حاصل کی گئی ویڈیو ہر جگہ دکھائی دے رہی تھی جس میں بانی کو ایک نامعلوم شخص گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ اس شخص کے جسم کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ قاتل نے لاش کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے بعد مکمل دھو کر بیگ میں رکھا تھا۔ لاش کے پاس سے کوئی نشان نہ ملا۔

قصبے میں خوف کی شام نے ڈیرے ڈال لیے۔ لوگ اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ایک ہفتے بعد پولیس چیف نے انہیں مکمل سکیورٹی کی تسلی دی تب جا کر بچوں کو اسکول بھیجا گیا۔ پولیس پر سخت دباؤ تھا۔ کورا اور ڈیوک مسلسل کیس کی تفتیش کر رہے تھے۔ اس دن بھی وہ سوشان کے سامنے بیٹھے تھے۔

''مسٹر سوشان..... ایک سوال ہے۔'' کورا نے اس کے چہرے پر نظریں دوڑائیں۔ ''کیا آپ کی بیوی پریت کو کوئی اور شخص بھی پسند کرتا تھا شادی سے پہلے؟''

''نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اصل میں ہم مختلف تھیوریز پر کام کر رہے ہیں۔'' ڈیوک نے وضاحت کی۔ ''اس طرح کے جرائم کا اگر مطالعہ کریں تو یا والدین کے کسی جرم کا نشانہ اولاد بنتی ہے یا پھر کوئی سیریل کلر..... یا پھر بچوں کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے والا کوئی شخص ایسا جرم کر سکتا ہے۔''

''بانی کے کیس میں ان تین میں سے کونسی تھیوری سچ لگتی ہے؟'' سوشان نے پوچھا۔

''ابھی تک ہم کسی ایک پر بھی یقین نہیں کر سکتے..... اس طرح قتل کرنے والا سیریل کلر کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ کسی جنسی دیوانے کا کام لگتا ہے..... اور یہ شخص اگر بچ گیا تو رکے گا نہیں۔'' کورا نے یقین سے کہا۔ سوشان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس سے ملاقات کے بعد کورا اور ڈیوک باہر آگئے۔

پندرہ منٹ بعد ان کے سامنے الزبتھ کا بیٹا جارج بیٹھا تھا۔ جارج کی عمر دس سال تھی۔ الزبتھ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جارج اس کے سابقہ بوائے فرینڈ کا بیٹا تھا۔ الزبتھ اور پریت آپس میں دوست تھیں جبکہ بانی اور جارج اکثر ساتھ کھیلتے تھے۔ الزبتھ پولیس ہیڈکوارٹر ڈروم میں نوکری کرتی تھی۔

کورا اور الزبتھ کی اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر زیادہ بات چیت نہ تھی۔

''کیسے ہو بوائے؟'' کورا نے خوشگوار انداز میں بات کا آغاز کیا۔

''میں ٹھیک۔'' جارج نے مختصر جواب دیا۔

''بانی تمہاری اچھی دوست تھی۔''

''ہاں۔''

''تم جب آخری بار ملے تھے اس سے، تب وہ کتنی دیر تمہارے ساتھ رہی تھی؟'' اس بار ڈیوک نے سوال کیا۔

''ہم بس تھوڑی دیر کھیلتے رہے تھے پھر مما نے مجھے گھر بلالیا اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔'' جارج نے جواب دیا۔ ڈیوک اور کورا نے اس سے کئی سوالات کیے مگر اس سے زیادہ وہ نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

ٹورنٹو پولیس اسٹیشن میں بانی کے کیس پر مسلسل بحث ہو رہی تھی۔ یہاں ماہرین کی ایک ٹیم موجود تھی۔ اس کے علاوہ ریٹائرڈ پولیس آفیسرز اور ماہر نفسیات کے علاوہ ایک پیتھالوجسٹ بھی موجود تھا۔ کورا، ڈیوک اور الزبتھ بھی وہیں موجود تھے۔ پولیس چیف جیک براؤن سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔

''میرا خیال ہے قاتل قصبے کا ہی کوئی بندہ ہے۔'' ایک ماہر نے خیال ظاہر کیا۔ ''اس قصبے میں کوئی شخص..... باہر سے آکر ایک لڑکی کو اغوا کرکے، قتل کردے اور پھر لاش بھی اسی قصبے کے قریب پھینکے، یہ ممکن نہیں۔''

''اس کے علاوہ قاتل اکیلا رہتا ہے گھر میں.....'' ماہرِ نفسیات نے رائے دی۔ ''وہ یا تو دماغی بیماری کا شکار ہے یا پھر..... بچپن میں اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آچکا ہے اسی طرح کا۔'' اس بات پر ایک بار پھر بحث شروع ہوگئی۔ جیک براؤن تھک گیا۔ اس نے کورا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو کافی دیر سے بحث سن رہی تھی۔ جیک نے سب کو خاموش ہونے کا کہا اور اسے بولنے کا اشارہ کیا۔

''میرا خیال سر..... یہ ضروری نہیں کہ ہم قاتل کی شخصیت یا اس کے ماضی کو کھنگالنے کی کوشش کریں۔ ضروری یہ ہے کہ ہم دیکھیں اس نے کتنی صفائی سے قتل کیا ہے۔ اس نے لاش کے تمام حصوں کو مختلف ایسڈز سے دھویا ہے تاکہ کوئی نشان نہ رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس کا پہلا قتل ہے۔''

''کیسے کہہ سکتی ہو تم؟'' چیف نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''سر..... مجرم خوف زدہ تھا کہ پکڑا نہ جائے اس لیے اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ عادی مجرم..... سیریل کلر، ایک یا دو لوگوں کو قتل کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی نشان چھوڑتے ہیں..... وہ ذہنی طور پر اپنی ذہانت کو خود ہی تسلیم کرکے اگلے قتل میں اتنی احتیاط نہیں کرتے جتنی پہلے قتل میں کرتے ہیں۔ یہ شخص جو بھی ہے، یہ عادی مجرم نہیں، اس نے پوری احتیاط کی ہے اس لیے اسے پکڑنا مشکل ہے۔ اگلی بات..... اس نے اپنا جسم مکمل چھپا رکھا ہے کیمروں کے سامنے..... اور پھر ایک بات اور..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ ثابت کرتی ہے کہ بانی کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے مگر جنسی زیادتی کا نہیں، اس کے جسم کے مخصوص حصوں پر نشان موجود ہیں لیکن ریپ ثابت نہیں ہوا۔ یہ بھی مجرم کی احتیاطی تدبیر تھی جو اس نے ڈی این اے ٹیسٹ سے بچنے کے لیے کی۔'' سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ایک طرف آپ کا پوائنٹ ہے کہ اس نے پہلا قتل کیا ہے۔ دوسری طرف آپ کہہ رہی ہیں، اس نے ڈی این اے سے بچنے کے لیے احتیاط کی ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ ہمارے پاس پورے علاقے کا ڈی این اے سیمپل نہیں ہوتا بس مجرموں کا ہوتا ہے یا قاتلوں کا۔'' پیتھالوجسٹ نے اعتراض کیا۔

''یہی بات ثابت کرتی ہے کہ مجرم قصبے سے ہی تعلق رکھتا ہے..... کیونکہ ہم قانون کو استعمال کیے بغیر عوام سے درخواست کر سکتے ہیں کہ اپنے ڈی این اے سیمپل ہمیں دیں..... عوام اس تفتیش میں ہماری مدد کر رہی ہے اور قصبے کے چند سو لوگ ضرور جمع کروا دیتے..... یہ بات مجرم کے دماغ میں بھی تھی..... کہ اگر وہ کوئی ایسا نشان چھوڑتا ہے تو پولیس ضرور ڈی این اے ٹیسٹ کرے گی اور اس تک پہنچ جائے گی کیونکہ تمام لوگوں میں بس وہی ہوگا جو پولیس کی تفتیش روکنے کے لیے ڈی این اے سیمپل جمع نہیں کروائے گا اور مشکوک ہوجائے گا۔'' اس بار کورا کا پوائنٹ سب نے سمجھ لیا۔

''تو تم اب کیا چاہتی ہو؟ اس کیس میں اب پولیس کیا کرسکتی ہے؟''

''ہمارے پاس ایک راستہ موجود ہے۔'' کورا نے ڈیوک کی طرف دیکھا جو ابھی تک خاموش تھا۔ اس کا اشارہ سمجھ کر اس نے اپنا منصوبہ بتانا شروع کیا۔

''قصبے کے چند سو لوگوں کا ریکارڈ حاصل کریں

گے..... جو ماضی میں مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں ان کی لسٹ بنا کر نگرانی کی جائے گی۔ اگلی بات..... تفتیش کے عمل کو ظاہری طور پر روک دیں گے اور اعلان کریں گے کہ بانی قتل کیس میں چند لوگوں پر شک کیا جارہا ہے جن کا نام فی الحال خفیہ رکھا جائے گا۔ یوں مجرم تفتیش کے عمل سے کچھ مطمئن ہوگا کیونکہ ظاہر ہے اب تک جتنے لوگوں سے ہم نے بات کی ہے..... ان میں کوئی قاتل نہیں ہوسکتا اور قاتل اس بات سے خوش ہوگا کہ اس پر کوئی شک نہیں کررہا۔'' ڈیوک نے مزید چند تجاویز پیش کیں جن پر بات کر کے تمام پولیس افسران کو ہدایت دی گئی۔

''الزبتھ، تم سارا ریکارڈ نکال کر ڈیوک اور کورا کو دو گی۔'' جیک نے الزبتھ کو ہدایت دی۔ ''ڈیوک اور کورا..... اس کیس پر پوری محنت سے کام کرو..... ورنہ پورا علاقہ خطرے میں ہے۔'' ان دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کورا شام کو واپس گھر آئی تو لوگان ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ویرا اس کے پاس بیٹھی لیپ ٹاپ پر کچھ دیکھنے میں مصروف تھی۔ لوگان نے کورا کو خوش آمدید کہا اور اس کے لیے فریج سے پانی نکال کر لایا۔ اس نے مسکرا کر شوہر کا شکریہ ادا کیا۔ ٹی وی پر بانی کے قتل کیس کی خبر چل رہی تھی۔

''کیا بنا اس کیس کا؟'' لوگان نے پوچھا۔

''فی الحال تو ہم بے بس ہیں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''قاتل بہت چالاک ہے..... مجھے بانی میں اپنی ویرا کی جھلک دکھائی دی ہے۔'' کورا گھر میں پولیس آفیسر نہیں تھی۔ یہاں وہ ایک محبت کرنے والی ماں تھی جو بہت نرم دل کی مالکن تھی۔ لوگان نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔

''ویرا محفوظ رہے گی..... قاتل پکڑا جائے گا۔'' اس نے تسلی دی مگر کورا جانتی تھی کہ یہ کیس حل کرنا بہت مشکل ہے۔ ''پولیس کیا کرے گی اب؟''

''پورے قصبے میں موجود سب لوگوں کا ریکارڈ چیک ہورہا ہے..... مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے افراد کی لسٹ بنے گی..... ان کی نگرانی کی جائے گی اور کچھ سے پوچھ گچھ بھی ہوگی خاص طور پر بچوں کے جرائم میں ملوث افراد سے۔'' اس نے جواب دیا۔ اس نے لوگان کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں گم دکھائی دیا۔ وہ اٹھ کر کچن میں آگئی۔ کھانا کھانے کے دوران بھی لوگان خیالوں میں گم دکھائی دیا۔

☆☆☆

کورا نے لسٹ دیکھی۔ اس میں دس لوگوں کے نام

نے ڈیوک سے پوچھا۔

''گیارہ ہی ہیں..... دس یہ اور گیارھویں بندے کا ریکارڈ ابھی ہم نے کیلیفورنیا سے منگوایا ہے مگر اس کا نام الگ لکھا ہے۔'' ڈیوک نے گہری سانس لی۔ ''کورا..... تمہیں یہ حوصلے سے سننا ہوگا۔'' کورا نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔

''کیا بات ہے ڈیوک؟''

''لوگان کا نام چیف نے الگ رکھنے کا کہا ہے۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''کیلیفورنیا میں آج سے کافی سال پہلے تین بچوں کو زیادتی کرنے کے بعد قتل کیا گیا تھا..... وہ لوگان کے بھائی کے بچے تھے۔'' اس نے انکشاف کیا۔ کورا کو محسوس ہوا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہے۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''لوگان اس وقت مشکوک لوگوں کی لسٹ میں تھا بلکہ اس لسٹ میں پہلا نمبر ہی اسی کا تھا..... جرم ثابت نہیں ہوا..... وہ کیس ابھی تک حل نہیں ہوا۔ لوگان نے اس کیس کے ایک سال بعد کیلیفورنیا چھوڑ دیا تھا اور یہاں آگیا۔''

''ڈیوک..... لوگان نہیں کرسکتا ایسا۔'' کورا نے ڈیوک سے زیادہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''وہ بہت نرم دل کا مالک ہے۔''

''سوری کورا..... مگر یہ سچ ہے کہ اس وقت وہی ہے جس پر سب سے زیادہ شک کیا جاسکتا ہے۔'' اس کے لہجے میں افسوس تھا۔ بات تلخ مگر سچ تھی۔ ''چیف نے اس کیس کی تفتیش کا حکم مجھے دیا ہے۔ میرے ساتھ الینا کام کرے گی.....'' اس نے ایک اور خبر سنائی۔

''لوگان کو تفتیش کے لیے بلایا گیا ہے؟''

''ہاں مگر.....''

''مگر کیا۔''

''وہ غائب ہے..... یارکویل میں پولیس گئی تھی مگر وہ وہاں نہیں ملا..... گھر بھی نہیں ہے، تمہیں کچھ علم ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں گھر جارہی ہوں اگر وہاں آیا تو میں گرفتار کرلوں گی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا اور باہر چل دی۔ اس کے دماغ میں مختلف خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی مگر دماغ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے لگا وہ دنیا کی احمق ترین عورت ہے جو ایک اجنبی کے ساتھ کئی سالوں سے زندگی گزار رہی ہے۔ کار چلاتے

گے..... جو ماضی میں مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں ان کی لسٹ بنا کر نگرانی کی جائے گی۔ اگلی بات..... تفتیش کے عمل کو ظاہری طور پر روک دیں گے اور اعلان کریں گے کہ بانی قتل کیس میں چند لوگوں پر شک کیا جارہا ہے جن کا نام فی الحال خفیہ رکھا جائے گا۔ یوں مجرم تفتیش کے عمل سے کچھ مطمئن ہوگا کیونکہ ظاہر ہے اب تک جتنے لوگوں سے ہم نے بات کی ہے..... ان میں کوئی قاتل نہیں ہوسکتا اور قاتل اس بات سے خوش ہوگا کہ اس پر کوئی شک نہیں کررہا۔'' ڈیوک نے مزید چند تجاویز پیش کیں جن پر بات کر کے تمام پولیس افسران کو ہدایت دی گئی۔

''الزبتھ، تم سارا ریکارڈ نکال کر ڈیوک اور کورا کو دو گی۔'' جیک نے الزبتھ کو ہدایت دی۔ ''ڈیوک اور کورا..... اس کیس پر پوری محنت سے کام کرو..... ورنہ پورا علاقہ خطرے میں ہے۔'' ان دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کورا شام کو واپس گھر آئی تو لوگان ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ ویرا اُس کے پاس بیٹھی لیپ ٹاپ پر کچھ دیکھنے میں مصروف تھی۔ لوگان نے کورا کو خوش آمدید کہا اور اس کے لیے فریج سے پانی نکال کر لایا۔ اس نے مسکرا کر شوہر کا شکریہ ادا کیا۔ ٹی وی پر بانی کے قتل کیس کی خبر چل رہی تھی۔

''کیا بنا اس کیس کا؟'' لوگان نے پوچھا۔

''فی الحال تو ہم بے بس ہیں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''قاتل بہت چالاک ہے..... مجھے بانی میں اپنی ویرا کی جھلک دکھائی دی ہے۔'' کورا گھر میں پولیس آفیسر نہیں تھی۔ یہاں وہ ایک محبت کرنے والی ماں تھی جو بہت نرم دل کی مالکن تھی۔ لوگان نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔

''ویرا محفوظ رہے گی..... قاتل پکڑا جائے گا۔'' اس نے تسلی دی مگر کورا جانتی تھی کہ یہ کیس حل کرنا بہت مشکل ہے۔ ''پولیس کیا کرے گی اب؟''

''پورے قصبے میں موجود سب لوگوں کا ریکارڈ چیک ہورہا ہے..... مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے افراد کی لسٹ بنے گی..... ان کی نگرانی کی جائے گی اور کچھ سے پوچھ گچھ بھی ہوگی خاص طور پر بچوں کے جرائم میں ملوث افراد سے۔'' اس نے جواب دیا۔ اس نے لوگان کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ کسی سوچ میں گم دکھائی دیا۔ وہ اٹھ کر کچن میں آگئی۔ کھانا کھانے کے دوران بھی لوگان خیالوں میں گم دکھائی دیا۔

☆☆☆

کورا نے لسٹ دیکھی۔ اس میں دس لوگوں کے نام تھے۔ ''کل تو تم بتا رہے تھے کہ گیارہ بندے ہیں۔'' اس نے ڈیوک سے پوچھا۔

''گیارہ ہی ہیں..... دس یہ اور گیارھویں بندے کا ریکارڈ ابھی ہم نے کیلیفورنیا سے منگوایا ہے مگر اس کا نام الگ لکھا ہے۔'' ڈیوک نے گہری سانس لی۔ ''کورا..... تمہیں یہ حوصلے سے سننا ہوگا۔'' کورا نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔

''کیا بات ہے ڈیوک؟''

''لوگان کا نام چیف نے الگ رکھنے کا کہا ہے۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''کیلیفورنیا میں آج سے کافی سال پہلے تین بچوں کو زیادتی کرنے کے بعد قتل کیا گیا تھا..... وہ لوگان کے بھائی کے بچے تھے۔'' اس نے انکشاف کیا۔ کورا کو محسوس ہوا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہے۔ اس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''لوگان اس وقت مشکوک لوگوں کی لسٹ میں تھا بلکہ اس لسٹ میں پہلا نمبر ہی اسی کا تھا..... جرم ثابت نہیں ہوا..... وہ کیس ابھی تک حل نہیں ہوا۔ لوگان نے اس کیس کے ایک سال بعد کیلیفورنیا چھوڑ دیا تھا اور یہاں آگیا۔''

''ڈیوک..... لوگان نہیں کرسکتا ایسا۔'' کورا نے ڈیوک سے زیادہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''وہ بہت نرم دل کا مالک ہے۔''

''سوری کورا..... مگر یہ سچ ہے کہ اس وقت وہی ہے جس پر سب سے زیادہ شک کیا جاسکتا ہے.....'' اس کے لہجے میں افسوس تھا۔ بات تلخ مگر سچ تھی۔ ''چیف نے اس کیس کی تفتیش کا حکم مجھے دیا ہے۔ میرے ساتھ الینا کام کرے گی.....'' اس نے ایک اور خبر سنائی۔

''لوگان کو تفتیش کے لیے بلایا گیا ہے؟''

''ہاں مگر.....''

''مگر کیا۔''

''وہ غائب ہے..... یارکویل میں پولیس گئی تھی مگر وہ وہاں نہیں ملا..... گھر بھی نہیں ہے، تمہیں کچھ علم ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں گھر جارہی ہوں اگر وہاں آیا تو میں گرفتار کرلوں گی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا اور باہر چل دی۔ اس کے دماغ میں مختلف خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کررہی تھی مگر دماغ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے لگا وہ دنیا کی احمق ترین عورت ہے جو ایک اجنبی کے ساتھ کئی سالوں سے زندگی گزار رہی ہے۔ کار چلاتے ہوئے اس کے دماغ میں ویرا کا خیال آیا۔ اسے لگا کسی نے

اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی ہے۔ اس کی سانس بند ہونے لگی۔ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے اس نے خود کو حوصلہ دینے کی ناکام کوشش کی۔ ویرا کو اسکول سے لینا اس کی ذمے داری تھی مگر جن دنوں وہ مصروف ہوتی، ان دنوں میں لوگان ویرا کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

کورا کی گاڑی اسکول کے سامنے رکی۔ چھٹی کے بعد بچے جا چکے تھے۔ اسکول خالی پڑا تھا۔ کورا گاڑی گھما کر دوسری سڑک پر لے آئی اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ گھر بھی خالی پڑا تھا۔ کورا نے آنکھ میں آئے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کی..... اس نے موبائل نکال کر ڈیوک کو کال ملائی۔ دوسری طرف سے اس کی آواز سنائی دیتے ہی اس نے روتے ہوئے کہا۔

''ڈیوک..... ویرا غائب ہے..... لوگان بھی.....''

اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

''میں آرہا ہوں۔'' کال کٹ گئی۔ پولیس کے آنے سے پہلے اس نے لوگان کا وہ سامان دیکھا جو وہ ہمیشہ حفاظت سے رکھتا تھا۔ اس میں بچوں کی تصویریں تھیں۔ یہ شاید اس کے بھائی کے بچے تھے۔ تصویریں خوفناک تھیں..... ٹھیک دس منٹ بعد پولیس کی گاڑی ان کے گھر کے سامنے آکر رکی۔ کورا بھاگتی ہوئی باہر نکلی اور ڈیوک سے لپٹ گئی۔

''وہ میری بیٹی کو لے گیا ہے۔''

''ہم ڈھونڈ لیں گے اُسے۔'' اس نے کورا کا گال تھپتھپایا اور گھر میں داخل ہوا۔ ایک گھنٹے میں پولیس نے پورے قصبے میں موجود سیکیورٹی کیمروں کی ریکارڈنگ حاصل کی..... بانی کی طرح ویرا بھی بغیر کوئی نشان چھوڑے غائب ہوئی تھی۔ پولیس کی مسلسل کوششوں کے باوجود اس کا کہیں پتا نہ چل سکا۔ کورا کو محسوس ہوا جیسے ایک دن میں ہی اس کی دنیا ختم ہوچکی ہے۔

''لوگان..... اگر میری بیٹی کو کچھ ہوا تو میں تمہارے جسم کے ٹکڑے کردوں گی۔'' وہ بڑبڑائی۔ اگلی صبح اخبارات میں ویرا اور لوگان کی تصاویر شائع ہوئی تھیں۔ ٹی وی پر مسلسل ان دونوں کے چہرے دکھائے جارہے تھے۔ ٹورنٹو پولیس شدید دباؤ میں تھی۔ ایک ایسا شہر جس کی مثالیں دی جاتی تھیں، اس شہر میں دو بچیاں اغوا ہوچکی تھیں جن میں ایک کو خوفناک طریقے سے قتل کیا گیا تھا.....

☆☆☆

لوگان کے دماغ میں فلم چل رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے تین لاشیں تھیں..... اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ آنکھ کھلنے کے بعد یہ منظر غائب ہوجانا تھا مگر نہیں ہوا۔ اس نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ دوسرے منظر میں اس کی طرف ایک میڈیا رپورٹر بھاگ رہا تھا۔ ''کیوں قتل کیا آپ نے بچوں کو؟'' منظر نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔ ایک پولیس آفیسر اس پر جھکا ہوا تھا.....

''مسٹر لوگان..... سچ بتا دیں تو آپ کو بہت کم سزا ملے گی۔'' وہ اسے لالچ دے رہا تھا مگر لوگان خاموش تھا۔ کسی نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

''نفرت ہے مجھے تم سے۔'' یہ اس کا بڑا بھائی تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ لوگان کا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ہائی وے پر سفر کررہا تھا۔ اس کی منزل خود اسے معلوم نہیں تھی۔ وہ کیوں جارہا ہے، اس کی بھی کوئی ٹھوس وجہ نہیں تھی اُس کے پاس۔ وہ بس دنیا کی نظروں سے اوجھل ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی یارکویل میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ ایک چوری کی گاڑی میں سفر کررہا تھا۔ اسے امید تھی کہ پولیس کو اطلاع ہونے تک وہ بہت دور نکل چکا ہوگا۔ کچھ دیر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سونے کے بعد اس نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ راستے میں ایک ہوٹل کو دیکھ کر وہ رک گیا۔

ایک بڑی کیپ اور ماسک کے ذریعے چہرہ چھپا کر وہ ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس نے کھانا پیک کرنے کا کہا اور ہوٹل کے باہر پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ماسک اور کیپ کو اتار کر میز پر رکھ دیا اور گہری سوچ میں گم ہوگیا۔ دس پندرہ منٹ بعد اسے احساس ہوا..... ہوٹل والے دیر کررہے تھے۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے سے آگاہ کیا۔ وہ ہوٹل میں داخل ہوا..... سامنے لگی ایل ای ڈی پر خبریں چل رہی تھیں۔ اس کی اور ویرا کی تصاویر دکھائی جارہی تھیں۔ ماسک اور کیپ اتارنے کے بعد جب وہ باہر بیٹھا تھا تب ہوٹل سے باہر لگے کیمرے میں اس کی تصویر دیکھ لی گئی تھی۔ چند لمحات میں ہی اسے پوری صورتِ حال سمجھ آگئی..... اسی وقت پولیس کی گاڑی ہوٹل کے سامنے رکی۔ لوگان مخالف سمت میں بھاگا۔

''رک جاؤ لوگان.....'' کوئی چیخا۔ ''ہم گولی چلا دیں گے۔'' مگر وہ موت کے خوف سے بے خوف ہوچکا تھا۔ ہوٹل کی دوسری طرف ایک گاڑی کھڑی تھی اور اس کے قریب ہی ایک شخص موجود تھا۔ یہ ہوٹل کے مالک کی گاڑی تھی کیونکہ اس پر ہوٹل کا نام اور لوگو لگا ہوا تھا۔ وہ شخص ہوٹل

کا مالک تھا۔ لوگان بھاگتا ہوا اُس شخص سے ٹکرایا۔ وہ شخص جانے کی تیاری میں تھا..... لوگان سے ٹکرانے کے بعد وہ نیچے گر گیا۔ گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔ لوگان نے چابی چھینی اور گاڑی میں گھس گیا۔ گولی چلنے کی آواز آئی مگر اسے نشانہ نہیں بنایا گیا۔ اس نے گاڑی موڑی اور پوری رفتار سے بھگا کر ہائی وے پر لایا۔ وہ واپس ٹورنٹو جا رہا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے میں اس کا دو بار پولیس سے سامنا ہوا مگر وہ دونوں بار بچ گیا۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی.....

''قسمت؟'' وہ بڑبڑایا۔ کیا واقعی قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے بانی اور ویرا کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ مسکرا دیا..... عجیب مسکراہٹ۔

گاڑی جھیل کے قریب چھوڑ کر وہ ٹورنٹو کے مصروف راستوں پر گم ہو گیا۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ اس کے خیال میں کوئی اسے نہیں پہچان سکتا تھا مگر کوئی تھا جو اس کے بہت قریب تھا۔ وہ چہرہ چھپا کر لاکھوں لوگوں میں گم بھی ہو جاتا تو تعاقب میں آنے والی عورت اسے پہچان سکتی تھی۔ کورا اُس سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔ وہ ڈیوک سے رابطے میں تھی۔

''کورا..... ہم اسے پکڑ سکتے ہیں۔''

''نہیں..... اس کے پاس ویرا نہیں ہے۔ جب تک ہمیں یہ ویرا تک نہیں پہنچائے گا تب تک ہم اسے گرفتار نہیں کریں گے۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ فاصلہ رکھ کر اس کے تعاقب میں تھی۔

''کورا..... چیف کو خبر ہوئی تو تم نوکری سے جاؤ گی۔'' ڈیوک کی جھنجلائی ہوئی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''مجھے بیٹی سے زیادہ کچھ عزیز نہیں۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''سنو ڈیوک.....'' اس نے تیز آواز میں کہا۔ ''یہ قصبے کی طرف جا رہا ہے..... اس کا مطلب ویرا وہیں ہے۔''

''تم اُس کے پیچھے رہو۔'' ڈیوک نے جواب دیا..... موسم تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ وہ دونوں واپس قصبے کی طرف جا رہے تھے.....

☆☆☆

ڈیوک کے ہاتھ میں دس لوگوں کی لسٹ تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر شک کیا گیا تھا مگر لوگان کے ماضی کی وجہ سے پولیس کا سارا دھیان اسی پر تھا..... ڈیوک نے اُلجھے خیالات کے ساتھ لسٹ پر دوبارہ غور کیا۔ یہاں ایک نام سوشان کا بھی تھا۔ وہ اچھل پڑا۔ سوشان بانی کا باپ تھا

تعمیلِ ارشاد

اسے بن مانس کا بچہ لیے گھومتے دیکھ کر تھانے دار نے پوچھا کہ وہ اسے فوراً چڑیا گھر لے جائے اور اس نے ہامی بھر لی۔ چار گھنٹے کے بعد پھر تھانے دار نے اسے بن مانس کا بچہ لیے گھومتے پکڑ لیا۔

''میں نے کہا تھا اسے چڑیا گھر لے جاؤ'' تھانے دار غصے سے بولا۔

''لے گیا تھا جناب لے گیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''اور یہ کل پھر جانے کو کہہ رہا ہے۔''

عورتوں کے اصول

1- میاں کا بٹوا کبھی بھرا نہیں رہنے دینا۔

2- بے جا ہر جگہ اپنی تعریف کرنا اور میاں کی برائیاں کرنا۔

3- جب میاں پٹائی وغیرہ سے نہ ڈرے تو مگرمچھ کے آنسو بہانا۔

4- جب میاں کسی دوسری لڑکی کی تعریف کرے تو اس کے کان کھینچنا۔

5- آخری اور سب سے ضروری کام کہ میاں کو اپنے ذریعے اور اولاد کے ذریعے اتنا پریشان کرنا کہ اس کے سر کے بال گر جائیں۔

مگر اس کو مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل کیا گیا تھا۔ اس نے کورا کو کال ملائی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ڈیوک نے سوشان کا مجرمانہ ریکارڈ دیکھا۔ اس پر ایک کیس تھا جس کا اس نے جرمانہ ادا کر کے بعد میں باقاعدہ معافی مانگ لی تھی۔ کیس کسی بچے کے ہی متعلق تھا۔ ڈیوک کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے سوشان کو کال ملائی۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دیتے ہی ڈیوک نے کہا۔

''مسٹر سوشان..... میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''گھر پر آ جائیں.....'' سوشان نے جواب دیا۔ اس نے 'اوکے' کہہ کر کال کاٹ دی۔ تقریباً تیس منٹ بعد وہ سوشان کے سامنے بیٹھا تھا۔ سوشان اور پریت کے گھر میں اداسی چھائی تھی۔ وہ ابھی بانی کے غم کو پوری طرح نہیں بھلا پائے تھے۔ ڈیوک نے اس سے معذرت کی۔

''میں معذرت چاہتا ہوں مجھے بے وقت آنا پڑا، اصل میں ہم مختلف تھیوریز پر کام کر رہے ہیں تو ہمیں بار بار

پوچھ گچھ کرنی پڑتی ہے۔''

''کوئی بات نہیں مگر خبروں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ قاتل کون ہے..... مجھے مل گیا تو میں ٹکڑے کر دوں گا اس لوگان کے۔'' اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ڈیوک نے سر ہلایا۔

''اس شیطان کو سزا ضرور ملے گی۔'' پاس بیٹھی پریت نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا ہم اکیلے میں بات کر سکتے ہیں؟'' ڈیوک نے سوالیہ نظروں سے سوشان کی طرف دیکھا۔ پریت اس کی بات سن کر کھڑی ہوئی اور کوئی بات کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ''مسٹر سوشان..... بہت عرصہ پہلے آپ کے خلاف ایک کیس تھا۔''

''کونسا کیس؟'' اس نے حیرت سے ڈیوک کی جانب دیکھا۔

''ایک بچے کو آپ نے تھپڑ مارا تھا..... تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے۔'' سوشان کو یاد آ گیا۔

''ہاں ہاں مگر اس کا اس کیس سے کیا تعلق؟''

''تعلق ہے..... بائی کیس کے بعد اس علاقے میں موجود ہر اُس شخص کا ریکارڈ حاصل کیا گیا ہے جو بچوں کے خلاف چھوٹے سے چھوٹے جرم میں بھی ملوث رہا ہو۔'' بات سوشان کی سمجھ میں آ گئی۔

''وہ کیس ختم ہو گیا تھا..... اور میں نے اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے ماہر نفسیات سے رابطہ کیا تھا..... چھ سات ماہ پہلے ہی میں اپنی اس کمزوری پر قابو پانے میں کامیاب ہوا ہوں۔'' اس نے وضاحت کی۔ ''رہی بات اس کیس کی تو وہ جس عورت نے کیس کیا تھا، اُس سے میں نے معافی بھی مانگی تھی..... میرا نہیں خیال کہ وہ اتنا اہم معاملہ تھا کہ اب اس کو بنیاد بنا کر پوچھ گچھ کی جائے۔''

''بات صرف آپ کی نہیں..... ہم قصبے کے ہر اُس شخص سے سوال کریں گے جس پر شک جائے گا۔'' کچھ دیر مزید بات کرنے کے بعد وہ سوشان سے اجازت لے کر باہر آ گیا۔ اس کے دماغ میں کچھ اٹک رہا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی چیز بھول رہا ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ کورا کی کال آ گئی۔

''وہ واپس گھر آ گیا ہے۔''

''پولیس اسے گرفتار کر لے گی، جورڈن تمہارے گھر کی نگرانی پر تھا۔''

''اسے منع کرو..... کوئی گرفتار نہیں کرے گا لوگان کو۔''

''کیوں؟ تم پاگل ہو گئی ہو؟''

''ویرا اُس کے پاس ہے ڈیوک، جب تک مجھے میری بیٹی کا سراغ نہیں مل جاتا..... تب تک لوگان آزاد رہے گا، جورڈن کو تم منع کرو، چیف کو میں سنبھال لوں گی۔'' کورا تیز آواز میں بولی۔ ''کوئی پولیس پارٹی ہمارے گھر نہیں آئے گی۔''

''میں نہیں سنبھال سکتا کورا.....'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''بات میڈیا تک پہنچی ہوئی ہے..... سب کو یقین ہے لوگان ہی قاتل ہے۔''

''ڈیوک پلیز۔'' وہ مکمل بے بس ہو چکا تھا..... ہاں مگر اس کے دماغ میں جو بات تھی، وہ رفتہ رفتہ واضح ہو رہی تھی۔

☆☆☆

''میری بیٹی کہاں ہے لوگان؟'' لوگان صوفے پر بیٹھا پانی پی رہا تھا جب کورا نے ریوالور اس کے سر سے لگایا۔ اس کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر کورا کی غراہٹ نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ ''حرکت مت کرنا..... میں گولی مار دوں گی تمہیں۔''

''تم غلط ہو..... تم سب غلط ہو.....'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''جھوٹے الزامات لگاتے ہو، انسان کی عزت..... سکون سب برباد کر دیتے ہو۔''

''میری بیٹی کہاں ہے..... مجھے بس سوال کا جواب دو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گی۔''

''ویرا کو میں نے اغوا نہیں کیا۔'' اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''میں تمہارے ساتھ مل کر بائی کے قاتل اور اپنی بیٹی کو اغوا کرنے والے کو ڈھونڈوں گا۔''

''میں تین تک گنوں گی۔'' اس کے لہجے میں جنون تھا۔ لوگان خاموش رہا۔ ''ایک.....'' اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔

''تم مجھے نہیں مار سکتیں۔''

''دو۔'' دو کے بعد کا وقفہ طویل تھا۔

''بتاتا ہوں۔'' کورا کا دھیان اُس کی بات پر گیا۔ لوگان نے اچانک اس کے ریوالور والے ہاتھ کو پکڑا اور ایک جھٹکے سے نیچے پھینکا۔ وہ سنبھل نہ سکی۔ ریوالور دور جا پڑا۔ ''میری بیٹی مر جائے گی بے وقوف عورت..... میں قاتل نہیں ہوں۔'' وہ چیخا۔ یہی وقت تھا جب کورا کے موبائل کی بیل بجی۔ لوگان نے موبائل اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ کال پر ڈیوک تھا۔ اس نے لوگان کی آواز سنے بغیر جواب دیا۔

''کورا..... کورا..... میری بات سنو..... لوگان قاتل نہیں ہے..... قاتل کوئی اور ہے۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

''کک کون؟'' کورا کے منہ سے نکلا۔

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

شہر	نمبر	شہر	نمبر	شہر	نمبر
کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیر آباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میر پور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفر آباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چنوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459	قصور	0300-6575020

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

''قاتل وہ ہے جس کے پاس دونوں افراد کا ریکارڈ تھا۔ اس نے پوری تحقیق کے بعد ان دونوں کو نشانہ بنایا ہے..... سوشان سے بدلہ لیا اور تمہارا سکون اُسے پسند نہیں آیا۔''

''کون ہے وہ؟''

''الزبتھ۔'' نام سنتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر باہر بھاگے۔ ان دونوں سے پہلے وہاں پولیس پہنچ چکی تھی۔ ڈیوک دروازے کے پاس موجود تھا۔

''وہ اندر ہے.....'' اس نے کورا کو دیکھتے ہی اطلاع دی۔ ''اسے علم ہو چکا ہے کہ اس کا راز مجھے معلوم ہو گیا ہے..... اب وہ دھمکیاں دے رہی ہے..... وہ ویرا اور اپنے بیٹے جارج دونوں کو قتل کر دے گی۔'' پولیس بے بس ہو چکی تھی۔ یہ سب کچھ بہت جلدی میں ہوا تھا۔ مکان کے چاروں طرف پولیس اہلکار کھڑے تھے۔ ''میں نے چیف کو کال کی ہے، کمانڈو ایکشن کا سوچ رہے ہیں مگر دو بچوں کی زندگی خطرے میں ہے۔'' یہ رات نو بجے کا وقت تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے پورے گھر کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اندر ایک جنونی عورت دو بچوں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد الزبتھ دروازے کے پاس آئی۔ اس نے ویرا کی گردن اپنے ہاتھوں میں جکڑ رکھی تھی۔

''تم لوگ یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ بانی کی طرح اس کے بھی ٹکڑے ملیں گے۔'' وہ چیخی۔

''الزبتھ..... میری بیٹی کو چھوڑ دو۔'' کورا نے بلند آواز میں کہا۔

''ہاں ہاں..... تم سب کو اپنی اولاد کی پروا ہوتی ہے۔ میں اسے چھوڑ دوں گی..... تم ہنسی خوشی اپنے شوہر کی بانہوں میں رات گزارو گی۔'' اس نے چند مزید گالیاں دیں..... ''اب کوئی سکون سے نہیں رہے گا۔'' وہ دوبارہ چیخی..... اسی لمحے کورا اور ڈیوک نے ارد گرد دیکھا۔ لوگان غائب تھا۔

''گھر کی دوسری طرف پولیس والے موجود ہیں۔ وہ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' کورا کی پریشانی محسوس کر کے ڈیوک نے سرگوشی کی مگر وہ اندر پہنچ چکا تھا۔ پولیس سے چھپ کر وہ گھر میں داخل ہوا..... دور کھڑی کورا کو اس کی جھلک دکھائی دی..... وہ چھت سے نیچے اتر رہا تھا۔ الزبتھ ابھی تک اُن پر چیخنے میں مصروف تھی۔ یہی وقت تھا جب لوگان دبے قدموں اس کے پیچھے آیا۔ آخری لمحات میں الزبتھ نے اس کی موجودگی محسوس کی مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ لوگان نے لات گھمائی اور الزبتھ اچھل کر نیچے گری۔ لوگان نے ویرا کو پکڑ کر پیچھے کیا اور اس کے سامنے آ گیا۔ وہ چیختی ہوئی اٹھی اور ہاتھ میں پکڑے خنجر سے اس پر وار کیا..... لوگان نے خود کو بچانے کی کوشش کی مگر خنجر کندھے میں اتر گیا۔ تکلیف کی شدت نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ اسی وقت ڈیوک اور کورا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے..... الزبتھ کو قابو کرنے میں انہیں چند منٹ لگے تھے.....

☆☆☆

''بھائی کے بچوں کا قاتل میں نہیں تھا مگر پھر بھی مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا..... کوئی ثبوت نہ تھا اس لیے مجھے چھوڑ دیا گیا مگر اس دوران میڈیا اور پولیس نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا۔ خاندان میں کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ میں قاتل نہیں تھا مگر کسی نے میرا یقین نہ کیا اس لیے میں نے کیلیفورنیا چھوڑ دیا.....

''ٹورنٹو میں زندگی جنت تھی۔ تمہارا ساتھ سب سے بڑھ کر تھا..... لیکن جب بانی قتل ہوئی اور تم نے بتایا کہ سب لوگوں کا ریکارڈ کھنگالا جا رہا ہے تب ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب یہاں میرا ماضی پلٹ آئے گا..... میں ایک بار پھر تمہاری اور قصبے والوں کی نظروں میں مشکوک ہو جاؤں گا اس لیے میں نے یہ قصبہ بھی چھوڑنے کا فیصلہ کیا لیکن راستے میں ہوٹل میں ویرا کی تصویر دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ہم کسی خوفناک سازش کا شکار ہوئے ہیں اس لیے میں لوٹ آیا.....'' اس کا زخم اب بہتر تھا۔ کورا نے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ دیے۔

''میں نے تم پر شک کیا..... مجھے معاف کر دو لوگان۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''الزبتھ نے پولیس ریکارڈ سے اس قصبے کے ان لوگوں کا ریکارڈ نکالا تھا جو پہلے بچوں کے حوالے سے کسی جرم میں ملوث رہے..... سوشان سے اس نے بدلہ بھی لینا تھا کیونکہ سوشان نے ایک مرتبہ جارج کو تھپڑ مارا تھا..... اس بدلے کے ساتھ ہی اس جنونی عورت نے اپنا کام شروع کیا..... دوسرا نشانہ ہم بنے..... الزبتھ اصل میں احساسِ کمتری کا شکار تھی..... اسے اس کے بوائے فرینڈ نے چھوڑ دیا تھا..... زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے شادی کسی نے نہیں کی..... وہ خوش رہنے والے شادی شدہ جوڑوں کو دیکھ کر اپنے اندر نفرت پالتی رہی اور نتیجہ یہ نکلا مگر برائی کا انجام یہی ہوتا ہے۔'' اس نے لوگان اور ویرا کے ہاتھ ہاتھوں میں لیے اور مسکرا دی.....

❖❖❖

صبح سے آج یہ تیسری مرتبہ ہوا تھا کہ مسکارا لگاتے لگاتے اس کا ہاتھ پھسل کر آنکھ میں جاتے جاتے رہ گیا تھا۔

''اُف، کیا مصیبت ہے۔'' یہ جلدی جلدی میں کام کرنے کی عادت اسے خود بھی بری لگتی تھی۔ دراصل اسے صبح سویرے جلد اٹھ کر کام پر جانے سے کوفت ہوتی تھی۔

''میں تو ''مارننگ پرسن'' بالکل نہیں ہوں۔'' وہ اپنی دوستوں سے ہنس کر کہتی۔

''رات کو جتنی دیر تک مجھے جگائے رکھو، میں مائنڈ

ہنستی مسکراتی تتلیوں کی شوخیاں..... جنہیں قاتل چھین لینا چاہتا تھا.....

انسانی شخصیت بھول بھلیوں کا نام ہے... کبھی اندیشے کبھی امید و امکان... کبھی خوشی اور کبھی المیے... پُرلطف اور پُرکیف لمحات ذہن سے اوجھل نہیں ہوتے... اسی طرح بعض اوقات زندگی میں ایک ایسا پل بھی آتا ہے جو ہمیشہ کے لیے اپنی کسک چھوڑ جاتا ہے... انسان کی ذات اسی ایک پل کی اسیر ہو کے رہ جاتی ہے... ایک ایسی پُرفریب شخصیت کا ماجرا جو اس دردناک وقت کا بدلہ دوسروں سے لینا چاہتی تھی...

فریبِ ذات

شہناز احمد

نہیں کرتی۔ لیکن ایک دفعہ بستر میں چلے گئے تو نیند سے جاگنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتا ہے۔''

لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس کو نوکری ملی بھی تو صبح جلدی پہنچنے کی۔ وہ ایک مشہور ماڈلنگ کمپنی میں کام کررہی تھی جہاں کمرشل شوٹ کرنے کے لیے ہمیشہ ہی صبح جلدی کام شروع ہوتا تھا۔ آج بھی شوٹنگ صبح آٹھ بجے تھی اور وہ لیٹ ہوگئی تھی۔

بھاگم بھاگ پرس اور گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔ آخری مرتبہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ میک اپ ٹھیک ہی تھا۔ بس ایک آنکھ تھوڑی سی لال ہورہی تھی جو اسے یقین تھا کہ آفس پہنچتے پہنچتے ٹھیک ہوجائے گی۔

آدھے گھنٹے کی ٹریفک کو بھگتتے ہوئے جب وہ ایجنسی کی بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تو سانس بُری طرح سے پھول رہا تھا۔

''ہیلو، میں لیٹ تو نہیں ہوگئی..... زیادہ؟'' ڈرتے ڈرتے وہاں سے گزرتے ہوئے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے اس نے پوچھا۔ اس نے بُرا سا منہ بنا کر جواب نہ دیا۔

''مایا..... جلدی کرو، سیٹ پر آؤ، ہمیں لائٹ چیک کرنی ہے۔'' ڈائریکٹر احسان صاحب نے بلند آواز میں اسے پکارا۔

''او کے، احسان سر۔'' اپنی جیکٹ جلدی جلدی اتار کر کرسی پر پھینکتے ہوئے وہ بولی۔ ''شوٹ کہاں سے لینا ہے سر؟''

''وہ سامنے کونے والے سنک کے پاس۔ نیچے فرش پر تمہارے لیے نشان لگا دیا ہے۔''

ابتدائی کام ختم کرنے کے بعد وہ شیمپو کی کمرشل کے لیے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے چھوٹے سے ڈریسنگ روم کی طرف آئی تو دروازے میں سائرہ کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مایا کے کپڑے، بیگ وغیرہ تھے۔

''یہ کہاں رکھوں؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ، سائرہ..... تم کتنی اچھی ہو۔ پلیز تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تھی، میں خود ہی لے لیتی۔'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

سائرہ ان کے آفس میں اسسٹنٹ تھی۔ وہ سب لوگوں کو نہ صرف اپنا پارٹ یاد کرنے میں مدد کرتی تھی بلکہ سب کے چھوٹے موٹے کام بھی کردیتی تھی۔

''اچھا مایا، کوئی کام ہے تو بتاؤ؟'' اس کا سامان وہیں رکھ کر وہ بولی۔

''ہاں، پلیز میری یہ زپ کھول دو، لگتا ہے جلدی جلدی میں مجھ سے پھنس گئی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس نے زپ کھول دی تو مایا نے جلدی جلدی اپنا بلاؤز اور جینز اتاریں۔ وہیں ہینگر پر پڑا اسکک کا گاؤن پہنا اور باہر نکلنے لگی۔ ''اور سناؤ، سائرہ طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' اس نے مڑ کر اسے دیکھا جو ابھی وہیں کھڑی تھی۔

''بالکل ٹھیک۔ اب تو مجھے کسی قسم کا درد یا تکلیف بھی نہیں ہوتی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''چلو، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' مایا نے بھی مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

سائرہ..... ان کی ایجنسی کی ایک ماڈل تھی۔ بے حد پُرکشش۔ اسمارٹ اور دبلی پتلی۔ تین ماہ قبل اس کی کار کا ایکسیڈنٹ ایک ٹرک سے ہوگیا۔ حادثہ خوفناک تھا۔ وہ سامنے والے شیشے کی اسکرین سے نکل کر باہر سڑک پر جا گری تھی۔ بہت زیادہ چوٹیں آئیں، جان بچ گئی آپریشن کے بعد سے جسم کی چوٹیں تو ٹھیک ہوگئیں لیکن چہرے پر کنپٹی سے لے کر ہونٹ تک ایک گہرا گھاؤ پڑ گیا جس سے اس کا چہرہ بدہیئت ہوگیا تھا۔ پلاسٹک سرجری کے لیے بہت زیادہ رقم درکار تھی۔ انتظار کررہی تھی کہ زخم خود ہی بھر جائے۔ بہرحال اس کا کیریئر ختم ہوگیا تھا۔ ماڈل کا سب سے بڑا سرمایہ اس کا چہرہ ہی تو ہوتا ہے۔ وہ چونکہ کام پر واپس آنا چاہتی تھی، سب کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتی تھی تو ڈائریکٹر احسان صاحب نے اسے اسسٹنٹ کے طور پر ملازمت دے دی۔ ہر شخص اس کے لیے رحم کا جذبہ رکھتا تھا۔ وہ تھی بھی بہت اچھی۔ سب کے کام بڑھ چڑھ کر کرنے والی۔

''اچھا سائرہ، میرے خیال میں، میں تو سیٹ پر جاؤں بعد میں ملتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

شیمپو کی کمرشل بہت اچھی اور بہت جلدی ہوگئی۔ واپس ڈریسنگ روم کی طرف آنے لگی تو ان کے پروڈیوسر کمال صاحب نے اسے پکارا۔

''مایا، کمرشل اچھی طرح سے کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہمیشہ ہی دیر سے آؤ۔ جب میں آٹھ بجے کا کہتا ہوں تو اس کا مطلب آٹھ ہوتا ہے۔ ساڑھے آٹھ یا نو نہیں۔'' طنز بھری آواز میں کہا گیا۔

مایا کا جی چاہا کہ کرارا سا جواب دے دے لیکن مجبوری تھی۔ ''سوری سر! کل سے ایسا نہیں ہوگا۔'' ڈریسنگ روم کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔

''ان کو کچھ کہنے کا فائدہ نہیں کمال صاحب۔ ان خوب صورت چہروں کے پاس اپنی خوب صورتی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، دماغ بالکل خالی۔ سوچنے سمجھنے سے عاری۔''

پیچھے مڑے بغیر ہی مایا کو اندازہ ہو گیا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ ان کے فوٹو گرافر شان کی جس کا نام تو کچھ اور ماں باپ نے رکھا تھا لیکن ایکٹر شان کی محبت میں نام ہی بدل لیا۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی کہ ان کو سب ماڈلز سے نفرت کیوں تھی۔ فوٹو گرافی میں اتنے ماہر تھے کہ شاید ہی ان کے مقابلے کا کوئی ہو۔

''کیا چھٹی ہو گئی؟'' وہ واپس کپڑے تبدیل کرنے کے لیے آئی تو سائرہ کی آواز آئی۔

''ارے کہاں یار، ابھی تو ایک بجے شہر کے دوسرے کنارے پر جا کر کسی کار کی کمرشل کرنی ہے۔'' گاؤن اتار کر اپنے کپڑے پہنتے ہوئے وہ بولی۔

''اتنی ڈیمانڈ سے کتنا اچھا لگتا ہوگا، ہے نا؟'' اس نے حسرت سے پوچھا۔

''اچھا تو لگتا ہے لیکن لگتا ہے کہ اپنی ذاتی زندگی کہیں گم ہو گئی ہے۔'' جلدی جلدی بیگ میں چیزیں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

☆☆☆

تیزی سے باہر نکلتے ہوئے سامنے سے آتے شخص کو نہ دیکھ سکی اور اس سے بُری طرح ٹکرا کر پیچھے کی طرف گری۔ پھر وہ تیزی سے اٹھ گئی۔ اب وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''اوہ، سوری...... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟'' کسی نے ہمدردی اور پریشانی سے پوچھا۔

''میں خود تو ٹھیک ہوں...... ذرا میری عزتِ نفس مجروح ہوئی ہے۔'' اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے اس نے اپنی طرف سے مزاحیہ جملہ بولا۔

''شاہ میر خان۔'' اس نے مایا کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

''یقین کیجیے اس طرح آپ سے ٹکرا کر مجھے بہت اچھا لگا۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔

''شاہ میر خان۔'' وہ اس کے متعلق سُن چکی تھی۔ شہر کی ایک مشہور ایڈورٹائزنگ کمپنی کا مالک اور جو ماڈلز اس کے متعلق بتاتی تھیں وہ بالکل سچ لگ رہا تھا۔ بے حد ہینڈسم، زبردست قد کاٹھ اور آنکھیں۔ واہ کیا خوب صورت براؤن آنکھیں تھیں۔ جب وہ مسکرا کر مایا کی طرف دیکھ رہا تھا تو اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

''معاف کیجیے، میں جانے کس دھیان میں جا رہی تھی۔''

''ارے، آپ معافی کس بات کی مانگ رہی ہیں، معافی تو مجھے مانگنی چاہیے کہ میری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی۔ ویسے آپ ٹھیک ہیں نا؟'' اب وہ ذرا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

''جی، بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے جینز کو جھاڑا پھر اپنا بیگ اور پرس سنبھالے وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' جاتے جاتے اس نے کہا۔

خوشی تو واقعی اسے ہوئی تھی۔ اتنی زبردست پرسنالٹی والے شخص سے مل کر۔ بس شرمندگی اس بات کی تھی کہ ملاقات کن حالات میں ہوئی تھی۔

''چلو کم از کم وہ اس ملاقات کو آسانی سے بھولے گا نہیں۔'' مسکراہٹ اس کے چہرے پر آپ ہی آپ آ گئی۔

☆☆☆

کام سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں داخل ہوئی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ اپنی ہائی ہیل والی جوتی وہیں دروازے کے پاس اتار کر اس نے ٹی وی آن کر لیا۔ سامنے پڑی آرام دہ کرسی پر دونوں پاؤں رکھ کر وہ جب بیٹھی تو جیسے چین آ گیا۔

''شکر ہے کام تو ختم ہوا۔'' ٹی وی پر نظر ڈالی۔ خبریں تقریباً ختم ہو رہی تھیں۔ اس نے انگڑائی لے کر اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں بند کر لیں کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' بڑبڑا کر اپنے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کس کا فون آ گیا۔''

''ہیلو۔'' بہت اکتاہٹ سے کہا۔

''مایا میں شاہ میر بول رہا ہوں۔ وہی شاہ میر جو آج آپ سے ٹکرانے کی جرأت کر چکا ہے، کیسی کیسی ہیں آپ؟''

''جی...... میں تو اچھی ہوں، آپ کی نوازش کہ فون کیا۔ ویسے آپ کو میرے نام اور فون نمبر کا کیسے پتا چلا؟'' خوشی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''بھئی ہم جسے ڈھونڈنا چاہتے ہیں اسے ڈھونڈ کر ہی چھوڑتے ہیں۔'' وہ بھی شاید مسکرا رہا تھا۔

''جی فرمائیے، اس مہربانی کی وجہ؟''

''دراصل میری اس مہربانی کے پیچھے کوئی اور ہی مقصد چھپا ہوا ہے۔ میں اکیلے کھانا کھاتے گھبراتا ہوں۔

سوچا اگر آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تو کیوں نا آپ کو آج ڈنر کی دعوت دے دوں۔''

''نہیں، میں تو ابھی ابھی گھر پہنچی ہوں۔'' مایا نے جلدی سے کہا۔

''تو بس پھر یہ طے ہے کہ آج رات کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گی۔ میں آدھے گھنٹے میں آپ کو لینے آرہا ہوں۔''

جواب سننے سے پہلے ہی فون بند ہوگیا۔ وہ ریسیور کی طرف بے وقوفوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔

''آدھا گھنٹا، میں اتنے کم ٹائم میں کیسے تیار ہوسکتی ہوں۔'' اپنے کپڑے چیک کرتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا پہنے۔ پھر سوچا ٹھیک ہے اگر وہ شارٹ نوٹس پر مجھے لے جانا چاہتا ہے تو میں بھی اسی حالت میں جاؤں گی جس میں ہوں۔ الماری بند کی۔ آئینے میں دیکھ کر بال برابر کیے۔ لپ اسٹک کی ایک تہ لگا کر پرفیوم لگایا اور باہر آگئی۔ ٹی وی نیوز کا سٹراب ہیڈ لائنز دہرا رہی تھی۔ اس نے شاہ میر خان کے بارے میں سوچا۔

''کتنی عجیب بات ہے کہ اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں جانا چاہتی ہوں یا نہیں؟ بس یہ کہ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔'' ایک لمحے کے لیے بُرا لگا کہ میری مرضی پوچھی نہیں گئی لیکن اندر ہی اندر خوشی بھی ہوئی کہ جیسے اسے پتا تھا کہ میں انکار نہیں کرسکتی۔ چلو جو بھی ہے، اچھا ہے اسے بُرا نہیں لگا۔ چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''اور آخر میں بریکنگ نیوز۔'' اناؤنسر نے کہا۔

''آج ایک اور ماڈل کو قتل کردیا گیا۔ پولیس کے مطابق شام تین بجے ماڈل عینی مرزا اپنے فلیٹ میں مردہ پائی گئی۔ اس کو کسی نے بہت بے رحمی سے تیز دھار آلے سے قتل کیا۔ ان کے مطابق یہ قتل پچھلی رات دس بجے کے قریب ہوا اور گزشتہ قتل کی طرح یہ بھی اس ''بیوٹی کلر'' کا کام لگتا ہے کیونکہ ماڈل کے فلیٹ میں کوئی شے چوری نہیں ہوئی، نہ ہی کوئی زبردستی دروازے سے داخل ہوا اور نہ ہی کسی جنسی زیادتی کا شبہ ہے۔''

یہ خبر سُن کر مایا سکتے میں آگئی۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس نے عینی مرزا کے ساتھ ایک کمرشل میں کام کیا تھا۔ وہ بڑی پیاری اور معصوم لڑکی تھی۔ بہت غریب خاندان سے ہونے کی وجہ سے پورے خاندان کی کفیل بھی وہی تھی۔ سندھ کے چھوٹے شہر سے تعلق تھا۔ کراچی آکر کمرا کمرائے پر لے کر ماڈلنگ کررہی تھی۔

''اُف..... اتنی جوان، زندگی سے بھرپور اور ہنس مکھ عینی۔ اب اس دنیا سے جاچکی تھی۔ اس ''بیوٹی کلر'' کا نام بھی پولیس نے نامعلوم ملزم کا رکھا تھا۔''

اب تک تین ماڈلز قتل ہوچکی تھیں۔ یہ اتفاق تھا کہ مایا ان تینوں کو جانتی تھی۔ وہ کوئی خاص اچھی دوست تو نہ تھیں لیکن ہیلو، ہائے تھی ان کے ساتھ۔ کبھی کبھی ان میں سے کسی ایک کے ساتھ کمرشل میں کام بھی کیا تھا۔ تینوں کو تیز دھار آلے کی مدد سے قتل کیا گیا تھا۔ بظاہر قتل کے محرکات کا پتا نہ تھا۔ نہ چوری، ڈکیتی، نہ ریپ نہ زبردستی انٹری۔ کوئی ایسا شخص جوان کے پاس آسانی سے آجاسکتا تھا۔

مایا نے محسوس کیا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی ہے۔ وہ بھی تو کراچی جیسے شہر میں تنہا رہتی تھی اور وہ بھی ایک ماڈل تھی۔ ان ہی سوچوں میں تھی کہ دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ وہ خوف سے اچھل سی گئی۔ دروازہ کھولنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ باہر سے بالکل ہلکی سی دبی دبی آواز آئی۔ ''مایا! میں شاہ میر ہوں، آپ تیار ہیں؟''

اس نے جلدی جلدی دروازے کے قریب پڑے جوتے پیچھے کیے۔ اپنا پرس اور کوٹ اٹھا کر دروازہ پورا کھول دیا۔

''ہیلو۔'' اپنے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ سجائے وہ بولی۔ ''میں بالکل تیار ہوں، کہیے جانا کہاں ہے؟'' باہر نکل کر دروازہ لاک کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''آپ کو سرپرائز دینا ہے۔'' شاہ میر نے مسکرا کر کہا۔

''چلیں۔''

وہ شہر سے دور نئے بنے ہوئے اٹالین ریسٹورنٹ کی طرف مڑا۔ اندر ماحول بہت خوب صورت تھا۔ میز پر چیک دار میز پوش، موم بتیاں اور ہلکا ہلکا میوزک۔ موم بتیوں کی مدھم مدھم روشنی ایک عجیب ہی منظر پیش کررہی تھی۔

''سر! ویلکم..... آپ اور میڈم کی ٹیبل تیار ہے۔'' باوردی بیرے نے بہت مؤدب طریقے سے شاہ میر کو راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''تھینک یُو۔'' شاہ میر نے مایا کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ پھر اس کے مقابل خود بھی بیٹھ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کچن بالکل نزدیک ہی ہو۔ اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو نے مایا کی بھوک بڑھا دی۔ مینیو کارڈ دیکھ کر وہ تھوڑا سا حیران ہوئی۔ قیمتیں بہت زیادہ تھیں۔

''آپ آرڈر کریں۔'' شاہ میر نے کہا۔

اس نے اپنی پسند کی ڈشیں آرڈر کیں۔ بیرا کارڈز اٹھا کر چلا گیا تو شاہ میر ذرا میز پر نزدیک ہو کر بولا۔

''یہ آپ کہیں میرا فائدہ تو نہیں اٹھا رہیں؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ ذرا گڑبڑا گئی۔

''میرا مطلب ہے آپ کو دیکھ کر تو ایسا نہیں لگتا کہ آپ یہ سب کھا سکیں گی یا پھر آپ نے سوچا کہ موٹا مرغا پھنسا ہے فائدہ اٹھالیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

مایا نے اس بات کو بہت انجوائے کیا۔ ''یہ بات بھی سچ ہو سکتی ہے لیکن ایک تو مجھے اٹالین کھانے بہت پسند ہیں۔ دوسرے موٹے مرغے پھنسانے میں مزہ بہت آتا ہے۔ ویسے آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کا فائدہ اٹھا رہی ہوں؟'' بہت دلفریب مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے وہ بھی ذرا میز پر بازو رکھ کر نزدیک ہو کر بولی۔

شاہ میر نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''واہ بھئی مزہ آ گیا۔ بیوٹی بھی اور برین بھی۔ مجھے بے وقوف بننے میں کوئی اعتراض نہیں اگر بنانے والی تمہارے جیسی خوب صورت لڑکی ہو۔''

''چلیں، میں یاد رکھوں گی۔'' مایا نے کہا۔ ویٹر ان کا کھانا لے کر گیا تھا۔ کھانے کے دوران وہ دونوں ہلکی پھلکی گفتگو کرنے لگے۔

''شاہ میر ایک بات بتائیں، یہ آپ نے مجھے میری لینڈ لائن پر فون کیوں کیا تھا جس نے آپ کو میرا نمبر دیا تھا اس نے موبائل نمبر نہیں دیا؟'' آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''دراصل موبائل آپ کے کلائنٹ کے لیے ہوتا ہے۔ تمام دن اس پر ان سے سر کھپاتی ہیں میں پہلی مرتبہ فون کر رہا تھا۔ بتانے والے نے لینڈ لائن نمبر دیا تو سوچا یہ بہتر ہوگا آپ ضرور اٹھالیں گی۔ موبائل پر نمبر نہ پہچاننے پر شاید نہ اٹھائیں۔'' اس نے کہا۔

''واہ۔'' وہ حیران رہ گئی۔ کیا آبزرویشن تھی۔

کھانے کے دوران دونوں ایک دوسرے کو اپنے اپنے متعلق بتاتے رہے۔ شاہ میر کا خاندان پشاور سے تعلق رکھتا تھا۔ دادا، پردادا امیر کبیر لوگ تھے۔ والد کا بزنس وسیع تھا۔ بہترین اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس کی اپنی خواہش پر اس کو نیویارک ایڈورٹائزنگ اسکول میں ٹریننگ کے لیے بھیج دیا گیا۔

''بابا کی بہت خواہش تھی کہ میں لاہور یا پشاور میں ان کے بزنس کو سنبھالوں لیکن مجھے یہ فیلڈ پسند تھی۔ جب میں ٹریننگ لے کر وطن واپس آیا تو کراچی میں ابا کے ایک ڈیرینہ دوست کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی تھی۔ کچھ دن ان کے ساتھ کام کر کے بہت لطف آیا۔ دل میں ٹھان لیا کہ بس مجھے یہ فیلڈ پسند ہے۔''

پاستا کا ایک لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے وہ بولا۔ ''بابا سے ذکر کیا، انہوں نے اپنے دوست سے بات کی جو کافی عمر کے ہو چکے تھے۔ ریٹائر ہو کر بیٹے کے پاس کیلی فورنیا جانا چاہتے تھے۔ ایجنسی مجھے سونپ کر وہ چلے گئے اور اب میں اس کو چلا رہا ہوں۔'' بات ختم کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''میں بہت زیادہ بولتا رہا ہوں، سوری۔''

''ارے نہیں، نہیں۔ میں نے بہت انجوائے کیا، آپ کی زندگی کی کہانی کو۔'' مایا اپنے کھانے کے ساتھ بھی انصاف کر رہی تھی۔ اتنا اچھا اور مزیدار کھانا شاید ہی اس نے کبھی کھایا تھا۔

''اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' وہ ذرا انٹرسٹ لیتے ہوئے بولا۔

''میں.....؟ میری کہانی بہت سادہ ہے۔ میرے ابا کا انتقال اس وقت ہوا جب میں نو برس کی تھی۔ سمن آباد میں نانی کے ساتھ دو کمروں میں، میں اور امی رہتے تھے۔ امی گریجویٹ تھیں۔ ایک مقامی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ میرا ناک نقشہ امی کی طرح اور قد اور رنگ ابو کی طرح ہے۔ وہ اپنے زمانے کے کافی خوبرو مشہور تھے۔'' وہ ذرا رکی۔

''میرا کوئی بھائی بہن نہ تھا۔ اس لیے امی کی پوری توجہ میری پرورش پر تھی۔ پڑھائی اور صرف پڑھائی۔ دولت تو وہ نہ دے سکتی تھیں لیکن اعتماد بہت دیا۔ مقامی کالج سے بی اے کیا، ہر فنکشن میں حصہ لیا۔ ڈیبیٹ، اسپورٹس، ڈراما وغیرہ۔ اور پھر جیسے اچانک ہی ایسا لگا کہ جہاں ماڈلز، ماڈلنگ کرتی ہیں، ان سے زیادہ اچھا میں کر سکتی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''بس صاحب کریز ہو گیا۔ شاید میرے خیال میں ان دنوں کچھ لوگوں نے تعریفاً کہہ دیا ''کہ ارے یہ ماہین تو بہت پیاری نکلی ہے، ماڈل لگتی ہے'' بس ضد پکڑ لی۔ امی سے بات کی تو حیران رہ گئیں۔

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ ماڈل؟ تمہیں پتا ہے کہ لوگ ان لڑکیوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ باپ دادا کا نام مٹی میں ملانا ہے؟'' غصہ آسمان کی بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا۔ ''اس پروفیشن میں کتنی بے راہ روی ہے، بے حیائی

ہے۔''

''کوئی پروفیشن بُرا نہیں ہوتا۔'' میں نے امی سے کہا۔ ''انسان کے اندر کی اچھائی یا برائی اس کو ایسا بنا دیتی ہے۔''

''بہرحال، بہت منتوں کوششوں سے ان کو نیم رضامند کرلیا۔ وہیں ایک انسٹی ٹیوٹ میں ماڈل بننے کی ٹریننگ بھی ہورہی تھی۔ وہی جوائن کرلیا۔ کراچی کی مشہور کمپنیوں میں اپلائی کیا۔ جس دن ''سلور بیل'' کی طرف سے جاب آفر ہوئی۔ جیسے خوشی سے پاگل ہوگئی۔ لاہور سے کراچی کا سفر بھی طویل تھا۔ امی کی ضد پر نام بدل کر ''مایا علی'' رکھا گیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ عارف حمید کی بیٹی ماہین حمید کو کوئی ماڈل کی حیثیت سے جانے۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے۔ دو سال پہلے امی کو منا کر اپنے پاس فلیٹ میں لائی تھی لیکن ان کے انتقال کے بعد سے بالکل تنہا ہوں۔'' شاہ میر بہت دلچسپی اور غور سے سُن رہا تھا۔

میٹھے کا دور شروع ہوا۔ کافی پی گئی اور یہ ملاقات بہت خوشگوار ماحول میں ختم ہوئی۔

☆☆☆

شاہ میر سے پہلی ملاقات یادگار تھی۔ مایا کو لگتا تھا جیسے آسمان پر اُڑ رہی ہے۔ اس کی باتوں میں سچائی لگتی تھی۔ وہ بے پناہ امیر ہونے کے باوجود بھی بہت ہی سُلجھا ہوا لگا۔ جی چاہتا تھا وہ اسے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کرے۔ اس کی یہ خواہش اسی ہفتے کی شام کو پوری ہوگئی جب اس کا فون آیا۔

''کیا کررہی ہو؟''

''بس کام سے واپس آئی ہوں، آرام کررہی ہوں۔''

''کیا خیال ہے۔ یہ شام ایک چرب زبان شخص کے ساتھ گزارنا پسند کروگی؟''

''سوچا جاسکتا ہے۔'' ذرا بن کر وہ بولی۔

''تو بس طے ہے میں تمہاری بلڈنگ کے نیچے ہی کھڑا ہوں، جلدی سے آجاؤ۔''

''ارے۔'' گھبرا کر اس نے پردہ پیچھے کیا۔ واقعی وہ نیچے اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے اوپر دیکھ رہا تھا۔ اسے ہنسی آگئی۔ جلدی جلدی پرس پکڑ کر نیچے آگئی۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملا۔ پاس ہی ایک پارک تھا۔

''چلو بیٹھو۔'' اس نے مایا کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''یار، ویسے ہی تم سے گپ شپ کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ یہاں سے گزر رہا تھا سوچا کمپنی اچھی رہے گی اور ''سلور بیل'' کی سب سے خوب صورت ماڈل سے ملاقات بھی ہو جائے۔'' وہ مزے لے کر کہہ رہا تھا۔

پارک کے پاس اسٹیک کی کئی دکانیں تھیں۔ گول گپے، چنے، آئسکریم، کیا کیا نہ کھایا۔ بہت لطف آیا۔

''آج شام اپنی ڈائٹنگ اور خوراک وغیرہ کی فکر نہ کرنا۔ کبھی کبھی بدپرہیزی کرنا اچھا لگتا ہے۔'' اس نے اس کے گال پر آئے ہوئے بالوں کی لٹ کو ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

اس کے لمس سے جیسے جسم میں عجیب سی سنسنی پھیل گئی۔ دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ایک دم آتی ہوئی لالی کو شاہ میر نے بہت غور سے دیکھا۔ بہت محظوظ ہوا۔ یہ خوب صورت شام گرما گرم کافی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

شاہ میر نے اسے فلیٹ کے نیچے اتارا تو جیسے خوشی سے سرشار اس کے قدم کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔ گنگناتی ہوئی فلیٹ میں داخل ہوئی، کپڑے تبدیل کرکے سونے کے لیے لیٹی تو خیالوں میں شاہ میر تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح الارم لگا کر وہ ٹائم پر اٹھی۔ تیار ہوکر آفس پہنچی تو تقریباً سب ہی لوگ آچکے تھے۔ چائے، کافی پی جارہی تھی اور موضوع ایک ہی تھا۔ ایک روز پہلے ہونے والا قتل۔

''تمہیں پتا ہے کہ میں تین میں سے دو لڑکیوں کو جانتی تھی۔ بہت اچھی دوست تو نہ تھیں لیکن سلام دعا تو ضرور تھی۔'' ایک ماڈل کرسٹل نے کہا۔ وہ اپنی کرسی مایا کے پاس لے آئی تھی۔ ابھی سینئر اسٹاف نہیں آیا تھا۔ شاید کوئی اہم شوٹ نہیں تھی۔

''یار، مجھے اب تھوڑی وحشت ہونے لگی ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ وہ بے چاری لڑکیاں، پتا نہیں کن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھیں۔ عینی کو تو میں نے پچھلے دنوں یہ کہتے سنا تھا کہ اگر پے منٹ ٹائم پر نہ ہوئی تو گھر والوں کو گھر کا کرایہ ادا کرنا مشکل ہوجائے گا۔''

''سب سے بڑی اہم بات یہ ہے کہ ان تینوں وارداتوں میں کچھ چوری نہیں ہوا۔ کوئی زبردستی، زیادتی نہیں ہوئی۔'' امبر حمید نے کہا۔

وہ خود بھی بہت پیاری اور بھلی لڑکی تھی۔ کم سے کم لوگوں سے میل ملاقات رکھتی تھی، کبھی کبھی بتاتی تھی کہ ابو اور بھائی بہت سخت ہیں۔ حکم یہی ہوتا ہے کہ اگر کام کرنا اتنا ہی ضروری ہے تو کام کے فوراً بعد گھر پہنچو۔''

''مجھے یہ بات بہت پریشان کررہی ہے کہ تینوں میں صرف ایک بات ہی کامن تھی کہ وہ ماڈلز تھیں اور اب مجھے یہ سوچ کر وحشت ہورہی ہے کہ میں بھی ماڈل ہوں، تنہا رہتی ہوں۔'' مایا نے کہا۔

کرسٹل نے کہا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مجھے کہہ رہا ہو۔ مرنے کی اب تمہاری باری ہے۔''

''کم آن، کرسٹل، ایسے نہ کہو۔'' مایا نے پریشان ہو کر اپنی اچھی دوست کی طرف دیکھا۔

''میں سیریس ہوں مایا، کبھی جی چاہتا ہے کہ جلد از جلد فلیٹ چھوڑ کر کسی رشتے دار کے ساتھ شفٹ ہو جاؤں۔'' بہت سنجیدگی سے کرسٹل نے کہا۔

''بھئی تم لوگ بات کو کہاں سے کہاں لے کر جارہی ہو؟'' صبا نے کہا۔ ''یہ اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔ اتنے بڑے شہر میں تینوں قتل کے محرکات اور بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تینوں کسی امیر آدمی کی دوست ہوں، اور اسے بے وقوف بنا کر اس کی دولت ہتھیا رہی ہوں۔ اس نے ان کو مروا دیا ہو۔ یار کافی دفعہ ایسے کیس ہوتے ہیں۔ تم لوگ اوور ری ایکٹ کررہی ہو۔'' ذرا بے پروائی سے بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے صبا نے کہا۔

''بھئی، جو بھی ہو۔ میں اب اپنے فلیٹ میں اکیلی رہنے والی نہیں۔'' کرسٹل نے کہا۔

''میں جانتی ہوں، زندگی میں رسک تو ہوتے ہیں لیکن جہاں ایک دیوانے قاتل سے پالا پڑ جائے تو ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔''

''تمہیں کیسے پتا کہ وہ قاتل دیوانہ ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ چاہتا ہو کہ دنیا سے خوب صورت چہرے والی لڑکیوں کو ختم کر دیا جائے۔ جن میں کوئی احساسات، جذبات نہیں ہیں۔ خالی دماغ، بھس بھرے ہوئے۔'' یہ کیمرا مین شان تھا۔ جو وہاں سے گزر رہا تھا۔

''جانے اس آدمی کا کیا پرابلم ہے؟'' تقریباً سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس پر ایسی کون سی افتاد پڑی تھی۔ کون خاتون دھوکا دے گئی کہ بے چارے کی تمام زندگی کا فلسفہ ہی بدل گئی۔'' مایا نے غصے سے کہا۔

''اگر یہ اتنا اچھا کیمرا مین نہ ہوتا تو کوئی بھی اس کی بکواس برداشت نہ کرتا۔'' امبر نے کہا۔

''لڑکیو، چلو بھئی اب سیٹ پر آجاؤ، جلدی۔'' کمال صاحب کی آواز آئی۔ وہ ذرا زنانہ ٹائپ تھے۔ آواز بھی زنانی سی تھی۔

''لو بھئی، کہیں یہی نا ''بیوٹی کلز'' ہوں۔'' کرسٹل نے مجھے ٹہوکا دیا۔

''توبہ کرو کرسٹل، یہ صاحب تو شاید خربوزہ بھی نہ کاٹ سکتے ہوں۔'' مایا نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''میری جان کئی مرتبہ اس طرح کے لوگ ہی ایسے کام کر جاتے ہیں جن کی طرف شک بھی نہ جاتا ہو۔'' بہت سوچ کر اس نے کہا۔ مایا خاموش ہوگئی۔

☆☆☆

تمام کام خوش اسلوبی سے ہوگیا۔ کرسٹل اچھی شوٹ ہوگئی۔ اب سہ پہر تک کوئی کام نہ تھا۔ سوچا گھر جایا جائے۔ رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی، سوچا مزے سے جا کر سوؤں گی۔ باہر نکلی تو سامنے راجر نظر آیا۔ وہ ان کے اسٹوڈیو کی لائٹس سیٹ کرتا تھا۔ وہ دروازے سے نکل کر باہر جارہا تھا۔

''ہائے، راجر۔'' مایا نے پکارا۔ ''کیسے ہو، نظر نہیں آتے۔'' مایا نے رسماً کہا۔

''میں تو یہیں ہوتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''گھر میں بیوی، بچے کیسے ہیں؟'' وہ جانتی تھی کہ راجر شادی شدہ ہے لیکن اپنے کام سے کام رکھتا تھا، کسی کا دوست نہیں تھا، بالکل چپ چاپ رہتا۔ تقریباً سڑا ہوا، جیسے اپنے سوا اسے کسی کی پروا نہ ہو۔

''وہ لوگ باہر گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

''باہر کہاں، شہر سے باہر یا ملک سے باہر؟'' اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بولی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اس طرف چل پڑا جہاں موٹر سائیکل پارک تھیں۔

مایا اسے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ ''نہ خدا حافظ، نہ بائے، بڑا عجیب ہے یہ شخص۔'' یہی سوچتے ہوئے اچانک مڑی تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''اُف۔'' اس نے ماتھا پکڑا۔ شاہ میر اسی کی طرف آرہا تھا اور ان کا ٹکراؤ پھر سے ہوگیا۔

''یہ ہمارا بار بار ٹکرانا، کوئی معنی رکھتا ہے مایا۔ اب تو لوگ بھی باتیں بنائیں گے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''اوہ..... آپ.....؟ اس وقت یہاں.....؟'' مایا نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں لنچ کے لیے ریسٹورنٹ جا رہا تھا، بالکل ہلکا پھلکا سلاد، سینڈوچ ٹائپ۔ راستے میں تم نظر آ گئیں تو سوچا کیوں نا خوب صورت ترین ماڈل کو ساتھ لے لیا جائے، مزہ بھی رہے گا اور ''ٹور'' بھی ہو جائے گی۔'' بہت خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا۔

وہ خوش تو بہت ہوئی۔ ''لیکن وہ تمام دن سونے کا پلان؟'' اس نے بتایا۔

''بے وقوف لڑکی، خالی پیٹ سوؤ گی تو نیند کیسے آئے گی۔ پیٹ بھر کر جتنی دیر مرضی سو جانا۔'' اسے بازو سے پکڑ کر اپنی گاڑی کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

''چلیے جناب، حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔'' اس نے مصنوعی سرد آہ بھر کر کہا۔

شاہ میر اس کے حواسوں پر بُری طرح سے چھا رہا تھا اور یہ سب اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

ریسٹورنٹ پہنچ کر شاہ میر نے حسبِ وعدہ ہلکا پھلکا کھانا آرڈر کیا۔ ''سنو اب رات تک کیا شیڈول ہے؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''آرام، قیلولہ اور قیلولہ اور بس.....'' مایا نے کہا۔

''اوہ گریٹ، یعنی تمام دن چھٹی؟''

''جی جناب، پوری چھٹی۔'' مزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''گڈ، پھر تو پروگرام چینج۔ ہم یہاں بیٹھ کر کھانے کے بجائے پکنک پر جا رہے ہیں۔'' شاہ میر نے ویٹر کو اشارہ کیا۔

''پکنک.....؟'' شاہ میر پلیز۔ مجھے گھر میں کافی کام کرنے ہیں۔'' اس نے بہانہ بنایا۔

''یہاں سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر ایک بے حد خوب صورت اسپاٹ کا مجھے پتا ہے، ہم کھانا وہاں جا کر کھائیں گے، چلو اٹھو۔''

وہ جانتی تھی کہ وہ انکار نہیں کر سکتی۔

''ویٹر، یہ سب کھانا پیک کر دو۔''

راستے سے کوک کی ٹھنڈی یخ بوتلیں لے کر وہ چلے۔ اب قدرے ایک ویران سی جگہ آ گئی جہاں گھنے درخت لگے ہوئے تھے۔ شاہ میر نے گاڑی روکی۔ ڈکی کھول کر ایک تہ شدہ کمبل نکالا اور اسے لے کر ایک درخت کی طرف چلا۔ درخت پرانا اور گھنا تھا۔

مایا نے دیکھا۔ جگہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ موسم میں خنکی کافی تھی جو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ہر طرف مکمل خاموشی، بس پرندوں کے چہچہانے کی آواز کے اور کچھ نہ تھا۔ شہر کے ہنگامے دور رہ گئے تھے۔

شاہ میر نے ایک اچھا سا کونا دیکھ کر کمبل بچھایا۔ لفافوں میں سے کھانا نکالا، کوک کی بوتلیں اور نیپکن بھی نکالے۔ مایا وہیں ایک کہنی کے سہارے ٹیک لگا کر دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا لڑکا ہو جو بہت انہماک کے ساتھ ''گھر گھر'' کھیل رہا ہو۔ کھانے کا بہت لطف آیا، واقعی وہ ہلکا پھلکا کھانا تھا لیکن اس جگہ نے اسے پُرلطف بنا دیا۔ وہ دونوں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

شاہ میر ذرا رومینٹک ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل تو مایا کا بھی چاہتا تھا کہ اس کے جذبات کا جواب دے سکے لیکن ڈر سی گئی۔

''میں اس شخص کو کتنا جانتی ہوں، صرف دو تین ملاقاتیں اور بس۔ پہلی نظر میں ہونے والی محبت جیسی کیفیت۔ جو نا سمجھ لڑکے لڑکیاں کرتے ہیں۔ وہ تو اس سے اب کافی آگے نکل چکی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ہوا چلنے سے شاہ میر کے خوب صورت بال اس کے چہرے پر آ رہے تھے اور وہ اتنا خوب صورت لگ رہا تھا کہ نظر ہٹانا مشکل تھی۔ مایا نے اپنے آپ پر قابو پایا۔

''شاہ میر.....'' وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔ ''چلیں۔''

''ارے کیوں، کیا ہوا؟'' وہ حیران ہو گیا۔

''مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔'' اپنی جینز کو جھاڑتے ہوئے وہ بولی۔

''چلیے میڈم۔'' ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ بولا۔

خالی لفافہ، بوتلیں وہیں کوڑے دان میں ڈالیں۔ کمبل جھاڑ کر تہ کیا۔ کار میں رکھا۔ ''تمہیں گھر چھوڑ دوں؟''

''نہیں، بس آپ مجھے میرے آفس کے پارکنگ لاٹ میں چھوڑ دیں جہاں میری گاڑی کھڑی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے جہاں سے میں نے تمہیں اغوا کیا تھا؟'' مسکرا کر وہ بولا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

''شاہ میر، میں نے آج واقعی بہت انجوائے کیا۔'' سچائی سے مایا نے کہا۔

''ارے میڈم جی، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گی تو ایسے ہی عیش کریں گی۔'' مزاحیہ لہجے میں

اس نے کہا۔

تمام راستے وہ سوچتی رہی کہ اس شخص میں ضرور کوئی خاص بات ہے جو مجھے اس کی طرف کھینچ رہی ہے، جو جذبات، احساسات میں اس کے لیے محسوس کر رہی ہوں، وہ کبھی کسی کے لیے نہیں کیے۔ اس کا قرب ایک عجیب طرح کے نشے کا باعث بن رہا تھا۔ اس کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ مسحور کن تھا۔ اس کی شخصیت کا طلسم اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ زندگی اگر کسی ایسے شخص کے ساتھ گزارنی پڑے تو لطف آجائے۔

☆☆☆

شاہ میر نے صحیح کہا تھا کہ اس کے ساتھ رہنے میں عیش ہی عیش تھے۔ اس نے پھولوں، رومینٹک کارڈز، مہنگے ترین پرفیومز، تحفے تحائف اور اس کے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کھانوں کی بھرمار کر دی۔ اس کا کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب وہ اسے کوئی تحفہ نہ دیتا۔ خواہ وہ گلاب کی کلی ہو یا کوئی خوب صورت پیغام۔ یا سونے کی نفیس بریسلیٹ۔ شروع میں وہ اسے اچھا لگتا تھا۔ اب لگتا تھا کہ وہ ''گوڈے گوڈے'' اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ وہ حساس، بے حد سمجھ دار اور بے انتہا خیال رکھنے والا شخص تھا۔ شکل صورت ویسے بھی اچھی، اوپر سے دولت کی فراوانی...... تو پھر اتنی ساری خوبیاں کسی ایک شخص میں ایک ساتھ ہوں تو عجیب سا لگتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی اس تمام خوبیوں، اچھائیوں کے پیچھے کوئی خوفناک، تاریک پہلو..... ہو جو نظروں سے چھپا ہوا ہے۔ وہ سوچتی۔ ایک دن اس کے منہ سے یہ بات نکل ہی گئی۔

وہ دونوں اس کے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں زمین پر بچھی ہوئی گدیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گرما گرم کافی کے ساتھ لذیذ چاکلیٹ کیک کھا رہے تھے۔ وہ کیک بھی شاہ میر آتے ہوئے بہترین بیکری سے لایا تھا۔

''شاہ میر میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' ذرا جھجکتے ہوئے مایا نے کہا۔ ''آپ اتنے ہی اچھے اندر سے بھی ہیں، جتنے دکھائی دیتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ میرا اتنا زیادہ خیال رکھتے ہیں، تحفے تحائف سے نوازتے ہیں، میری ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا میں اظہار کروں۔ سچ بتایئے آپ کی شخصیت میں کوئی ایسا پہلو تو چھپا ہوا نہیں ہے، جس کا مجھے بعد میں پتا چلے تو میں پریشانی سے مر جاؤں؟'' اس کی آواز دھیمی تھی لیکن اس میں سنجیدگی تھی۔

''مایا! میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، بس ایک عام سا انسان جو سمجھتا ہے کہ تم کوئی خاص مخلوق ہو۔ دنیا کی سب سے منفرد لڑکی...... اسپیشل۔ جو صرف میرے لیے بنائی گئی ہے۔ اس کو محبت کہتے ہیں۔'' اس نے نرمی سے مایا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے مایا، زبردست عشق۔ آئی لو یو۔'' اس کے ہاتھوں کے لمس اور الفاظ کے جادو نے اس کی روح تک کو سرشار کر دیا۔ وہ ساتویں آسمان پر اڑ رہی تھی۔ ہاں یہ عشق ہی تھا جو اسے اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

دنیا اس کے لیے اتنی رنگین اور خوب صورت ہو گئی تھی کہ ایسا لگتا تھا اسے ہر شے سے پیار ہو گیا ہے۔ تمام دن ہنستے مسکراتے گزر جاتا، تنہائی میں گنگناتی رہتی۔ جی چاہتا تھا تمام دنیا کو چیخ چیخ کر بتا دے کہ لوگو! مجھے عشق ہو گیا ہے دنیا کے سب سے زیادہ ہینڈسم اور اچھے انسان سے۔ اس کی دوست خوش تھیں کہ اب وہ خوش خوش رہتی تھی۔ اس کا راز صرف اس کی بہت قریبی دوست رابعہ ہی جانتی تھی۔

''شکر ہے تیرا سڑنا کڑھنا تو ختم ہوا۔'' وہ کہتی۔

''یار یہ جو تبدیلی آپ کے اندر بقول آپ کے عشق کی وجہ سے آئی ہے تو کاش یہ خان صاحب آپ کو کافی عرصہ پہلے مل جاتے۔ ہم آپ کے مزاج کی گرمی سردی سے تو بچ جاتے۔'' مصنوعی ٹھنڈی سانس لے کر وہ کہتی۔

مایا کو لگتا تھا کہ اب اس کی زندگی میں سکھ ہی سکھ ہوں گے۔ کوئی غم نہ آئے گا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں۔ بس یہ جو ''بیوٹی کلر'' کا خوف تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً طاری ہو جاتا۔ جس نے دو شکار اور کر لیے تھے۔ وہ دونوں بھی ماڈلز تھیں اور ان کی ایجنسی ''سلور بیل'' کے لیے کام کر چکی تھیں۔ جب سب ماڈلز کبھی اکٹھی ہوتیں تو یہی بات ڈسکس ہوتی۔

''میں تو کبھی کبھی کمال صاحب کو غور سے دیکھتی ہوں، کہیں زنانہ گیٹ اَپ میں خطرناک قاتل نہ چھپا ہو۔'' نورین نے کہا۔

''توبہ کرو نورین، جتنے گھاؤ ہر ماڈل کو لگے ہیں اتنی دفعہ تو شاید یہ آلۂ قتل بھی نہ اٹھا سکتے ہوں۔'' سب ہی ہنس پڑے۔

لیکن اسے کرسٹل کی بات یاد آ گئی۔ کسی کے چہرے پر یہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ قاتل ہے۔ وہ جو بھی کوئی تھا۔ بے حد چالاک، ہوشیار اور اسمارٹ تھا کہ اب تک پولیس کی دسترس

سے باہر تھا۔ مایا کے دماغ میں اور بھی لوگ آ گئے۔

شان۔ جو ماڈلز سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ کوئی موقع بھی ان کو بے عزت اور ذلیل کرنے کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا یا پھر راجر۔ وہ کیا سوچتا تھا، کیا کرتا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اتنا الگ تھلگ، کوئی دوست نہیں، کسی سے ہیلو ہائے نہیں۔ اتنا سٹریل کہ ہر شخص اس سے دور بھاگتا تھا۔

احسان صاحب! آواز کرخت، پاٹ دار، بات کرتے تو لگتا کہ لٹھ مار رہے ہوں۔ کبھی کسی کے لیے نرمی کا ایک بول بھی منہ سے نہیں نکلتا تھا۔

اسے کپکپی سی آ گئی۔ ذرا مجھے دیکھو۔ دنیا کے عجیب دیوانوں کے گروپ میں گھری ہوئی ہوں۔ دائیں بائیں قتل ہو رہے ہیں اور میں اس ایجنسی کے لیے ابھی بھی کام کر رہی ہوں۔

''مایا...... ا'' اچانک ایسا لگا کہ بم اس کے قریب پھٹا ہو۔

''بہری ہو؟'' آدھے گھنٹے سے آوازیں دے رہا ہوں۔'' احسان صاحب خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ''سوری سر۔'' بے انتہا نروس آواز میں کہا۔

''سوری...... سوری سر۔'' چہرہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔ ''سارا دن تم لوگوں سے یہی لفظ سنتا ہوں...... تنگ آ گیا ہوں۔''

''سنو جب میں سیٹ پر بلاؤں تو فوراً سے پیشتر حاضر ہو...... اور اگر نہ آئیں تو چھٹی...... مکمل...... پرمانٹ۔'' دانت پیس کر احسان صاحب نے کہا۔

مایا کا جی چاہا، منہ توڑ دے لیکن مجبوری تھی جواب بھی نہ دے سکی۔ ''اگر میں قاتل ہوتی، تو یہ شخص یقیناً میری ہٹ لسٹ پر نمبر ون ہوتا۔'' اس نے سوچا۔ شکر ہے شوٹنگ ٹھیک ٹھاک ہو گئی۔ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور اپنے فلیٹ کی طرف چل دی۔

سوچا، خوب آرام کروں گی۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ شاہ میر شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ اسے مس تو بہت کر رہی تھی لیکن سوچا کہ کبھی کبھی الگ رہ کر بھی وقت گزارنا چاہیے۔ گھر جا کر سب سے پہلے ہلکا پھلکا کھانا تیار کیا۔ جلدی جلدی کھا کر سوچا کہ دانت صاف کرتے ساتھ ہی بستر میں گھس جاؤں [illegible]

کر رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے سوچا شاید شاہ میر واپس آ گیا ہے۔ نلکا بند کر کے وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ لاک کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا۔

''کون ہے؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

پتا نہیں کیوں اس کے دل نے اسے کہا کہ عقل سے کام لے اور دروازہ یوں ہی نہ کھول دے۔

''میں راجر، راجر مارشل۔'' باہر سے بالکل ہلکی سی آواز آئی۔

''مایا! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''راجر؟'' اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ بڑھتا ہوا ہاتھ لاک کھولتے کھولتے رک گیا۔

''اس کا یہاں کیا کام؟'' سیٹ کی لائٹس ٹھیک کرنے والا۔ راجر...... جو کبھی کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا تھا اس کے دماغ نے دلیل دی۔ وہ ذرا گھبرا گئی۔

''سوری راجر! میں...... میرا مطلب ہے کہ میری طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔'' اس نے ذرا نرمی سے دروازے کے بالکل قریب آ کر کہا۔

''پلیز مایا! مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے.... مل لیجیے۔ میری بات سن لیں۔'' جیسے وہ منت کر رہا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ اسے ٹی وی نیوز کاسٹر کی بات یاد آ گئی۔

''قتل ہونے والی تمام ماڈلز کے دروازے زبردستی نہیں کھولے گئے تھے، ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب قاتل کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔''

''اوہ مائی گاڈ۔'' خوف سے تھرتھرا کر اس نے سوچا۔ ''کہیں راجر ہی ''بیوٹی کلر'' تو نہیں ہے؟'' وہ بھی سب ماڈلز کو جانتا تھا اور اس وقت اس کے فلیٹ کے باہر دروازے پر اندر آنے کو کہہ رہا ہے۔

اپنی آواز میں مضبوطی اور سختی لاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ میری طبیعت اس وقت خراب ہے، میں آپ سے نہیں مل سکتی جو کچھ بھی کہنا ہے کل آفس میں کہہ دیجیے گا۔''

''اوہ طبیعت ٹھیک نہیں۔'' راجر کی آواز میں طنز، غصہ

سے باہر تھا۔ مایا کے دماغ میں اور بھی لوگ آ گئے۔

شان۔ جو ماڈلز سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ کوئی موقع بھی ان کو بے عزت اور ذلیل کرنے کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا یا پھر راجر۔ وہ کیا سوچتا تھا، کیا کرتا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اتنا الگ تھلگ، کوئی دوست نہیں، کسی سے ہیلو ہائے نہیں۔ اتنا سٹریل کہ ہر شخص اس سے دور بھاگتا تھا۔

احسان صاحب! آواز کرخت، پاٹ دار، بات کرتے تو لگتا کہ لٹھ مار رہے ہوں۔ کبھی کسی کے لیے نرمی کا ایک بول بھی منہ سے نہیں نکلتا تھا۔

اسے کپکپی سی آ گئی۔ ذرا مجھے دیکھو۔ دنیا کے عجیب دیوانوں کے گروپ میں گھری ہوئی ہوں۔ دائیں بائیں قتل ہو رہے ہیں اور میں اس ایجنسی کے لیے ابھی بھی کام کر رہی ہوں۔

''مایا.....ا'' اچانک ایسا لگا کہ بم اس کے قریب پھٹا ہو۔

''بہری ہو؟'' آدھے گھنٹے سے آوازیں دے رہا ہوں۔'' احسان صاحب خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ''سوری سر۔'' بے انتہا نروس آواز میں کہا۔

''سوری..... سوری سر۔'' چہرہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔ ''سارا دن تم لوگوں سے یہی لفظ سنتا ہوں..... تنگ آ گیا ہوں۔''

''سنو جب میں سیٹ پر بلاؤں تو فوراً سے پیشتر حاضر ہو..... اور اگر نہ آئیں تو چھٹی..... مکمل..... پرمانٹ۔'' دانت پیس کر احسان صاحب نے کہا۔

مایا کا جی چاہا، منہ توڑ دے لیکن مجبوری تھی جواب بھی نہ دے سکی۔ ''اگر میں قاتل ہوتی، تو یہ شخص یقیناً میری ہٹ لسٹ پر نمبر ون ہوتا۔'' اس نے سوچا۔ شکر ہے شوٹنگ ٹھیک ٹھاک ہو گئی۔ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور اپنے فلیٹ کی طرف چل دی۔

سوچا، خوب آرام کروں گی۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ شاہ میر شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ اسے مس تو بہت کر رہی تھی لیکن سوچا کہ کبھی کبھی الگ رہ کر بھی وقت گزارنا چاہیے۔ گھر جا کر سب سے پہلے ہلکا پھلکا کھانا تیار کیا۔ جلدی جلدی کھا کر سوچا کہ دانت صاف کرتے ساتھ ہی بستر میں گھس جاؤں گی۔ یہ پورا ہفتہ ہی اس کے لیے بہت سخت گزرا تھا۔ پورا، پورا دن شوٹنگ، پھر ''بیوٹی کلر'' کا خوف۔ وہ دانت صاف کر رہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے سوچا شاید شاہ میر واپس آ گیا ہے۔ نلکا بند کر کے وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ لاک کھولتے ہوئے اس کا ہاتھ رک گیا۔

''کون ہے؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

پتا نہیں کیوں اس کے دل نے اسے کہا کہ عقل سے کام لے اور دروازہ یوں ہی نہ کھول دے۔

''میں راجر، راجر مارشل۔'' باہر سے بالکل ہلکی سی آواز آئی۔

''مایا! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''راجر؟'' اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ بڑھتا ہوا ہاتھ لاک کھولتے کھولتے رک گیا۔

''اس کا یہاں کیا کام؟'' سیٹ کی لائٹس ٹھیک کرنے والا۔ راجر..... جو کبھی کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا تھا اس کے دماغ نے دلیل دی۔ وہ ذرا گھبرائی۔

''سوری راجر! میں..... میرا مطلب ہے کہ میری طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔'' اس نے ذرا نرمی سے دروازے کے بالکل قریب آ کر کہا۔

''پلیز مایا! مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔ بس تھوڑی دیر کے لیے..... مل لیجیے۔ میری بات سن لیں۔'' جیسے وہ منت کر رہا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ اسے ٹی وی نیوز کاسٹر کی بات یاد آ گئی۔

''قتل ہونے والی تمام ماڈلز کے دروازے زبردستی نہیں کھولے گئے تھے، ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب قاتل کو اچھی طرح سے جانتی ہوں۔''

''اوہ مائی گاڈ'' خوف سے تھرتھرا کر اس نے سوچا۔ ''کہیں راجر ہی ''بیوٹی کلر'' تو نہیں ہے؟'' وہ بھی سب ماڈلز کو جانتا تھا اور اس وقت اس کے فلیٹ کے باہر دروازے پر اندر آنے کو کہہ رہا ہے۔

اپنی آواز میں مضبوطی اور سختی لاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''میں نے کہا ہے نا کہ میری طبیعت اس وقت خراب ہے، میں آپ سے نہیں مل سکتی جو کچھ بھی کہنا ہے کل آفس میں کہہ دیجیے گا۔''

''اوہ طبیعت ٹھیک نہیں۔'' راجر کی آواز میں طنز، غصہ تھا۔ ''تم سب ایک جیسی ہو، منہ سے میٹھی۔ اندر سے زہر سے

بھری ہوئی۔ تم لوگوں کو بس لینا آتا ہے، دینا نہیں، نفرت ہے مجھے تم سب سے۔ مجھے کہتی تھیں میں تمہاری دوست ہوں، اونہہ میرا کوئی دوست نہیں۔ سوری اگر میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا، آئندہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔"

اس کی آواز اور تلخی سے وہ کانپ سی گئی۔ باہر قدموں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"ہوسکتا ہے راجر واقعی کسی مشکل میں ہو اور مدد لینا چاہتا ہو، اسی لیے اسے ملنے آگیا ہو۔" یہ تو وہ جانتی تھی کہ اسے کوئی مسئلہ تھا لیکن وہ کیا کرے، آج کل کے حالات میں کسی پر بھی اعتبار کرنا مشکل تھا۔

☆☆☆

غسل خانے سے نکل کر بستر پر آئی۔ "توبہ ہے، یہ مجھے کیا ہوگیا ہے، لگتا ہے ساری دنیا نے خنجر تھام لیا ہو۔" اس نے بلند آواز سے کہا۔ یوں زندگی تو نہیں گزاری جاسکتی، خوف زدہ ہوکر، ڈرتے ڈرتے، وہ جو کہتے ہیں جو ڈر گیا وہ مرگیا بالکل ٹھیک کہتے ہیں جب تک قاتل گرفتار نہیں ہوجاتا، اسے بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا، یہی کرنا ہوگا۔ جو آج راجر کے ساتھ کیا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی نیچر کے خلاف تھا لیکن کیا کیا جاسکتا ہے۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ آفس پہنچی، سوچا راجر سے بات کروں، بھلے وہ قاتل ہی کیوں نہ ہو، اتنے سارے لوگوں میں اس سے کوئی ڈر نہ ہوگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے اسے بیک روم میں پالیا، وہ لائٹنگ ٹھیک کر رہا تھا۔

"ہیلو، راجر۔" بشاشت آواز میں لاتے ہوئے وہ بولی۔ "سوری، میں رات آپ سے بات نہ کرسکی۔ میری طبیعت ذرا خراب تھی۔ اب بتایئے آپ کیا کہنا چاہتے تھے؟"

"کچھ نہیں، اسے میری بے وقوفی سمجھ کر معاف کر دینا، مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑ کر باہر جانے لگا۔

مایا اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔ وہ ماڈلز کے کمرے میں داخل ہوئی، جہاں ان لوگوں کے لیے ڈریسنگ روم بنایا گیا تھا۔ یہی سوچ رہی تھی کہ خواہ مخواہ اس بے چارے کو نہ ملنے دیا۔ ہوسکتا ہے واقعی وہ کسی مسئلے کو ڈسکس کرنا چاہتا ہو، کپڑے تبدیل کر رہی تھی کہ سائرہ اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا مایا، تم ٹھیک تو ہو؟" بہت ہمدردی سے اس نے پوچھا۔ شاید مایا کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی

مایوسی تو گناہ ہے

صرف بے اولاد

گھرانے متوجہ ہوں۔

انسان کو کسی بھی صورت رب تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ اکثر گھرانوں میں صرف اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اُداسی، پریشانی، ہر وقت کے گھریلو جھگڑے اور پھر علیحدگی تک بات پہنچ جاتی ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں انشاء اللہ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کِھل سکتے ہیں ہم نے کستوری عنبر و دیگر ہربلز سے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے کہ جس کے استعمال سے انشاء اللہ آپ کے ہاں بھی ایک صحت مند خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آپ آج ہی فون کریں اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

دے رہے تھے۔

''لگتا ہے جیسے پوری دنیا کی فکر اور پریشانی تم نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھی ہے۔'' وہ نزدیک آ کر بولی۔

''نہیں سائرہ، میں ٹھیک ہوں، شکریہ۔'' کمزور آواز میں اس نے کہا۔

''کیا راجر نے تمہیں کچھ کہا ہے؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''نہیں تو، تمہیں کس نے کہا؟'' حیرت سے مڑ کر مایا نے کہا۔

''میں نے تمہیں اس سے بات کرتے دیکھا اور وہ بدتمیزی سے منہ موڑ کر باہر نکل گیا۔'' کندھے اچکاتے ہوئے وہ بولی۔ ''بڑا عجیب، خبیث قسم کا انسان ہے۔ ہر وقت غصہ ناک پر دھرا رہتا ہے۔ ویسے تم تو ٹھیک ہو؟''

''ہاں، ہاں میں ٹھیک ہوں، سائرہ۔ یار تم اتنی اچھی کیوں ہو، آج کل کے زمانے میں لوگ سگے رشتے داروں کو نہیں پوچھتے اور تم سب کا خیال رکھتی ہو۔'' مایا نے نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم بچے تو ہیں نہیں کہ اپنا خیال بھی نہ رکھ سکیں۔''

''میں جانتی ہوں مایا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر میں تم لوگوں کا خیال نہ رکھوں، اپنے آپ کو مصروف نہ رکھوں، تو پھر مجھے اپنے اوپر ترس آنے لگے گا جو میں نہیں چاہتی۔''

اپنے چہرے کے گہرے گھاؤ پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ ''ویسے مایا! میری ایک بات یاد رکھنا۔'' وہ بہت سنجیدگی سے بولی۔ ''اس راجر سے ذرا بچ کر رہنا، اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس کو دس گز کے فاصلے پر رکھتی۔ عجیب وغریب مخلوق ہے یہ، توبہ، توبہ مجھے تو زہر لگتا ہے۔ پاگل کہیں کا۔'' اس نے ذرا خوف زدہ ہو کر کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا سائرہ؟'' بٹن بند کرتے کرتے اس کا ہاتھ رک گیا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ یہ ان سب کا..... میرا مطلب ہے راجر نے سب کو.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''بھئی میں کچھ نہیں کہہ رہی، بس میری یہ نصیحت ہے تمہارے لیے کہ تم کو اپنا بہت خیال رکھنا ہے، میں تمہیں اپنی دوست سمجھتی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں۔''

وہ دن بھی بہت عجیب کیفیت میں گزرا۔ خوف، پریشانی، گھبراہٹ سے اس سے کوئی کام بھی ٹھیک سے نہ ہو سکا۔ شام پانچ بجے کمال صاحب نے شوٹنگ ختم ہونے کا اعلان کیا۔

''لڑکیو، منگل تک کوئی کام نہیں ہے، بس لیے چھٹی رہے گی۔''

اس نے ذرا سکھ کا سانس لیا۔ پورے تین دن کی چھٹی اور شاہ میر بھی آج رات کی فلائٹ سے واپس آ رہا تھا۔

☆☆☆

شاہ میر کو ائرپورٹ سے بھی اسی نے پک کیا۔ اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ تمام راستے ان دونوں قتل ہونے والی لڑکیوں کے متعلق بتاتی رہی۔

''شاہ میر! وہ دونوں ہماری ایجنسی کے لیے ہی کام کرتی تھیں۔'' اس نے ذرا جوش سے کہا۔

شاہ میر خاموش تھا، وہ مسلسل تفصیلات بتا رہی تھی۔

''مایا بس کرو، پلیز.....'' شاہ میر نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ وہ گھبرا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تناؤ تھا، طنز تھا جو مایا کے لیے بہت انوکھا تھا۔

''میں تنگ آیا ہوں، اس ''بیوٹی کلر'' قاتل کے نام سے۔ جہاں جاؤ یہی ذکر۔ تمام اخبار بھرے ہوئے ہیں... ٹی وی پر بریکنگ نیوز، اور اب تم..... تم بھی یہی قصہ لے بیٹھی ہو۔'' اس نے ذرا گہری سانس لی۔

''آئی ایم سوری مایا، میں اتنے دن تم سے دور رہا میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تم سے رومینٹک، مزے مزے کی باتیں کروں گا۔ تمہاری باتیں سن کر غصے پر قابو نہ پا سکا۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔'' اس نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''بس سر جی، اب اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں ہوگی، پرامس۔'' اس کے ہاتھوں کے لمس نے بدن میں جیسے بجلی سی دوڑا دی۔

باقی راستہ خاموشی سے گزرا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کر لیا اور وہ فلیٹ تک پہنچ گئے۔

''مایا! اگر تم مائنڈ نہ کرو تو آج میں نہ رک سکوں گا، تھکاوٹ کے ساتھ سر میں بہت درد ہے اس طرح تم کمپنی انجوائے بھی نہ کر سکو گی۔'' اس نے ذرا نرمی سے کہا۔

اسے مایوسی تو بہت ہوئی لیکن آواز میں بشاشت لاتے ہوئے بولی۔ ''کوئی بات نہیں شاہ میر، آپ گھر جا کر آرام کریں، انشاء اللہ کل ملیں گے۔''

شاہ میر نے اسے گلے لگا لیا۔ ''تم جانتی ہو میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں، آئی لو یو۔'' جذبات سے اس کی آواز

بھاری ہوگئی۔

''آئی لو یو ٹو شاہ میر۔'' اس نے خواب ناک آواز میں کہا۔

جی چاہا، لمحے جاوداں ہوجائیں، وقت تھم جائے۔

☆☆☆

فلیٹ کے دروازے تک اسے چھوڑ کر شاہ میر واپس لوٹ گیا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور دروازہ مضبوطی سے بند کرلیا۔ سونے کی تیاری کرتے ہوئے اسے شاہ میر کا رویہ یاد آگیا۔ جب سے اس کی شاہ میر سے ملاقات ہوئی اس نے کبھی بھی اس کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا تھا، اتنی بدتمیزی اور بلند آواز۔ اسے حیرت ہورہی تھی کہ ''بیوٹی کلر'' کے ذکر پر وہ بھڑک سا گیا تھا۔ وہ نرمی سے اسے منع بھی کرسکتا تھا۔ بار بار اس کا ذہن وہی سین دہرا رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ میں اس چھوٹی سی بات کو اپنے حواسوں پر سوار نہیں ہونے دوں گی۔ اس نے ذہن سے بات نکال دی اور ریلیکس ہوگئی۔

ہفتے کا دن دونوں نے ایک دوسرے کی معیت میں گزارا۔ خوب صورت، رومینٹک اور خوشگوار ماحول میں۔ گزری ہوئی باتوں کی کلفت دور ہوگئی۔ ذہن ہلکا پھلکا ہوگیا۔ اتوار کی صبح اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر پڑا ہوا اخبار اٹھایا جو اس کا ہاکر گرا جاتا تھا۔ ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ بڑی بڑی سرخیوں میں دی ہوئی خبر نے جیسے دل کو جکڑ لیا۔ ''بیوٹی کلر'' کا ایک اور شکار۔ وہ جلدی جلدی دروازہ بند کر کے اخبار اندر لے آئی اور دھڑکتے دل سے پڑھنے لگی۔

''جمعے کی رات ایک اور ماڈل کرسٹل اسی بربریت کا شکار ہوگئی جس کا شکار اس سے پہلے پانچ ماڈلز ہوچکی ہیں۔ پولیس کے مطابق گھر کا سامان چوری ہوا نہ کوئی زبردستی اندر داخل ہونے کی شہادت ملی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مقتولہ قاتل کو اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اس کے لیے خود ہی دروازہ کھول دیا۔'' مایا کو پچھلے جمعے کا خیال آیا۔ ان کی شوٹنگ میں کرسٹل نے بھی حصہ لیا تھا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ کرسٹل نے کسی سے ملنے کا ذکر کیا ہو۔ جب اس سے اس لیے ویک اینڈ کا پوچھا تو بولی۔ ''یار تھک کر چور ہوں، گھر جا کر خوب لمبا سوؤں گی۔'' ایسا لگتا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی آرام کررہی ہوگی۔ کسی سے ملنے کا ارادہ بھی نہ تھا لیکن وہاں ایسا کوئی شخص ضرور آیا ہوگا جس کے کھٹکھٹانے پر اس کی آواز پہچان کر اس نے دروازہ خود ہی کھول دیا ہوگا۔

مارے دکھ اور درد کے وہیں پڑی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔ اخبار ابھی بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ سارے خوشگوار موڈ کا بیڑا غرق ہوگیا تھا۔ بے چاری کرسٹل۔ کتنی اچھی دوست بن گئی تھی اس کی۔ زندگی سے بھرپور، ہنستی، مسکراتی کرسٹل۔ اس نے مایا کو اپنے بارے میں بتایا تھا اس کا نام کرسٹل نہیں تھا۔ وہ پنجاب کے ایک چھوٹے شہر سے تعلق رکھتی تھی۔ ماں باپ نے نام ''کلثوم بی بی'' رکھا تھا۔ قدامت پسند، غریب گھرانا، شکل صورت بہت اچھی تھی۔ پڑھائی کوئی خاص نہ تھی۔ بس فلمیں، ٹی وی پر دیکھ دیکھ کر ایکٹریس بننے کا شوق ہوگیا تھا۔ محلے میں ایک لڑکا شکیل بھی یونہی آوارہ پھرتا رہتا تھا اس سے دوستی ہوگئی۔ شکیل کو بس دبئی جانے کا شوق تھا۔ اس نے کسی ایجنٹ سے بات کی ہوئی تھی۔ کلثوم بی بی عشق کی ماری ہوئی تھی۔ اس سے کہا کہ وہ اس سے شادی کر کے لاہور یا کراچی لے جائے تاکہ کسی فلم ڈائریکٹر والے سے بات ہوسکے۔ شادی تو اس نے کیا کرنی تھی، اس کو ورغلایا کہ گھر میں پڑی ہوئی کوئی بھی قیمتی شے اور نقدی لے کر رات کے اندھیرے میں تیار رہے۔ جب اس نے ماں باپ کی دہلیز پار کی تو اس کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ دونوں بھاگ کر کراچی آگئے۔ کچھ دن ایک دوست کے یہاں ٹھہرے لیکن خطرہ ہر طرف تھا۔ اس کے بھائی کے دوست اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ خوف اور ڈر کے مارے سارا عشق ہوا ہوگیا۔ جس دوست کے پاس وہ دونوں ٹھہرے ہوئے تھے اس کی بیوی بیوٹی پارلر میں کام کرتی تھی۔ اس نے کلثوم کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا حلیہ بدل لے، بالوں کو براؤن ڈائی کیا۔ آنکھوں میں نیلے کونٹیکٹ لینز لگائے اور نام کرسٹل رکھ لیا۔ شکل صورت کافی خوب صورت تھی۔

''ارے تم تو اب ماڈل لگتی ہو۔'' زرینہ نے خوش ہو کر کہا۔ ''میرے ساتھ پارلر آجایا کرو، وہاں میڈ مز کافی آتی ہیں، ہوسکتا ہے کوئی تمہیں کام دے دے۔''

شکیل اس کی زندگی سے ویسے بھی غائب ہوچکا تھا۔ اور یوں وہ کرسٹل بن کر ''سلور بیل'' میں کام کرنے لگی۔ مہارت اتنی ہوگئی کہ دھڑا دھڑ کمرشلز، اشتہارات ملنے شروع ہوگئے۔ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

''ویسے مایا، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے والدین، بھائی، بہن اور قریبی رشتے داروں سے ایسا رشتہ جوڑا ہے کہ وہ دنیا میں کہیں بھی ہو، ان کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔

دن تو کام میں مصروف رہ کر گزر جاتا ہے لیکن جونہی رات ہوتی ہے پتا نہیں کہاں کہاں سے یادیں ٹپک پڑتی ہیں اور تمام رات سونے نہیں دیتیں۔ میں نے ایک اچھا کام شروع کیا ہے۔ اپنے ابو کے نام ہر مہینے ایک منی آرڈر بھجوانا شروع کیا ہے شروع میں تو ان کو سمجھ نہیں آیا کہ کون بھجوا رہا ہے۔ پھر میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو اعتماد میں لے کر تمام واقعہ بتا دیا کہ میں تو شاید ہی کبھی گاؤں واپس آؤں لیکن میرے ماں باپ، بہن بھائی اپنی زندگی کو ڈھنگ سے گزار سکیں۔''

بہت دکھ اور تکلیف سے اس نے یہ تمام واقعہ مایا کو بتایا۔

وہ جانتی تھی کہ کرسٹل نے یہ باتیں کبھی کسی سے شیئر نہیں کی ہوں گی۔ اس کی ذاتی، پرائیویٹ لائف، اور اب وہ جا چکی تھی۔ اپنے تمام خواب، خواہشوں اور آرزوؤں کے ساتھ، کسی ظالم، دیوانے کے ہاتھوں قتل ہو کر قبر میں جا چکی تھی۔ کتنا ظلم تھا یہ، کیا قصور تھا اس کا اور باقی دوسری ماڈلز کا۔

وہیں بیٹھ کر چپکے چپکے وہ آنسو بہاتی رہی، ایک اچھی دوست کی یاد میں۔ شاہ میر گیارہ بجے آ رہا تھا۔ سوچا تھا برنچ کریں گے، ناشتے میں اتنا کچھ بنا لے گی کہ پھر لنچ کی ضرورت نہ پڑے گی۔ گروسری فریج میں رکھی ہوئی تھی۔ سامان سب تیار تھا لیکن اب جیسے ڈھے سی گئی۔ کچھ بھی کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بس یونہی روتی رہی۔

''یا اللہ! یہ سب عذاب آخر کب ختم ہوگا، کب تک یہ قاتل یونہی دندناتا پھرے گا۔'' اس نے سوچا۔

پھر اس نے مجرم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کون ہو سکتا ہے، یہ بات تو طے تھی کہ جو کوئی بھی تھا وہ سب کو جانتا تھا اور یہ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں شاہ میر آ گیا۔ وہ بھی تو ان سب ماڈلز کو جانتا تھا۔ جس طریقے سے وہ اچانک ہی جمعے کی رات اسے چھوڑ کر گیا تھا، بہت عجلت میں..... تو کیا وہ.....؟ اس نے خوف زدہ ہو کر اپنے گال پیٹ ڈالے۔

''توبہ، توبہ..... میں یہ کیا سوچ رہی ہوں، ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اسے محسوس ہوا کہ وہ بلند آواز میں یہ کہہ رہی ہے۔ اچھل کر کرسی سے اٹھی اور یونہی فلیٹ میں اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ اس نے جتنا اس فضول خیال کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کی۔ وہ اتنا ہی اسے جیسے چپک سا گیا۔

شاہ میر کا تقریباً تمام ماڈلز سے کسی نہ کسی صورت میں تعلق تھا۔ اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے بزنس کے سلسلے میں ہیلو ہائے تھی۔ پھر کار میں اس کا مایا کے ''بیوٹی کلز'' کے ذکر پر اتنی بُری طرح سے بھڑک اٹھنا۔ جمعے کی رات کو سر درد کا بہانہ بنا کر اس کو دروازے تک چھوڑ کر چلے جانا کہ تھکاوٹ بہت ہو گئی ہے رک نہیں سکتا۔ اس سے پہلے وہ جب بھی شہر سے باہر جاتا تھا تو واپس آنے پر اس کا والہانہ پن مایا کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیتا تھا۔ بس یہ سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہو گیا۔ گیارہ بجنے والے تھے اور وہ..... اس سے ملاقات کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانا تھا۔ اپنے دماغ میں آنے والے اس شک کو دور کرنا تھا۔ اس نے فون اٹھایا۔ کانپتے ہاتھوں سے شاہ میر کا نمبر ملایا۔ چار گھنٹیوں کے بعد اس کی آواز آئی۔

''ہیلو۔''

''شاہ میر! مجھے لگتا ہے کہ آج مجھے برنچ کا پروگرام کینسل کرنا ہوگا۔ میری طبیعت خراب ہے۔ لگتا ہے جیسے فلو ہو گیا ہو۔'' رونے سے اس کی آواز ویسے ہی بھاری ہو رہی تھی۔

''تم نے اخبار کی سرخی پڑھ لی ہے۔'' جذبات سے عاری آواز میں اس نے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اور یقین کرو اس خبر کو پڑھ کر تو طبیعت اور بھی بگڑ گئی ہے۔ سوری ڈارلنگ، میں رات کو فون کر کے بات کر لوں گی۔'' لجاجت سے اس نے کہا۔

''تو ایسا کیوں نہ کریں، ناشتے کو گولی مارو، میں ویسے ہی آ جاتا ہوں۔ تمہاری تیمارداری بھی کر لوں گا اور تمہاری حسین صورت کا دیدار بھی کر لوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں تمہیں بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ تمہیں آرام کرنے دوں گا۔'' بڑی بشاشت سے اس نے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے اتنی سختی سے کہا کہ خود بھی اپنے لہجے پر اسے حیرت ہوئی۔ ''میرا مطلب ہے کہ جس وائرس نے مجھ پر حملہ کیا ہے وہ آپ کو نہ لگ جائے۔ بس تمام دن آرام کروں گی، آپ سے رات میں بات ہو گی۔'' بڑی مشکل سے اس نے بات بنائی۔

''اچھا میڈم جی..... آپ جیتیں میں ہارا۔ ویسے آپ یہ اس خادم کے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں۔ میں تمام دن آپ کے لیے فکرمند رہوں گا، اچھا سنو، فون ضرور کر لینا، اپنا بہت سا خیال رکھنا۔'' اس نے بند فون کیا تو مایا شرمندہ سی ہو گئی۔

یہ مجھے کیا مسئلہ ہے، اپنی جان سے زیادہ عزیز شاہ میر پر شک کر رہی ہوں۔ اسے اس منحوس قاتل کی لسٹ میں شامل کر رہی ہوں جسے میری فلاح کا اتنا خیال ہے۔ ایک

لمحے کے لیے سوچا۔ فون کر کے اسے بُلا لوں۔ پھر سوچا اب بات بنا چکی ہوں تو بھرم بھی رکھنا ہوگا۔ وضاحتیں دینی ہوں گی، وہ کیا سوچے گا؟

☆☆☆

اس سہ پہر کو جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو وہ اُچھل پڑی۔ اٹھ کر دروازے کے پاس پہنچی۔ سوچا شاہ میر نے میرا کہنا نہ مان کر بھی آنے کا ارادہ کرلیا۔ اسے یہ سوچ کر خوشی ہوئی لیکن پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں سائرہ، میں اندر آسکتی ہوں؟''

اس نے جلدی سے دروازے کا لاک کھولا۔ سائرہ باہر کھڑی تھی۔ ''ارے سائرہ، تم یہاں؟ بڑی اچھی سرپرائز دی ہے تم نے۔'' خوشی سے اسے ملتے ہوئے مایا نے کہا۔

''بس یار، ادھر سے گزر رہی تھی، تمہارا خیال آگیا کہ تمہارا فلیٹ بھی نزدیک ہی ہے مل لوں۔ تم نے مائنڈ تو نہیں کیا؟'' سائرہ اندر آتے ہوئے بولی۔

''ارے کیسی باتیں کر رہی ہو، مجھے تو تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم کی طرف اسے لاتے ہوئے وہ بولی۔

''چائے پیو گی؟ میں نے ابھی ابھی بنائی ہے گرما گرم۔'' کچن کی طرف جاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''پی لیتی ہوں، شکریہ۔'' اس کی آواز پیچھے سے آئی۔

مایا نے الماری میں سے دو مگ نکالے، چائے دانی میں سے چائے انڈیلی اور سائرہ کی طرف مڑی۔

سائرہ اس کے پیچھے کچن میں آچکی تھی۔ چائے کا مگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر کر کرچی کرچی ہوگیا۔ اس نے دیکھا۔ سائرہ کے ہاتھ میں بہت لمبا چمک دار چھرا ہے جسے اس نے بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے، اور وہ مایا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔

''اب مرنے کی تمہاری باری ہے مایا۔'' قسائی والا لمبا چھرا لہراتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی۔

خوف، اور دہشت کے مارے اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اس نے پیچھے کھسکتے ہوئے کاؤنٹر کو پکڑنے کی کوشش کی کہ کسی طرح سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

اچانک اس نے پوری قوت کے ساتھ چھرا اس کی طرف گھمایا۔ مایا نے دیوانوں کی طرح کچھ پکڑنے کی کوشش کی۔ دائیں طرف ہوتے ہوئے گرم چائے کی چائے دانی اس کے ہاتھ آگئی۔ پوری قوت سے وہی چائے دانی اس نے سائرہ کی طرف گھما کر دے ماری۔ کھولتی ہوئی چائے اس کے چہرے اور جسم پر گری تو چیختی چلاتی سائرہ کے ہاتھ سے چاقو اچھل کر ایک طرف جا گرا۔

وہ پاگلوں کی طرح اپنے چہرے کو مل رہی تھی، چیخ رہی تھی، اسی لمحے دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ جیسے کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اسے شاہ میر کی آواز آئی۔ ''مایا! جلدی سے دروازہ کھولو، جلدی کرو۔'' وہ چیخ رہا تھا۔

وہ بھاگ کر دروازے کی طرف لپکی۔ وہ اتنی بُری طرح سے کانپ رہی تھی کہ لاک کھولنا مشکل ہو رہا تھا۔ باہر شاہ میر کھڑا تھا۔ وہ بے ہوش سی ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

''کیا ہوا، مایا! میں نے تمہاری چیخ سنی تھی۔'' وہ جھنجوڑ جھنجوڑ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''شاہ میر، وہ سائرہ تھی۔ سائرہ سب کی قاتل ہے۔'' سسکیوں کے درمیان وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

اتنے میں سائرہ ان دونوں کی طرف لپکی۔ چاقو اس نے پھر سے پکڑ لیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح ان کی طرف لپکی۔

''اب تم دونوں کی باری ہے۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ، میں چھوڑوں گی نہیں۔'' چیخ چیخ کر وہ کہہ رہی تھی۔

شاہ میر نے پورا زور اپنے دائیں پاؤں پر ڈالتے ہوئے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر بائیں پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ چھرا گر کر دور جا پڑا۔ چھرا اپنے قبضے میں لے کر اس نے پولیس کو فون کیا۔ انہوں نے آتے ہی اسے گرفتار کرلیا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے دو تین گھنٹے مایا نے ہوش اور نیم ہوش میں گزارے۔ اپنی پوری قوت جمع کر کے اس نے پولیس کو اپنا بیان تو دے دیا لیکن ان کے فلیٹ سے نکلتے ہی وہ وہیں صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ خوف کی شدت سے اس کا جسم اور ذہن جیسے مفلوج ہو گئے تھے۔ دل متلا رہا تھا، چکر آرہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح سے رو رہی تھی۔ سسکیوں کے ساتھ۔

''اوہ شاہ میر، آج اگر آپ نہ آئے ہوتے تو.....'' بار بار وہ شاہ میر سے کہہ رہی تھی۔ وہ بڑی محبت اور نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''اب تم بالکل محفوظ ہو میری جان۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔

بس اس کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرو۔''

اس کے بعد جانے وہ کتنی دیر تک وہاں اس صوفے پر لیٹی رہی۔ شاہ میر نے اس کے اوپر کمبل ڈال دیا تھا۔ خود وہ وہیں پڑی آرام دہ کرسی پر بیٹھا رہا۔

اگلے دن وہ اپنے حواسوں میں آگئی۔ شاہ میر ابھی بھی اس کے پاس موجود تھا۔

''سائرہ کا اب کیا بنے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کو مینٹل اسپتال لے گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ وہ پاگل ہے۔ جب اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور چہرہ بدنما ہوگیا تھا تب سے وہ نیم پاگل سی ہوگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ ماڈل نہیں بن سکتی تو پھر کسی لڑکی کو بھی ماڈل بننے کا حق نہیں ہے۔ وہ ان کے چہروں پر چھرے سے حملہ کرتی تھی اور اتنی دفعہ وار کرتی تھی جب تک وہ چہرہ بالکل زخم زخم نہ ہو جائے۔ اس میں حملہ کرنے کی بے پناہ قوت آجاتی تھی۔'' شاہ میر نے بتایا۔

''لیکن وہ تو بے حد اچھی، محبت کرنے والی، سب کی مدد کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ ایسا قدم کیسے اٹھا سکتی تھی؟''

''اپنی محبت اور ہمدردی جتا کر ہی وہ لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیتی تھی۔ سب لڑکیاں اس کے لیے اپنے دل میں بے پناہ ہمدردی اور محبت کا جذبہ رکھتی تھیں۔ اسی لیے تو جب وہ ان سے ان کے گھر ملنے جاتی تھی تو وہ فوراً دروازہ کھول کر اسے اندر آنے دیتی تھیں۔''

''لیکن کسی کو اس طرح بے دردی سے قتل کرنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے ہوتا ہے؟''

''دراصل وہ یہ سب کرنے کے بعد بالکل بھول جاتی تھی کہ وہ کیا کر بیٹھی ہے۔''

''مجھے تو اس پر ترس آرہا ہے کہ وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بعد بالکل بھول جاتی تھی کہ کیا کر بیٹھی ہے۔ اگر اس کا وہ خوفناک ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو وہ بھی نارمل ہوتی۔'' مایا نے افسوس سے کہا۔

''ترس آرہا ہے؟'' شاہ میر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''لڑکی، وہ تمہیں قتل کرنے کے ارادے سے آئی تھی اور شاید کر بھی دیتی، اللہ نہ کرے۔ اگر میں بروقت نہ پہنچ جاتا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو مایا، نرم دل اور کھوٹ سے پاک۔'' شاہ میر نے محبت سے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

اس کی بانہوں میں آکر اسے محسوس ہوا کہ وہ خود کو کتنا محفوظ محسوس کر رہی ہے ہر خطرے سے دور۔ طمانیت سے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

اگلے دن سب سے پہلے آفس جا کر راجر سے ملاقات کی، اسے تمام بات بتا دی کہ وہ اس دن اس سے ملنے کے لیے کیوں کترا رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا۔

''لیکن آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے تھے؟'' مایا نے پوچھا۔

''اوہ کچھ نہیں، دراصل مجھے آپ ہمیشہ سے ہمدرد اور اچھی لگتی تھیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے۔ میں بس آپ سے کچھ ذاتی باتیں شیئر کرنا چاہتا تھا۔'' سر جھکا کر نیچے دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

''اوہ راجر۔'' مایا کا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر راجر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ میرے لیے آپ کے جذبات اچھے ہیں، مجھے اپنا دوست سمجھا اور مجھ پر اعتماد کیا۔''

آفس میں داخل ہوئی تو وہاں عجیب سماں تھا..... ٹی وی کے رپورٹر، کیمرا مین اپنے اپنے کیمرے سیٹ کر رہے تھے۔ اینکرز پوری کوشش کر رہے تھے کہ مایا سے بات کرسکیں۔ کیمرے آن ہو چکے تھے۔ اتنی دیر میں ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس نے دیکھا۔ شاہ میر اندر داخل ہو رہا تھا۔

سب اس کی تعریف کر رہے تھے کہ اس نے مایا کی جان بچائی اور اس کی وجہ سے ایک انتہائی خطرناک اور شاطر قاتل کی گرفتاری عمل میں آئی۔

مسکراتا ہوا وہ مایا کی طرف آیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''بھئی آپ لوگ مجھے صرف ایک ہینڈسم، اسمارٹ، خوش مزاج اور کامیاب بزنس مین ہی سمجھتے تھے۔'' وہ مسکرایا۔

''ہم اپنی عورتوں کی حفاظت خوب اچھی طرح کرنا جانتے ہیں۔'' اس نے مایا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''اور ہاں مایا نے بھی بہت ہمت اور بہادری دکھائی ہے۔'' ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

''تمہیں ہیرا مل گیا ہے مایا! بہت خوش قسمت ہو، اس کا خیال رکھنا۔'' کسی نے کہا۔

''جی ہاں، اپنی جان سے بڑھ کر۔'' اس نے کہا۔ اور اپنا سر شاہ میر کے سینے سے ٹکا دیا۔

❖❖❖

حوصلہ مند

حسام بٹ

غلط کاموں سے بچنے کے لیے انتہائی قدم اٹھانا پڑتا ہے... ایمان داری سے سچائی کے راستوں پر چلنے کے لیے جگہ بنانی پڑتی ہے... راہ میں جگہ جگہ رکاوٹیں قدموں کو روکتی ہیں مگر حوصلہ مند اور جی دار اپنے ارادوں کی مضبوطی اور ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہتے ہیں... وہ مکروہ چہروں کے درمیان پھنسا ہوا تھا... اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہونے کو بے قرار تھا... بالآخر فیصلہ کن گھڑی آن پہنچی...

ایک فرض شناس پولیس افسر کی حکمتِ عملی کا جارحانہ ثبوت.....

نصف شب کا عمل تھا۔ اسٹیشن ہاؤس آفیسر (تھانہ انچارج) نواز علی اپنے کمرے میں بیٹھا ''ایرو بینک روبری'' کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تین مسلح ڈاکو دن دہاڑے ''ایرو بینک'' سے دس کروڑ کی خطیر رقم لوٹ کر غائب ہو گئے تھے۔

یہ واقعہ آج سے تین روز پہلے یعنی بارہ فروری کی دوپہر میں پیش آیا تھا۔ ایرو بینک چونکہ انسپکٹر نواز علی کے تھانے کی حدود میں آتا تھا لہٰذا اس کے دن کا سکون اور رات کی نیند اُڑی ہوئی تھی۔ اس کا دماغ مسلسل ان روبرز کے بارے ہی میں سوچ

رہا تھا جنہیں گرفتار کرنا اس کی زندگی کی پہلی ترجیح بن چکی تھی۔

اے ایس آئی آصف محمود اس کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے سوالیہ نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا اور اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''اس نے زبان کھولی کہ نہیں؟''

''اس'' سے نواز علی کی مراد عدنان نامی ایک شخص تھا جسے آج دوپہر ہی میں اس کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ عدنان اس بینک ڈکیتی کیس میں پرائم سسپیکٹ کی حیثیت کا حامل تھا۔ اس روبری سے ایک روز پہلے کی سی سی ٹی وی ویڈیوز میں شام سے تھوڑی دیر پہلے عدنان، ایرو بینک کے سامنے مشتبہ حرکات کرتا ہوا پایا گیا تھا۔ بینک کے بیرونی حصے میں نصب کلوز سرکٹ ٹی وی کیمراز نے گیارہ فروری کی شام عدنان کی مشکوک کارروائی کو بڑی کامیابی سے ریکارڈ کر لیا تھا۔ عدنان کو تلاش کرنے میں پولیس کو تین دن لگ گئے تھے۔ بہرحال، اس وقت وہ نواز علی کے تھانے کی حوالات میں بند تھا۔

''نو سر.....!'' اے ایس آئی آصف محمود نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ اپنی کہانی پر جما ہوا ہے۔''

''اس کی کہانی بچکانہ ہے۔'' نواز علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کم از کم میں تو اس پر یقین نہیں کر سکتا۔''

''یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا سر.....'' آصف محمود نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن حقیقت تک تو پہنچنا ہے نا۔''

''پھر کیا کریں؟'' نواز علی نے پوچھا۔

''میرے ذہن میں دو راستے ہیں.....'' اے ایس آئی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یا تو ہمیں ضیا کریم صاحب سے اس بندے کے بیان کی تصدیق کرنا چاہیے اور یا پھر.....'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر منحوس لہجے میں اضافہ کر دیا۔

''سر! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ آپ مجھے اس فوٹو گرافر پر تھرڈ ڈگری آزمانے کی اجازت دیں۔ میں اس کی زبان کو کسی ٹیپ ریکارڈر کے مانند بجنے پر مجبور کر دوں گا۔''

اے ایس آئی آصف محمود اس بینک روبری کیس میں انکوائری آفیسر کے طور پر متحرک تھا۔ انسپکٹر نواز علی اپنے اس اے ایس آئی پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ آصف محمود کی ایمان داری، بہادری اور ڈپارٹمنٹ کے ساتھ کمٹمنٹ کو ہر کوئی مانتا تھا۔ آصف محمود ایک ایسا پولیس آفیسر تھا جس کی ایمان داری اور دیانت داری کی سب مثالیں دیتے تھے۔

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس پر تھرڈ ڈگری بھی آزمائیں گے۔'' نواز علی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں ضیا کریم صاحب سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

بات کے اختتام پر انسپکٹر نواز علی نے اپنے سیل فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اے ایس آئی نے استفسار کیا۔

''کیا سر اس وقت جاگ رہے ہوں گے؟''

ضیا کریم ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھا۔ اپنی سروس کے آخری دنوں میں وہ کرائم برانچ میں بہ طور انسپکٹر کام کر رہا تھا۔ وہ خاصا اصول پرست اور کڑک پولیس آفیسر سمجھا جاتا تھا۔ گرفتار شدہ عدنان نے بتایا تھا کہ اس نے گیارہ فروری کی شام ایرو بینک کے سامنے جو فوٹو گرافی کی تھی، اس کے لیے اسے ضیا کریم نے کہا تھا اور صرف پندرہ منٹ کے کام کا پندرہ ہزار معاوضہ بھی دیا تھا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی کہ زندگی میں جب بھی اسے مدد کی ضرورت پیش آئے وہ فوراً سے پیشتر ضیا کریم کو فون کرے مگر..... ایسا کوئی فون کرنے سے پہلے ہی اے ایس آئی آصف محمود نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ بہرحال، اپنی سیٹنگ کے لیے عدنان نے ضیا کریم کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ اے ایس آئی کے حوالے کر دیا تھا۔ مذکورہ کارڈ کے تمام مندرجات صد فیصد درست تھے۔

''اگرچہ آدھی رات ہو رہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ابھی سوئے نہیں ہوں گے۔'' نواز علی نے آصف محمود کے سوال کے جواب میں کہا۔

حسن اتفاق سے ضیا کریم نے انسپکٹر نواز علی کی کال پک کر لی۔ انسپکٹر نے مختصر الفاظ میں ریٹائرڈ پولیس آفیسر کو صورت حال سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔

''سر! آپ کل صبح یا دن میں کسی وقت میرے پاس چند منٹ کے لیے تشریف لائیں تاکہ یہ معاملہ کسی کروٹ بیٹھ سکے۔''

''پہلی بات تو یہ کہ میں عدنان نامی کسی فوٹو گرافر کو جانتا تک نہیں۔'' ضیا کریم نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ یا تو وہ سراسر جھوٹ بول رہا ہے اور یا پھر واقعتاً کوئی جرائم پیشہ شخص میری حیثیت میں عدنان سے ملا ہے اور اسے وہ سب کرنے کے لیے کہا ہے۔ تیسری بات.....'' لمحاتی توقف کر کے ضیا کریم نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس معاملے میں میری ذات کو استعمال کیا گیا ہے۔

یہ سب جان لینے کے بعد میرے لیے ممکن نہیں رہا کہ سو پاؤں لہٰذا میں ابھی آپ سے ملنے آرہا ہوں۔"

"موسٹ ویلکم سر۔" نواز علی نے پُرجوش انداز میں کہا۔

نواز علی نے سیلولر رابطہ موقوف کیا تو اے ایس آئی نے پوچھا۔ "سر کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہ بہت کچھ کہنے اور سننے کے لیے یہاں آرہے ہیں۔" نواز علی نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن حوالاتی کو ابھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ پہلے ہم سر سے بات کریں گے۔ اس کے بعد عدنان کو ان کے سامنے لائیں گے۔"

"سمجھ گیا سر.....!" آصف محمود نے فرمانبرداری سے کہا۔

☆☆☆

عدنان پیشے کے اعتبار سے ایک فری لانس فوٹو گرافر تھا مگر پچھلے دو ماہ سے وہ بقول کسے، بے روزگار چلا آرہا تھا۔ فری لانس ہونے کی وجہ سے اس کی روزی ہوائی تھی۔ اس کی رہائش کمرشل ایریا میں بنی ایک عمارت کی چھت پر تھی۔ وہ سنگل روم کا ایک مختصر سا یونٹ تھا جو عدنان نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ بے روزگاری کے دنوں میں بھی وہ جیسے تیسے گزارہ کر ہی رہا تھا کہ ایک خواہش نما ضرورت نے اسے پریشان کر دیا تھا اور اس ضرورت کا نام تھا وی۔ ڈے.....

آج گیارہ فروری کا دن تھا اور تین دن کے بعد یعنی چودہ فروری کو وی۔ ڈے (ویلنٹائن ڈے) تھا۔ اس روز وہ اپنی محبوبہ علینا کو کوئی شاندار تحفہ دینا چاہتا تھا۔ شاندار تحفے کا سیدھا سیدھا مطلب ہوتا ہے، مہنگا تحفہ..... اور ان دنوں اس کی مالی حالت خاصی دگرگوں تھی۔

وہ کئی دنوں سے علینا کے گفٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور آج وہ طے کر کے گھر سے نکلا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ اپنا کیمرا فروخت کر دے گا۔ بہرحال مختلف دکانوں سے اپنے کیمرے کی ویلیو معلوم کرنے کے بعد وہ خاصا مایوس ہوا تھا اور انتہائی بددلی کے ساتھ وہ ایک جدید طرز کے مال میں ونڈو شاپنگ کر رہا تھا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس کی ونڈو شاپنگ جاری تھی۔ ایک گفٹ شاپ کے اندر رکھی ہوئی خوب صورت رنگ اسے پسند آگئی۔ گولڈ کی اس سادہ سی رنگ میں ننھے منے ڈائمنڈز جڑے ہوئے تھے۔ اس سائز کے ڈائمنڈز کی زیادہ قیمت نہیں ہوتی مگر وہ رنگ بائیس کیرٹ گولڈ سے بنائی گئی تھی۔ اس نے دل کڑا کر کے سیلز مین سے مذکورہ انگوٹھی کی قیمت پوچھ لی۔

"سر! بارہ ہزار آٹھ سو۔" سیلز مین نے بتایا۔

عدنان جانتا تھا کہ اس معیار کے مالز میں بارگیننگ کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ہر آئٹم کی پرائس فکس ہوتی ہے۔ وہ اپنی پسند کی رنگ کی قیمت سن کر افسردہ ہو گیا۔ وہ اس رنگ کو خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا دل مسوس کر وہ اس شاپ سے باہر نکل آیا۔

ابھی وہ مال کے اندر چند قدم ہی چلا تھا کہ عقب میں کسی نے اسے پکارا۔ "مسٹر سنیے.....!"

عدنان نے پلٹ کر دیکھا تو اسے اپنے سامنے ایک پُرکشش شخصیت کا مالک خوش لباس شخص کھڑا نظر آیا۔ عدنان نے اس ادھیڑ عمر شخص کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا آپ نے مجھے آواز دی ہے؟"

"یس۔ آف کورس!" وہ شائستہ لہجے میں بولا۔ "میرا نام ضیا کریم ہے۔ میں اس ڈائمنڈ رنگ کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، اگر آپ اپنے چند قیمتی منٹ مجھے دے سکیں تو.....؟"

"میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔" عدنان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "جتنے منٹ دل چاہیں، لے لیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو اس ڈائمنڈ رنگ میں کیا دلچسپی ہے جسے میں چھوڑ آیا ہوں؟"

"میری دلچسپی کا سبب بھی یہی ہے کہ آپ قیمت پوچھنے کے بعد اس رنگ کو چھوڑ آئے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کی قوتِ خرید اس رنگ کی قیمت کے سامنے بے بس اور لاچار ہے۔" ضیا کریم نامی وہ شخص عدنان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے کہ وہ رنگ آپ اپنی سوئٹ ہارٹ کے لیے خریدنا چاہتے ہیں مگر آپ کی جیب اجازت نہیں دے رہی۔ اگر آپ چند منٹ کے لیے میرے ساتھ کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ جائیں تو میں وہ رنگ خریدنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" پھر وہ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے کے بعد معتدل انداز میں بولا۔ "اس مال کے تھرڈ فلور پر ایک برانڈ کافی ہاؤس ہے۔ کیا وہاں چلیں.....؟"

ضیا کریم کی متاثر کن شخصیت اور مہربان پیشکش کے سامنے عدنان نے سپر ڈال دی۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد وہ مذکورہ برانڈ کافی ہاؤس کے پُرسکون، خواب ناک ماحول میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دوں۔" ضیا کریم گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس کے بعد تمہاری سنوں گا۔"

وہ شخص کافی ہاؤس میں براجمان ہوتے ہی ''آپ'' سے سلپ ہو کر ''تم'' پر آ گیا تھا۔ بہرحال، عدنان نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''او کے.....!''

''میں تمہیں اپنا نام تو بتا ہی چکا ہوں۔'' وہ اپنی جیب میں سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر عدنان کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر ہوں۔ کرائم برانچ میں انسپکٹر کے عہدے پر کام کر چکا ہوں۔ آج کل ایک حساس ادارے کے لیے خدمات انجام دے رہا ہوں اسی لیے پبلک ڈریس میں ہوں.....''

عدنان ایک نظر ضیا کریم اور ایک نگاہ اس کے وزیٹنگ کارڈ کو تکنے لگا۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر پسینا نمودار ہو گیا تھا اور ذہن میں طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات ڈوبنے ابھرنے لگے تھے۔ ضیا کریم نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

''مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک پولیس والا ضرور ہوں مگر اس وقت مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے لہٰذا تم مجھے اپنا ایک دوست ہی سمجھو.....''

''آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟'' عدنان نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''بتاتا ہوں۔'' ضیا کریم رسان بھرے لہجے میں بولا۔ ''پہلے تم اپنا تعارف کرا دو۔ پھر آگے کی بات کریں گے۔''

عدنان نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ضیا کریم کو اپنے بارے میں بتا دیا جس میں اس کا نیچر آف جاب، مالی حالات کا رونا، علینا سے محبت، کیمرا کی فروخت کے لیے کی جانے والی کوشش وغیرہ سب شامل تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''سر! اس کیمرے کی مارکیٹ ویلیو ایک لاکھ سے اوپر ہے.....'' وہ میز پر رکھے ہوئے اپنے ڈیجیٹل کیمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر یوز میں بھی ہو تو ساٹھ ہزار سے کم کا نہیں ہوگا اور مارکیٹ میں کوئی دکان دار اس کے دس ہزار دینے کو تیار نہیں۔''

''لعنت بھیجو ان نامرادوں پر۔ یہ کم بخت ایسے ہی بدذات اور کمینے ہوتے ہیں۔'' ضیا کریم نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''بہرحال..... میرے پاس تمہارے لیے ایک اسائنمنٹ ہے۔ اگر تم صرف پندرہ منٹ میرے لیے فوٹو گرافی کرنے کو تیار ہو جاؤ تو میں تمہیں اس جاب کا معاوضہ پورے پندرہ ہزار روپے دوں گا۔ تم یہ آسانی اپنی گرل فرینڈ کے لیے وی۔ڈے کا گفٹ وہ ڈائمنڈ رنگ خرید لو گے.....!''

''ایسا کون سا اسائنمنٹ ہے سر.....؟'' عدنان نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں قانون کا محافظ ہوں اس لیے یہ اطمینان رکھو کہ میں تم سے کوئی غیر قانونی کام تو کراؤں گا نہیں۔'' ضیا کریم اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم ''یس'' کہو گے تو میں تمہیں اس سیدھی سادی چھوٹی سی ''جاب'' کی تفصیلات سے آگاہ کروں گا۔''

عدنان نے ضیا کریم پر بھروسا کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس کی پُرکشش آفر سے وہ اپنے خوابوں کو تعبیر دے سکتا تھا۔ اگر وہ ضیا کریم کی بات مان لیتا تو تین روز بعد، وی۔ڈے پر علینا کو ڈائمنڈ رنگ دینا ممکن ہو جاتا۔

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اب آپ مجھے اسائنمنٹ کے بارے میں بتائیں؟''

''کچھ عرصہ پہلے ''ایرو بینک'' کی مین برانچ میں دس کروڑ کی روبری ہوئی تھی۔'' وہ عدنان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں بولا۔ ''پولیس کی تمام تر کوشش کے باوجود بھی ان تین ڈاکوؤں کا سراغ ملا ہے اور نہ ہی چرائی جانے والی خطیر رقم کے بارے میں کسی قسم کی انفارمیشن ہاتھ لگی ہے۔ اب اس معاملے کی چھان بین نہایت ہی خفیہ طریقے سے ایک حساس ادارہ کر رہا ہے جس کی طرف سے میں اس کیس کو لیڈ کر رہا ہوں.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہم لوگ اپنے آپریشنز میں بعض اوقات عام شہریوں سے بھی کام لیتے ہیں تاکہ کسی کو ہماری کارروائیوں پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ ہم، ہماری مدد کرنے والے کو بھاری معاوضہ بھی دیتے ہیں جیسا کہ میں نے تمہیں پندرہ منٹ کی فوٹو گرافی کے لیے پندرہ ہزار کی پیشکش کی ہے۔''

''میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں سر۔'' عدنان نے مؤدب انداز میں کہا۔ ''لیکن ابھی تک آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ کہاں اور کس طرح کی فوٹو گرافی کرنا ہے؟''

''میں اسی طرف آ رہا تھا.....'' ضیا کریم نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں پچھلے دو گھنٹے سے تمہیں فالو کر رہا تھا۔ کیمرا مارکیٹ سے لے کر مال والی گفٹ شاپ تک میں تمہارے آس پاس موجود رہ کر تمہیں واچ کر رہا تھا جس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تم بہت اچھے اور محبت کرنے والے انسان ہو لیکن اس وقت سخت ضرورت مند ہو لہٰذا میں نے تمہاری مدد کے بدلے تم سے اپنا کام کرانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ میرے

مشاہدے اور تجربے کے مطابق تم ایک قابل بھروسا انسان ہو۔ اس جاب کو نمٹانے کے بعد تم کسی سے اس کا ذکر نہیں کرو گے۔ میں ٹھیک سمجھا ہوں نا؟''

''جی بالکل۔'' عدنان نے اٹل انداز میں کہا۔ ''میں انشاء اللہ! آپ کے اعتماد پہ پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

''ویری گڈ! مجھے تم سے یہی امید ہے اور اب ذرا فوٹو گرافی کی بات ہو جائے۔'' ضیا کریم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے ابھی جس بینک کی مین برانچ کا ذکر کیا، اس کے باہر تین مختلف زاویوں کی ریکارڈنگ کے لیے کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرا زنصب ہیں۔ مذکورہ بینک پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ تم نے ٹھیک چھ بجے سے چھ پندرہ تک اس بینک کے سامنے کھڑے ہو کر سی سی ٹی وی کیمرا ز کی اس طرح فوٹو بنانا ہیں کہ بینک کا فرنٹ ویو فوٹو کے بیک گراؤنڈ میں ضرور نظر آئے۔ میں تمہارے بہت ہی قریب موجود رہوں گا تاکہ کسی نوعیت کے اپ سیٹ میں تمہاری مدد کر سکوں۔ اب بتاؤ، کر لو گے یہ کام؟''

ضیا کریم نے آخری سوالیہ جملہ بڑے سنسنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ عدنان نے بھی پورے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔

''یس سر!''

''جب تم میرا یہ کام کر لو گے تو ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر شاندار ڈنر کریں گے۔'' ضیا کریم نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اس دوران میں، میں تمہاری بنائی ہوئی تمام فوٹوز تم سے لے کر تمہیں پندرہ ہزار روپے دے دوں گا۔ اس کے بعد تم اپنی اس جاب کو ذہن میں ڈیلیٹ کر دینا اور ہاں.....'' وہ کچھ ایسے انداز میں متوقف ہوا جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو پھر عدنان کے چہرے پر نظر جما کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''میرا وزیٹنگ کارڈ سنبھال کر رکھنا۔ زندگی میں اگر کبھی تم پر کوئی مصیبت آئے تو فوراً مجھے فون کرنا۔ میں چٹکی بجاتے ہی تمہارا مسئلہ حل کر دوں گا۔''

''بہت شکریہ سر!'' عدنان نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا کہ سوچا گیا تھا۔ عدنان نے مذکورہ فوٹو گرافس ضیا کریم کے حوالے کر کے پندرہ ہزار وصول کر لیے تھے۔ وی۔ ڈی پر اس نے علینا کو ڈائمنڈ رنگ بھی گفٹ کر دی تھی۔ وہ بہت خوش تھا کہ پندرہ فروری کی دوپہر اے ایس آئی آصف محمود نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ ضیا کریم کو فون کرنے کے بارے میں محض سوچ کر ہی رہ گیا تھا کیونکہ آصف محمود نے اسے کوئی سرگرمی دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور گرفتار کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں ڈال دیا تھا۔

وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے آصف محمود اور نواز علی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ ایرو بینک والی روبری میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ وہ پولیس والوں کو ضیا کریم سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں من وعن بتا چکا تھا مگر کوئی اس کی سنائی ہوئی کہانی کو سچ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

وہ بیٹھے بٹھائے ایک خطرناک جھمیلے میں پھنس گیا تھا۔

☆☆☆

رات کا ایک بجا تھا۔ ریٹائرڈ انسپکٹر کرائم برانچ ضیا کریم، ایس ایچ او نواز علی کے کمرے میں موجود تھا۔ نواز علی نے عدنان کی سنائی ہوئی کہانی ضیا کریم کے گوش گزار کر دی تھی۔ ضیا کریم نے پوری توجہ سے اس کے بیان کو سنا اور نواز علی کے خاموش ہونے پر کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کسی شاطر مجرم نے اس بندے کی سادگی، ضرورت اور مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایرو بینک روبری کے معاملے میں ملوث کرنے کے لیے یہ سارا کھیل رچایا ہے تاکہ روبری کے بعد پولیس کو گمراہ کیا جا سکے۔ عین ممکن ہے کہ ضیا کریم بن کر عدنان سے ملاقات کرنے والا کوئی ایسا شخص ہو جسے ماضی میں، میں نے کڑی سزا دلوا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچایا ہو۔ رہائی کے بعد اس کرمنل نے بینک ڈکیتی کا منصوبہ بنایا ہو اور مجھ سے انتقام لینے کی غرض سے اس نے عدنان کو استعمال کیا ہو تاکہ پولیس یہی سمجھے کہ اس روبری کا ماسٹر مائنڈ ڈپارٹمنٹ ہی کا کوئی آدمی ہے یعنی کہ میں..... ضیا کریم، میری بات آپ کی سمجھ میں آ رہی ہے نا؟''

''یس سر! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔'' نواز علی نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی لگنا کافی نہیں ہے انچارج صاحب!'' ضیا کریم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میری ذات کو ایرو بینک روبری میں ملوث کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اب میرا یہ فرض بنتا ہے کہ اپنے اوپر چھائے ہوئے شکوک وشبہات کے بادلوں کو صاف کروں لہٰذا.....'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ٹھوس انداز میں بولا۔

''لہٰذا آپ عدنان کو یہاں بلائیں اور اس سے میری

شناخت کرائیں۔ جب تک آپ مجھے کلیں چٹ نہیں دیں گے، میں سکون کی نیند سو نہیں سکوں گا۔''

''سر! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔'' نواز علی الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ میرے سینئر ہیں۔ میں بھلا آپ کو شک کی نگاہ سے کیسے دیکھ سکتا ہوں؟''

''یہ آپ کی محبت ہے نواز صاحب لیکن قانون کی نگاہ میں کوئی جونیئر سینئر نہیں ہوتا۔'' ضیا کریم نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''بینک روبری آپ کے تھانے کی حدود میں ہوئی ہے چنانچہ آپ پر بڑی بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ آپ نے اگر یہ کیس حل کرنا ہے تو ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھنا ہوگا حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی.....''

''او کے سر۔'' نواز علی نے فرمانبرداری سے کہا۔

''تو پھر بلائیں حوالاتی کو یہاں۔'' ضیا کریم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور قانونی تقاضے پورے کریں۔''

نواز علی نے اپنے قابلِ اعتماد اے ایس آئی سے کہا کہ وہ عدنان کو اس کے کمرے میں پہنچا دے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ حوالاتی یعنی عدنان وہاں موجود تھا اور نواز علی کے سامنے گردن جھکائے کھڑا تھا۔ نزدیک ہی ایک کرسی پر ضیا کریم براجمان تھا۔

نواز علی نے ضیا کریم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عدنان سے استفسار کیا۔ ''کیا تم انہیں جانتے ہو؟''

عدنان نے بہ غور ضیا کریم کا جائزہ لیا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں سر۔''

''مطلب، تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ زندگی میں کبھی تمہاری ان صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی؟'' نواز علی نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''اچھی طرح اپنے ذہن پر زور ڈال کر جواب دو۔''

''نہیں جناب۔'' عدنان نے بے چارگی سے کہا۔ ''میں آج سے پہلے کبھی ان سے نہیں ملا۔''

''کہیں دور سے انہیں دیکھا ہو؟''

عدنان نے ایک بار پھر نفی میں جواب دیا۔ ''بالکل نہیں۔''

''جاننا چاہتے ہو، یہ کون ہیں؟'' نواز علی نے پوچھا۔

''جی، بتا دیں۔'' وہ معصومیت بھرے انداز میں بولا۔

''یہ ہیں.....'' نواز علی نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''ریٹائرڈ انسپکٹر کرائم برانچ جناب ضیا کریم صاحب.....''

عدنان نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ضیا کریم کی طرف دیکھا۔ ''یہ وہ ضیا کریم نہیں ہیں جنہوں نے پندرہ ہزار دے کر مجھ سے فوٹو گرافی کرائی تھی۔'' وہ بے یقینی سے بولا۔ ''وہ تو ان سے بہت مختلف تھے۔''

نواز علی نے عدنان کو دوبارہ حوالات میں بھیج دیا تو ضیا کریم نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''انچارج صاحب! آپ کی تسلی ہوگئی؟''

''مجھے تو پہلے بھی یقین تھا کہ عدنان کو کسی بہروپیے نے بے وقوف بنایا ہے۔'' نواز علی نے معتدل انداز میں کہا۔

''ایرو بینک روبری کے حوالے سے پچھلے دو تین دنوں میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا بلکہ سوشل میڈیا پر بھی جو کچھ لکھا اور بولا گیا ہے، وہ سب میری نگاہ سے بھی گزرا ہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کوئی مشورہ دوں؟'' ضیا کریم نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''سر! آپ کی رہنمائی میرے لیے مفید ثابت ہو گی۔'' نواز علی نے باادب، باملاحظہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''حکم کریں جناب۔''

''حکم نہیں، عرض ہے انچارج صاحب.....'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ اس نکتے پر غور کریں کہ جس دوران میں یہ روبری ہوئی، وہ عرصہ پندرہ سے بیس منٹ پر محیط ہے اور مزے کی بات یہ کہ بینک کے اندر اور باہر نصب تمام کے تمام سی سی ٹی وی کیمرا زاس واردات کو ریکارڈ نہیں کر سکے۔ آئی ٹی ڈپارٹمنٹ نے کسی ٹیکنیکل خرابی کو اس مسنگ کا سبب بتایا ہے لیکن میں کسی اور انداز میں سوچتا ہوں۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ٹٹولنے والی نظر سے نواز علی کو گھورا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ دس کروڑ کی اس روبری میں اندر کا کوئی آدمی ملوث ہے۔''

نواز علی نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے، بینک کے اسٹاف میں سے کوئی؟''

''بالکل، میرا یہی مطلب ہے۔'' وہ اٹل انداز میں بولا۔ ''اور وہ بھی کوئی اعلیٰ عہدے دار۔ آپ غور تو کریں۔ اس روبری سے ایک روز پہلے آپ کا یہ حوالاتی بینک کے بیرونی حصے کی چند فوٹو اتارتا ہے تو سی سی ٹی وی کیمرا زاس کی موومنٹس کو کیپچر کرنے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لیتے اور اس سے اگلے دن جب دن دہاڑے تین مسلح روبرز بینک کے اندر دندناتے ہوئے لوٹ مار کر رہے تھے تو اندر، باہر

کے سب کلوز سرکٹ کیمرا نے شرما کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ٹیکنیکل خرابی..... مائی فٹ۔''

''سر! آپ نے بڑی پتے کی بات کی ہے۔'' نواز علی نے کہا۔ ''اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔''

''آپ اس پوائنٹ کو ذہن میں رکھ کر مینیجنگ لیول کے بینک اسٹاف کو اینٹروگیٹ کریں گے تو مجھے یقین ہے، آپ کو ضرور کامیابی ملے گی۔'' ضیا کریم نے کہا۔ ''مشورہ دینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ عمل کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے انچارج صاحب۔''

''سر! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔'' نواز علی منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کی انسٹرکشنز کو فالو کروں گا۔''

ضیا کریم اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ایک بات اور۔ بینک روبری جس سائز کا کیس ہے اس کی انویسٹی گیشن کے لیے اے ایس آئی لیول کا بندہ فٹ نہیں ہے۔ آپ اپنے اے ایس آئی پر کچھ زیادہ ہی بھروسا کرتے ہیں۔ آپ کو اس معاملے کو خود ہی دیکھنا چاہیے۔''

''میں ہی دیکھ رہا ہوں سر۔'' نواز علی جلدی سے بولا۔ ''میں نے اے ایس آئی آصف محمود کو محض بھاگ دوڑ کے لیے رکھا ہوا ہے تاکہ اسے کچھ سیکھنے کا موقع ملے۔''

ضیا کریم نے اطمینان بھرے انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی پھر نواز علی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

ضیا کریم کے جاتے ہی نواز علی کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کال پک کر لی پھر دوسری جانب کی بات سننے کے بعد ٹھوس انداز میں کہا۔

''ڈونٹ وری۔ میں دس منٹ میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

کال اینڈ کرنے کے بعد اس نے سیل فون کو جیب میں ڈالا پھر اے ایس آئی کو اپنے پاس بلا کر اضطراری لہجے میں کہا۔

''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ امید ہے، ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔''

''او کے سر۔'' اے ایس آئی نے کہا۔

''ان امیر زادوں کا کیا حال ہے؟'' نواز علی نے سرسری انداز میں پوچھا۔

آج شام میں دو نوجوانوں کو سنگین الزامات میں گرفتار کر کے حوالات میں پہنچایا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کسی سٹنگ منسٹر کا بیٹا تھا اور دوسرا ارب پتی بزنس مین کی اکلوتی اولاد۔ دونوں کی عمریں بیس اور بائیس کے درمیان تھیں۔

''سر! آپ کے حکم کے مطابق، نبیل اور کاشان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ ابھی تک میں نے ان میں سے کسی ایک کو تھپڑ تک نہیں مارا اور ان کے لیے شاندار ڈنر کا بھی انتظام کیا ہے۔'' اے ایس آئی نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔

''شاباش!'' نواز علی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو، یہ نوجوان ارب پتی صاحبِ اختیار لوگوں کی بگڑی ہوئی اولادیں ہیں۔ ان کے ساتھ مار پیٹ کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔''

اے ایس آئی کو اپنے سینئر کی باتیں اگرچہ اچھی نہیں لگ رہی تھیں تاہم اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے بددلی سے کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔''

نواز علی اس کا کندھا تھپتھپا کر اپنے کمرے سے نکل گیا۔

آصف محمود نے نواز علی کے سامنے تو اپنے احساسات

تلخ و شیریں پکوان

☆ دنیا میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد محض کھانے کے شوق میں زندہ ہے۔

☆ اس کا ایک ہی مشغلہ ہے۔ بہترین کھانا اور ڈاکٹر کا بل ادا کرنا۔

☆ لوگ اسے پیٹو کا طعنہ دیتے ہیں کیونکہ وہ ''بچپن'' میں بے تحاشا کھاتا تھا اور اب ''پچپن'' میں بیوی کے سینڈل کھاتا ہے۔

☆ ہمارے ہاں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جن کا منہ ہر وقت بکریوں کی طرح ''جگالی'' کرتا ہے۔

☆ اور ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں خوب سے خوب تر کھلایئے لیکن وہ خوش اس وقت ہوتے ہیں جب آپ ان کی دو گھنٹے تک بکواس سنیں گے۔

☆ جب سے ڈاکٹر نے مرزا علی کو صبح شام چپاتی کھانے کے لیے کہا ہے، اس کا نام ''مرزا چپاتی'' پڑ گیا ہے۔

کوئٹہ سے سجاول خان کے تجربات

کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔

لگ بھگ دو بجے رات حوالاتی عدنان نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس کی زبان پر بس ایک ہی مطالبہ تھا۔ ''مجھے تھانے دار صاحب سے بات کرنا ہے۔''

نواز علی تھانے میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا آصف محمود نے حوالاتی کو اٹینڈ کیا اور اسے بتایا کہ انچارج صاحب کسی کام سے باہر گئے ہیں۔ اس پر عدنان نے برہمی سے کہا۔

''تو پھر آپ ہی سن لو میری بات۔''

''ہاں، بولو کیا بات ہے؟''

عدنان نے اپنے برابر والے کمرے میں موجود نبیل اور کاشان پر ایک ناپسندیدہ نگاہ ڈالی پھر آصف محمود سے کہا۔

''یہاں نہیں سر.....!''

عدنان کے انداز سے اے ایس آئی نے بھانپ لیا کہ وہ بینک روبری کے حوالے سے کوئی اہم انکشاف کرنے والا ہے لہٰذا وہ اسے حوالات سے نکال کر نواز علی کے کمرے میں لے آیا اور اپنے سیل فون کا ریکارنگ آپشن آن کرنے کے بعد اس سے کہا۔

''اب بتاؤ، تم تھانے دار صاحب سے کیا کہنا چاہتے تھے؟''

عدنان نے غصیلے انداز میں اے ایس آئی کے محسوسات اور توقعات کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دی۔ اے ایس آئی تحمل سے اسے سنتا رہا۔ جب عدنان اپنے دل کا غبار نکال چکا تو اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تم حوالات میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔ تھانے دار صاحب جب واپس آئیں گے تو میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ تم فکر نہیں کرو۔ تمہاری تمام شکایات کو دور کیا جائے گا۔''

عدنان نے بے یقینی سے اے ایس آئی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ جا کر حوالات میں بیٹھ گیا۔ اے ایس آئی نے حوالات کے دروازے کو لاک کیا اور واپس نواز علی کے کمرے میں آ کر عدنان کی باتوں پر غور کرنے لگا۔

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔

☆☆☆

تین بجے کے قریب اے ایس آئی کے سیل فون پر نواز علی کی کال آئی۔ اس نے فون اٹینڈ کیا تو نواز علی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تھانے سے باہر نکل آؤ۔ میں تین سو گز دور پیٹرول پمپ پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

ان لمحات میں اے ایس آئی خود نواز علی سے بات کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ بڑی سرعت کے ساتھ تھانے سے نکلا اور نواز علی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ ایس ایچ او اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ اس نے اے ایس آئی کو گاڑی کے اندر بلا لیا۔ جب اے ایس آئی نے اپنے باس کے حکم کی تعمیل کر دی تو نواز علی نے گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ڈپارٹمنٹ کے ایک انتہائی سینئر آفیسر نے فون کر کے مجھے ایک بنگلے پر بلایا تھا۔ وہاں پر نبیل اور کاشان کے ڈیڈی حضرات بھی موجود تھے۔ مجھے سیٹل منٹ کے لیے مجبور ہونا پڑا.....''

اے ایس آئی نے عدنان کی زبانی جو تلخ اور ترش حقائق سنے تھے، وہ اس کے رگ و پے میں زہر گھول رہے تھے۔ اس نے دل پر برداشت کا بھاری پتھر رکھ کر سادہ سے لہجے میں پوچھا۔

''سر، کتنے میں سیٹل منٹ ہوا ہے؟''

''بیس لاکھ میں۔'' نواز علی نے بتایا پھر اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے پانچ ہزار مالیت کے نوٹوں والا ایک بنڈل نکال کر اے ایس آئی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''دس لاکھ اس سینئر آفیسر نے اپنے پاس رکھ لیے ہیں اور دس لاکھ مجھے دیے ہیں۔ میں اپنے والے دس لاکھ میں سے تمہیں برابر کا شیئر دے رہا ہوں۔ یہ پانچ لاکھ روپے تمہارے لیے ہیں۔''

نواز علی سراسر غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ عدنان کی زبانی اے ایس آئی کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان دونوں امیر زادوں بہ الفاظِ دیگر حرام زادوں کو چھوڑنے کے لیے تھانے دار کے ساتھ پچاس لاکھ میں ڈیل ہو گئی ہے۔ پچیس لاکھ نبیل کے ڈیڈی اور پچیس لاکھ کاشان کے ڈیڈی نے دیے تھے۔ اے ایس آئی نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ حقائق سے واقف ہو چکا ہے کیونکہ وہ ایک انتہائی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

''سر! یہ غلط نہیں ہو گا۔'' اس نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''ان دونوں لڑکوں پر کڈنیپنگ، ریپ اور بروٹل مرڈر کے چارجز ہیں۔ انہیں پیسے لے کر چھوڑ دینا ناانصافی نہیں ہو گی؟''

''میں تمہاری سوچ سے اتفاق کرتا ہوں آصف!''

نواز علی نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''لیکن ہمارے اختیارات کی بھی ایک حد ہے۔ بعض اوقات ہمیں اپنے ہاتھوں سے انصاف کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ ہم اپنے سینئرز کے احکامات کے سامنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی تالاب میں رہتے ہوئے ہم مگرمچھوں سے بیر نہیں پال سکتے اور نہ ہی ان کے بیر کو افورڈ کر سکتے ہیں۔ امید ہے، تم میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے؟''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے اپنے دل میں کہا۔ ''انچارج صاحب! میں اتنا بھی مجبور اور لاچار نہیں ہوں کہ انصاف کو مرتے ہوئے دیکھوں۔'' پھر اس نے نواز علی کے بھاشن کے جواب میں کہا۔

''سر! آپ کی بات میری سمجھ میں بیٹھ گئی ہے۔ ہمارے پاس ان دونوں بگڑے ہوئے لونڈوں کو چھوڑنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی.....''

''کون سی بات؟'' نواز علی نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اے ایس آئی نے نوٹوں کے بنڈل کو اپنے گریبان کے راستے پیٹ کے نزدیک پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''عدنان کا کیا کرنا ہے؟''

''اسے ایک آدھ روز حوالات میں رکھیں گے۔'' نواز علی نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''پھر لاتیں جوتے مار کر اسے بھی چھوڑ دیں گے۔ میری نظر میں وہ ایک یوزلیس انسان ہے۔''

''اور میری نگاہ میں وہ انتہائی خطرناک انسان ہے۔'' اے ایس آئی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خطرناک.....؟'' نواز علی نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا بھلا؟''

''اس نے میرے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔'' اے ایس آئی عدنان کی کڑوی کسیلی گفتگو ایڈٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''پہلے تو اس نے اس بات کا گلہ کیا کہ اسے بھکاریوں والا کھانا دیا گیا اور ان امیرزادوں کے لیے کینٹھی منگوایا گیا اور وہ بھی کولڈ ڈرنکس کے ساتھ۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ منسٹر کے بیٹے کے پاس سیل فون بھی ہے۔ اس نے فون پر کسی سے بات کرنے کے بعد اپنے دوست کو بتایا ہے کہ ڈیڈی نے تھانے دار سے ڈیل کر لی ہے لہٰذا کل صبح انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔''

''اوہ..... یہ تو تم نے بُری خبر سنا دی۔'' نواز علی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

اے ایس آئی نے ''تنگ آمد، بہ جنگ آمد'' کے مصداق جو ٹھان لی تھی اس کو تقویت پہنچانے کی غرض سے کہا۔ ''سر! عدنان کو اگر ہم نے چھوڑ دیا تو یہ میڈیا کے پاس جا کر ہماری اس ڈیل کا پول کھول دے گا۔ میڈیا والے تو پولیس ڈپارٹمنٹ کے خلاف خبروں کو سونگھتے پھرتے ہیں..... ہماری بینڈ بج جائے گی سر.....''

''کچھ نہیں ہو گا۔'' نواز علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اس مسئلے کا بھی حل ہے میرے پاس.....''

''آپ کے ذہن میں کیا چل رہا ہے سر؟'' اے ایس آئی نے پُراشتیاق لہجے میں دریافت کیا۔

''کئی سالوں سے بند وہ ٹیکسٹائل ملز.....'' نواز علی نے وحشیانہ انداز میں کہا۔ ''نبیل اور کاشان سے پہلے ہمیں عدنان کو ''رہا'' کرنا ہو گا اور..... وہ بھی ابھی اور اسی وقت۔''

نواز علی نے لفظ ''رہا'' پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا تھا۔ اس مترو کہ ٹیکسٹائل ملز سے متعلق رہائی کا سیدھا سیدھا مطلب تھا..... زندگی کی قید سے دائمی رہائی.....!

☆☆☆

شہر کے انڈسٹریل ایریا میں واقع، الگ تھلگ وہ ٹیکسٹائل ملز پچھلے کئی سالوں سے بند پڑی تھی۔ اس طرف چونکہ آمدورفت نہیں رہی تھی لہٰذا فیکٹری کی جانب جانے والی ذیلی سڑک بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ اس سمت کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا تھا اور اس وقت تو ویسے بھی رات کا آخری پہر چل رہا تھا۔

مذکورہ مقام پر پہنچنے کے بعد نواز علی نے اے ایس آئی سے کہا۔ ''آصف! تم گاڑی ہی میں بیٹھو۔ میں عدنان کو اس کی گاڑی پر سوار کر کے آتا ہوں۔''

نواز علی کے ان معنی خیز جملوں کا مطلب وہ بہ خوبی جانتا تھا۔ اس نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فرمانبرداری سے کہا۔

''او کے سر.....!''

نواز علی، عدنان کو لے کر جیسے ہی اس ویران فیکٹری کے اندر داخل ہوا، آصف محمود کے ذہن میں ایک توانا لہر اٹھی جس نے اس کے تن بدن میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ بے اختیار اس کی زبان سے پھسل گیا۔

''ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں.....!''

نواز علی اپنی سروس گن کے بل بوتے پر عدنان کو چلاتے ہوئے ایک مخصوص مقام پر پہنچ گیا۔ عدنان کو احساس

ہو گیا تھا کہ تھانے دار اس کا ان کاؤنٹر کرنے کے لیے وہاں لایا ہے۔ جب نواز علی نے اس کے عقب میں اپنی گن کو لوڈ کرنے کے بعد اس کی کھوپڑی سے ٹکایا تو عدنان نے باہمت لہجے میں پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے ان امیر زادوں کو چھوڑنے کے لیے جو پچاس لاکھ روپے وصول کیے ہیں، وہ کتنے دن چلیں گے؟''

یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ تھانے دار اس کی زبان پر دائمی قفل ڈالنے والا ہے، اس کے اندر بے پناہ توانائی آ گئی تھی۔ بعض مخصوص حالات میں موت کو سامنے دیکھ کر انسان میں بہادری جاگ اٹھتی ہے۔

''اب اس سوال و جواب کا کوئی مطلب نہیں.....!''

نواز علی نے سفاکی بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ سارا نصیب کا کھیل ہے۔ نبیل اور کاشان کا نصیب اچھا ہے اس لیے انہیں آزادی مل جائے گی اور تم.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بے رحمی سے بولا۔

''تم سمجھ لینا کہ تمہارے نصیب نے دھوکا دے دیا۔ تم اس ڈیل کے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو۔ تمہیں چھوڑ دینا اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے مترادف ہوگا لہٰذا تمہیں، ہماری بقا کے لیے مرنا ہوگا۔ تمہارے مقدر میں یہی لکھا ہے۔''

عدنان نے آنکھیں بند کر لیں۔

ادھر نواز علی کی بات ختم ہوئی، ادھر ایک فائر کی آواز گونجی۔ اگلے ہی لمحے ایک قاتل گولی نے نواز علی کی کھوپڑی میں ہوا دان بنا دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین بوس ہو گیا۔

زندہ بچ جانے کے احساس نے عدنان کو بے ساختہ پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی نظر پہلو میں، چند فٹ کے فاصلے پر کھڑے گن بہ دست اے ایس آئی پر پڑی۔ اگلے ہی لمحے اے ایس آئی کی سرسراتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اپنے باس سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

''سوری سر! آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ میں نے پولیس ڈپارٹمنٹ صرف اس لیے جوائن کیا تھا تاکہ جرم اور مجرم کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک سکوں۔ آپ نے دولت کے لالچ میں ان بدکردار اور مکروہ جرم زادوں کو چھوڑنے کی ڈیل کر لی لیکن میں آپ کو بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ میں غلط نہیں ہوں۔ میں نے جو ٹھیک سمجھا وہی کیا۔ آپ کی خبیث روح سے التماس ہے کہ وہ کل کے اخبارات کا ضرور مطالعہ کرے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کو بے توقیر نہیں ہونے دوں گا کیونکہ آپ کی ذلت درحقیقت پولیس ڈپارٹمنٹ کی رسوائی ہوگی اور یہ مجھے کسی بھی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔''

''سر.....!'' عدنان نے حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ استفسار کیا۔ ''آپ نے مجھے موت کے منہ میں جانے سے کیوں بچایا؟''

''میں نے تمہیں نہیں، تمہاری محبت کو بچایا ہے.....''

اے ایس آئی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر محبت موت کے منہ میں چلی گئی تو یہ دنیا بڑی بدشکل اور قابلِ نفرت بن جائے گی۔ اس کا حسن اور رعنائی گہنا جائے گی۔''

عدنان نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''سر! میں کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں.....''

''میرا شکریہ ادا کرنے کے چکر میں تم اپنا وقت برباد نہ کرو۔'' اے ایس آئی نے اپنی شرٹ کا ایک بٹن کھول کر نوٹوں والا بنڈل برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنی محبت کو لے کر فی الفور کہیں دور چلے جاؤ۔ اگر اس شہر میں رہے تو دوبارہ بینک روبری کے جرم میں دوبارہ دھر لیے جاؤ گے.....'' پھر اس نے نوٹوں والا بنڈل عدنان کی جانب بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''یہ پورے پانچ لاکھ روپے ہیں۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے یہ رقم تمہارے اور علینا کے بہت کام آئے گی۔''

''اور آپ.....؟'' عدنان نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرے پاس بہت سا کام نکل آیا ہے۔'' اے ایس آئی نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ ''مجھے کل والی پریس میٹنگ کے لیے بھی ذہنی تیاری کرنا ہے۔''

عدنان گردن جھکا کر، بوجھل قدموں کے ساتھ، اپنے معبود کا شکر ادا کرتے ہوئے فیکٹری سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز کے تمام اخبارات نے شاہ سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع کی ''بہادر اور فرض شناس انسپکٹر نواز علی گزشتہ رات، خطرناک مجرموں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ کو نواز علی کی محکمہ جاتی خدمات پر فخر ہے۔ ان کی اس قربانی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔''

اگر ہر انسان پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے حصے کا کام کرنے لگے تو یہ دنیا بہت جلد بہشتِ ارضی بن جائے گی۔

❖❖❖

مضبوط عورت

تنویر ریاض

ماضی کے کچھ واقعات ایسے دردناک ہوتے ہیں جو وقت گزرنے کے باوجود یاد رہتے ہیں... ان تکلیف دہ لمحات کی اذیت ہر لمحہ بے کل و بے چین رکھتی ہے... برسوں بیتے واقعات کی بازگشت... جو ایک دفعہ پھر اپنی یادیں تازہ کر رہے تھے...

اس عورت کا قصہ جسے وقت نے قاتل کے مدمقابل کھڑا کر دیا تھا.....

پرائیویٹ سراغ رساں ولی کوستا نے اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے پکڑا اور بڑبڑانے لگا۔ وہ آدھے گھنٹے سے ٹریفک میں پھنسا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے اسے اذیت ہو رہی تھی۔ پولیس کی ملازمت کے دوران اسے صرف یہ کرنا ہوتا تھا کہ گاڑی کا سائرن بجائے اور چھت پر لگی ہوئی لائٹس جلا دے اور اسے راستہ مل جاتا تھا لیکن اب وہ ٹریفک کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ گاڑیوں کی قطار آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی اور بمشکل پندرہ فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے

بعد ایک بار پھر سب گاڑیاں رک گئی تھیں۔ اس نے اپنے دائیں بائیں لین میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھا۔ ان کے ڈرائیور بالکل پُرسکون تھے۔ شاید یہ ان کے لیے روز کا معمول تھا۔ ولی سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے صبح کے وقت اپنے میڈیکل چیک اَپ کا پروگرام بنالیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دوسری گاڑیوں کو اوورٹیک کر کے بغلی سڑک سے نکل جائے۔ اگر کسی پولیس والے نے روکا تو وہ اس سے نمٹ لے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اسے جانتا ہو اور اسے جانے دے۔ دوسری صورت میں وہ جرمانہ بھر دے گا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ولی نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''کوستا انوسٹی گیشن۔''

دوسری طرف سے ایک عمر رسیدہ عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ ہسپانوی زبان بول رہی تھی۔

''کیا میں مسٹر کوستا سے بات کر سکتی ہوں؟''

وہ ان چند الفاظ سے ہی سمجھ گیا کہ اس عورت کا تعلق ارجنٹائن سے ہے۔ وہ اس لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

''میں کوستا بول رہا ہوں۔'' ولی نے بھی ہسپانوی میں جواب دیا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میرا نام نومی مارکوس ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے تمہاری مدد کی اشد ضرورت ہے۔''

ولی نے اپنی کار چند فٹ آگے بڑھائی اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔

''تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

''کیونکہ میں نہیں بلکہ میرا شوہر خطرے میں ہے۔''

''اسے کس قسم کا خطرہ ہے؟''

وہ کچھ ہچکچائی اور ولی اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ ''میں فون پر بات کرتے ہوئے گھبرا رہی ہوں۔ کیا ہم کہیں اور مل سکتے ہیں مسٹر کوستا؟ میں میامی بیچ میں رہتی ہوں۔ کیا تم نے کولنز ایونیو پر ٹینکو ریستوران دیکھا ہے؟''

ولی اس جگہ سے واقف تھا اور وہاں کئی دفعہ کھانا بھی کھا چکا تھا۔ وہ ریستوران ایک خاص ڈش کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کی پیسٹری بھی بہت خوش ذائقہ ہوتی تھی۔ ان کھانوں کا تصور کرتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی۔

''ہاں۔ میں نے وہ جگہ دیکھی ہے اور میں وہاں تم سے دو گھنٹے میں مل سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن تم کم از کم ...مجھے ایک آئیڈیا تو دو کہ تم کس سے خوف زدہ ہو؟''

ایک بار پھر وہ ہچکچائی جیسے کچھ کہنے سے ڈر رہی ہو لیکن بالآخر اس نے کہا۔ ''میں اس لیے خوف زدہ ہوں کہ میرے شوہر نے پرندوں کو دیکھنا شروع کر دیا ہے۔''

ولی کی نظریں سامنے تھیں۔ وہ پوری طرح اس کی بات نہ سُن سکا۔ ''تم نے کیا کہا کہ وہ پرندے دیکھ رہا ہے اور تم اسی وجہ سے پریشان ہو؟''

''ہاں لیکن یہ بہت خطرناک پرندے ہیں جب میں تم سے ملوں گی تو میری بات سمجھ جاؤ گے، میں تمہارے وقت کا معاوضہ دوں گی۔''

ولی نے اسے اپنا یومیہ معاوضہ بتایا۔ ملنے کا وقت طے کیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

ٹریفک اب بھی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ولی کا منہ بن گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس پہنچنے تک اس کا بلڈ پریشر بڑھ چکا ہوگا اور اسے ڈاکٹر کا لیکچر سننا پڑے گا۔

ٹینکو ریستوران، نارتھ بیچ کے علاقے میں واقع تھا۔ یہاں ارجنٹائن سے ہجرت کر کے آنے والوں کی بڑی تعداد رہتی تھی۔ ولی اس عورت کے آنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بلڈ ٹیسٹ کی وجہ سے بارہ گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس لیے اسے بھوک لگ رہی تھی اور کچن سے آنے والی خوشبوؤں نے اس کی بھوک چمکا دی تھی۔

اس نے گوشت کے قتلوں والے برگر کا آرڈر دیا اور پھر اس شیلف کی طرف مڑ گیا جس میں میٹھی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں میٹھے بسکٹ، کسٹرڈ، چاکلیٹ، جام اور مختلف اقسام کے کیک شامل تھے۔ اس نے اپنے لیے پنیر کیک اور کافی کا انتخاب کیا اور ایک ایسی میز پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ آنے جانے والوں کو دیکھ سکے۔

پندرہ منٹ بعد مسز نومی مارکوس بھی آ گئی۔ اس وقت ولی میٹھے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے دروازے میں رکی۔ اس نے ہال کا جائزہ لیا اور ولی کو دیکھتے ہی اس کے پاس چلی آئی۔ اس کی عمر تقریباً ستر سال، چھ فٹ کے قریب قد، دبلی پتلی اور گوری رنگت۔ اس نے کریم کلر کا پینٹ سوٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔

انہوں نے مصافحہ کیا اور وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہارے لیے کھانا یا ڈرنک منگواؤں؟'' ولی نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں شکریہ۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کھانے سے بھی ڈر لگتا ہے۔''

''اگر تمہارا شوہر پرندے دیکھتا ہے تو تمہیں کیا پریشانی ہے؟''

اس عورت نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اسے کچھ عرصہ پہلے تک پرندوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر اچانک ہی اس نے ایک دوربین خرید لی اور ہر دوسرے روز پرندے دیکھنے کے لیے ایور گلیڈز پارک جانے لگا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ وہاں کسی پرندے کو دیکھنے نہیں جاتا۔''

ولی نے سر ہلایا۔ یقیناً وہ عورت اپنے شوہر کے افیئر کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ وہ پرندوں میں نہیں بلکہ کسی عورت میں دلچسپی لے رہا تھا اور وہ عورت اپنا آشیانہ بچانا چاہ رہی تھی۔ ولی کی خدمات اسی لیے حاصل کی گئی تھیں کہ وہ اس کے شوہر کا پیچھا کر کے اسے رنگے ہاتھوں پکڑے۔

مسز مارکوس اسے غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کے خیالات پڑھ سکتی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جو تم سوچ رہے ہو، ایسا نہیں ہے۔ اس کا کسی دوسری عورت سے تعلق نہیں، کاش ایسا ہوتا۔ اس سے آسانی سے نمٹا جا سکتا تھا اور وہ ہمارے لیے کم خطرناک ہوتی۔''

ولی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا بات ہے؟''

وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''یہ قصہ دس روز پہلے شروع ہوا۔ میرا شوہر کسی وجہ سے پریشان لگ رہا تھا پھر اس نے اعلان کیا کہ لوگ ایور گلیڈز، میں خوب صورت پرندوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور وہ انہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے لیکن اس نے کہا کہ نہیں وہ اکیلا ہی جائے گا۔

''اس نے دوربین خریدی اور دوپہر کے وقت گیا جب وہ واپس آیا تو میں نے اس سے پرندوں کے بارے میں پوچھا تو وہ میرا سوال سن کر حیران رہ گیا جیسے جانتا نہ ہو کہ میں کیا پوچھ رہی تھی، پھر سنبھلتے ہوئے بولا کہ پرندے بہت خوب صورت تھے اور وہ دوبارہ جانا چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں بتایا۔''

اس نے ایک گہری سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کے بعد وہ اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔ میں باہر گارڈن میں کام کر رہی تھی۔ میں نے کھلی ہوئی کھڑکی سے سنا وہ اپنے پرانے دوست آندریس کورڈووا سے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ وہ بھی ارجنٹائن سے آیا ہے۔ اس نے آندریس کو بتایا کہ وہ پارک کے کنارے اس جگہ پر گیا تھا جہاں سے پرندے دیکھے جاتے ہیں لیکن آگے چل کر اس نے بتایا کہ وہ دوربین سے پرندوں کے بجائے آدمیوں کو دیکھ رہا تھا۔''

''وہ آدمی کون تھے، وہ انہیں کیوں دیکھ رہا تھا اور وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟''

مسز مارکوس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے کچھ نام لیے جنہیں میں نہیں جانتی تھی لیکن ایک نام میں پہچان گئی۔ ہرنانڈو ولا، وہ شخص ارجنٹائن میں کافی بدنام ہے۔ اس نے ستر اور اسّی کی دہائی میں ہمارے ملک کی فوجی حکومت کے لیے بہت کام کیا۔ اس کے ذمے ان شہریوں کو تلاش کرنے، ان پر تشدد کرنے اور انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کا کام تھا جو فوجی حکومت کے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ انہوں نے فوجی راج کی مخالفت کی۔ بالآخر اس فوجی حکومت کے بہت سے لیڈروں پر مقدمہ چلا اور انہیں سزا ہوئی لیکن ولا ملک سے بھاگ گیا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ یہاں ہے اور میرے شوہر نے شاید اسے پارک میں دیکھا ہو۔ ضرور کسی نے اسے بتایا ہوگا کہ ولا کہاں مل سکتا ہے۔''

''اور یہ شخص ان آدمیوں کے ساتھ تھا جن میں تمہارے شوہر کو دلچسپی ہے؟''

''ہاں، جیسا کہ میں نے کہا کہ میں ان کے نام نہیں جانتی لیکن اس نے کئی بار ان کے لیے ایک دوسرا لفظ استعمال کیا۔''

''وہ کیا؟''

''گدھ۔''

''اس نے یہ لفظ کیوں استعمال کیا؟ ایور گلیڈز یا یہاں کسی اور جگہ گدھ نہیں پائے جاتے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے یہی کہا تھا؟''

''ہاں، میں نے یہی سنا تھا۔''

ولی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کئی ایسی جگہیں ہیں جہاں لوگ پرندے دیکھ سکتے ہیں۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں جاتا ہے؟''

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ بتا سکی۔ ولی نے ایک مرتبہ ایسی عورت کے ساتھ ڈیٹنگ کی تھی جسے ایور گلیڈز کے کنارے پر پیدل چلنا پسند تھا۔ اس نے چند ایسے مقامات کا ذکر کیا جہاں وہ جا چکا تھا اور جب اس نے

این ہنگ ٹریل، کا نام لیا تو وہ بولی۔

''ہاں وہی۔ اس نے اسی پگڈنڈی کا نام لیا تھا۔''

ولی سوچ میں پڑ گیا۔ اس جگہ لوگ صرف مخصوص پرندے دیکھنے جاتے تھے جیسے نوخیز بگلا، ماہی خور عقاب اور سفید بگلا وغیرہ لیکن وہ صرف سورج نکلنے یا ڈوبنے کے وقت وہاں جاتے کیونکہ دن کے بقیہ حصے میں وہ پرندے خوراک کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔

''تم نے کہا کہ تمہارا شوہر دوپہر میں وہاں جاتا ہے؟''

اس عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا شوہر وہاں پرندوں کو دیکھنے نہیں جاتا ہے۔ ولی نے اس پر اپنی نظریں جما دیں۔ ''تمہارے شوہر کو سمجھنا چاہیے کہ ولا ایک مفرور مجرم ہے۔ وہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔''

مسز مارکوس نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں جانتی ہوں۔ میں نے بھی تمہیں یہی بتایا ہے لیکن تمہیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب وہ ارجنٹینا یونیورسٹی میں طالب علم تھا تو میرے شوہر نے حکومت کے خلاف ایک مظاہرے کا اہتمام کیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ فوج نے اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے ہیں تو وہ پڑوسی ملک یوروگوئے چلا گیا۔ تاہم ولا نے اس کا پیچھا کیا اور اسے واپس ارجنٹائن لے آیا۔ وکٹر کو جیل میں رکھ کر تشدد کیا گیا پھر ایک فیملی فرینڈ کی سفارش پر رہائی ملی۔ اسی وجہ سے چالیس سال گزرنے کے بعد بھی وہ ولا سے نفرت کرتا اور اسے سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے میں چاہوں گا کہ تم مجھے اپنے شوہر کی ایک تصویر دو۔''

نومی مارکوس نے پرس کھول کر اپنی اور وکٹر کی ایک رنگین تصویر نکالی جو کئی برس قبل لی گئی تھی۔ وکٹر اپنی بیوی سے قد میں کچھ انچ زیادہ تھا۔ وہ بھی دبلا پتلا تھا اور اس کے بال پوری طرح سفید تھے۔

''دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب وہ آئندہ ایور گلیڈز جانے کا ارادہ کرے تو تم مجھے اطلاع کر دینا۔ تمہارے پاس میرا فون نمبر ہے۔ امید ہے کہ وہ اسی پگڈنڈی کی طرف جائے گا۔''

نومی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں یہ کر سکتی ہوں۔''

اس کے بعد آخری مرحلہ ولی کو دو دن کے معاوضے کی ادائیگی کا تھا۔ ولی توقع کر رہا تھا کہ وہ چیک دے گی لیکن نومی مارکوس نے اپنے پرس سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور اسے نقد ادائیگی کر دی۔ ولی نے اپنی نوٹ بک سے ایک کاغذ نکالا اور اس پر رسید لکھ کر دے دی۔ ایک بار پھر انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ جیسے ہی وکٹر پرندے دیکھنے جائے گا۔ وہ اسے فون کر دے گی اس کے بعد وہ چلی گئی۔

ولی نے بھی واپس شہر کا رخ کیا اور راستے میں ہی اس نے ایلیک آرڈن کا نمبر ملایا۔ وہ ایک امیگریشن وکیل تھی جس کے لیے وہ بعض اوقات تحقیقات کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لاطینی امریکا کی پچاس سالہ تاریخ سے بھی واقف تھی۔ کیونکہ انہی سیاسی اور معاشی حالات کی وجہ سے اس کے بہت سے مؤکل میامی آئے اور اس کی مدد لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ولی اس کے لیے ایک عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اسی دوران وہ اس میں دلچسپی لینے لگا۔ ایلیک اس کے جذبات کو سمجھتی تھی لیکن اس نے کبھی ولی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

ولی نے فون پر اسے آمد کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً ملنے پر آمادہ ہو گئی۔ بیس منٹ بعد وہ اس کے دفتر میں تھا۔ ایلیک نے ایک بہت ہی خوب صورت سیاہ سوٹ اور آسمانی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا اور ہمیشہ کی طرح پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے ولی کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

''میرے پاس ارجنٹائن سے تعلق رکھنے والی ایک عورت کا کیس آیا ہے۔ اسی کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

''اس عورت کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟''

''اس کے شوہر کو پرندے دیکھنے کا شوق ہو گیا ہے۔''

ایلیک بھی بالکل اسی طرح حیران ہوئی جیسے ولی ہوا تھا جب نومی مارکوس نے اسے اپنے شوہر کے نئے شوق کے بارے میں بتایا۔ لہٰذا ولی نے اسے وکٹر مارکوس کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ کس طرح اسے اچانک ہی پرندے دیکھنے کا شوق ہوا اور جوانی میں اسے کیوں تشدد کا نشانہ بننا پڑا۔ پھر اس نے اس فون کال کے بارے میں بتایا جو نومی نے سنی تھی اور ان آدمیوں کے نام بھی جنہیں وکٹر نے دیکھا تھا اور آخر میں اس نے گدھ کا تذکرہ کیا گو کہ وہاں دور دور تک کوئی گدھ نہیں تھا۔

''گدھ؟ اس عورت کو یقین ہے کہ وکٹر نے گدھ ہی کہا تھا؟''

''ہاں، اسے پورا یقین ہے۔ کیوں؟ تمہارے لیے

اس کی کیا اہمیت ہے؟''
ایلیک نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولی۔ ''پینتیس یا چالیس سال پہلے جب کئی لاطینی ممالک میں فوجی حکومتیں قائم ہوئیں تو انہوں نے اپنے مخالفین پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ انہیں جیلوں میں ڈال کر تشدد کیا گیا اور بہت سے مار دیے گئے۔ ان مخالفین نے اپنا ملک چھوڑ کر سرحد پار کی اور ان ملکوں میں چلے گئے جہاں انہیں کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی انہیں تلاش کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اب وہ محفوظ مقامات پر ہیں۔''
ولی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں تھا۔''
ایلیک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ان سب ملکوں کے فوجی حکمران رابطے میں تھے۔ انہوں نے ان پناہ گزینوں کے بارے میں معلومات کا تبادلہ کیا اور ان ملکوں میں جو بھی پناہ گزین تھے، انہیں تلاش کر کے اپنے وطن بھیج دیا گیا۔ ان پر تشدد ہوا اور زیادہ تر مار دیے گئے۔''
ولی نے کہا۔ ''وہ ایک بین الاقوامی معاہدہ تھا۔''
ایلیک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں اور تم جانتے ہو کہ اسے کیا نام دیا گیا؟''
''تم بتاؤ۔''
''آپریشن کونڈور۔''
یہ سُن کر ولی چند سیکنڈ کے لیے دم بخود رہ گیا۔ ''گویا اس کیس میں گدھ کا حوالہ کسی پرندے کے لیے نہیں دیا گیا بلکہ یہ فوجی قاتلوں کی بین الاقوامی تنظیم ہے۔''
ایلیک نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ''وکٹر کے ساتھ بھی یہی ہوا، اسے ایک ملک سے اغوا کر کے اپنے وطن واپس لایا گیا۔ اس پر تشدد ہوا۔ میں اس پر شرط لگا سکتی ہوں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان ملکوں میں فوجی حکومتوں کے خاتمے کے بعد یہ مجرمان فرار ہو کر امریکا آ گئے۔ لہٰذا یہ بھی امکان ہے کہ وکٹر نے اس شخص ولا کو آپریشن کونڈور کے دوسرے ممبران کے ساتھ دیکھا ہو۔''
ولی نے اس پر غور کیا۔ نومی مارکوس کے بیان سے یہ واضح تھا کہ اس کے شوہر کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اگر پرندے دیکھنے والے واقعی آپریشن کونڈور میں حصہ لے چکے تھے تو انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بین الاقوامی مجرم تھے۔ اور انہیں گرفتار کرنے کے بعد انہیں ان کے ملکوں میں بھیج دیا جاتا۔ ان پر مقدمہ چلتا اور سزائیں ملتیں اور وہ غالباً جیل میں ہی مر جاتے۔ اگر ان بدنام زمانہ مجرموں کو معلوم ہو جاتا

حلف

گواہ: جناب عالی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے عدالت میں کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں۔''
جج: ''اس کا کوئی خاص سبب ہے؟''
گواہ: ''جی ہاں، جناب عالی، میں نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا ہے لیکن جب بھی سچ بولنے کی کوشش کرتا ہوں، کوئی نہ کوئی وکیل اس پر اعتراض کر بیٹھتا ہے۔''

نشانہ

جج: ''تم کہتی ہو کہ تم نے غلطی سے اپنے شوہر کو ہلاک کر دیا۔ حالانکہ تمہارا اسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا؟''
ملزمہ: ''جی ہاں، جناب عالی!''
جج: ''کیا تم اپنی بات کی وضاحت کر سکتی ہو؟''
ملزمہ: ''دیکھیے، جناب عالی، ہوا یہ کہ میں بندوق سے اپنی ساس کا نشانہ لے رہی تھی کہ وہ اچانک دوڑ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔''

پشاور سے بلقیس خانم کا معصومانہ انداز

کہ وکٹر مارکوس ان کا پیچھا کر رہا ہے تو وہ کوئی بھی سخت قدم اٹھا سکتے تھے۔ اسے فوری طور پر تحفظ کی ضرورت تھی۔
ایلیک بھی انہی خطوط پر سوچ رہی تھی۔ ایسا اکثر ہوا کہ وہ دونوں ایک ہی طرح سوچ رہے ہوتے تھے۔ ''لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں یقین ہونا چاہیے۔ وہ شخص ولا ہی ایور گلیڈز میں تھا اور ہمیں یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے آدمی کون تھے۔ ہم کچے پکے شک کے ساتھ پولیس کے پاس نہیں جا سکتے۔ وہ نیلی وردی والے ٹس سے مس نہیں ہوں گے۔''
ولی جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسی وقت ایلیک کو ایک فون سننا پڑا اور ولی اپنے ذہن میں منصوبہ ترتیب دینے لگا۔ دس منٹ بعد جب وہ فارغ ہوئی تو ولی نے اس کے ساتھ ممکنہ کارروائی پر تبادلۂ خیال کیا۔
ولی جانتا تھا کہ اس کی رسائی بین الاقوامی ڈیٹا تک ہے جس میں ان بدنام زمانہ مجرموں کی فہرست کے علاوہ مفروروں کی تصاویر بھی ہوں گی۔
''میں چاہتا ہوں کہ تم ڈیٹا دیکھو اور ولا کی ایک تصویر ڈاؤن لوڈ کر کے مجھے دو۔''

ایلیک نے اپنا کمپیوٹر کھولا اور ایک منٹ میں ہی اسکرین پر ہرنانڈو ولا کی فائل اور تصویر آگئی۔ اس فائل میں دی گئی تصویر کے مطابق ولا نے ارجنٹائن کی فوج میں کیپٹن کا عہدہ حاصل کیا۔ وہ ان لوگوں پر تشدد اور خفیہ ہلاکتوں کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔ اس فائل میں اس کی مختلف تعیناتیوں اور پوزیشنوں کا بھی ذکر تھا۔ بالکل آخری سطر میں بتایا گیا تھا کہ اس نے ارجنٹائن سے بھاگے ہوئے شہریوں اور دوسرے ملکوں سے ارجنٹائن آنے والے سیاسی مخالفین کا تعاقب کیا اور پڑوس کی فوجی حکومتوں کے ساتھ اس بندوبست کو آپریشن کونڈور، کا نام دیا گیا۔

اس فائل کے ساتھ ہی ایک نوجوان فوجی افسر کی تصویر تھی جس کے کالر میں کیپٹن کے ستارے لگے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھوں میں سرد مہری تھی۔ وہ دیکھنے میں ہی خونی لگ رہا تھا۔

''مجھے اس کا ایک پرنٹ نکال دو۔''

ایلیک نے ایسا ہی کیا۔ ''اب میں اس آپریشن میں حصہ لینے والے ایسے قاتلوں کو تلاش کروں گی جو بھی نہیں پکڑے گئے۔ ان کے نام اور تصویریں بھی تمہیں بھیج دوں گی۔ نہ جانے ولا یہاں کن لوگوں سے مل رہا ہے۔''

ولی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو ولی؟'' ایلیک نے پوچھا۔

''میں موٹر وہیکل ڈپارٹمنٹ سے ولا کی رہائش کا پتا معلوم کرتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ یہاں اپنے اصلی نام سے رہ رہا ہوگا۔ اس لیے میرے پاس واحد راستہ یہی ہے کہ پرندے دیکھنے جاؤں۔''

ایلیک نے کہا۔ ''محتاط رہنا، سب گدھ ایک جیسے ہوتے ہیں۔''

ولی نے اسے چونک کر دیکھا اور چلا گیا۔

اپنی کار میں بیٹھ کر ولی نے نومی مارکوس کو فون کیا۔

''نومی، میں ولی بول رہا ہوں۔ تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

اس نے دبی زبان میں جواب دیا تاکہ کوئی سن نہ لے۔ ''وہ یہیں ہے لیکن کل صبح گیارہ بجے وہ دوبارہ وہاں جا رہا ہے۔ میں نے اسے فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے جو تمہارے علم میں لانا ضروری ہے۔''

''اس نے اپنے ایک دوست سے پستول مانگا ہے۔ میں بہت خوف زدہ ہوگئی ہوں مسٹر کوستا۔''

ولی نے کچھ سوچا اور ایک منٹ بعد اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آگیا۔

''ٹھیک ہے۔ میری بات سنو۔ کل صبح جب وہ گھر سے باہر جانے لگے تو تمہیں اسے روکنا ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم کیا کرو گی لیکن اسے گھر سے باہر نہ جانے دینا۔ جھوٹ موٹ دل کا دورہ ظاہر کرو۔ فرش پر گر کر بے ہوش ہو جاؤ۔ اسے ورغلاؤ۔ کار کی چابیاں چھپا دو۔ کچھ بھی کرو لیکن اسے ایور گلیڈز نہ جانے دو۔ اس کے بجائے میں وہاں جاؤں گا۔''

نومی نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں وہی کروں گی جو تم کہہ رہے ہو لیکن پلیز محتاط رہنا مسٹر کوستا۔''

ولی کو ہمیشہ کلیلاہٹ ہونے لگتی جب اس کا کوئی کلائنٹ اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیتا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اگلے روز صبح دس بجے ولی، ایور گلیڈز نیشنل پارک کی جانب چل دیا۔ نومی نے اسے ابھی تک فون نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس نے فرض کر لیا کہ وہ اپنے شوہر کو روکنے کی کوشش کر رہی ہوگی وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے کیا طریقہ اختیار کیا ہوگا۔

وہ پارک اس کے گھر سے جنوب کی جانب پینتالیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ اس طرف جانے والی ہائی وے کے دونوں جانب مضافاتی بستیاں تھیں۔ جن میں کوئی عمارت دو منزل سے زیادہ اونچی نہ تھی۔ کچھ عمارتوں اور ہائی وے کے درمیان کنکریٹ کی دیوار تھی تاکہ ٹریفک کا شور وہاں تک نہ پہنچ سکے جبکہ کچھ عمارتوں کے سامنے پام کے درختوں کی دیوار تھی جو دیکھنے میں تو اچھی لگ رہی تھی لیکن ولی کا خیال تھا کہ وہ پوری طرح آواز کو نہیں روک سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد دیہی علاقہ شروع ہو گیا۔ ہائی وے کے اختتام پر ولی نے کار مغرب کی جانب موڑ لی اور کھیتوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔

اس نے گاڑی جنوب کی طرف موڑی اور کیلوں کے باغ سے گزرتا ہوا ایلی جیز فارم پر پہنچ گیا۔ یہ ایک تفریح گاہ تھی لیکن ولی کا تفریح کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ لہٰذا وہ چلتا رہا ایک میل کا مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ مغرب کی جانب ایک دو لین والی سڑک پر مڑ گیا اور جلد ہی اسے پارک کا داخلی دروازہ نظر آگیا۔

ایک نوجوان خاتون رینجر نے اس سے داخلہ فیس لی اور اسے پگڈنڈی کی سمت بتانے لگی۔ دو میل سیدھے اور دو

میل بائیں جانب۔ پھر اس کے لیے اچھے دن کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ اسے بتانے والا تھا کہ اسے گدھ کی تلاش ہے لیکن خاموش رہا۔

وہ اس کی بتائی ہوئی سمت چل دیا اور بالآخر پارکنگ لاٹ پر پہنچ گیا۔ وہاں چند ریسٹ روم اور ایک عمارت تھی۔ ویک اینڈ پر بہت رش ہوتا تھا لیکن اس وقت وہاں چند کاریں ہی تھیں۔ اگر وہ بوڑھے قاتل پرانی خونی مہمات کا دوبارہ تجربہ کرنے کے لیے کسی پرائیویٹ جگہ کی تلاش میں تھے تو وہ ایک اچھا مقام تھا۔

ولی نے دوربین گلے میں لٹکائی اور ہولسٹر میں رکھے ہوئے پستول پر ہاتھ مارا۔ وہ اس پختہ راستے پر چل دیا جو عمارتوں کے عقب میں ایک نہر کے کنارے کے ساتھ تھا۔ اس راستے کے اختتام پر چلنے کے لیے ایک تختہ لگا ہوا تھا اور نیچے دلدلی زمین تھی۔ اس کے دونوں جانب سبزہ تھا جو اتنا گھنا اور اونچا ہو گیا تھا کہ اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اگر آس پاس کوئی دوسرا شخص ہوتو وہ اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنی طرف آنے والی آوازیں سنیں۔ اس نے اپنا سیل فون نکال کر بائیں کان سے لگا لیا اور چلتا رہا۔ یہ بھی لوگوں کو دھوکا دینے کا ایک طریقہ تھا تاکہ وہ یہی سمجھیں کہ کوئی انہیں چیک کرنے کے بجائے باتوں میں مصروف ہے۔ وہ اپنی یک طرفہ گفتگو ختم کرنے ہی والا تھا کہ اسے کسی خطرے کا احساس ہوا لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ دو عمر رسیدہ خواتین تھیں۔ انہوں نے چتلونیں اور ہیٹ پہن رکھے تھے۔ ولی نے اپنا فون نیچے کیا اور انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ انہوں نے بھی جواب میں ایسا ہی کیا۔

اس تختے پر چلتے ہوئے وہ ایک کھلے ہوئے خیمے پر پہنچ گیا جو اس وقت خالی تھا لیکن وہ وہاں سے کچھ پرندے دیکھ سکتا تھا جو خوراک کی تلاش میں نہیں گئے تھے۔ ان میں آنگا، بگلے اور سفید ماہی خور شامل تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اور پرندے بھی دیکھے جن کے نام وہ نہیں جانتا تھا البتہ اسے وہاں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو گدھ جیسی خوبیاں رکھتا ہو۔

اس خیمے کے بالکل پیچھے ایک اور تختہ تھا جو جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ ولی نے اس پر چلنا شروع کیا اور اسے دور سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ وہ رک کر سننے لگا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ مردانہ آوازیں ہیں لیکن یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔

اس نے دوبارہ اپنا سیل فون کان سے لگا لیا اور اسی راستے پر چلتے ہوئے فرضی ماں سے بہ آواز بلند باتیں کرنے لگا، یہ یک طرفہ گفتگو ہسپانوی زبان میں ہو رہی تھی۔

''ہاں ماما، میں اس وقت ایورگلیڈز میں پرندے دیکھنے آیا ہوں۔ ہاں جانتا ہوں کہ اس وقت مجھے کام پر ہونا چاہیے لیکن یہ پرندے بہت خوب صورت ہیں۔ اس لیے انہیں دیکھنے چلا آیا۔''

وہ اس تختے پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ بیس فٹ کے فاصلے پر یہ تختہ ختم ہو رہا تھا اور وہاں ایک بینچ پر تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی گردن میں دوربینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ وہ جگہ جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ لہٰذا انہیں صرف وہی شخص دیکھ سکتا تھا جو تختے پر چلتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہا ہو۔ ولی کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے اور ان کی نظریں اس پر جم گئیں۔

ولی نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ''ہاں میں جانتا ہوں کہ کچھ حاصل نہیں کر پاؤں گا اگر میں پرندے دیکھنے میں وقت ضائع کرتا رہا۔ تم نے مجھے یہ بات کئی مرتبہ سمجھائی ہے ماما۔''

فون پر باتیں کرتے ہوئے اس نے ان تینوں آدمیوں کا بغور جائزہ لیا۔ درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ وہ یقیناً ہرنانڈو ولا تھا۔ وہ اس تصویر کے مقابلے میں کئی برس زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا جو ولی کی جیب میں تھی لیکن وہ اب بھی دبلا پتلا تھا اور اس کا لمبوترا چہرہ مختلف اور قابلِ شناخت لگ رہا تھا لیکن اسے دوسرے دو افراد کی تصویریں دیکھنی تھیں جو ایلیک نے اسے بھیجی تھیں۔ اس نے فون پر دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''تم نے مجھے بار بار کے نومولود بچوں کی تصویریں بھیجی تھیں۔ وہ جڑواں ہیں۔ مجھے دیکھنے دو۔''

اس نے اپنے پیغامات دیکھے تو وہاں اسے نصف درجن قاتلوں کی تصویریں نظر آئیں جو ایلیک نے اسی ڈیٹا بیس سے حاصل کی تھیں۔ اس نے فوراً ہی ولا کے دوسرے دونوں ساتھیوں کو پہچان لیا۔ ان میں ایک چلی کی فوج کا سابق کرنل فریاس اور دوسرا برازیل کا سابق میجر اولیورا تھا۔ یہ دونوں تصویریں بھی برسوں پرانی لیکن قابلِ شناخت تھیں۔

''اوہ دیکھو۔ یہ کتنے پیارے ہیں۔'' ولی فون پر بولا۔

وہ تختے کی آخری ریلنگ پر رک گیا۔ تینوں آدمی اس

کے دائیں جانب تھے اور وہ محسوس کرسکتا تھا کہ ان کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ جیسے فون پر اپنی ماں کی بات سن رہا ہے۔ اس دوران اس نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ وہ اپنا پستول نکالے اور انہیں گرفتار کرلے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک یا تینوں مسلح ہوں گے اور وہ ان عمر رسیدہ لوگوں کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ نہیں کرسکتا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہوں نے ماضی میں کیا جرائم کیے تھے۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ ان سے الجھنے کے بجائے میامی پولیس انٹیلی جنس یونٹ سے رابطہ کر کے ان تینوں افراد کی یہاں موجودگی کی اطلاع دے۔ یہ یونٹ غیر ملکی مجرموں کا کھوج لگاتا تھا۔ ولی اس یونٹ میں کام کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ اسے کس سے بات کرنی ہے۔ وہ تینوں مجرم پولیس مقابلے میں مارے جاتے تو کسی پر کوئی الزام نہ آتا اور اگر پولیس والے بروقت وہاں نہ پہنچ پاتے تو وہ اس جگہ کی نگرانی کر کے اور انہیں اگلی مرتبہ وہاں آنے پر گرفتار کر لیتے۔

وہ تینوں آدمی خاموش بیٹھے ولی کے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ایسا کرنے والا تھا لیکن اس کے اندر کا پولیس والا مچل گیا اور اس کے دل میں خواہش جاگ اٹھی کہ وہ ان تینوں کو اپنے طور پر قابو کرے۔ وہ اپنے ہولسٹر سے پستول نکال کر ان کی گرفتاری کا اعلان کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ان تینوں کی نظر کسی اور طرف چلی گئی۔ انہوں نے اس کے عقب میں دیکھا اور اچھل کر کھڑے ہوگئے۔

ولی نے پلٹ کر دیکھا۔ اس سے دس فٹ کے فاصلے پر نومی مارکوس نائن ایم ایم کا پستول لیے ان تینوں کو نشانہ بنائے ہوئے کھڑی تھی اور وہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ولی بھی نومی مارکوس کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے بھی اپنے پستول کا رخ ان بدمعاشوں کی طرف کیا تاکہ وہ کوئی حرکت نہ کرسکیں پھر وہ گردن موڑ کر بولا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو مسز مارکوس؟ کیا تمہارا شوہر یہاں ہے؟''

اس نے ان تینوں پر سے نظر نہیں ہٹائی۔ اس وقت وہ ضرورت مند نومی نہیں بلکہ ایک جنگجو عورت لگ رہی تھی۔

''میرا شوہر مر چکا ہے مسٹر کوستا۔ وہ کئی سال پہلے مر گیا تھا۔ اس نے خودکشی کرلی تھی۔ وہ کبھی اپنے دماغ سے نہ نکال سکا جو کچھ ان جانوروں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔''

اس نے اپنی نظریں ہرنانڈو ولا پر جما دیں۔ ''میرا شوہر وکٹر مارکوس تھا۔ کیپٹن ولا تمہیں یاد ہے کہ تم نے اس پر کتنا تشدد کیا تھا کیا تم اور تمہارے یہ بے رحم ساتھی ان لوگوں کو بھول گئے جو تمہارے ظلم کا نشانہ بنے تھے کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔''

نومی نے ان تینوں کو گھورا۔ ''کوئی حرکت نہ کرنا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس پستول کو استعمال کرنا جانتی ہوں۔ میں نے اس وقت کے انتظار میں کئی سالوں تک نشانے بازی کی مشق کی ہے۔''

ولی کو ڈر تھا کہ کہیں وہ ان لوگوں کو موقع پر ہی گولی نہ مار دے۔ اسے روکنا تھا۔ قتل بہرحال قتل ہے۔ خواہ وہ انتقاماً ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس کی کلائنٹ بھی اور وہ اسے جیل جانے سے بچانا چاہ رہا تھا۔

''تو تم نے مجھے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں جو کہانی سنائی، وہ من گھڑت تھی؟''

اس نے فوراً سر ہلا دیا۔ ''مجھے افسوس ہے مسٹر کوستا لیکن میں اس وقت تمہیں بتا دیتی کہ میں ان لوگوں کو قتل کرنا چاہتی ہوں تو کیا تم میری مدد کرتے۔ میں ایک روز اپنی دوست کے ہمراہ یہاں آئی تو میں نے کیپٹن ولا کو دیکھا۔ میں تب سے ہی اس وقت کی پلاننگ کر رہی تھی۔ وہ ان لوگوں کو تلاش کر رہے تھے جنہوں نے جان بچانے کے لیے اپنا ملک چھوڑا۔ اب یہ خود اپنے ملکوں سے فرار ہوگئے۔ میں نے فلوریڈا کا سفر کیا تاکہ انہیں تلاش کر کے پکڑوں۔ اسی طرح انصاف ہوگا۔''

''لیکن تم نے مجھے کیوں اس معاملے میں شامل کیا؟'' ولی نے پوچھا۔

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ میرا مقابلہ تین آدمیوں سے تھا۔ اس لیے سوچا کہ شاید تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئے۔''

ولی کو امید تھی کہ شاید کوئی شخص فائر کی آواز سن کر پولیس یا کم از کم پارک رینجرز کو فون کر دے لیکن اس وقت صرف وہی وہاں موجود تھا۔ اس نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا جب تک کہ وہ اس کے قریب نہ پہنچ گیا۔ اس دوران بھی اس نے اپنے پستول کا رخ ان تین آدمیوں کی طرف رکھا۔

ولی نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی لیکن وہ دور ہٹ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ولی اس سے پستول لے لے۔

''دور رہو۔'' اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ ولی اپنی جگہ پر رک گیا۔

''نومی تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ تم جنگ جیت چکی ہو۔ اب یہ تم مجھ پر چھوڑ دو تاکہ میں پولیس کو فون کر دوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ان لوگوں کو ان کے گناہوں کی سزا ضرور ملے گی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں شکریہ۔ اگر میں نے ایسا کیا تو انہیں واپس بھیج دیا جائے گا اور غالباً انہیں ان کے ملکوں میں قید کی سزا بھی ہو جائے گی .... کیونکہ یہ عمر رسیدہ ہیں۔ اس لیے شاید انہیں لمبی سزا نہ ہو۔ لاطینی امریکا میں بوڑھوں کے ساتھ کافی نرمی ہوتی ہے۔ ان کے گناہوں کی سزا دینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں بھی اسی طرح قتل کیا جائے۔ جس طرح انہوں نے دوسروں کو کیا تھا۔ ان کا علاج صرف گولی ہے۔''

وہ اتنی بلند آواز میں بات کر رہے تھے کہ ان تینوں نے اسے سنا۔ نومی کے الفاظ ان کے لیے موت کا پیغام تھے۔ عین اسی وقت ہرنانڈو لا نے فیصلہ کیا کہ وہ نومی کے سنجیدہ ہونے کا انتظار نہیں کرے گا۔ اس نے اچانک بائیں طرف بڑھ کر اپنے ساتھی اولیورا کو کھینچا تاکہ وہ جزوی طور پر اسے کور کرے اور اس کے ساتھ ہی اس نے دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر پستول نکال لیا۔

نومی مارکوس گھبرا گئی اور اس نے پے در پے کئی گولیاں چلا دیں۔ ولی نے بھی فائر کھول دیا۔ اولیورا جلدی سے نیچے جھکا اور ولا کو دو فائر کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ وہ پیچھے کی طرف گرنے لگا۔ اس نے ایک اور ہوائی فائر کیا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ تیسرا آدمی فریاس ایک طرف کو گرا لیکن زخمی نہیں ہوا اور رحم کی بھیک مانگنے لگا۔

چند منٹ بعد مسلح گارڈز پہنچ گئے۔ ان کے ہمراہ گیٹ پر تعینات لیڈی آفیسر بھی تھی۔ ان کے آنے تک ولی، نومی مارکوس سے پستول لے چکا تھا اور اسے تختے پر رکھ دیا۔ وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑے ہو کر خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔ فریاس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا منہ بسور رہا تھا۔ اولیورا حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے دونوں بازو زخمی ہوئے تھے لیکن وہ زندہ تھا۔ البتہ ولا کی موت واقع ہو گئی تھی۔

کاؤنٹی ہومی سائڈ پولیس آدھے گھنٹے بعد پہنچی۔ ان کے ایک آفیسر ٹم اوٹلے کو ولی اس وقت سے جانتا تھا جب وہ خود پولیس میں تھا۔ ولی نے اسے ان تین آدمیوں، نومی سے ان کا تعلق، اپنی شمولیت اور واقعے کی تفصیل بتائی۔ اوٹلے یہ سن کر حیران رہ گیا۔ بالآخر اس نے بڑبڑاتے ہوئے ایک لفظ کہا۔ ''بھوت۔''

ولی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''بھوت؟''

''ہاں، بہت سے لاطینی پرانے ملکوں سے اپنے بھوت بھی ساتھ لے کر آئے یہ سلسلہ بھی ختم نہیں ہوا۔''

ولی نے اس پر بحث نہیں کی۔

فریاس اور اولیورا نے فائرنگ کے تبادلے کے لیے ولا کو مورد الزام ٹھہرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ولا نے نتائج کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا پستول نکال کر فائر کیا تو ولی اور نومی کو بھی اپنے دفاع میں گولی چلانا پڑی۔

تین دن بعد ولی، ایلیک آرڈن کے دفتر میں بیٹھا اسے تفصیل بتا رہا تھا۔

''میں نے ابھی بیلسٹک اور پوسٹ مارٹم رپورٹس دیکھی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''جو مجھے شاید کسی کو نہیں بتانی چاہئیں لیکن ولا، نومی کی چلائی ہوئی گولی سے ہلاک ہوا۔ وہ سیدھی اس کے دل میں جا کر لگی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس کا نشانہ تم سے بہتر ہے۔''

''یہ بات کسی کو نہ بتانا۔''

''کیا تم نے اسے بتایا؟''

''نہیں اور نہ ہی بتاؤں گا۔ اس نے پوچھا بھی نہیں۔ ولا مر چکا ہے اور اس کا مشن پورا ہو گیا۔ وہ ارجنٹائن واپس جانے کا پروگرام بنا رہی ہے اور اگر ضرورت پڑی تو گواہی دینے کے لیے واپس آ جائے گی۔''

''وہ ایک مضبوط عورت ہے جس نے ان تینوں بدمعاشوں کو للکارا، اور ایک جھوٹی کہانی سنا کر تمہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔''

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس نے میرے وقت کا پورا معاوضہ ادا کیا اور میں اس قابل ہوا کہ ان بدمعاشوں کا سراغ لگا سکوں اور تمہارا بھی شکریہ کہ تم نے میری مدد کی۔''

''خالی شکریہ سے کام نہیں چلے گا۔ میں کسی اچھے ریستوران میں ڈنر کروں گی۔''

''بصد شوق اور اس کے بعد؟''

''زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں۔'' ایلیک نے کہا اور منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔

❖❖❖

آخری قسط

انا گیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو انا گیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے ابھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستان دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر دروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جا سکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

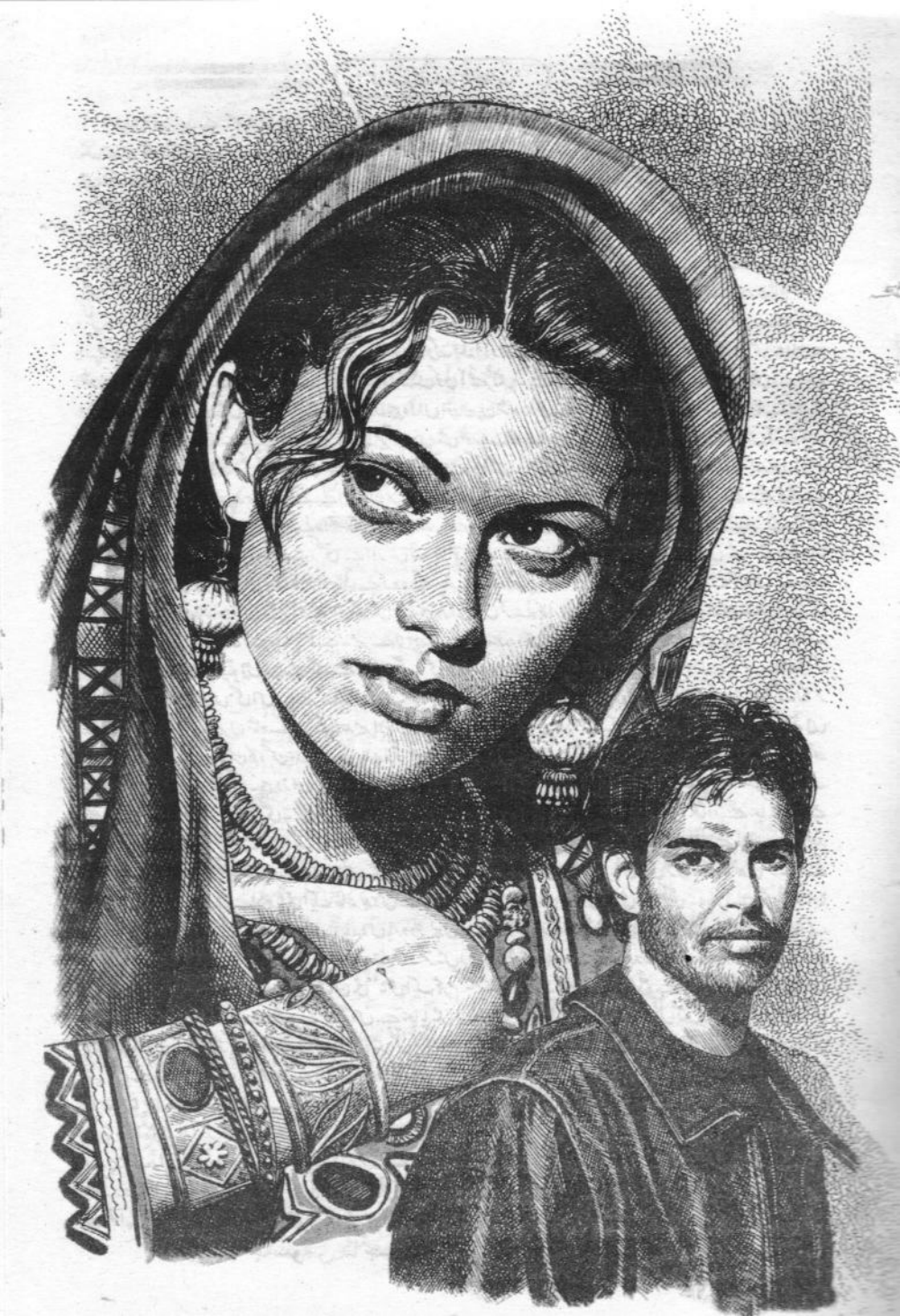

میرا نام علی زین ہے۔ صحرائے چولستان میں وارد ہوتے ہی میں مقامی غنڈوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ مجھے زخمی کر کے بستی چراغ شاہ میں میرن شاہ کے ڈیرے پر لے آئے۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا وہ غلط فہمی اور جلد بازی میں کسی دوسرے بندے کو اغوا کر کے لے آئے ہیں جبکہ مجھے اسی بستی اور ڈیرے پر جانا تھا۔ میں نے اپنا تعارف سروے آفیسر کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میرن شاہ چونکہ اس علاقے کا حاکم تھا۔ میرے رہنے کا بندوبست اسی کے ڈیرے پر ہوا تھا۔ اس بستی میں میرے بچپن کی یادیں بکھری تھیں۔ مجھے اپنے بچپن کے دوست ساتول اور ساوری کے علاوہ کئی دوسرے بھی یاد تھے۔ اگلے ہی دن معلوم ہوا کہ جس کے دھوکے میں مجھے اغوا کر کے لائے ہیں وہ نزدیکی بستی کا ایک فرد بخشاور تھا، جن کے ساتھ ان کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ میرن شاہ بجائے وہاں کا سروے کروانے کے.... مجھے خرگوش کے شکار پر لے گیا۔ اسی رات بارڈر پار سے کچھ لوگ میرن شاہ سے ملنے آئے ہیں۔ جو سخت غصے میں تھے اور میرن شاہ پر قتل کا الزام لگایا جس سے وہ لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ اسی رات ڈیرے پر میری ملاقات میرن شاہ کی خودسر بہن پیروزاں سے ہوگئی جو اپنے بھائی سے بھی زیادہ ظالم تھی۔ اگلی رات ڈیرے پر کچھ لوگ حملہ آور ہوئے جن میں ایک اس کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا اور دو شدید زخمی ہو گئے یہیں سے میرے بارے میں شک ہوا کہ میں کوئی آفیسر نہیں۔ مجھے جلد ہی ایک مقامی نوجوان زمان موہل سے بہت ساری معلومات ملنے لگی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوا کہ پیروزاں اور میرن شاہ روہی کے علاقے میں کیسے اپنی حاکمیت بنائے ہوئے تھے۔ دونوں بہن بھائی اپنے اپنے طور پر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھے، دونوں ایک دوسرے کے راستے میں نہیں آتے لیکن اپنی اپنی حاکمیت مضبوط بنا رہی تھی۔ میری ساوری سے ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ پیروزاں ایک ''ڈائن'' اور مرد مار قسم کی عورت ہے۔ وہ مجھے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ روہی میں بارڈر پار سے کئی لوگ آتے تھے جو مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ پیروزاں نے راجھستان کے کئی بندے مروا دیے تھے۔ رتو بھوہڑ سے بھی مڈھ بھیڑ ہوئی ہے۔ مجھے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے تعلقات میں کتنی وسعت رکھتی ہے اور کس قدر طاقتور ہے۔ مجھ پر راجھستانی حملہ کرتے ہیں، جس میں، میں بچ جاتا ہوں۔ اس حملے میں پیروزاں کی نیت ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ مجھے چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بھی اس کے ساتھ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالات اس نہج پر آ پہنچتے ہیں کہ میں نے پیروزاں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ساوری اس رات پیروزاں کو بچا لیتی ہے اور مجھے اس کے ڈیرے سے جانا پڑتا ہے۔ میرے لاہور والے دوست روہی آ کر میری مدد کرتے ہیں اور میرن شاہ کے کئی لوگ ہمارے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں۔ میرن شاہ سے میری جنگ لکھی تھی۔ میں پوری پلاننگ کے ساتھ میرن شاہ کو اس کے گھر سے نکال کر بستی میں اس جگہ لایا جہاں کبھی اس نے میرے ماں، باپ اور بہن کو قتل کیا تھا۔ میں نے میرن شاہ کو اس کی ماں کے سامنے آگ لگا کر بے رحمی سے قتل کر دیا۔ میرن شاہ کے قتل کے بعد میرا وہاں رہنا مشکل تھا۔ پیروزاں اور اس کے طاقتور ساتھی پوری کوشش کرتے ہیں کہ مجھے گھیر کر مار دیں۔ دشمن کا دشمن، دوست کی بنا پر رتو بھوہڑ اور چاچا سائیں نے میری مدد کی۔ یہاں تک کہ پیروزاں کے ساتھ جنگ جیسی صورت حال بن گئی۔ پیروزاں نے فورسز کا سہارا لیا تو چاچا سائیں اور رتو بھوہڑ کی مدد سے میں سرحد پار راجھستان پہنچ گیا۔ مجھے ایک سرحدی بستی میں پناہ ملی تھی۔ مجھے وہاں کا کھیا قتل کرنے کے درپے تھا۔ وہاں سے چاچا سائیں کا بیٹا بخشا اور مجھے بچا کر اودھے رام کے پاس لے گیا۔ اودھے رام ایک مجرم تھا جو اپنے ہاں پناہ لینے والوں سے جرم کرواتا تھا۔ اودھے رام سے ملاقات کے بعد مجھے ٹاسک دیا گیا کہ جیسلمیر میں موجود ایک بزنس مین کو قتل کرنا ہے۔ میں جیسلمیر پہنچ چکا تھا۔ مانسی نامی لڑکی کے ساتھ مل کر میں نے بزنس مین کا کام تمام کر دیا۔ مادھو نامی ایک خانہ بدوش کے ہاں پناہ لینا پڑی جہاں بھارتی آرمی آن پہنچی۔ وہاں سے بھی فرار ہونا پڑا۔ اسی جرم کی دنیا میں مجھے نیا ٹاسک سونپ دیا۔ اس بار دو لڑکیوں کو اغوا کرنا تھا۔ رتنا اور ششما نامی لڑکیوں کو میں نے اغوا کر کے ایک ویرانے میں پہنچا دیا تھا، جہاں میرے قتل کا منصوبہ تیار تھا۔ مگر میں رتنا اور ششما کو بچا کے جودھ پور لے گیا۔ رتنا اور ششما خود جرم کی دنیا کی بڑی کھلاڑی تھیں۔ وہیں پر مجھے ''کلیان جی'' نامی ایک مجرم تنظیم کا پتا مل گیا۔ مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ پوجا نامی لڑکی دراصل کلیان جی کی ایجنٹ ہے۔ میں نے خود کو اس سے بچایا میں اسے اغوا کر کے قتل کرنا چاہتا تھا مگر قتل نہیں کر پاتا۔ پوجا کا ساتھی پرتاب راؤ، ان دونوں لڑکیوں کو غداری کی پاداش میں قتل کروانا چاہتا تھا۔ اسی دوران میں پتا چلا کہ کلیان جی کے ڈانڈے تو ریاستی خفیہ تنظیم سے ملتے ہیں، اس تنظیم کو چلانے والوں میں راکیش ورما بھی شامل تھا۔ جودھ پور میں خود کو بچاتے ہوئے مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہیں سے مجھے ایک مددگار سے مشراء جی نامی آدمی سے پرتاب راؤ کے بارے میں خبر ملی۔ میں اس کے تعاقب میں دیوگڑھ جا پہنچا۔ دراصل وہاں پر رانی بھاگ وتی اور پرتاب راؤ کے درمیان دشمنی چل رہی تھی۔ اس نے رانی بھاگ وتی کی طرف سے پرتاب راؤ پر حملہ کیا۔ رتیو نامی ایک بازی گر لڑکی نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ اپنی کارروائیوں سے میں نے پرتاب راؤ کو جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پرتاب راؤ خود ریاستی ایجنٹ تھا اور کلیان جی نامی خفیہ تنظیم کا رکن جس نے ڈاکٹر کامران ملک اور اس کی بیوی فائزہ ملک کو اپنی نجی جیل میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ان دونوں کو بازیاب کروایا۔ یہاں سے مجھے پتا

چلا کہ کلیان جی نامی تنظیم کا وجود کتنی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پرتاب راؤ کے قتل کی پاداش میں مجھے وہاں سے فرار ہونا پڑا، آرمی فورس تعاقب میں تھی۔ ایک سادھو مائی نامی عورت کی مدد سے میں جے پور پہنچا۔ آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا کے مصداق میں جے پور میں پھنس گیا۔ ایک مقامی تنظیم نے اس شرط پر مجھے بھارت سے نکالنے کی ہامی بھری کہ میں ستیہ رام نامی شخص کو قتل کردوں۔ بملا نامی آئی ٹی ایکسپرٹ کی مدد سے میں نے ان لوگوں کو قتل کردیا۔ وہی بملا مجھے دوبارہ جیسلمیر تک لے گئی جہاں بھارتی فورسز انتظار میں تھیں۔ وہاں بھی حالات خراب تھے۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا مگر بختاور کی مدد سے میں واپس روہی آن پہنچا ..... میرا نارگٹ پیروزاں تھی جو میرے لیے پہلے ہی جال بچھائے بیٹھی تھی۔ پیروزاں اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ اس کی مدد کو راجستانی دشمن اور بھارتی ایجنٹ آگئے۔ یہاں ایک نئی کشمکش کا آغاز تھا۔ یہاں تک کہ بختاور کی مدد سے ہم نے پیروزاں کو اغوا کرلیا۔ ساوری اپنے انتقام کے باعث پیروزاں کو قتل کرنا چاہتی تھی۔ ساوری کو اپنی محبت کے اظہار کے طور پر میں نے اپنا ماضی بتایا کہ کس طرح بستی چراغ شاہ سے بھاگا اور کہاں کہاں سے ہوتا ہوا لاہور پہنچ گیا۔ اب تک کی زندگی کیسے گزری۔ چاچا عبدالمجید جس نے ہر پل میری راہنمائی اور مدد کی، وہ روہی میں آگیا تھا۔ ہم نے سانول اور رحماں کی شادی کردی تھی۔ اسی شادی پر ناچنے والی لڑکی روحی سے چھوٹو رام جیسا بدمعاش سامنے آگیا تھا، جس کے ڈانڈے جرم کی دنیا میں بہت دور تک جاتے تھے۔ چھوٹو رام محض ایک پرزہ تھا۔ اصل بیوپار کرنے والے پیچھے چھپے رہنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے ساتھ زبردست ٹاکرا ہوا۔ ہم شہر آگئے۔ اب کلیان جی نامی تنظیم کا کھوج لگانا تھا۔ اس سلسلے میں پوجا رہنمائی کرسکتی تھی مگر وہ کیا کھیل، کھیل رہی تھی۔ ابھی ہماری سمجھ سے دور تھا۔ پوجا سے ملاقات طے ہوچکی تھی۔ پوجا پر تشدد کرنے کے بعد کچھ باتیں پتا چلیں۔ میں اس پر اعتماد کرنے پر تیار نہ تھا۔ مگر چاچا عبدالمجید کے کہنے پر اس کی جاں بخشی دی۔ اب اس کے اور میرے ارادے خطرناک صورت اختیار کرگئے۔ پوجا نے جو کچھ بتایا تھا اس کے پیش نظر ہمیں اپنی کارروائی کرنی تھی۔ ریتو سے بھی میں رابطے میں تھا۔ وہ ہر مشکل گھڑی میں ہمارے کام آتی تھی۔ اس وقت بھی وہ میرے ساتھ تھی کہ اس بندے کی کال آگئی جو مسلسل مجھے دھمکی آمیز کال کرتا تھا۔ اس نے پوجا کا حوالہ دیا تھا اور اب مجھے ٹارگٹ کرنے آرہا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اودت کے اچانک فون آنے سے بلاشبہ میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ میں حواس باختہ ہوگیا، تو یہ سچ تھا۔ میری یہ کیفیت چند لمحوں تک رہی لیکن اگلے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہوا تم نے خود ہی فون کرلیا، میرا وقت بچ گیا، کہو کہاں ملو گے؟''

''ارے اتنی جلدی کاہے کی ہے، ذرا شہر کی سیر و تفریح تو کرلو، تھوڑا سانس تو لے لو، ملتے ہیں پھر، مرنے کا اتنا شوق ہے تمہیں۔'' اس نے مذاق اُڑاتے ہوئے خالص لوفرانہ انداز میں کہا تو میں طنزیہ انداز میں بولا۔

''وقت ہی تو نہیں ہے میرے پاس۔''

''اوہ اچھا..... چلو پھر جلدی ملتے ہیں بلکہ میں خود ملوں گا تم سے آکر۔'' اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

اس کی آواز کار کے اندر گونج کر رہ گئی تھی۔ اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ مجھے اردگرد خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اودت کو میرے بارے میں معلوم ہونا اور میرا فون نمبر اس کے پاس اتنی جلدی پہنچ جانا، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ اگرچہ یہ سوال انتہائی اہمیت رکھتا تھا، لیکن اس سے بھی زیادہ یہ اہم تھا کہ مجھے فوراً منظر بدلنا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا، پھر ساتھ بیٹھے رویندر سے کہا۔

''رویندر، یہاں چندی گڑھ میں کوئی محفوظ ٹھکانا مل جائے گا؟''

''جیسا ٹھکانا کہو بائی جی..... شاید آپ بھول گئے ہیں، میں یہاں دس برس رہا ہوں اور میرے یہاں پر.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

''تم ایسا کرو، فوراً واپس پلٹ جاؤ، نینا اور ریتو کو لے کر کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچو، میں بملا کو لے کر.....''

''کوئی خطرہ ہے کیا؟'' اس نے تشویش سے پوچھا تو میں نے اودت کے فون کے بارے میں اسے بتادیا۔ اس کے چہرے پر بھی خوف بھری پرچھائیں پھیل گئی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

''ریتو کو فون کر کے کہیں، وہ اپنا سامان لے کر خاموشی سے نکل آئے۔ ہم واپس وہیں گھر کے قریب جاتے ہیں اور انہیں لے آتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن کوئی ٹھکانا.....'' میں نے پوچھنا چاہا۔

''بائی جی، آپ ڈرائیونگ کرو، میں سب کچھ کرلیتا ہوں، بملا کو بھی دیکھ لیں گے۔'' رویندر نے پُرسکون انداز میں سمجھایا تو میں بولا۔

''اوکے، بملا اگر تھوڑی دیر انتظار بھی کرلے گی تو

کوئی بات نہیں۔''

میری بات سن کر رویندر نے گاڑی سڑک کنارے روکی، میں ڈرائیونگ سیٹ پر آیا تو وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی بڑھا دی، وہ ریتو کو فون کرنے کے بعد فون ہی میں بزی ہو گیا۔

مجھے واپسی کے راستے کا آئیڈیا تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ دو تین کلومیٹر دور آئے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد ہم اس گھر سے تھوڑا فاصلے پر رکے تو ریتو اور نینا سامان اٹھائے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ رویندر جلدی سے اتر کر ان تک پہنچا، جو سامان پکڑ سکا اس نے پکڑا اور واپس گاڑی میں آ گیا، وہ پچھلی نشست پر سامان کے ساتھ بیٹھیں تو میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''راج ویر خیریت، اتنی تیزی؟'' ریتو نے کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، ہماری زندگی میں کہیں سکون ہے؟'' میں نے خوشگوار انداز میں کہا اور قہقہہ لگا دیا۔ وہ خاموش رہی تو میں نے اودت کے فون بارے میں بتا دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

''یوں اندازہ لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ اسے یہ سب کیسے پتا لگا، ہماری پہلی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ ہم کہیں چھپ جائیں۔''

''بالکل تم درست کہہ رہی ہو۔ اب دیکھیں، یہ رویندر ہمیں کہاں لے کر جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر یہ کچھ نہ کر پائے تو مجھے بتائیں، میں کر لوں گی کچھ نہ کچھ۔''

''تم بھی ٹرائی کر لو۔'' میں نے کہا تو گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ رویندر ابھی تک مصروف تھا اور میں گاڑی یونہی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خوشگوار انداز میں بولا۔

''لو جی گھر مل گیا، یہ دیکھو، بنگلا ہے پورا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے تصویر دکھائی۔ وہ بالکل نیا تعمیر ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لوکیشن بھی تھی۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے۔ وہاں پر صرف ایک چوکیدار تھا۔ اس نے وہ بنگلا کھول دیا۔

''تم لوگ یہاں کے معاملات دیکھو، میں بملا کو لے کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''ٹھہرو، تم نہیں جا سکو گے، سیکیورٹی کیسے پار کرو گے؟'' رویندر نے کہا۔

''ایسا کرو، تم ہی اسے لے آؤ، میں یہیں رہتا ہوں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا تو اس نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔ نینا اور وہ دونوں نکل گئے۔ میں نے ریتو کو سامنے بٹھایا اور اسے بملا کے بارے میں بتایا کہ وہ کون ہے؟ اسے بہت زیادہ اہمیت دینی ہے۔ ریتو نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

''جو حکم جہاں پناہ، تم دونوں کو تخلیے کا پورا موقع فراہم کیا جائے گا۔''

''یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ مجھے تخلیہ کیوں چاہیے۔ ابھی ہم کوئی چائے وغیرہ کا بندوبست کر لیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ضرور۔'' اس نے کہا اور اٹھ گئی۔

بملا ائرپورٹ پہنچ چکی تھی۔ رویندر کو اس کے بارے میں بتایا۔ وہ خیریت سے پہنچ چکی تھی۔ اب بملا لاؤنج میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ خوشگوار حیرت سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ وہ کسی بزنس وومین کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بہترین تراش کا سیاہ سوٹ، سفید شرٹ، ہلکے ائر رنگ، شولڈر کٹ بال، وہ اپنے لبوں پر مسکان سجائے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر میرے سینے سے آ لگی۔ ایک طویل اور پُرجوش احساس کے ساتھ وہ مجھ سے الگ ہو گئی۔ پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے یقین نہیں ہو رہا، میں تم سے دوبارہ مل رہی ہوں۔''

''لیکن مجھے تمہارے بدن کی گرمی احساس دے رہی ہے کہ تم یہاں ہو میرے پاس، میرے دل کے قریب۔'' میں نے پوری سچائی سے کہا تو اس نے خمار آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور تنک کر بولی۔

''مگر مجھے یہ احساس ہے کہ تم نے مجھے اپنے ہی کسی کام سے بلایا ہوگا، ورنہ تم جیسا خودغرض، اور پرلے درجے کا.....''

''خدا کے لیے تھوڑا سا خیال کرو، یہ لوگ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔'' میں نے اسے ٹوکا اور باقی تینوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

''چل تجھے معاف کیا۔''

''آؤ تمہیں کمرا دکھاؤں، فریش ہو جاؤ۔ پھر چائے پیتے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ میرے ساتھ اوپری

منزل کی طرف چل دی۔ وہ فریش ہونے لگی اور میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آ کر بیٹھی تو میں نے کہا۔

''بملا، میں نے تمہیں ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بلایا ہے اور.....''

''وہ بتا، تمہید چھوڑ۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے سامان میں سے بلراج کا سیل فون، لیپ ٹاپ اور پن ڈرائیو نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ بلراج، وہ بندہ ہے جو میرے دشمنوں پر پیسہ خرچ کرتا تھا، وہ پاگل تو نہیں تھا نا، مجھے ان چیزوں سے بہت کچھ ملنے کی امید ہے۔''

''اوئے فکر نہ کر جانی، جو اس میں نہیں ہے وہ بھی نکال لیں گے۔'' اس نے جوشیلے انداز میں کہا۔

ہم لنچ کر چکے تو بملا نے آرام دہ کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

''لے بھئی رویندر سنگھ جی..... ایسے کرو، دو تین برانڈ کا دارو لا کر رکھ دو میرے کمرے میں۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔''

''آ جاتے ہیں جی اور کوئی حکم؟'' میں نے پوچھا۔

''کل حکم دوں گی اگر من کیا تو.....'' اس نے بے باک نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے ریتو کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔

''چلو جی آؤ، برتن اٹھاؤ، ہم کچن میں جا کر دھوئیں۔'' میں نے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا تو نینا قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''تم بیٹھو، ہم کر لیں گے۔'' نینا نے کہا اور برتن اٹھانے لگی۔ بملا اٹھی اور اوپر کی طرف جانے لگی۔ رویندر باہر چلا گیا۔ میرے دماغ میں سوال اٹھنے لگا کہ اودت کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آ گیا ہوں؟ یہی میں نے ریتو سے کہا۔

''میں نے پہلے بھی تمہیں کہا ہے، اس پر دماغ کھپانے کی ضرورت نہیں، تھوڑا وقت گزرنے دو، سب پتا چل جائے گا جس طرح ہمارے پاس کچھ جدید ٹیکنالوجی ہے، ممکن ہے وہ ہم سے بھی آگے ہوں۔'' ریتو نے دھیمے سے انداز میں کہا تو میں بولا۔

''اگر ایسا ہے تو یہ سب مزید مشکل ہو جائے گا۔''

''جو بھی ہو، لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ اودت بے وقوف ہے اور ضرورت سے زیادہ ہی خود پر اعتماد رکھتا ہے یا پھر بہت زیادہ عقل مند اور دشمن کو تھکا کر مارنے دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کچھ ہے اس میں۔'' ریتو نے سوچتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

''مجھے اودت کافی مشکل لگ رہا ہے۔ جس طرح ہم نے نذر انصاری کے فوراً بعد بلراج کو ختم کیا ہے تو وہ سمجھ گیا ہے تیسرا ہدف وہی ہے۔ لیکن..... ریتو سوال پھر وہی ہے، اتنی جلدی اسے ہمارے بارے میں پتا کیسے چلا؟''

''ظاہر ہے ہم دونوں کے پاس جواب نہیں ہے، یہ بملا ہے نا، اسے دو اودت کا نمبر، شہباز سے بات کرو۔'' ریتو نے صلاح دی تو مجھے خیال آیا۔

''یار ہم ایسے ہی چھپتے پھر رہے ہیں، وہ ہماری لوکیشن پر ہمیں.....''

یہ کہتے ہوئے میں چونک پڑا تو ریتو سکون سے بولی۔

''ایسا ہوتا تو ہم تک کوئی نہ کوئی پہنچ چکا ہوتا، کیونکہ تمہارا فون اب بھی لاہور ہی کی لوکیشن بتا رہا ہے، اس کا رابطہ صرف تمہارے ساتھ ہے، ہمارا رابطہ ہوتا تو شاید ہم تک پہنچ گیا ہوتا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہمیں سب سے پہلے اسی سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا، خیر تم ایسا کرو، سکون کرو۔ میں بملا کو رام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''ایک بات اور.....'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''رویندر کے جاننے والوں کو تو نہیں پتا نا ہم کون ہیں، ہمیں کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہیے کہ ہم کہاں ہیں، یہاں تک کہ اپنے قریب ترین لوگوں کو بھی۔ پھر دیکھتے ہیں، اگر تو اودت ہم تک پہنچ گیا، تو پھر کوئی ٹیکنالوجی کی بات ہو گی، اور نہ پہنچ سکا تو سمجھو ہمارے اردگرد کہیں کوئی ہے جس نے اودت کو بتایا۔''

اس نے کہا تو میرے خیالات کی تائید ہو گئی۔ میں ریتو کو دیکھ کر مسکرایا اور اس کے گال پر ہاتھ رکھ دیا، اس نے بھی نرماہٹ سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ تشکر کا یہ انداز ہم دونوں کو مزید اعتماد دے گیا۔

☆☆☆

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ میری بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ میں نے دو بار شہباز سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میری اس سے بات نہیں ہو پائی تھی۔ رنگ جانے کے باوجود اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس بار بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی تو

بلاشبہ کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چاچا عبدالمجید کو فون کروں لیکن دماغ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے بھی اور وہ مجھے خود نہیں بتانا چاہتے تو مجھے بھی نہیں پوچھنی نہیں چاہیے۔ ایسی جگہ پر جہاں میں خود موت کے حصار میں گھرا ہوا تھا، توجہ بانٹ دینے والی کوئی بھی سوچ مجھے موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ دوبارہ کال کرنے کے بعد اگر شہباز نے فون نہیں کیا تھا تو یقیناً کوئی وجہ ہوگی۔ مگر مجھے اپنی بے چینی پر اختیار نہیں تھا۔

دوسری طرف اودت کا بھی فون نہیں آیا تھا اور نہ ہی وہ اب تک مجھے تلاش کر پایا تھا۔

دوپہر کے بعد سے نینا اور رویندر کہیں نکلے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس اسلحے کے نام پر صرف دو پسٹل اور دو ہی میگزین تھے۔ رویندر اسلحے کے ایک مقامی ڈیلر کو جانتا تھا۔ ایک لمبی رقم کا ریتو نے بندوبست کر دیا تو وہ گھر سے نکلا تھا۔ وہ میرے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا۔ اب واپسی میں نجانے کتنا وقت لگتا، یہ حتمی طور پر کہا نہیں جا سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا تو دھوپ ختم ہو چکی تھی۔ سائے ڈھل کر شام میں بدل گئے تھے۔ میں لاؤنج میں آیا تو ریتو کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ میں بسملا کے کمرے کی جانب چل دیا۔

وہ کمرے میں دھیمی روشنی کیے، بیڈ پر نیم دراز اپنے لیپ ٹاپ میں کھوئی ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر پینے پلانے کا سارا سامان رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تم سگریٹ کب سے پینے لگی ہو؟''

''میں تو بہت عرصے سے پی رہی ہوں لیکن پہلے کم پیتی تھی لیکن اب زیادہ پیتی ہوں۔ جب ٹینشن زیادہ ہو تو اور زیادہ پیتی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب کیا ٹینشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یار یہ جو تمہارا کام ہے نا، بہت اُلجھا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر سنجیدگی سے بولی۔ ''اس کا فون تو میں نے کھول لیا ہے، چند فون نمبر ہیں، جو ایک جال کے مانند ہیں۔ میں ان میں کنکشن ملانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ہو جاتا ہے سب کچھ۔''

''اور وہ پن ڈرائیو؟'' میں نے پوچھا۔

''پاس ورڈ لگے ہوئے ہیں، وہ بھی کھولنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''او کے، اس کا لیپ ٹاپ دیکھو، کچھ کرو۔'' میں نے بے چینی سے کہا تو اس نے لیپ ٹاپ سے نگاہیں ہٹائیں اور دھیمی سی مسکان کے ساتھ بولی۔

''میں تمہاری ذہنی حالت سمجھتی ہوں راج ویر۔ پُرسکون رہنے کی کوشش کرو، ہو جائے گا، تھوڑا وقت تو لگے گا نا۔''

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، میرا فون بجا، میں نے اسکرین پر دیکھا تو وہ شہباز کا فون تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کر لی۔

''او ماما کہاں تھے تم؟'' میں نے قدرے تلخی سے پوچھا۔

''میں سو گیا تھا یار، ابھی اٹھا ہوں، کل سے پھنسا ہوا تھا۔ خیر بول کیا بات ہے، خیریت سے ہو نا؟'' اس نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا۔

''ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اودت والی بات اسے بتائی تو وہ بولا۔

''پریشان نہ ہو، وہ ایسے ہی گیدڑ بھبکی دے رہا ہوگا۔ باقی رہی تمہارا فون نمبر لینے کی بات تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ایک لاہور میں بھی تمہیں فون کرتا تھا نا، ایسے ہی یہ ہوگا۔''

''نہیں یہ اودت ایسا نہیں ہے، میں اسے ہی ٹارگٹ کرنے آیا ہوں، اس نے آدھے گھنٹے میں مجھے فون دے مارا، کچھ ہے یار سمجھو میری بات۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا تو وہ کافی حد تک تشویش سے بولا۔

''او کے، میں سمجھ گیا، میں کوشش کرتا ہوں اور ابھی نکلتا ہوں آفس اور شانزے سے بھی کہتا ہوں۔''

''او کے.....'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں لاشعوری طور پر رویندر کے لیے بھی پریشان ہو رہا تھا۔ کافی دیر ہو گئی تھی، اس نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور اسے کال کر دی۔ رابطہ ہوتے ہی وہ بولا۔

''بس، میں ابھی پہنچے ہی والا ہوں۔ یہیں نزدیک ہوں۔''

''او کے، جب تک تم پہنچ نہیں جاتے، مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ڈونٹ وری، میں بس دو منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''چل پہنچ جلدی۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد روبندر پہنچ گیا تو میں نے اطمینان کا سانس تو لیا مگر میری بے چینی نہیں جا رہی تھی۔

ایسا کیوں ہو رہا تھا، اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں ان سب کو چھوڑ کر اوپر چھت پر چلا گیا۔ اگرچہ باہر اندھیرا چھا گیا تھا، لیکن اسٹریٹ لائٹ سے کافی روشنی ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے گہرے گہرے سانس لیے، خود کو ذہنی طور پر آزاد چھوڑ دیا۔ کچھ دیر بعد اچانک میرے دماغ میں آیا۔ میں صرف اودت کے فون آنے ہی سے ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اودت کو تلاش کرنے کے بجائے، یہ ڈھونڈنے کی کوشش میں لگ گیا کہ اسے کیسے پتا چلا؟ یار اگر اسے پتا چل گیا ہے تو کیا ہوا، مجھے اپنا ٹارگٹ تو پورا کرنا ہے۔ اب اس میں موت کس کی ہوتی ہے، میری یا اُس کی؟ یہ فیصلہ تبھی ہونا تھا جب میرا اور اس کا سامنا ہوتا۔ کیا میں ذہنی طور پر اودت سے مرعوب ہو گیا ہوں؟ مگر میرے اندر کا انا گیر جاگ اٹھا اور پوری قوت سے آواز ابھری۔

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، مجھے اپنا ہدف ہر حال میں پورا کرنا ہے۔''

''تو پھر دیکھتا کیا ہے، خود تلاش کر اُسے۔'' میرے دماغ نے کہا تو میرے اردگرد پھیلی ساری بے چینی ختم ہو گئی۔ میں ابھی اسی پر سوچ رہا تھا کہ میرا فون بجا، میں نے اسکرین پر دیکھا تو وہ سردار صاحب کا فون تھا۔

''ارے بھائی کہاں ہو تم؟ مجھے پتا چلا کہ تم وہاں نہیں ہو جہاں میں نے بندوبست کیا تھا؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا تو میں نے بتایا۔

''میں نے وہاں پر خود کو غیر محفوظ سمجھا اس لیے نکل کر کیسی دوسری جگہ پر آ گیا ہوں۔ ابھی تک وہیں ہوں، یہاں سے بھی نکلنا ہو گا مجھے۔''

''اوہ...... تم جہاں بھی ہو، کم از کم وہاں سے جاتے ہوئے مجھے بتانا تو تھا، میں کہیں بہتر بندوبست کر دیتا، خیر، جہاں تم بہتر سمجھو وہیں رہو۔''

''نہیں میں محفوظ جگہ پر ہوں۔'' میں نے بتایا تو اس نے پوچھا۔

''اودت کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

''نہیں ابھی تک میں نے اُسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' میں نے صاف لفظوں میں بتایا تو دوسری طرف سردار صاحب چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔

''او کے، جب تم بہتر سمجھو۔ کچھ چاہیے تو مجھے بتاؤ۔''

''نہیں ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے، ہاں مگر اودت کے بارے میں کوئی جانکاری ہو تو وہ ضرور دیں۔'' میں نے کہا۔

''میں صبح سے اسی کی تلاش میں تھا۔ مجھے اس کے چند ٹھکانے معلوم ہوئے ہیں، میں وہ میسج کر دیتا ہوں، باقی تم دیکھ لینا۔'' اس نے کہا پھر چند الوداعی باتوں کے بعد کال ختم کر دی۔

میں نے فون جیب میں رکھتے ہوئے سوچا، اودت کو کیسے تلاش کیا جائے؟ کہاں ملے گا وہ مجھے؟ کیونکہ اس وقت میرے سامنے سب سے بڑا سوال یہی تھا۔ میں تھوڑی دیر چھت پر ٹہلتا رہا، پھر نیچے آ گیا۔ ریتو نے باہر سے کھانا منگوا لیا تھا، وہ کھانے کے بعد بملا اپنے کمرے میں جا گھسی، نینا کچن میں مصروف تھی۔ ہم تینوں لاؤنج میں رہ گئے۔ میں کچھ دیر بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں سردار صاحب کی طرف سے چند میسج ملے، ان میں مختلف جگہوں کے نام تھے۔ سارے مقامات کے بارے میں پڑھنے کے بعد میں اٹھا اور بملا کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس کے پاس بیڈ پر بیٹھا تو وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگی، پھر لیپ ٹاپ پر نگاہیں جما کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بڑے قریب ہو رہے ہو، اب میں کام نہ کروں کیا؟''

''کرو کام، کس نے روکا ہے، مجھے ایک نمبر کی لوکیشن دیکھنی ہے۔'' میں نے بڑے پیار سے کہا تو اس نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

''نمبر بولو۔''

میں نے سیل فون سے اودت کا نمبر نکال کر اُسے بتایا۔ اس نے وہ فون لیپ ٹاپ میں لکھا اور وہیں کچھ کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے وہ لوکیشن تلاش کر لی۔ اسکرین پر انگلی رکھ کر بولی۔

''یہاں پر ہے وہ نمبر۔''

''کون سا علاقہ ہے یہ؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''تمہارے فون پر بھیج دی ہے لوکیشن، وہیں دیکھ لو۔''

میں اپنے فون پر وہ لوکیشن دیکھنے لگا۔ وہ کوئی 'سہانا' کا علاقہ تھا۔ میں لاؤنج میں آ گیا۔ ریتو اٹھ گئی تھی۔ روبندر ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے لوکیشن کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

''بائی جی آپ بھی کمال کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ، میں جانتا ہوں اودت کو۔''

''کیا جانتے ہو اس کے بارے میں؟''

''آپ نے تو مجھ سے بات ہی نہیں کی، میں نے سوچا شاید ابھی آپ اس کا پتا ہی نہیں کرنا چاہتے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر کہتا ہی چلا گیا۔ ''کبھی وہ سڑک چھاپ غنڈا تھا، جہاں رہتا تھا، مجھے اس جگہ کے بارے پتا ہے، میں بھی اُن گلی محلوں میں رہا ہوں۔ پچھلے تین چار برس میں وہ ایک دم سے ابھر کر سامنے آیا ہے، سنا ہے شہر کا نامی بدمعاش بن گیا ہے۔''

''اب کہاں ملے گا؟''

''یہی تو کامیابی ہے اُس کی، رہتا بھی وہ یہیں چندی گڑھ میں ہے اور دکھائی بھی کسی کو نہیں دیتا۔'' رویندر نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس کی تعریف کرنے کو نہیں کہا بلکہ یہ پوچھا ہے کہ وہ ہے کہاں اس وقت، اس کا نمبر اس جگہ کے بارے میں بتا رہا ہے۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ وہ سہانا نہیں جا سکتا لیکن یہ کنفرم ہے وہ وہاں رہتا نہیں۔ باقی ہم تلاش کر لیں گے اسے۔''

''چل پھر اس کا پتا کر کہاں ہے، اس سے پہلے کہ وہ ہمیں تلاش کرے، ہم اس تک جا پہنچتے ہیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

''چلیں ٹھیک ہے۔''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ بملا لاؤنج میں آ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''وہ نمبر اب وہاں پر نہیں، وہ موو کر رہا ہے۔''

''تم نے دیکھا؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں، میں نے کراس چیک کیا ہے، اس کے ساتھ دو نمبر ایسے ہیں جن سے وہ مستقل بات کرتا ہے، میں نے ان نمبروں کو بھی دیکھا ہے۔ ایک اس کے ساتھ ہے دوسرا کافی دور۔'' بملا نے سمجھانے والے انداز میں بتایا۔

''اس کی لوکیشن کیا ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''بھیج دی ہے تمہارے فون پر۔''

میں نے فون دیکھا تو اس پر وہ لوکیشن موجود تھی۔ بملا واپس کمرے میں چلی گئی۔ رویندر اپنے فون پر مصروف تھا۔ میں لوکیشن دیکھ رہا تھا کہ شہباز کی کال آ گئی۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا۔

''کچھ ملا اودت کے بارے میں؟''

''ہاں، ملا ہے، اس کا ایک دشمن ہے سیکٹر سینتالیس میں، اس کا نمبر بھیج رہا ہوں، بات کرو، وہی مدد کر سکے گا۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔

''یہ تو اچھا ہو گیا، میں کرتا ہوں بات۔''

''بہت احتیاط سے ماما۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور چند لمحے کچھ نہ بولا پھر فون بند کر دیا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور رویندر سے کہا۔

''رویندر..... چل اٹھ نکلیں۔''

''کہاں؟'' اس نے فون ایک طرف کرتے ہوئے پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

☆☆☆

ہم سیکٹر سینتالیس پہنچ چکے تھے۔ ہماری منزل سری رام مندر کے پاس ایک چھوٹا سا ریستوران تھی جس کی تصویر ہمیں مل گئی تھی۔ وہاں ہمیں سرجیت سنگھ سے ملنا تھا جس نے اپنی تصویر بھی ساتھ بھیجی تھی۔ مندر کے ساتھ ہی ایک خم کھاتی سڑک جا رہی تھی جس کے سرے پر وہی ریستوران تھا۔ وہاں کافی گاڑیاں پارک تھیں۔ اسٹریٹ لائٹ کے علاوہ بھی کافی روشنی تھی مگر کہیں رش نہیں تھا، یوں لگ رہا تھا جیسے کسی پُرسکون گوشے میں وہ ریستوران بنایا گیا ہو۔ ہم نے وہیں گاڑی پارک کر دی اور باہر آ گئے۔ جھینگروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بڑا پُرسکون ماحول تھا۔ ہم نے اپنے اطراف میں دیکھا اور ریستوران میں داخل ہو گئے۔

رویندر میرے کور پر تھا۔ میں نے ہال میں بیٹھے لوگوں پر نگاہ ڈالی، ان میں کوئی بھی سردار نہیں تھا۔ مجھے ایک لمحے کو جھٹکا لگا۔ کیا سرجیت کو آنے میں دیر ہو گئی ہے یا ہم غلط ریستوران میں آ گئے ہیں۔ میں غیر محسوس انداز میں پورے ہال پر نگاہ ڈال کر ایک میز کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کوئی تو گڑبڑ ہے۔ رویندر کے چہرے پر بھی اُلجھن نظر آ رہی تھی۔ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

''بائی جی..... شاید اسے پہنچنے میں دیر ہو گئی ہے۔ فون لگائیں اسے۔''

''دو چار منٹ انتظار نہ کر لیں، ممکن ہے وہ احتیاط برت رہا ہو۔'' میں نے کہا تو اس نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں لگتا، یہ علاقہ ان کا ہے، انہیں کوئی ڈر خوف نہیں ہونا چاہیے۔''

''شاید، ہماری وجہ سے وہ.....'' میں نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ رویندر نے میری طرف دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ ہوئے ہوں گے۔ باہر تین گاڑیاں آ رکیں۔ ان میں سے پہلے دو تین لوگ باہر نکلے، پھر سرجیت باہر آ گیا۔ وہ تیزی سے ریستوران کے اندر آیا۔ اس نے

چاروں طرف دیکھا اور پھر سیدھا میری طرف بڑھ آیا۔ اس کے تینوں ساتھی اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا تو مجھے لگا جیسے کسی مضبوط انسان کے ہاتھ میں میرا ہاتھ ہے۔ اس کی روشن آنکھیں میرے چہرے پر تھیں، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویلکم کہتا ہوں جی..... بیٹھو۔''

ہم بیٹھ گئے تو میں نے کہا۔

''میں جلد از جلد اودت تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس وقت وہ اپنے ٹھکانے پر موجود ہے، سیدھے اُس تک جاسکتے ہیں۔ اگر جگرا ہے تو پہنچ جاؤ وہاں تک۔'' اس نے دھیمی سے مسکان سے کہا۔

''اگر اتنا ہی آسان ہے وہاں تک پہنچ جانا تو پھر تم اسے اپنے راستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے ہو، کیا اسے مارنے کا تم میں بھی جگرا نہیں ہے؟'' میں نے پُرسکون انداز میں طنزیہ بات کہہ دی۔

''کوئی مشکل نہیں اُسے مارنا، لیکن اسے مارنے کا مطلب ہے، بہت سارے لوگوں کی مخالفت لینا، مجھے اس شہر میں رہنا ہے، کوئی دوسرا مار جائے تو مجھے کیا۔'' اس نے وضاحت کردی۔

''مطلب تم ان کی ہی اجازت سے اس شہر میں اپنے علاقے میں.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''جو مرضی سمجھ لو۔ مجھ سے جو چاہتے ہو، وہ بتاؤ۔''

''یہی کہ اس تک پہنچنے کا راستہ، باقی میں خود دیکھ لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اگر... تمہارا ارادہ یہ ہے کہ اس کے ٹھکانے تک جا کر اسے ختم کردیں تو سمجھو ناممکن ہے۔ ہاں، جب وہ کہیں اردگرد جارہا ہو... یا خاص طور پر جب وہ گرودوارے جارہا ہو تو ممکن ہے۔ اس کے لیے آدمی چاہئیں، جو اس کا پیچھا کرتے رہیں، وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم مجھے اس کے بارے میں بتاتے رہو، باقی میرا کام ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں، تمہیں اس شہر کے بارے میں کوئی خبر نہیں، اس لیے تم ابھی تھوڑا جھجک رہے ہو، ایک دو دن لگیں گے، میں تمہیں پوری طرح گائڈ کردوں گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور اٹھنے لگا تو وہ بولا۔

''ارے کچھ کھا پی لو، پھر چلے جانا۔''

''نہیں بس تم سے ملنا تھا۔ میں کام ختم کرلوں، پھر کھائیں پئیں گے۔'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا اور اٹھ گیا۔ واپسی پر مجھے لگا جیسے سرجیت میرے کسی کام نہیں آسکے گا۔ اس نے صرف باتوں سے مجھے ٹرخانے کی کوشش کی تھی، وہ خود اودت سے خوف زدہ تھا بلکہ اپنے مفاد اور فائدے کے لیے سمجھوتا کرچکا تھا۔ مجھے لگا کہ میں نے یہاں آکر وقت ہی ضائع کیا ہے۔ میں کافی حد تک دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ میرے اندر ایک طرح سے بے بسی والا غصہ ابھرنے لگا تھا۔ میں اپنا تجزیہ کرنے لگا۔ میں نے کبھی کسی پر بھروسا نہیں کیا تھا اور حتی الامکان کوشش کی تھی کہ کسی کی مدد نہ لوں۔ مجھے اس دیارِ غیر میں یوں مدد لینا عجیب سا لگ رہا تھا

''بائی جی آپ کوئی بات کیوں نہیں کررہے ہیں؟'' روبندر نے بالآخر مجھ سے پوچھ ہی لیا تو میں نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار، یہ سرجیت بھی ہماری کوئی مدد نہیں کرپائے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اس نے ایک دم سے کہا۔

''اچھا ہوا تم سمجھ گئے ہو، ہمیں خود ہی کوئی راستہ نکالنا ہوگا۔''

''بائی جی، دن چڑھنے دیں۔ میں نکلوں گا شہر میں، واپسی پر کوئی نہ کوئی بہتر خبر لاؤں گا۔ ابھی آپ پُرسکون رہیں۔'' اس نے کہا تو اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور کہا۔

''یار، جیسے سرجیت نے کہا، اودت کی نگرانی کی جائے تو کیوں نا ہم اس کی نگرانی کریں اور جہاں موقع ملے.....''

''یہی کرتے ہیں، ہمیں صرف اُسے مارنا ہے۔'' وہ سکون سے بولا۔

''چل پھر، ایک گاڑی کا بندوبست کر، ہم چاروں

نکلیں گے الگ الگ، کہیں تو ملے گا وہ.....'' میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔ مجھے لگا یہی سوچ کر میرے اندر پھیلنے والی بے بسی ختم ہو رہی ہے۔

ہم واپس پہنچ کر لاؤنج میں آئے تو ریتو جاگ رہی تھی۔ ہم بیٹھے تو وہ چائے بنانے کچن کی طرف چل دی۔ رویندر اپنے کمرے کی جانب گیا تو میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے سوچا ایک بار بملا کے کمرے کا چکر لگا آؤں شاید اس نے کوئی ''توڑ'' کر لیا ہو۔ میں کمرے میں گیا تو بملا بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا جس میں تھوڑی سی بچی ہوئی تھی۔ نینا بھی ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور وہ بھی گلاس ہاتھ میں لیے سُرور میں تھی۔

''نینا تم یہاں.....؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بس میرا بھی جی کیا اور میں ساتھ دینے آ گئی۔''

''ہاں کافی ماہر لگتی ہے۔'' بملا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن اتنی نہیں جتنی آپ ہو؟'' نینا نے کہا

''تمہاری دونوں پن ڈرائیو کھول دی ہیں میں نے۔ اس میں کچھ ویڈیوز..... اور تصویریں موجود ہیں۔ اب تھوڑا انجوائے کر رہی ہوں۔''

''انجوائے تو تم ہر وقت کرتی ہو، پر اچھا کیا یہ کام ہو گیا۔ وہ پن ڈرائیو دو مجھے، میں اپنے کمرے میں جا کر دیکھ لوں، میرا لیپ ٹاپ اُدھر ہی پڑا ہے۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ وہ اودت کی کال تھی۔ میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ ضرور کوئی اُفتاد پڑنے والی ہے۔ اس وقت تک بملا پن ڈرائیو میری جانب بڑھا چکی تھی، میں نے وہ لیں اور کال ریسیو کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

''ہاں بولو.....'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''بس ابھی اتنا بتانا تھا، وہ جو سرجیت تھا نا جس سے ابھی تمہاری ملاقات ہوئی ہے، اسے میں نے غداری کی سزا دے دی ہے۔'' اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں بے ساختہ بولا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب نہیں ہوتا کوئی بھی، نہ ہی مجھے تم کو سمجھانا ہے۔ ابھی کسی چینل پر دیکھ لینا یا صبح کسی اخبار میں پڑھ لینا، یقین آ جائے گا۔'' اس نے پھر اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

''مطلب تم جانتے ہو کہ میں اُس سے ملا ہوں؟''

''میں وہیں تھا، تم سے تھوڑی دور ایک میز پر تھا۔ ویڈیو بنائی ہے میں نے تمہاری، ابھی بھیج دیتا ہوں۔'' وہ اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تو مجھے اس کا لہجہ مصنوعی نہیں لگا بلکہ مجھے اس سے وحشت ہونے لگی۔ میں چونک گیا۔ وہ کوئی انگلی گیم کر رہا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا، ''میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ میں چاہتا تو اسی وقت تمہیں ختم کر سکتا تھا لیکن نہیں کیا۔''

''کیوں نہیں کیا، احسان کیا مجھ پر اور اب یہ احسان جتاؤ گے بھی کہ میں نے تمہیں نہیں مارا اور.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں احسان جتانا نہیں کچھ اور چاہتا ہوں۔''

''کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا تو وہ اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ابھی نہیں، ابھی تم ویڈیو دیکھو اور انجوائے کرو، یہ دیکھو میں تمہیں کیسے مار سکتا تھا۔ لیکن زیادہ خوش فہمی میں مت رہنا، اب بھی تم میرے نشانے پر ہو۔''

''تو پھر تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے؟'' میں نے قدرے سختی سے پوچھا۔

''یہی بات میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں ابھی تمہیں نہیں مار رہا۔ اس بات کا یقین تمہیں ویڈیو دیکھنے سے مل جائے گا۔'' یہ کہتے ہی اس نے کال کاٹ دی۔ میں اپنے کمرے تک آ گیا تھا، میں نے فون دیکھا، تو ایک دم سے کئی سوچیں میرے دماغ میں در آئیں۔ میں اودت پر حیران تھا، یہ بالکل الگ طرح کے دشمن سے پالا پڑا تھا۔ میں نے فون کھولا تو ایک ویڈیو موجود تھی۔

وہی ریستوران کا منظر تھا۔ میرے دائیں جانب سے کسی نے وہ ویڈیو بنائی تھی، یہی کوئی ایک منٹ دور انے کی تھی۔ اس نے بتایا ہی نہیں، جتا بھی دیا تھا کہ اس نے جو کہا تھا، ٹھیک کہا تھا۔ میں ابھی وہ ویڈیو دیکھ کر اس کے اثر سے نہیں نکلا تھا کہ ایک تصویر آ گئی۔ جسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ تصویر سامنے سڑک سے لی گئی تھی۔ اسی گھر کی تھی جس میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے، ذرا سا غور کرنے پر پتا چل گیا کہ یہ تصویر ابھی کی ہے۔ میں ایک دم چونک گیا، کیا وہ ابھی باہر ہیں، کیا انہوں نے ہمیں گھیر لیا ہے؟ یہ خیال آتے ہی میں تیزی سے باہر نکلا، میں نے فون جیب میں ڈالا اور پسٹل نکال کر چھت کی جانب بڑھا۔ انتہائی کم وقت میں چھت پر تھا۔ میں نے احتیاط سے باہر کی جانب دیکھا تو سڑک پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے حتی الامکان ہر طرف دیکھا کہیں بھی کوئی ذی روح نہیں تھا۔ سڑک دور تک سنسان تھی۔

''یہ بندہ میرے ساتھ کیوں کھیل رہا ہے؟'' میرے دماغ میں خیال آیا تو مجھے حالات کی گمبھیرتا کا احساس ہوا۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا کہ میں اس کے نشانے پر ہوں۔ ایک لمحے کے لیے میں خود کو بے بس تصور کرنے لگا۔ وہ بندہ جس کے میں نشانے پر تھا، اس نے مجھے مارا کیوں نہیں؟ یہی وہ سوال تھا جو میرے دماغ میں گردش کرنے لگا تھا۔

میں واپس کمرے میں آ گیا۔ میرے سامنے کئی سوال آن کھڑے ہوئے تھے۔ اودت کے نشانے پر میں ہوں تو وہ مجھے مار کیوں نہیں رہا؟ دوسرا، اگر وہ مجھے مارنا نہیں چاہتا تو یہ کھیل کیوں کھیل رہا ہے؟ وہ چاہتا کیا ہے؟ اس کا رویہ ایسا کیوں ہے؟ کیا وہ چوہے بلی کے مانند مجھے تھکا کر مارنا چاہتا ہے؟ ایک دم سے سوچیں میرے دماغ پر حاوی ہو گئی تھیں۔ جیسے ہی مجھے احساس ہوا، میں نے سبھی سوچوں کو جھٹکا اور اپنا لیپ ٹاپ کھول کر اس میں پن ڈرائیو لگا دی۔

اس میں چند ویڈیوز تھیں۔ وہ اس نے اپنے خفیہ کیمروں سے بنائی تھیں، جن میں آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کسی میں کوئی پلان ڈسکس ہو رہا تھا، کہیں رقم دے رہا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس نے اپنے پاس ثبوت رکھے ہوئے تھے۔ میں باری باری انہیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک ویڈیو میرے سامنے آئی تو اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

اس ویڈیو میں بلراج کے گھر میں سردار صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان جو گفتگو تھی، وہ نجانے کس موضوع پر تھی لیکن سردار صاحب کا اس کے گھر میں ہونا اور یوں باتیں کرنا مجھے سب کچھ سمجھا گیا تھا۔ میرے دماغ میں فوراً یہ خیال آ گیا کہ اودت کو اگر میرے بارے میں معلوم ہے تو وہ صرف سردار صاحب کی وجہ سے۔ میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ایک شخص جس پر میں نے اعتماد کیا تھا، اب وہ چابی والے کھلونے کے مانند مجھے چلا رہا تھا۔ میں ساری کہانی سمجھ کر اٹھا اور بملا کے کمرے میں جا پہنچا۔ نینا وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''بڑی جلدی دیکھ لیا سب کچھ؟''

''بملا، ایک کام کرو، یہ ایک نمبر لو، اور اودت کے نمبر سے ملاؤ، دیکھو، ان میں کب اور کتنی بار گفتگو ہوئی ہے۔'' میں نے کہا تو میرا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ تبھی اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''راج ویر، خیر تو ہے نا؟''

''خیر ہی تو نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے نینا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جاؤ ریتو اور رویندر کو لے آؤ یہیں۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے سردار صاحب کا نمبر اس کی طرف بڑھایا تو وہ اسے لیپ ٹاپ میں دیکھنے لگی۔ جب تک بملا نے وہ دونوں نمبر دیکھے، ریتو اور رویندر بھی وہیں آ گئے۔ تبھی بملا نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں راج ویر، تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ ان کی آپس میں بات ہوتی ہے، آج بھی کئی دفعہ بات ہو چکی ہے۔''

''اصل بات تو بتاؤ بائی جی، ہوا کیا ہے؟'' رویندر نے تیزی سے پوچھا تو میں نے سب کے سامنے ویڈیو چلا دی اور پھر جو میں نے سوچا اور سمجھا تھا سب کو بتا دیا۔ تبھی ریتو نے غصے میں کہا۔

''اوہ..... اس کا مطلب ہے کہ سردار ہمیں ڈبل کراس کر رہا ہے؟''

''نہیں ڈبل کراس نہیں..... وہ ہمیں اپنے انداز میں چلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں مرجاؤں یا اودت..... دونوں ہی اس کے لیے فائدہ مند ہیں۔''

''بات سمجھ میں نہیں آ رہی؟'' رویندر نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''سمجھ آ جائے تو منافقت کیسی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، کوئی جواب نہ پا کر میں بولا۔ ''ہم اس وقت اودت کے نشانے پر ہیں، وہ کسی بھی وقت یہاں اپنے بندے لے کر چڑھائی کر سکتا ہے۔ ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑنا ہوگی۔''

''تو پھر نکلیں۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''نکلنا تو ہے، کوئی ٹھکانا ہے یا.....'' میں نے پوچھا۔

''کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنا فون نکال لیا۔

''اچھا کرو کوشش۔'' میں نے کہا اور ساری ویڈیوز چاچا عبدالمجید کو بھیجنے لگا۔ نیٹ پاور فل نہ ہونے کی وجہ سے کچھ وقت لگ رہا تھا۔ اس دوران میں سوچتا رہا، پھر اچانک میں نے سر اٹھا کر کہا۔

''ریتو، بملا، اور نینا، تم تینوں پہلی ملنے والی فلائٹ سے نکل جاؤ۔ میں اور رویندر ہوں گے تو سب سنبھال لیں گے۔''

''ایسے کیسے چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ جانی تھوڑا صبر کرو۔

کچھ نہ کچھ حل نکل آتا ہے، صبر۔'' ریتو نے کمالِ تحمل سے کہا لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ یہ محض طفل تسلیاں ہیں، ان سے کچھ نہیں ہونے والا۔

''دیکھو ریتو..... میں خود کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا اور نہ اپنے پیاروں کو دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ سمجھ لو ہم ٹریپ میں آچکے ہیں۔ تم لوگوں کا مجھ سے الگ ہونا بنتا ہے۔ ضد نہیں کرو اور نکل جاؤ۔''

''میں ضد نہیں کر رہی..... میں تو.....'' ریتو نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

''میں ابھی اودت کو نہیں ماروں گا، کیونکہ وہ پوری طرح میری نگرانی کر رہا ہوگا۔ اس وقت مجھے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہونا ہے، دوبارہ اس تک پہنچنے میں چند دن لگ سکتے ہیں یا میں واپس بھی جا سکتا ہوں۔ کچھ بھی فیصلہ کرنا پڑے گا مجھے اس لیے پلیز، میری بات مانو اور.....''

''راج ویر ٹھیک کہہ رہا ہے، اس وقت ہم سب کا جتھا ہی ہماری ناکامی ہوگا، ہم چھپ نہیں پائیں گے۔'' بملا نے ایکدم سے کہا۔

''بالکل ٹھیک، ہم اس سے الگ ہو کر کہیں بھی رہ لیں گے اور جیسے ہی ہماری ضرورت پڑی ہم.....'' نیتا نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یہاں چندی گڑھ میں رہنا، ایک طرح سے بوجھ ہو گا، ہمیں رویندر اور راج ویر کو بالکل آزاد کر دینا چاہیے۔'' بملا نے سوچتے ہوئے، کیونکہ وہ کہیں بھی رہ کر میری مدد کر سکتی تھی۔

''او کے، جیسا تم چاہو۔'' ریتو نے سر مارتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تبھی بملا نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہم ابھی نکلتے ہیں ائرپورٹ، جدھر کی فلائٹ ملی نکل جائیں گے۔''

''اور اگر فلائٹ نہ ملی تو یا کل کسی وقت امکان ہو؟'' نیتا نے کہا۔

''تو پھر چلو ریلوے اسٹیشن، جہاں کی ٹرین ملی اُدھر نکل جائیں گے، راستے میں سوچ لیں گے کیا کرنا ہے۔'' بملا نے کہا۔

او کے، اب وقت ضائع مت کرو۔'' ریتو نے کہا اور اٹھ گئی۔

اگلے آدھے گھنٹے کے بعد ہم سب نیچے پورچ میں تھے۔ رویندر گاڑی لے آیا تھا۔ ہم اس میں بیٹھے اور چل دیے۔

ہم بنگلے سے نکلے تو انتہائی محتاط تھے۔ گاڑی ریتو چلا رہی تھی۔ میں اور رویندر پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا مجھے کیا کرنا ہے۔

''ریتو، کسی ایسی جگہ گاڑی کھڑی کرنا جہاں اندھیرا ہو، ہمیں نکلتے ہوئے کوئی دیکھ نہ سکے۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''او کے۔'' اس نے بھی آہستہ آواز میں کہا۔

ہم اس علاقے سے باہر آ چکے تھے۔ چونکہ یہ علاقہ نیا آباد ہو رہا تھا اس لیے گنجان آباد تو کیا زیادہ تر ویران ہی تھا۔ ایک موڑ مڑتے ہی کافی اندھیرا تھا، سڑک کے ساتھ ہی جھاڑیاں اور پودے تھے۔ ریتو نے گاڑی آہستہ کرتے ہوئے ہیڈ لائٹس بجھا کر روک دی۔ میرے ساتھ بملا بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ایک اس کا ہاتھ دبایا اور گاڑی سے باہر نکل گیا۔ مجھ سے پہلے ہی رویندر باہر نکل کر جھاڑیوں میں چھپ چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے ریتو نے گاڑی بڑھا دی۔ کچھ دور جا کر اس نے ہیڈ لائٹس روشن کر لیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا، میرے دل سے دعا نکلی کہ وہ لوگ خیریت سے پہنچ جائیں۔

میں اور رویندر پہلے تو کھڑے رہے، پھر ایک ٹیکری پر بیٹھ گئے۔ تبھی اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''بائی جی، ہم کتنے بے وقوف بنے رہے ہیں؟''

''اور اب تک بنے ہوئے ہیں۔'' میں نے شوخ لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

''دل تو کرتا ہے کہ اودت سے پہلے سردار صاحب کو گولی مار دوں۔''

''لیکن ابھی تم مار نہیں سکتے۔'' میں نے کہا اور ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اب نکلیں پیدل، جہاں تک بھی جائیں گے۔''

''ہاں تھوڑا بہت تو چلنا پڑے گا، میں نے ایک دوست سے رابطہ کیا ہے، ابھی کچھ دیر میں گاڑی مل جائے گی اور رہنے کو جگہ بھی۔'' رویندر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا، مجھے بھی اس کے ساتھ کھڑا ہونا پڑا۔

ہم دونوں سڑک کنارے چلنے لگے۔ ابھی ہم تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے فون نکالا تو وہ اودت کی کال تھی۔ میں نے اس کی کال ریسیو کر لی۔ میرے ہیلو کہتے ہی وہ بولا۔

''او یار کدھر بھاگ رہے ہو؟ میں نے... ابھی تمہیں

کچھ کہا تو نہیں، بڑے بزدل ہو تم؟''

''میں تمہارے پاس پہنچنے ہی کے لیے نکلا ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے کو طنزیہ بناتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر حقارت سے بولا۔

''تو پھر اپنی کار کا رخ موڑو اور سیدھے میری طرف آجاؤ۔ ورنہ ساری رات یونہی کار پر سفر کرتے رہو گے اور مجھ تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔ اپنا پتا بتا دوں؟ آجاؤ گے؟ اتنی ہمت ہے تمہارے پاس؟''

جیسے ہی اس نے ایسے کہا تو میرے دماغ میں موجود خیال مزید پختہ ہو گیا۔ تبھی میں نے مزید تصدیق کے لیے پوچھا۔

''جہاں پر میں ہوں، وہاں سے کتنی دیر لگے گی تم تک پہنچنے میں، کوئی وقت ضائع کیے بغیر تم تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔''

''ارے جہاں ہو وہیں رک جاؤ، دس منٹ میں تم تک بندے پہنچ جائیں گے، لے آئیں گے تمہیں میرے پاس......'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں تو سمجھا تھا تم بہت سمجھدار ہو لیکن تم تو نرے احمق نکلے ہو، تم صرف گاڑی کے ٹریکر پر مجھے فالو کر رہے ہو، میں نے گاڑی چھوڑ دی تو تم......''

''بہت جلدی نہیں سمجھ گئے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا۔

''چل بتا کہاں ہو تم، میں آتا ہوں تیرے پاس۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''اتنا غصہ ٹھیک نہیں میری جان، میں چاہوں تو ابھی تمہیں دبوچ کر تمہارا سر کچل سکتا ہوں، بس کھیل رہا ہوں تم سے۔''

''چل پتا بتا۔'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے فون کی طرف دیکھا اور ریتو کو فون کر دیا۔

''ہیلو...... ٹھیک ہو تم؟'' اس نے فوراً پوچھا تو میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہ گاڑی فوراً چھوڑ دو۔ یہ گاڑی ٹریکر کی وجہ سے فالو ہو رہی ہے۔''

''اوہ...... تو یہ بات ہے، سردار نے ہمارے ساتھ پوری دشمنی کی ہے۔'' اس نے کڑوے سے لہجے میں کہا۔

''باتیں بعد میں، پہلے جلدی کرو، چھوڑ دو یہ گاڑی۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ اب مجھے کیا

قارئینِ بیرون ملک متوجہ ہوں!

محکمہ ڈاک نے دوسری مرتبہ بیرون ملک ڈاک خرچ پر تقریباً 200 سے 250 فیصد اضافہ کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم بحالت مجبوری بیرون ملک ڈاک خرچ میں اضافہ کر رہے ہیں۔

جو کہ اس ماہ نومبر 2020 سے لاگو ہوگا جس کی تفصیل تمام رسائل میں فراہم کر دی گئی ہے۔

سرکولیشن منیجر

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

کرنا ہے۔

☆☆☆

وہ انتہائی شاداب علاقہ تھا۔ ہر طرف گہرا سبزہ تھا۔ خوشنما پھول اور پودے نگاہوں کو بھلے لگ رہے تھے۔ شاید وہ ساتویں یا آٹھویں منزل تھی جہاں ایک فلیٹ کے کمرے میں کھڑا میں باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ زرک پور کا علاقہ تھا اور یہاں بڑی بڑی رہائشی بلڈنگ بنی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہاں درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے رہائش رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرح سے یہ گنجان آباد علاقہ تھا۔ یہ رویندر کے کسی دوست کا تھا۔ رات بہت پُرسکون گزر چکی تھی۔ میں خوب سویا تھا اور اب فریش ہو کر، چائے کا مگ ہاتھ میں پکڑے باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں چائے کا سپ لیتے ہوئے باہر موجود نظارے میں کھویا ہوا تھا۔ ایسے میں رویندر کمرے میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے۔

''یہ لیں بائی جی، جو سمجھ میں آتا ہے، پہن لیں۔''

''یہ تو بہت اچھا کیا ہے تم نے۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ پہنیں، میں آتا ہوں تھوڑی دیر بعد۔'' اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔ میں نے چائے ختم کی، کپڑے پہنے اور باہر چھوٹے سے لاؤنج میں آ گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں وہاں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ میں اودت کے ہاتھ نہیں آیا تھا یا اس نے خود مجھے پکڑنا نہیں چاہا؟ ساری اُلجھن یہیں پر تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس سے بچ گیا تھا تو یہ نری احمقانہ دلیل تھی، ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے ہونے اور مجھ تک پہنچنے کا ثبوت بھی دیا تھا، وہ مجھے ریستوران میں مار سکتا تھا۔ وہ جنگلے پر حملہ آور ہو سکتا تھا، اس کے پاس گاڑی کا ٹریکر تھا، وہ کہیں بھی روک کر ہمیں موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اس نے سرجیت سنگھ کو غداری کی سزا دے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب بات یہ تھی کہ اس نے خود مجھے کیوں نہیں پکڑنا چاہا؟ اگر میں یہ کہوں کہ اسے میرا کوئی خوف تھا تو فضول بات تھی۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اس نے ہمیں نہیں مارا، حتیٰ کہ ہم پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ ایسا کیوں تھا؟ اس کا جواب میرے پاس بالکل نہیں تھا۔ لیکن اسی سوال کا جواب مجھے تلاش کرنا تھا۔

میرا فون بجا تو میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے جیب سے فون نکالا تو وہ شہباز کا تھا۔ میں نے اس کی سنے بغیر فوراً کہا۔

''اوئے ماما تم کب سے غائب ہو؟ پتا ہے.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے شرمندگی سے بولا

''اور یار میں بہت شرمندہ ہوں۔ یار یہ جو سردار صاحب والا سورس تھا نا، یہ میں نے دیا تھا۔ حالانکہ میں پچھلے ایک برس سے اس پر کام کر رہا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ دھوکا دے گا۔''

''چل ابھی تک کچھ نہیں بگڑا، زندہ ہوں۔ دفعہ کر، مجھے کوئی نیا سورس بتا۔'' میں نے یوں کہا جیسے یہ کوئی بات نہ ہو، ظاہر ہے اب اسے شرمندہ کر کے مجھے کیا کرنا تھا۔ تبھی وہ بولا۔

''مجھے اسی لیے دیر ہو گئی تھی۔ میری چاچا عبدالمجید سے طویل بات ہوئی ہے، ہم رات سے یہی سب کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا، دیر آید درست آید، اب معاملہ ایسا ہی ہوا ہے۔ ایک بہت دھانسو بندہ مل گیا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''ابھی میں اس کی تفصیلات چیک کر رہا ہوں۔ تم اس پر اعتماد کر سکتے ہو۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا تو میرا دل چاہا کہ ساوری کے بارے میں پوچھوں، لیکن اپنی خواہش کو میں نے دل ہی میں دبا دیا۔ شہباز نے الوداعی باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔ میں ساوری کے خیالوں میں کھو جانا چاہتا تھا کہ میرا فون پھر سے بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا، وہاں بملا کے نمبر جگمگا رہے تھے۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے ہیلو کہا تو وہ بولی۔

''کیسے ہو راج ویر جی۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں، کہاں پہنچ گئی ہو؟'' میں نے یونہی پوچھا۔

''بس بنگلے سے ہوٹل تک۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم تینوں یہیں چندی گڑھ میں ہیں۔ یہاں ایک ہوٹل ہے، کافی اچھا ہے، دارو بہت اچھی ملی ہے یہاں سے.....'' وہ کہہ رہی تھی اور مجھے غصہ آنے لگا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم، مجھے اب تم لوگوں کی فکر ہو گی، اگر تم لوگوں کو کچھ.....''

''راج ویر خاموش ہو جاؤ۔'' بملا نے اُکتائے

ہوئے لہجے میں کہا، پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی۔

''ہم بالکل محفوظ ہیں، جب تک تم یہاں ہو ہم یہیں رہیں گے۔ اگر تمہیں ہماری ضرورت پڑے تو.....''

''ضرورت پڑے تو.....'' میں نے اسی کے لفظ دہرا دیے تو وہ بولی۔

''چل غصہ تھوک دے، سکون کر۔ میں کرتی ہوں تم سے بات۔''

''دیکھو اگر میرے پاس فون ہی نہ رہے، تو کیسے رابطہ کرو گی، یار خدا کے لیے واپس چلی جاؤ، مجھے پریشان مت کرو۔'' میں نے کہا۔

''اگر تمہارا فون دو گھنٹے کے لیے بند ہو گیا تو سمجھو ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے، اب خوش.....'' اس نے مذاق بھرے لہجے میں کہا تو میں نے چڑتے ہوئے فون ہی بند کر دیا۔ مجھے بے حد غصہ آ رہا تھا۔ میں جو اُن کو بھیج کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا، ایک دم سے پریشان ہو گیا۔

''بائی جی خیریت ہے؟'' رویندر نے کمرے میں آ کر پوچھا تو میں نے بسملا کے بارے میں بتایا۔ وہ ہنستے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھے رات سے ہی پتا ہے، انہوں نے مجھے بتا دیا کہ وہ جائیں گی نہیں، یہیں ہوٹل میں ٹھہریں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے، انجوائے کریں۔'' میں نے کہا اور اس معاملے کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے فون دیکھا، ابھی تک شہباز نے کچھ نہیں بھیجا تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔

''بائی جی، میں نے کچھ معلومات لی ہیں اودت کے بارے میں۔''

''کیا ہیں معلومات؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کمبالی کے علاقے میں رہتا ہے، مطلب اس کا اہم ترین ٹھکانا وہی ہے۔ جہاں سے وہ دھندا کرتا ہے۔ وہیں سے وہ سارا نیٹ ورک چلاتا ہے۔''

''کیا ہم اسے صرف وہیں پکڑ سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں بہت مشکل ہے، قدم قدم پر اُس کے بندے پھیلے ہوئے ہیں۔'' رویندر نے سوچتے ہوئے کہا، اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، میرا فون بج اٹھا۔ وہ سردار صاحب کا فون تھا۔ میں نے ہیلو کہا تو وہ میرا حال احوال پوچھنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ارے کہاں گم ہو یار، کوئی اتا پتا دو، میں بہت پریشان ہوں تمہارے لیے، کوئی مشکل ہے تو مجھے بتاؤ۔''

''میں ایک بنگلے میں ہوں، یہاں سکون سے پڑا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں کوئی راستہ نہیں مل رہا۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''اچھا ایسا کرو، میں آج شام چندی گڑھ آ رہا ہوں ایک کام سے، رات ہی کسی وقت مجھے واپس بھی جانا ہوگا، آ جانا میرے پاس، کوئی راستہ نکالتے ہیں، وہاں تمہیں ایک بندے سے ملواتا ہوں۔''

''مجھے پتا بھیج دیں، میں آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''میں تمہیں پتا بھیجتا ہوں، وہیں آ جانا۔'' اس نے کہا اور الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ چند لمحوں ہی میں اس کی طرف سے پتا آ گیا۔ وہ کوئی سیکٹر اڑتالیس کا تھا۔ میں نے وہ پتا پڑھ کر رویندر کو سنایا تو وہ بولا۔

''مطلب اب ہمیں گھیرنے کا چکر ہے۔''

''بالکل، وہ تو اب پوری کوشش کریں گے کہ مجھے مار دیں، انہیں پورا یقین ہے کہ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنا ایک دوست بھیجتا ہوں وہاں پتا کرتے ہیں کہ.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ضرورت ہی نہیں ہے۔ اب دیکھنا میں انہیں کیسے چکر دیتا ہوں۔''

''چلیں دیکھ لیں۔'' رویندر نے کہا تو میرا فون بجا، شہباز کی طرف سے معلومات آ گئی تھیں۔ وہ پڑھتا رہا، چند منٹ بعد میں نے کہا۔

''اس پر ذرا فون تو ملا۔''

اس نے فون ملایا تو فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔ میں نے فون پکڑا تو دوسری طرف سے ایک بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہاں بولو بھائیا.....''

''مکمل پرکاش بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں کر رہا ہوں بات، بولو۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''آپ کے پاس سٹلج والی مچھلی ہو گی کیا؟'' میں نے پوچھا تو دوسری طرف لمحہ بھر خاموشی کے بعد وہ بولا۔

''ارے، آج کل تو وافر مقدار میں ہے، بولو کتنی چاہیے۔''

''جتنی آپ دے سکتے ہو۔'' میں نے پوچھا تو تیزی سے بولا۔

''چلیں میں پتا کرتا ہوں اسٹاک میں کتنی ہے اور کب مل سکتی ہے۔''

''رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور کال ختم کر دی۔ ہم نے طے شدہ کورڈ ورڈ میں بات کر لی تھی۔ میں فون واپس کرتے ہوئے بولا۔

''تیار ہو جا رویندر..... ہمیں ابھی نکلنا ہے۔''

''میں تیار ہوں بائی جی۔'' اس نے کہا تو میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میرے اندر ایک دم سے بے چینی بھر گئی تھی۔

وہ موہالی کے علاقے میں ہی ایک گوشت مارکیٹ تھی۔ وہاں مچھلی زیادہ فروخت ہوتی تھی، باقی گوشت بہت کم۔ ہم دونوں مارکیٹ تک ایک ٹیکسی میں پہنچے تھے۔ مجھے مارکیٹ کے اندر نہیں جانا تھا، باہر ہی کھڑے ہو کر مکمل پرکاش کا انتظار کرنا تھا۔ چند منٹ انتظار کے بعد میں نے دیکھا، ایک موٹا سا سانولے رنگ کا، بڑے پیٹ والا، گنجا سا شخص مارکیٹ سے باہر نکلا۔ اس نے سیاہ ڈھیلی سی پتلون اور چیک دار شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ عام سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا سڑک کنارے آ گیا، پھر اس نے جیب سے فون نکال کر کال کی تو رویندر کا فون بول اٹھا۔ اگلے چند منٹ میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو وہ بولا۔

''وہ سڑک کے پار ایک بینچ دیکھ رہے ہو، ادھر ہی آ جاؤ، وہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

اس نے سڑک پار کی تو ہم بھی اس کے پیچھے لپکے۔ کچھ دیر بعد ہم اس کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سبھی وہ حتمی لہجے میں بولا۔

''دیکھ راج ویر..... اودت والا معاملہ تھوڑا ٹیڑھا تو ہے لیکن میں خود اس کا بہت بڑا دشمن ہوں، میں تو چاہتا ہوں وہ کہیں مر مرا جائے، لیکن اس میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے، ذرا سی بھی بھنک لگ گئی نا تو میں گیا سمجھو۔''

''یار مجھے اُس تک پہنچا دو۔ تمہارا نام نہیں آئے گا، یہ تو پکا ہے، باقی تمہاری ڈیل جو بھی ہے، وہ تو ہے۔''

''ڈیل تو مجھے مل گئی ہے اسی لیے تیرے ساتھ بیٹھا ہوں۔'' اس نے سکون سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''تو پھر کیا کہتا ہے؟''

''ہو جائے گا، بس تیار رہنا۔'' اس نے کہا اور سوچتے ہوئے کھڑا ہو گیا، پھر ہم سے ہاتھ ملا کر واپس مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

اس وقت شام ڈھلنے والی تھی۔ اُفق پر سورج غروب ہونے کے بالکل قریب تھا۔ میں کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہا تھا۔ مجھے سردار صاحب کے فون کا بھی انتظار تھا، وہ کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتا تھا۔ میں گومگو کی کیفیت میں تھا کہ اس سے ملوں یا نہ ملوں۔ میں کوئی ایسا بہانہ تلاش کرنے کی کوشش میں تھا کہ کسی طرح اس سے نہ ملوں اور وہ بھی میری مجبوری سمجھ جائے کہ میں کیوں نہیں اس تک پہنچ سکتا ہوں۔ ممکن ہے وہ سامنے سے یہ کہہ دے کہ میں خود آ رہا ہوں۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا، پھر سب کچھ ذہن سے نکال دیا۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ میں وہیں کھڑا تھا کہ رویندر تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مکمل پرکاش ہے.....''

میں نے فون لے کر کہا۔

''ہاں بولو مکمل.....''

''اگلے آدھے گھنٹے تک تم اودت تک پہنچ سکتے ہو۔'' اس نے کہا تو میرے اندر بے چینی بھر گئی۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''کیسے اور کہاں؟''

''وہ اس وقت اپنے ہی علاقے میں ایک فیکٹری کے ریسٹ ہاؤس میں موجود ہے۔ وہ وہاں اکثر جاتا ہے۔ تھوڑی بہت عیاشی کے لیے۔ میں اس کی لوکیشن بھیج رہا ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''خبر پکی ہے نا؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''بالکل پکی خبر ہے، وہاں سے ہی ملی ہے، وہ اس وقت وہیں ہے۔''

''اور سیکیورٹی؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''یہی کوئی تین چار لوگ ہیں وہاں۔ وہاں وہ سکون کے لیے جاتا ہے، کوئی مشکل ہوئی تو رابطہ کر لینا۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ رویندر نے ساری بات سن لی تھی اس لیے جلدی سے لوکیشن نکال کر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں بعد بولا۔

''یہاں سے کوئی پندرہ سے بیس منٹ کا فاصلہ ہے۔''

''چل نکل؟'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''چلے تو جائیں گے، نکلیں گے کیسے؟ ہمارے پاس کوئی سواری نہیں ہے، یہ دیکھ لیں۔'' اس نے کہا پھر ایک دم سے چونک کر بولا۔ ''نیچے کئی موٹر سائیکل کھڑی ہیں، کوئی بھی نکال لیتا ہوں۔''

''چل موٹر سائیکل ہی سہی لیکن.....'' میں کہتے ہوئے رک گیا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''لیکن کیا.....؟''

''پارکنگ میں کیمرا تو ہوگا میری جان، ہم یہیں سے موٹر سائیکل لیں گے تو واپس اس بلڈنگ میں نہیں آنا؟''

''ہاں یہ تو ہے، چلو آگے کہیں سے لے لیتے ہیں۔'' اس نے کہا تو ہم تیزی سے نیچے آگئے۔

ہماری بلڈنگ سے آگے کئی دفاتر اور رہائشی بلڈنگ تھیں۔ وہ ایک بلڈنگ کی پارکنگ میں چلا گیا۔ میں اس کے کور پر ہو گیا۔ وہ بڑے اعتماد سے اس طرف بڑھا جہاں بہت ساری موٹر سائیکل کھڑی تھے۔ وہ ان کے درمیان تک چلا گیا، چند لمحے دیکھتا رہا، پھر ایک نئی موٹر سائیکل کے پاس جا کر اسے جھٹکا دیا، اس کا لاک کھل گیا۔ اس نے تاروں کو کچھ کیا اور اسٹارٹ کر کے باہر آ گیا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھا اور ہم چل دیے۔

وہ ایک ون وے روڈ تھا۔ ہم تیزی سے اس طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے جہاں وہ فیکٹری تھی۔ ہم دونوں کے پاس سوائے ایک ایک پسٹل کے مزید کچھ نہیں تھا، یہاں تک کہ کوئی فالتو میگزین بھی نہیں تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو گیا تھا جب ہم فیکٹری کے پاس پہنچ گئے۔

''پہلے چاروں طرف سے اس کا جائزہ لے لیں؟'' میں نے کہا۔

''اس کے تین اطراف ہیں، پچھلی طرف ایک مزید فیکٹری ہے۔'' رویندر نے مجھے بتایا تو میں نے غور کیا۔ دیواریں یہی کوئی چھ فٹ کی تھیں۔ گیٹ پر چوکیدار کھڑا تھا۔ ممکن ہے وہاں کیمرا بھی لگا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان دیواروں کے ساتھ بھی ہو۔ لیکن اس وقت وہاں پر مکمل خاموشی تھی۔ میں نے رویندر سے کہا۔

''پچھلی والی فیکٹری کی دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی کرو۔ وہاں سے اندر جاتے ہیں۔''

اس نے ایسا ہی کیا۔ میں موٹر سائیکل پر چڑھا تو دیوار کے کناروں تک میرا ہاتھ پہنچ گیا۔ میں ایک ہی جست میں دیوار پر چڑھ گیا۔ عقبی فیکٹری میں بالکل سناٹا تھا لیکن جس فیکٹری میں ہمیں جانا تھا، وہاں سامنے ہی ایک سوئمنگ پول تھا۔ وہاں تھوڑی سی روشنی تھی جو کچھ فاصلے پر بنے ایک کاریج کی روشنی سے چھن کر وہاں تک آ رہی تھی۔ میں نے پوری توجہ سے دیکھا تو سوئمنگ پول میں کوئی تھا، میں نے جلدی سے رویندر کو اوپر کھینچا۔ اس نے بھی سامنے کا منظر دیکھا۔

''سامنے تو کوئی نہیں ہے بائی جی۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''سوئمنگ پول میں دیکھ۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''وہی ہے نا جو بھی ہوگا، لیکن ارد گرد تو کوئی نہیں ہے نا۔'' اس نے کہا۔

''او کے، میں اتر رہا ہوں، تم کور پر رہنا۔'' یہ کہتے ہی میں دیوار کے ساتھ نیچے کی طرف آ گیا۔

ہلکی سی دھپ کی آواز ہوئی تو میں وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد میں نے سر اٹھایا اور سامنے دیکھا، کوئی دو سو فٹ کے فاصلے پر سوئمنگ پول میں ایک مرد اور ایک عورت اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ میں انتہائی محتاط انداز میں تیزی سے آگے بڑھا۔ اس وقت تک رویندر نیچے آ چکا تھا۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ یہ فاصلہ مجھے بہت طویل لگ رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہو گئی تھی۔ میں انتہائی چوکنا تھا۔ سوئمنگ پول میں جو کوئی بھی تھا، غالب امکان یہی تھا کہ وہ اودت ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے جو مجھے اطلاع ملی تھی، وہ یہی تھی کہ اودت یہاں عیاشی کرنے آتا ہے۔ سوئمنگ پول میں وہی ہوا اور اگر اسے ذرا سی بھی بھنک لگ گئی تو معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔ لیکن میں نے بھی اسے کوئی آسان شکار نہیں لیا تھا، اس لیے پوری احتیاط سے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہاں سوئمنگ پول کے کنارے کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر کرسیاں میز رکھے ہوئے تھے۔ میں ان کی آڑ لیتا ہوا بالکل قریب پہنچ گیا۔ میرے سامنے جو منظر تھا، اس میں وہ جوڑا ہر طرف سے بے خود تھا۔ میں نے چند لمحے کرسیوں کی آڑ میں بیٹھ کر نشست لگائی اور پھر ایک ہی جست میں سوئمنگ پول کے کنارے تک جا پہنچا۔ مجھے یوں ایک دم قریب پا کر... وہ الگ ہوئے تو میں نے دیکھا، وہ اودت ہی تھا۔ مجھے پسٹل تانے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔

''باہر آ جاؤ۔'' میں نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

''مان گیا ہوں تمہیں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''آ جاؤ باہر..... تم سے بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں اس کے لیے بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت پانی میں ڈبکی لگا کر

چھپنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن وہ یہ بھی ضرور جانتا ہوگا کہ جب تک وہ ڈبکی لگاتا، فائر ہو جاتا تھا۔ اتنا رسک لینے کا مطلب اپنی موت کو خود دعوت دینا تھا۔

''اوکے..... میں بھی تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور باہر آنے لگا۔ وہ جیسے ہی کنارے پر آیا، میں نے پسٹل کی نال اس کے ماتھے پر رکھ دی۔

''بول کیا کہتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اب نہیں..... شاید تم سوچو گے میں نے موت کے ڈر سے بھیک مانگی ہے، موت سے یا تم سے ڈر گیا، میں مان گیا تمہیں، چاہو تو مجھے مار سکتے ہو۔'' اس نے کہا اور اپنے ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھ لیے۔ میں نے پسٹل کی نال سے اس کے ماتھے پر مزید دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم نے موقع ہوتے ہوئے بھی مجھے نہیں مارا، مارے بغیر چھوڑ دیا، میں نہیں چاہتا کہ تمہارا احسان لوں، چھوڑ رہا ہوں تمہیں، ہاں اگلی بار نہیں۔'' یہ کہتے ہی میں نے اسے زوردار دھکا دیا۔ وہ سیدھا سوئمنگ پول میں جا گرا، ساتھ کھڑی عورت کی چیخ نکل گئی۔ اب وہاں کھڑے رہنا، یا لمحے کا دسواں حصہ بھی ٹکنا میری موت تھی۔ میں نے چھلانگ لگائی اور دیوار کی جانب بھاگا۔ رویندر دیوار پر چڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دیا، وہ دیوار پر پہنچ گیا، میرا اس نے ہاتھ کھینچا تو میں بھی اوپر چڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے ہم دیوار کی دوسری جانب تھے۔ جب تک اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، میں پیچھے بیٹھ چکا تھا۔ کافی دور آ کے رویندر نے مجھ سے انتہائی حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بائی جی آپ نے اُسے مارا کیوں نہیں؟''

''میں نے اس کا احسان لوٹا دیا ہے۔ اسے بدلہ دے دیا، اب نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''بائی جی لکھوا لو مجھ سے، اب وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''نہ آئے، یہ الگ بات ہے، وہ مجھے مار بھی دے تو کوئی دکھ نہیں ہوگا، میں دشمن کا احسان نہیں رکھتا۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہو گیا۔

ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ سردار صاحب کا فون آ گیا۔

''ارے کہاں ہو تم؟'' اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''یہیں سڑکوں پر مٹر گشت کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں پہنچ گیا ہوں چندی گڑھ، ابھی تمہیں بلاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ہم نے موٹر سائیکل ایک ویران سی بلڈنگ میں کھڑی کی اور پیدل چلتے ہوئے واپس اسی بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں آ گئے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھے لگا رویندر کافی ناراض لگ رہا تھا۔ سو میں نے اس سے بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ نیچے گیا اور کھانا لے کر آ گیا۔ ہم کھا چکے تو اس نے بھی مجھ سے بات نہیں کی۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''ناراض ہو؟''

''ہاں بائی جی بالکل ناراض ہوں، دشمن کے ساتھ کیا احسان کرنا۔''

''اوئے پاگل یہی تو ہے، اسی سے اصل نسل کا پتا چلتا ہے۔ تو نے ایک بات نہیں سوچی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا بائی جی؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یار، یہ جو اودت ہے نا، یہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہماری اس کی دشمنی ہے کیا؟ یہ تو سردار نے ہمیں بتایا ہے نا کہ یہ بھی نذر انصاری، بلراج کی طرح کلیان جی کا وہ مہرہ ہے جس نے لاہور میں دہشت گردی کی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اب اگر سردار کی بات مان بھی لیں تو سردار خود غلط بندہ ہے، منافق ہے، وہ اپنی گیم کھیل رہا ہے تو سوچا جا سکتا ہے کہ کیا واقعی... اودت نے ایسا کیا ہے جیسے سردار کہہ رہا ہے؟'' میں نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بات تو سوچنے کی ہے۔''

''تو پھر ذرا صبر..... دیکھ ہوتا کیا ہے۔ میرے نزدیک اب میرا دشمن اودت سے زیادہ سردار صاحب ہے، اسے مارنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اگر اسے مار دیا تو کیسے پتا چلے گا کہ سردار یہ ساری گیم کیوں کر رہا ہے، کس کے لیے کر رہا ہے، ہمیں کیوں اُلجھا رہا ہے؟'' اس نے اُلجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہی بات..... یہی بات ہے رویندر یہی بات۔ یہ ساری گیم ہے کیا، اب اس کا پتا چلانا ہے۔ اس میں اگر ایک کو بھی مار دیا نا تو ہم ہاتھ نہیں آئے گی، سب کچھ نگاہوں

سے اوجھل ہوجائے گا۔''

''چلیں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے، ابھی تو سردار سے ملنے جانا ہے۔'' اس نے کہا تو میں بولا۔

''ہاں دیکھتے ہیں، وہ کیا نئی کہانی سناتا ہے۔''

''چائے بناؤں۔'' وہ بولا کیونکہ اب مزید بات نہیں کرنا تھی۔ میں نے سر ہلایا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔

تبھی میں نے ریتو کو کال ملالی، وہ تینوں ہوٹل کے کمرے میں بیٹھی گپ شپ کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں واپس جانے کا کہا لیکن ان کی وہی بحث تھی۔ میں تھوڑی دیر ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلا رہی تھیں۔ میں نے بھی ضد پکڑلی کہ نہیں آنا۔

''دیکھو ہم نے چھاپا مار لینا ہے تم پر۔'' ریتو نے کہا۔

''تمہیں پتا ہے میں کہاں ہوں؟'' میں نے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''بالکل پتا ہے، اپنی نینا نے تیرے اس رویندر سے اُگلوالیا ہے۔''

''جھوٹ بول رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''اچھا چل ٹھیک ہے۔ دو گھنٹے میں آجاؤ تو اچھا ہے ورنہ ہم پہنچ جائیں گے تمہارے پاس۔'' اس نے دھمکی بھرے لہجے میں کہا۔

''اوکے، آجانا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

رویندر چائے لے آیا تھا۔ اس نے نینا کو بالکل بھی نہیں بتایا تھا۔ ہم یونہی باتیں کرتے ہوئے چائے پی رہے تھے کہ اودت کا فون آگیا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں بولو.....'' میں نے کہا تو وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''راج دیر، تم جو کوئی بھی ہو، مجھے تم نے متاثر کیا، اگر تم نے احسان نہیں لیا تو کوئی بات نہیں، لیکن میں اب تم پھر ایک اور احسان کرنے جارہا ہوں، تم چاہو بھی تو میرا یہ احسان رد نہیں کرسکتے ہو۔''

''کیسا احسان؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''جس بندے نے تمہیں کچھ دیر بعد بلایا ہے نا ملنے کے لیے، مجھے بھی اُسی بندے نے بلایا ہے، پتا ہے کیوں؟'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تاکہ میں تمہیں مار سکوں۔'' اس نے ایک دم سے کہا تو میں کافی حد تک سردار صاحب کی نیت کو سمجھ گیا۔ تبھی میں نے کہا۔

''میں وہاں جاؤں گا اور تم مجھے مارو گے؟''

''ہاں نا..... اس کو ایک ڈیل کرنی ہے، وہی ڈیل فیصلہ کرے گی کہ ہم میں سے کس نے مرنا ہے۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''کیسی ڈیل؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہیں تھوڑی دیر بعد پتا چل جائے گا، پھر اس کے بعد فیصلہ تمہارا ہوگا کہ تمہیں کیا کرنا ہے، جو کرنا، بہت سوچ سمجھ کے کرنا، میں نے یہی کہنا تھا۔'' اس نے اسی سنجیدگی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

''اس میں احسان والی بات کیا ہے؟''

''اس کا فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگرچہ مجھے تھوڑی بہت سمجھ آگئی تھی کہ یہ گیم کیا ہوسکتا ہے لیکن میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں نا کہ وہ منافقت ہی کیا جس کا پتا چل جائے۔ کوئی بھی شخص بلاوجہ منافقت نہیں کرتا، منافقت کی بنیاد میں صرف اور صرف حسد ہوتا ہے۔ حاسد شخص کسی نہ کسی خیال کا سہارا لیتا ہے اور مخالفت کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگ زمین پر بوجھ ہیں۔ سردار بھی منافقت کر رہا تھا لیکن کس لیے؟ شاید اسی سازش کو مجھ پر بے نقاب کرنے ..... کے لیے اودت مجھ پر احسان کر رہا تھا۔ وقت آگیا تھا کہ میں انتہائی محتاط انداز سے ان سارے حالات کو دیکھوں۔

اس بار سردار نے جو مجھے ایڈریس دیا تھا، وہ کسی نئی جگہ کا تھا۔ اس نے مجھے ایک گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ میں رویندر کے ساتھ اپارٹمنٹ سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہی موٹر سائیکل ہمارے کام آئی تھی، جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے اٹھائی تھی۔ وہ ویران بلڈنگ میں ویسے ہی کھڑی تھی۔ رویندر موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور میں بیٹھے بیٹھے انتہائی طور پر ذہنی دباؤ محسوس کر رہا تھا۔ میں یہ بالکل اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں میں جارہا ہوں وہاں نہ سردار میرا دوست ہے اور نہ اودت..... دونوں ہی دشمن ہیں۔ وہ مجھے بھی مار سکتے ہیں۔ اس وقت میں خودکشی کی راہ پر ہوں۔ لیکن مجھے امید تھی کہ جو کچھ بھی ہوگا، اس سے کم از کم یہ حالات بدلنے والے تھے۔

اس وقت ہم سڑک پر تیزی سے جارہے تھے کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو اودت کے

نمبر تھے۔ میں نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا اور ہیلو کہا۔

''دیکھ راج ویر..... خاموشی سے سنتے رہنا، میری اور سردار کی ڈیل ہونے جا رہی ہے۔''

''تم کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہیں جہاں اس نے تمہیں بھی بلایا ہے۔ بس سنتے رہنا۔'' یہ کہہ کر شاید اس نے فون کان سے ہٹا لیا تھا۔ اس کی طرف سے کال چل رہی تھی۔ میں نے رویندر سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل سائڈ پر لگائے۔ سڑک کنارے رک کر میں فون کال سننے لگا۔ کچھ دیر بعد آواز ابھری۔

''ارے آؤ اودت..... کیسے ہو؟''

''میں تو ٹھیک ہوں..... بولو کیا بات کرنی ہے۔''

''ارے یار، ابھی سکون سے بات.....'' سردار نے کہا۔

''چھوڑو سردار، سیدھی بات کرو۔'' اودت بولا۔

''سیدھی بات یہ ہے کہ جب بساط پر کھیل جاری ہو تو بڑے مہرے کو بچانے کے لیے چھوٹا مہرہ مروا دینا چاہیے۔ اس لیے.....'' سردار نے کہنا چاہا تو اودت بولا۔

''سردار..... مجھ سے سیدھی بات کرو۔''

''تو سیدھی بات یہ ہے میرے یار کہ تیرے راستے کے دو بڑے مہرے مروا دیے ہیں۔''

''وہ میرے لیے نہیں، تم نے اپنے لیے مروائے ہیں۔''

''چلو یہی سمجھ لو..... ڈیل یہی ہے، ہم تمہارے چندی گڑھ میں کوئی دخل نہیں دیں گے یہ تمہارا ہوا۔ تم یہاں جو چاہو سو کرو۔ لیکن لدھیانے سے فرید کوٹ تک تمہارا عمل دخل نہیں ہوگا۔'' سردار نے کہا۔

''ڈن ہے.....''

''لیکن راکیش ورما ایک سیاست داں بھی ہے، اسے چندی گڑھ تو آنا ہی ہوگا، سو کام پڑتے ہیں یہاں اسے اور.....''

''وہ آئے ہزار بار آئے، لیکن یہاں اس نے میرے معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی تو پھر تم لوگ میرے دشمن ہو گے۔''

''ڈن ہو گیا۔ لیکن ایک بات طے کرنا ہوگی۔''

''وہ کیا؟''

''تنظیم کا بڑا کون ہوگا؟ یہاں تو راکیش ورما ہی تھا نا.....''

''مجھے تم لوگوں کے، یا تنظیم کے معاملات سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے صرف اپنے علاقے سے مطلب ہے۔ راکیش بڑا ہے یا چھوٹا، مجھے اس سے بھی کوئی لینا دینا نہیں۔''

''ڈن ہو گیا۔ کوئی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا، اگر کوئی بھی آئے، بھلے وہ راکیش ہو، تم اس کے ساتھ جو مرضی کر سکتے ہو۔''

''اور وہ جو راج ویر مجھ پر چھوڑا ہوا ہے تم نے، اس کا کیا کرنا ہے، اسے ماردوں یا واپس لے جانا ہے تم نے؟''

''اس کا مرنا ہی بنتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد وہ میرے پاس آنے والا ہے، میں اسے تمہاری طرف بھیج دوں گا، ختم کر دینا اُسے۔'' سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''چل پھر چلتا ہوں۔ راکیش سے کہنا، میرا جو نقصان کیا ہے نا اس نے وہ بھر دے، پھر چندی گڑھ میں جب چاہے آئے۔''

''ہاں وہ ہو جائے گا۔ میں ضمانت دیتا ہوں۔''

''او کے۔ بھیج پھر اس راج ویر کو۔''

''میں اسے بلاتا ہی نہیں ہوں، سیدھا تیری طرف بھیج دیتا ہوں۔ بولو کہاں بھیجوں۔''

''وہیں میری فیکٹری میں بھیج دے۔'' اس نے کہا تو اس کے ساتھ ہی فون کال پر خاموشی چھا گئی پھر کچھ لمحوں پر کال ختم ہو گئی۔ وہی ہوا تھا جو میں کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ اودت نے پھر سے مجھ پر احسان کر دیا تھا۔

''بائی جی خیریت ہے نا؟'' رویندر کی آواز پر میں چونکا۔

''نہیں یار، خیریت نہیں ہے، اور شاید ہے۔'' میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''بات کیا ہے، وہ بتاؤ گے؟'' اس نے پوچھا تو میں نے اسے سب بتا دیا، وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔

''یقیناً اودت یہی کہنا چاہتا تھا۔''

''ہاں کہنا تو یہی چاہتا تھا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو اب کیا کرنا ہے؟'' رویندر نے پوچھا۔

''یہی کہ اب یہاں نہیں رہنا، فوراً واپس فرید کوٹ جانا ہے، ہمیں خواہ مخواہ یہاں پھنسایا گیا ہے، بس یہ کنفرم کرنا ہے، راکیش ورما اس وقت کہاں ہے، اب صرف وہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''یہی ٹھیک ہوگا۔'' رویندر نے کہا ہی تھا کہ سردار کا

فون آگیا۔ میں نے کال ریسیو کی تو اس نے پوچھا۔
"ابھی تک پہنچے نہیں؟"
"راستے میں ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔
"اچھا، اگر میں تمہیں یہ بتادوں کہ اس وقت اوودت کہاں ہے تو......"
"فوراً بتائیں کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔
"بس ایک منٹ ٹھہرو، میں اس کی لوکیشن بھیج رہا ہوں۔ پہلے اس کا کام کرو، باقی سب کچھ بعد میں۔" اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
"اوکے بھیجو لوکیشن۔" میں نے کہا اور کال ختم کر دی۔
میں نے لمحہ بھر سوچا اور پھر کمل پرکاش کو فون کردیا۔
"ہاں بھائیا...... بتاؤ کیا بات ہے؟" اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔
"ایک گاڑی چاہیے۔" میں نے کہا۔
"مل جائے گی۔ لیکن جتنا پیسہ دو گے، ویسی ملے گی۔" اس نے صاف لفظوں میں کہا۔
"جہاں سے میری بات ہوئی ہے نا وہاں سے پیسہ مانگ لو، ابھی مل جائے گا، بس فوراً۔" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولا۔
"ابھی بتاتا ہوں۔"
یہ کہتے ہی اس نے کال ختم کردی۔
سردار کی طرف سے لوکیشن آچکی تھی۔ اب مجھے فیصلہ کرنا تھا۔

☆☆☆

اس وقت میں چندی گڑھ سے نکل رہا تھا۔ جب میرے دل میں بے اختیار بملا اور ریتو کا خیال آیا۔ مجھے لگا جیسے میں بہت ہی خودغرض انسان ہوں۔ انہیں بتاؤں بھی نہیں اور یہاں سے نکل جاؤں۔ میں کچھ دیر تک خود پر قابو رکھے رہا، پھر روبندر سے بولا۔
"یار...... وہ بملا اور......"
"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ پھر پتا نہیں ان سے ملاقات ہو بھی پائے یا نہیں۔ ایک بار مل لیں ان سے۔"
اس نے اداس لہجے میں کہا تو میں نے اشارے سے اسی طرف چلنے کو کہا۔
اسے معلوم تھا کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ میں نے بملا کو کال کی تو وہ تیکھے لہجے میں بولی۔
"میں جانتی ہوں تم اس وقت کہاں کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو۔"
"میں آرہا ہوں تمہارے پاس۔" میں نے کہا۔
"سچ میں......" اس نے خوشی سے کہا۔
"ہاں، ڈنر سب کے ساتھ کروں گا۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔
"چل آجا جلدی سے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کردیا۔
تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ان کے پاس تھے۔ ڈنر کے دوران میں نے سب کچھ انہیں بتادیا۔
"مطلب اب اوودت تمہارا انتظار کررہا ہے؟" ریتو نے سنجیدگی سے کہا۔
"ظاہر ہے، اس کے علاوہ وہ اب کیا کرسکتا ہے۔" میں نے کہا۔
"تم اب فرید کوٹ واپس جارہے ہو؟" بملا نے پوچھا۔
"ہاں نا۔ اب میرا ٹارگٹ صرف اور صرف راکیش ورما ہے۔" میں نے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔ "اب تم لوگوں کا یہاں رہنا فضول ہوگا، اب تم لوگ چندی گڑھ چھوڑ دو۔"
"فلائٹ صبح کے وقت جاتی ہے اس لیے......" اس نے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔
"ضروری ہے، ٹرین سے چلی جاؤ یا جو بھی......"
"اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں، ہم چلے جائیں گے۔" بملا نے کہا تو میں نے سب کی طرف دیکھا۔ نجانے میرے دل میں کیسا بوجھ تھا۔ یہ سب میرے لیے کتنے مخلص تھے۔ کیسا رشتہ ہے ان کے ساتھ۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ تبھی بملا نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ دوسری طرف ریتو میرے ساتھ لگ گئی۔
اچانک فون کی بیل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ دوسری طرف اوودت تھا۔ سبھی میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے اسپیکر آن کیا اور کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں بولو اوودت......"
"میرا احسان اب چکتا نہیں کرو گے؟"
"وہی تو کررہا ہوں، میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔" میں نے بے ساختہ کہا، حالانکہ یہ کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے خود اپنی بات کھوکھلی لگی تھی۔
"چل ٹھیک ہے تم مجھے چھوڑ رہے ہو تو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں مگر میری ایک بات یاد رکھنا...... وہ تمہیں

کبھی نہیں چھوڑیں گے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''اب تم سمجھ چکے ہو، میں مروں یا تم، فائدہ ان دشمنوں ہی کا ہے۔ کیوں نا ہم مل کر اپنے دشمنوں کو ختم کر دیں؟'' اس نے آفر کی۔

''ایسا کیسے ہوگا؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''میری مدد سے سب کچھ ہو جائے گا۔ اس کی وجہ ہے۔''

''کیا وجہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر میں نے انہیں ختم کیا تو جن کے لیے وہ کام کر رہے ہیں، جس کی یہ بغل بچہ تنظیم ہے، وہ مجھے کسی طور بھی نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن اگر انہیں کوئی دوسرا مار جاتا ہے تو.....'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''وہی گیم جو وہ تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں، وہی ان پر پلٹ دی جائے۔'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا تو وہ بولا۔

''بالکل، وہی..... پھر تنظیم کا جو بڑا ہوگا، وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔''

''اوکے ہو گیا۔ تمہارے احسان کا بدلہ چکتا ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو اس نے ایک دم سے قہقہہ لگا دیا پھر بولا۔

''جب چاہو، مجھ سے مدد کے لیے کہہ سکتے ہو۔''

''راکیش ورما کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت وہ فرید کوٹ میں ہے۔ اس تک پہنچا سکتا ہوں۔''

''پہنچا دو۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا تو وہ بولا۔

''صبح اس کو نے لدھیانہ آنا ہے۔ اسی سردار سے ملنے۔ شاید میں بھی وہاں پر جاؤں.....''

''اوکے ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

''باقی میں بتاتا ہوں گا۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔'' ریتو نے ایک دم سے کہا۔

''غلط، بالکل غلط..... تم لوگ مجھ سے وعدہ کر چکی ہو۔'' میں نے سختی سے کہا تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ تھوڑی سی بحث کے بعد وہ مان گئی۔ میں اور رویندر کچھ دیر مزید ان کے ساتھ رہے، پھر ہوٹل سے نکلتے چلے گئے۔

اس وقت صبح کی نیلگوں روشنی پھیل چکی تھی جب ہم فرید کوٹ کے نواح میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک ڈھابا نما ہوٹل تھا۔ ہم نے وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ چار گھنٹے کے مسلسل سفر سے میں اکتا گیا تھا۔ وہاں فریش ہو کر ہم نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ جس وقت ہم وہاں سے نکلنے لگے تو اودت کا فون آ گیا۔

''بولو، کہاں شکار کرنا چاہو گے، فرید کوٹ میں یا لدھیانہ میں؟''

''جہاں آسانی سے شکار ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر نکلو، وہ تم سے چار گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ وہ فرید کوٹ سے نکل چکا ہے، میرے خیال میں تم اسے لدھیانہ کے آس پاس پکڑ سکو گے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''چل ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے کال بند کر دی۔

میں نے رویندر کو بتایا تو اس نے کہا۔ ''راستہ تو یہی ہے۔ اب جو کہو۔''

''یہیں پکڑتے ہیں، تم یہ بتاؤ وہ کہیں رک سکتا ہے یہاں.....'' میں نے پوچھا تو اس نے تیزی سے کہا۔

''یہ جو کوٹ کپورہ روڈ جہاں سے آ کر ملتا ہے، وہاں پر ٹول اسٹیشن ہے، وہاں بھی گاڑیاں رکتی ہیں۔''

''چل پھر وہاں فوری چل.....'' میں نے کہا اور گاڑی کی جانب بڑھا۔

فرید کوٹ شہر کی طرف سے ایک سڑک آ رہی تھی، دوسری بائی پاس روڈ ہے جہاں یہ دونوں آ کر ملتی تھیں، وہاں سے تھوڑا سا آگے ایک ٹول اسٹیشن تھا۔ اگلے دس منٹ تک ہم ٹول اسٹیشن تک جا پہنچے۔ ہمارا رخ فرید کوٹ جانے کی طرف تھا سو ہم نے ٹول ادا کیا اور گاڑی تھوڑے فاصلے پر روک دی۔ میں نے اتر کر دیکھا، وہاں چند گاڑیاں تھیں جو ٹول ادا کرنے کے لیے قطار میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک بندہ کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر ٹول لینے والوں کی رہائش تھی۔ اس لیے وہاں صبح صبح کوئی آدمی نہیں تھا۔ ہاں دو چار بھکاری ضرور موجود تھے۔ ہم ایسی جگہ آ گئے جہاں سے ہمیں یہ کنفرم ہو جائے کہ فرید کوٹ سے آنے والا راکیش ورما کس گاڑی میں ہے۔

میں نے ہر طرف سے اپنی توجہ ہٹالی تھی، یہاں تک کہ فون کو بھی خاموشی پر لگا دیا، کہیں اچانک میری توجہ نہ بٹ جائے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، فوری طور پر وہاں سے کوئی ردِعمل نہیں ہونے والا تھا۔ صرف ایک خطرہ تھا کہ وہاں اگر کیمرے ہوئے تو ہم اس میں آ جائیں گے لیکن

یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ اس کے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف بے آباد زمینیں تھیں۔ لاشعوری طور پر فرار کا ہر راستہ میری نگاہ میں تھا۔

ہمیں وہاں زیادہ دیر نہیں کھڑا ہونا پڑا۔ اگلے پانچ منٹ میں رویندر نے سرسراتے ہوئے کہا۔

''وہ سیاہ گاڑی میں، پسنجر سیٹ پر راکیش ورما۔''

اتنا سننا تھا کہ میں نے دیکھا ایک سیاہ رنگ کی گاڑی قطار میں آ کر لگ گئی تھی۔ میں دھیمے قدموں سے آگے بڑھا تو رویندر پیچھے ہٹ گیا۔ میں بے پروا انداز میں آگے بڑھا اور اس گاڑی کے قریب ہوتا چلا گیا۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹا کر پسٹل ہاتھ میں یوں لیا ہوا تھا کہ اس پر کپڑا تھا۔ میں نے دیکھا، راکیش ورما پورے کروفر سے پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے پاس آدھے منٹ سے بھی کم وقت تھا، اگلی دونوں گاڑیاں نکل چکی تھیں۔ سیاہ گاڑی کا شیشہ کھلا، ڈرائیور نے ٹول دینا تھا، میں پسنجر سیٹ والی طرف سے آگے بڑھا، ایک ہاتھ سے گیٹ کھولا اور پسٹل سے فائر کر دیا، جس وقت تک پیچھے بیٹھے گارڈز کو احساس ہوا، میں راکیش ورما کے ماتھے پر چھید کر چکا تھا۔ میرے لیے ان گارڈز کو مارنے سے زیادہ یہ اہم تھا کہ میں وہاں سے غائب ہو جاؤں۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی پھرتی نہیں دکھائی تھی، جتنا سیاہ گاڑی سے اپنی گاڑی تک سفر کیا تھا۔ رویندر نے گیئر لگایا ہوا تھا، جب تک میں گاڑی میں بیٹھا، دو فائر ہو گئے۔ تیسرا فائر ہونے سے پہلے اس نے فرید کوٹ کی طرف گاڑی بھگا دی تھی۔

☆☆☆

رویندر شہر میں داخل ہوا تو راستے میں تھوڑا رش تھا۔ ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں کچھ موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ اس نے کار وہاں پارک کی تو ہم باہر نکل آئے۔ اس نے چند منٹ وہاں کا جائزہ لیا، پھر وہاں سے موٹر سائیکل لے کر ہم نکل پڑے۔ ہم شہر سے باہر باہر نکلتے ہوئے فرید کوٹ شہر سے نکل پڑے۔ یہاں تک کہ ہم فیروز پور پر موجود نواحی گاؤں راجو والا میں جا پہنچے۔ ہم پانی والی ٹینکی کے پاس سے ہوتے ہوئے دو منزلہ مکان تک جا پہنچے۔

گھر میں وہی خاتون تھی جو ہمیں وہاں مل چکی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہمیں اوپر منزل پر پہنچا دیا۔ میں سکون سے بیڈ پر لیٹا تو رویندر نے کہا۔

''بائی جی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، راکیش ورما یوں مارا جائے گا۔''

''سمجھا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب، وہ اتنی آسانی سے..... لیکن اس کے لیے جگرا چاہیے۔ اتنا زیادہ رسک.....''

''بس یہی رسک ہے، جس سے بڑا کام ہو جاتا ہے یا پھر.....'' میں نے کہا اور بیڈ پر کروٹ لی۔ تبھی مجھے جیب میں پڑے فون کا خیال آیا۔ میں نے فون نکال کر دیکھا۔ اودت کی کئی کالز آ چکی تھیں۔ اس کے ساتھ بملا کی بھی کالز تھیں۔ میں نے پہلے بملا کو فون کرنا مناسب سمجھا۔

''ہاں بولو بملا.....''

''کال کیوں نہیں لے رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک انتہائی اہم کام میں مصروف تھا، تم بولو۔'' میں نے کہا۔

''وہ تمہارے سردار صاحب کا کام کر دیا ہے ریتو نے۔'' اس نے سکون سے کہا تو میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کب.....؟''

''آج صبح، جب وہ کہیں جا رہا تھا، یہ پہنچی وہاں پر شیرنی کی طرح اور کام کر دیا اس نے اور نینا نے۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔

''اوہ..... اب کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید انبالہ ابھی گزرا ہے۔ ہم ٹرین میں ہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

''اوکے، تم لوگ خیریت سے پہنچو۔ راکیش ورما کا کام بھی ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی۔

''ارے یہ بات، چل اب سکون سے پہنچو تم بھی۔''

ہم میں چند الوادعی باتیں ہوئیں اور کال بند کر دی گئی۔

میں نے یہ اطلاع رویندر کو دی تو وہ تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مطلب اب اودت ہی سارے جنگل کا شیر ہو گیا، اسے کوئی نہیں اب پوچھنے والا۔''

''نہیں اس کے اوپر بہت سارے لوگ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''انہوں نے اسی سے کام لینا ہے، انہیں کام سے غرض ہے نام سے نہیں، خیر، یہ سردار مارا کیسے گیا ہو گا۔''

''یار تم اب بھی نہیں سمجھے ہو، ریتو نے اسے دیکھا تو ہوا ہے، فون کال سے ٹریس ہو گیا اور انہوں نے کام کر دیا۔''

''چلو، اب سکون تو ہوا۔'' اس نے کہا۔

''ابھی کہاں، ابھی تو مجھے پار جانا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ بھی ہو جائے گا۔ ابھی تو آرام کریں۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔ میں نے اودت کو کال ملائی۔

اس نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا۔ ''کہاں ہو تم؟''

''مطلب کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

''اِدھر سردار اور فرید کوٹ میں راکیش مارا گیا، تم نے.....'' اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تو میں نے کہا۔

''دیکھو اودت تمہاری راہ کے سارے کانٹے صاف ہو گئے ہیں، تمہیں اس سے کیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے تمہارا احسان چکا دیا۔''

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، تمہارے ساتھ سیلی بریٹ کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا تو میں بولا۔

''زندگی رہی تو ملیں گے، ضرور ملیں گے۔ ابھی مجھے تھوڑا مزید کام کرنا ہے، وہ زیادہ ضروری ہے۔''

''مجھے بتاؤ میں تمہاری مدد.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھے مدد نہیں چاہیے، اگر تم میری مدد کرنا ہی چاہتے ہو تو آئندہ کلیان جی کو یہاں اپنے ملک تک محدود رکھنا۔ ورنہ میں تو جان ہی گیا ہوں کون کہاں پر کیا کر رہا ہے۔''

''سچ پوچھو تو یہ کلیان جی ایک دیمک ہے، جو ہر طرف پھیل گئی ہے۔ اسے اب سمیٹنا بہت مشکل ہو گا خیر، میری طرف سے سب اچھا ہی اچھا ہو گا، اس بات کا یقین رکھنا۔'' اس نے یوں کہا جیسے بہت خلوص سے کہہ رہا ہو۔ میں نے چند لمحے مزید بات کی اور کال ختم کر دی۔

اس وقت شام کے سائے پھیل گئے تھے، جب میں بیدار ہوا۔ میں فریش ہو کر ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جب رویندر کے ساتھ وہی میزبان اندر داخل ہوا۔ وہ آتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔

''کمال کر دیا، میرا دشمن ختم کر دیا تم نے۔ کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ اس طرح مارا جائے گا وہ۔''

''تمہارا کام ہو گیا، یہی بڑی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ہو گیا۔ اب مجھے یہاں سے کوئی بھی ایم ایل اے بننے سے نہیں روک پائے گا۔'' اس نے وہ بات کہہ دی جو اس نے پہلے نہیں کہی تھی۔ چونکہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں نے سب نظر انداز کر دیا۔

''اب مجھے واپس جانا ہے۔ کب تک جا پاؤں گا؟'' میں نے پوچھا۔

''آج رات ہی، میری بات ہو گئی ہے، وہی لڑکی تمہیں واپس بھیجے گی۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''کب جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ابھی کھانا کھا لیں تو رویندر چھوڑ دے گا۔'' اس نے کہا تو میں سر ہلا کر رہ گیا۔ یہ سب سے مشکل اور رسکی مرحلہ تھا۔

☆☆☆

اندھیرے میں ڈوبا ہوا وہی ڈیرا میرے سامنے تھا جہاں مجھے پہلی بار رویندر ملا تھا۔ ہم اسی سڑک پر کھڑے تھے۔ ایک جیپ ہمارے پاس آ کھڑی ہوئی تھی، جس نے مجھے لے جانا تھا۔

''رب راکھا بائی جی۔'' رویندر نے یہ کہتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا تو میں نے اس کے کان میں کہا۔

''جب دل کرے آ جانا میرا نمبر تمہارے پاس ہے۔''

''بالکل، میں آؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے خود سے الگ کیا تو میں جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ چل دی اور میں رویندر سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ لڑکی اندھیرے میں جیپ چلانے کی عادی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ مجھے ایک ٹیکری کے پاس لے گئی۔ وہاں اس نے مجھے ایک اور لڑکی کے حوالے کر دیا۔ وہ مجھے جھاڑیوں کے درمیان سے لیتی ہوئی گیٹ کے بالکل قریب لے گئی۔ وہاں جا کر اس نے مجھ سے کہا۔

''لاؤ، دو سونے کے بسکٹ.....''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو تھا، اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے اپنی جیکٹ میں کہیں رکھے اور پھر اگلے چند لمحوں میں گیٹ کھل گیا۔ پہلے ایک شخص اندر آیا تو اگلے چند لمحوں میں مجھے باہر کی جانب دھکیل دیا۔ اس طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ میں کرانگ کرتا ہوا کافی دور تک چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ کافی فاصلے پر شہباز کھڑا میرا منتظر ہے۔ میں نے فون نکالا اور اسے مطلع کر دیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اس کے پاس تھا۔

''اوئے ماشکر ہے تم پہنچ گئے ہو۔''

''تمہارا کیا خیال تھا کہ میں راستے میں کہیں رہ جاتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ درشتی سے بولا۔

''او کوئی اچھا اچھا بول..... پتا ہے جتنے دن تو ادھر رہا ہے، میرا سانس ہی خشک ہوتا رہا ہے، چل چھوڑ۔'' یہ کہتے ہی اس نے مجھے گلے لگا لیا۔ اس کا جوش دیدنی تھا۔ وہ مجھے بار بار چھو کر دیکھ رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جس وقت ہم لاہور شہر میں داخل ہو رہے تھے، اس وقت اذانیں ہو رہی تھیں۔ تبھی میں نے بڑے دھیمے سے انداز میں کہا۔

''شہباز..... اس وقت پوجا کہاں ہوگی؟''

''اُو خیر ہے، اس کا کیوں پوچھ رہا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کا کام ختم ہو گیا، اس نے بہت جھوٹ بولے ہیں میرے ساتھ.....'' میں نے نفرت سے کہا۔

''ذرا سانس لے لو، گھر ہو لو، پھر اسے بھی دیکھ لینا، اتنی جلدی کس بات کی ہے۔'' شہباز کے لہجے سے حیرت اب بھی نہیں گئی تھی۔

''میں اس وقت تک بے چین رہوں گا، جب تک اُسے مار نہیں دیتا۔ سالے اپنے دھندے کے چکر میں ہمارے لوگ مارتے رہے ہیں۔'' میں نے پھر کہا تو میرے لہجے سے نفرت جدا نہیں ہو پائی تھی۔

''وہ اس وقت اسی جیل میں ہے جہاں سے بکا راجھستانی اور جیون رام کو لیا تھا۔ اس وقت وہاں جائیں گے بھی تو کچھ حاصل نہیں ہوگا، کل دن میں سہی۔'' اس نے مجھے دلاسا دے دیا۔ اس پر میرا خاموش ہونا ہی بنتا تھا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا تو وہ بولا۔ ''تم نے جو وہ بلراج والی ویڈیوز بھیجی تھیں، انہوں نے تو یہاں کے انڈر ورلڈ کو سامنے کر دیا ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، یہاں ایجنٹ ہی نہیں، اپنے بھی ملوث ہیں۔'' میں نے دکھ سے کہا تو گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔

''دیکھ لیں گے ایک ایک کو۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔

''ابھی تو اس کے لیپ ٹاپ میں بہت کچھ موجود ہے، وہ اس وقت بملا کے پاس ہے۔ جو اَب تک شاید جے پور پہنچ چکی ہو۔'' میں نے کہا اور اپنا فون نکال لیا پھر بملا کے نمبر ملا کر کال کر دی۔ دوسری طرف سے فون ریسیو کر لیا گیا، میں نے اس کے ہیلو کے جواب میں پوچھا۔

''پہنچ گئی ہو؟''

''نہیں ابھی بس تھوڑا سا سفر رہتا ہے۔'' اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا تو میں نے بتایا۔

''میں تو پہنچ گیا ہوں۔''

''چلو تم کرو آرام، میں پہنچ کر بتا دوں گی۔ یہ ٹرین کا سفر بھی نا.....'' اس نے کہا اور چند گالیاں سرکا دیں۔ میں نے فون بند کر دیا۔

میں گھر پہنچا تو گیٹ کھلتے ہی میری نگاہ ساوری پر پڑی، وہ پورچ میں کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں کٹوری تھی۔ اس کے پیچھے شانزے تھی۔ انہی کے ساتھ شبانہ اور فرزانہ کھڑی تھیں۔ میں گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس نے پورچ کے ستونوں پر تیل ڈال دیا۔ یہ ایک پرانی رسم تھی۔

''میرا بچا گھر آیا.....'' میرے پیچھے کھڑا شہباز ہولے ہولے گنگنانے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر ساوری سے ہاتھ ملایا، وہ بڑے وقار سے کھڑی تھی پھر شانزے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہم لاؤنج میں آ گئے۔

☆☆☆

مجھے اور ساوری کو باتیں کرتے ہوئے صبح ہو گئی۔ ہمیں اس وقت احساس ہوا جب چڑیاں چہکنے لگی تھیں۔

''اب تھوڑی دیر سو لو، پھر میں تمہیں ناشتے پر جگاتی ہوں۔''

''نہیں شاید اب میں نہ سو پاؤں۔ تم بناؤ ناشتا، میں فریش ہوتا ہوں۔'' میں نے کہا اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔

شہباز اور شانزے بھی نہیں سوئے تھے۔ ناشتا لگ گیا تو وہ دونوں بھی وہیں موجود تھے۔ تبھی شہباز نے صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''یار اب کچھ چھٹیاں لے کر کہیں سیر کے لیے نکلتے ہیں۔''

''ابھی چند دن کہیں نہیں جا سکتے۔'' میں نے کہا۔

''میں کون سا کہہ رہا ہوں آج ہی چلیں، کچھ آرام کر لو پھر.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

''شاید میرے نصیب میں آرام نہیں ہوگا، یہ جو سانپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں نا، انہیں بلوں سے نکال کر ان کا سر کچلنا ہے۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''اوماما..... کس چکر میں پڑا ہے۔''

''مطلب، کیا ایسا نہیں کرنا چاہیے؟'' میں نے

سنجیدگی سے پوچھا تو وہ بھی ازحد سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''میں نے کب کہا ہے، نہیں ہونا چاہیے لیکن سب کچھ ہمیں کرنا ہے۔ کچھ دوسروں کو بھی کرنے دو۔''

''جو ہم کر سکتے ہیں وہ تو کریں گے نا، یہ ہمارا فرض بنتا ہے۔'' میں نے صاف لفظوں میں کہا تو وہ بولا۔

''دیکھ سوہنے..... پاکستان بننے سے لے کر اب تک پڑوسی ملک نے ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کیا، یہ حقیقت ہے کہ ہم چاہیں بھی تو ان سے دوستی نہیں کر پائیں گے، کیونکہ نہ حکومت نے باز آنا ہے اور نہ عوام نے۔ ان کے دماغ میں پاکستان کی نفرت پلی بڑھی ہے۔ یہ تسلسل ہے، اور کئی نسلوں تک پھیلا ہوا ہے، ہم ختم ہو جائیں گے لیکن یہ ختم ہونے والا نہیں۔''

جیسے ہی شہباز نے بات ختم کی تو شانزے اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

''اب اگر تقریر ختم ہو گئی ہو تو ناشتا کر لو۔ جو کرنا ہو گا کر لیں گے لیکن اس وقت تم دونوں گھر پر ہو۔''

''او کے۔'' شہباز نے کہا اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ناشتا ختم ہونے تک ہم مختلف باتیں کرتے رہے۔ اب کوئی اتنا زمانہ تو نہیں بیت گیا تھا کہ سب کچھ بدل گیا ہوتا، یا کوئی بہت اہم واقعہ رونما ہو گیا تھا۔ بس وہی عام زندگی تھی یہاں، کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

میں باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا تو شہباز نے بھی گاڑی کی چابی اٹھالی، وہ جانتا تھا کہ میں رکنے والا نہیں ہوں۔ اگلے آدھے گھنٹے کے تک ہم آفس پہنچ گئے تھے۔ جہاں چاچا عبدالمجید ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے درمیان کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، پہلے انہوں نے مجھ سے رُوداد سنی، جو میں نے انتہائی اختصار سے سنا دی۔ تب پھر انہوں نے کہا۔

''تم نے جو معلومات وہاں سے بھیجی ہیں وہ کافی اہم ہیں۔ لیکن ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس ابھی ان کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں۔''

''ثبوت تلاش کیے جا سکتے ہیں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں، انہیں اپنی نگاہ میں رکھا ہوا ہے، جیسے ہی کوئی ثبوت ملا، ہاتھ ڈال دیں گے اُن پر۔'' چاچا نے یاس بھرے لہجے میں کہا تو مجھ پر بھی مایوسی چھانے لگی۔ یہ ایک المیہ تھا اور ہمیشہ ہی رہا تھا۔ وائٹ کالر کرائم اتنے محفوظ انداز میں کیا جاتا ہے کہ باوجود معلوم ہونے کے ان پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اگر کسی کو شک کی بنا پر پکڑ بھی لائیں تو ایسا اودھم مچتا ہے کہ انہیں چھوڑنا مجبوری بن جاتی ہے۔

''ایک لسٹ ہے یہاں لاہور میں رہنے والوں کی اور اردگرد کے شہروں کی، یہ سب لوگ معاشرے میں ایک مقام رکھتے ہیں۔'' شہباز نے کہا۔

''کھاتے اس ملک کا ہیں اور اسی ملک کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہمارے معاشرے میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا تو چاچا عبدالمجید بولے۔

''کوئی بات نہیں، جو ہاتھ آ گیا، اس سے نمٹ لیں گے، وطن کی حفاظت پر کوئی سمجھوتا نہیں ہے، یہ طے ہے۔''

''لیکن جن کا پتا ہے، انہیں.....'' یہ کہتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تو چاچا عبدالمجید پُرسکون انداز میں بولے۔

''انہیں بھی دیکھ لیں گے لیکن ابھی تم کچھ دنوں کے لیے آرام کرو۔ میں ایک پلان بنا رہا ہوں۔ مجھے ان لوگوں کی جڑ تک پہنچنا ہے، جو یہ سارا کھیل بھی کھیل رہے ہیں لیکن سامنے نہیں آتے۔''

''جیسے آپ کہیں۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا اور خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے اس پلان کے بارے میں بتاتے رہے تاکہ میں بھی سوچوں اور دھیان رکھوں۔ پھر وہ اٹھ کر چلے گئے۔

''ہاں، اب تمہارا کیا پلان ہے؟'' شہباز نے پوچھا۔

''پوجا کے پاس چلو، مجھے اس سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا تو شہباز نے ایک بار مجھے غور سے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ماما، بڑا تڑپ رہا ہے، کوئی جذباتی تعلق تو نہیں تیرا اس کے ساتھ۔''

''تیری پھوپی لگتی ہے اس لیے ملنا ہے۔'' میں نے سکون سے کہا تو وہ ایک دم سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''چل آ چلیں۔''

ہم دونوں آفس سے نکل پڑے۔ وہ مجھے شہر سے کوئی سو کلومیٹر دور ایک ایسی پرانی بلڈنگ میں لے آیا، جو بہت سنسان سی تھی۔ وہ عمارت کھیتوں کے درمیان ایک فارم ہاؤس میں تھی۔ کبھی وہاں کسی کا بسیرا رہا ہو گا، لیکن اب جس بندے کی ملکیت تھی، اس نے اپنی رہائش کچھ فاصلے پر جدید طرز کے گھر

میں رکھی ہوئی تھی۔ اس بلڈنگ کے اندر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی ہے ہی نہیں ہے۔ باہر خودرو پودے اُگے ہوئے تھے، بے تحاشا اُگی ہوئی گھاس، اور ویران سے لان تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی انگریز دور کی بنی ہوئی عمارت ہے۔ گیٹ پر ایک کین تھا جہاں سے شناخت وغیرہ کروانے کے بعد اس نے کار پورچ میں جارو کی اور مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔

داخلی دروازہ پار کیا تو سامنے ایک لمبا سا لاؤنج تھا۔ پرانے انداز کے صوفے، کرسیاں وغیرہ ویسے ہی پڑے ہوئے تھے۔ سامنے ہی ایک شخص کھڑا تھا، جو مسلسل ہماری طرف دیکھ رہا تھا، ہم دونوں اس کے قریب جا پہنچے تو اس نے ہم سے ہاتھ ملائے اور شہباز کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آیئے.....''

یہ کہتے ہی وہ پلٹا اور اندر کی طرف چل دیا۔ ہم اس کے پیچھے چل دیے، وہ اندر کی طرف بنی سیڑھیوں پر چڑھا اور اوپری منزل کے ایک کمرے کے سامنے لے گیا، پھر دروازہ کھول کر ہلکا سا جھکا، جیسے ہمیں اندر جانے کا عندیہ دے رہا ہو۔ ہم اندر چلے گئے۔ سامنے صوفے پر بوجا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک گئی، پھر اضطراری انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''راج ویر تم.....'' اس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ حیرت، دکھ اور یاسیت میں بھیگے ہوئے تھے۔ تبھی میں نے کہا۔

''ہاں میں، تم سے ملنے آیا ہوں، بیٹھو۔''

وہ بیٹھ گئی تو شہباز باہر چلا گیا۔ میں اس کے قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھے چلے جا رہی تھی اور میں اس کی جانب۔ وہ بالکل ہی مرجھائی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک مجھے یونہی دیکھتی رہی، پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے بھیگے ہوئے لہجے میں ہذیانی انداز میں بولی۔

''راج ویر تم نے مجھے مارا کیوں نہیں، اتنی اذیت ناک زندگی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔''

''سکون سے پڑی ہو، آرام سے..... اس میں کیا اذیت؟'' میں نے جان بوجھ کر یوں کہا جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہو۔

''نہیں راج ویر..... ہر لمحہ موت کا خوف، تنہائی اور بے چارگی کی زندگی مجھے مفلوج کر رہی ہے۔ مجھے مار کیوں نہیں دیتے ہو۔''

''میں تمہیں آزاد کر دینا چاہتا ہوں، اب جس طرح کی آزادی تم چاہو۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا تو اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں سمجھی نہیں، کیسی آزادی..... مطلب؟''

''مطلب، میں تمہیں ایک گولی ماردوں اور زندگی سے آزادی..... دوسرا، یہاں سے تمہیں بھارت بھیج دوں، یہ والی آزادی.....''

''ایک مرتے ہوئے انسان کے ساتھ اس طرح کا بھیانک مذاق کرنا انسانیت کی توہین ہے راج ویر.....'' اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

''تم کوئی پنڈت یا اپسرا نہیں ہو جو انسانیت کی بات کر رہی ہو، جب تک تمہیں یہاں قید نہیں کر دیا گیا، تب تک تم بھی دوسروں کو مارنے ہی کا کام کرتی تھیں، اُس وقت یہ توہین کہاں 'وڑی' ہوئی تھی۔'' میں نے طنز سے زیادہ حقارت سے اسے اس کی اوقات یاد دلائی۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''ایک اطلاع دینے آیا تھا۔''

''کیسی اطلاع.....'' اس نے بھویں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ راکیش ورما سمیت کچھ دوسرے لوگوں کو بھی ٹھکانے لگا آیا ہوں۔ یہ ابھی کل ہی کی بات ہے۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں کہا تو اس نے میری طرف یوں دیکھا، جیسے میں دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بول رہا ہوں، وہ چند لمحے سکتے کی سی کیفیت میں رہی پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ کیسے ممکن ہے، وہ تو.....''

''لوہے کا بنا ہوا ہے نا تمہاری طرح، روبوٹ ہے، اس کے تو بدن میں گولی بھی نہیں گھستی، ہے نا ایسے ہی ہے؟'' میں نے حقارت سے کہا۔

''لیکن کیسے.....؟'' اس کے لہجے میں حیرت سے زیادہ احتجاج تھا۔ مجھے لگا شاید راکیش ورما کے ساتھ اس کا جذباتی تعلق ہو، اس لیے ایسی اطلاع نے اسے شاک پہنچایا ہو۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''تصدیق کرنا چاہو گی کیا؟''

''ہاں لیکن کس سے.....'' اس نے کہا مگر میں نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے اودت کا نمبر ملا دیا، بیل جانے لگی تو میں نے اسپیکر آن کر دیا۔ چند لمحوں ہی میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا۔

''ہاں پہنچ گئے ہو، خیریت سے؟''

''بالکل، اور آرام بھی کر چکا، تم سناؤ راکیش ورما کے قتل

سے کوئی ہلچل تو نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہلچل تو ہوئی، لیکن انہیں سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کس جگہ کام کس نے کیا، یہ سمجھ آئے تو کچھ ہو۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔

''سمجھ آئے یا نہیں، تمہارا راستہ تو صاف ہوگیا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی اتنا آسان نہیں ہے لیکن میں سنبھال لوں گا۔'' اس نے سکون سے کہا تو میں نے تیزی سے کہا۔

''اوہاں یاد آیا، لدھیانہ میں ایک بوڑھا ہے رام ٹکیت، وہ بھی دھرتی کا بوجھ ہے، انہی کا ساتھی ہے۔''

''تمہیں سن کر خوشی ہوگی، وہ رات ہی لڑھکا دیا ہے۔ سالا وہ بھی ایم ایل اے کے خواب دیکھ رہا تھا۔'' اس نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''چل ٹھیک ہے رکھتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے پوجا کے چہرے کی طرف دیکھا جو دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کے بجائے دکھ تیرنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے زور سے آنکھیں بند کرلیں جیسے اپنے اندر کی تکلیف کو برداشت نہ کر پا رہی ہو۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی، اسے ایسی ہی کیفیت میں رہنے دیا۔ چند منٹ یونہی گزر گئے تو وہ بولی۔

''میرا تو سب کچھ ختم کر دیا تم نے۔''

''اب بتاؤ، کیسی آزادی چاہتی ہو؟'' میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

''میں تمہاری قید میں ہوں راج ویر، فیصلہ آزاد لوگوں سے لیا جاتا ہے، قیدیوں سے نہیں۔ مجھے آزاد کر اور پھر اسی طرح فون پر پوچھنا.....'' اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو میں نے قہقہہ لگا دیا۔

''یہ چانس میں تمہیں پہلے دے چکا ہوں، خیر، تم نہیں چاہتی ہو تو.....'' میں نے کہا اور پسٹل نکال لیا۔ پوجا کا رنگ فق ہوگیا۔ اسے اپنی موت دکھائی دینے لگی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں کپکپانے لگی تھیں۔ تبھی وہ تیزی سے بولی۔

''مجھے بھارت بھیج دو۔''

''تم نے فیصلے کا حق کھو دیا ہے میری جان۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''اب کہہ رہی ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''چل پھر بتا، یہاں تم لوگوں کا بڑا کون ہے، جو اس سارے کھیل کے پیچھے ہے، بتاؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا لیکن راکیش ورما سے کئی بار سنا ہے کہ وہ یہاں کا بہت بڑا بزنس مین ہے۔ بظاہر اسے بزنس کے سوا کوئی کام نہیں ہے لیکن وہ یہاں ہر شعبے میں اپنا تسلط چاہتا ہے، وہ کامیاب بھی ہے، اس کی یہی کمزوری ہے اسی لیے وہ ہمارے ساتھ ہے۔''

''کیا نام ہے اُس کا؟'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''چوہدری بدرالدین.....'' اس نے دھیمے سے کہا پھر تھوڑی دیر بعد اس کے بارے میں جو جانتی تھی، وہ مجھے بتاتی رہی۔

''یہ بندہ جیسے ہی ٹھکانے لگا، تمہیں بھیج دیا جائے گا۔''

''میری بات سنو.....'' اس نے تیزی سے کہا۔

''سناؤ۔'' میں نے کہا تو وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے جانے دو..... میں تھک گئی ہوں، میں اب یہ سب چھوڑ دینا چاہتی ہوں، چھپ کر باقی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میری دولت جو اَب تک میں نے بنائی ہے، وہ سب ضائع ہوجائے گی۔ پلیز مجھے جانے دو۔''

''تمہیں پتا ہے میں جو وعدہ کرتا ہوں، پورا کرتا ہوں۔ تمہیں بھی جانے دوں گا۔ بس ذرا کنفرم ہوجائے۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ اس کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملے گا، اور تمہیں ایسا کوئی ثبوت تلاش کرنے میں نجانے کتنا عرصہ لگ جائے، یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''وہ میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تو وہ بولی۔

''راج ویر..... میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا اور آج پھر روک رہی ہوں۔ اس کھیل میں مت پڑو، یہ تمہارے بس کا نہیں ہوگا راج ویر..... جو لوگ معاشرے کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں، ان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ میری مان لو۔'' اس نے دردمندی سے کہا۔

''کیوں نہیں کیا جا سکتا مقابلہ اور تم منع کیوں کرو؟'' میں نے حقارت سے کہا تو وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''دیکھو راج ویر، ہم نے کچھ برس پہلے ایک خواب دیکھا تھا، اور وہ خواب یہ تھا کہ سرحدوں سے ہٹ کر، انہیں نظر انداز کر کے، ایک ایسی خفیہ تنظیم بنائی جائے، جس کا تسلط اس

پورے خطے پر ہو، ہم جو چاہیں وہی ہو۔ تم ہمیشہ مجھ سے سوال کرتے تھے کہ میں دہری چال کیوں چلتی ہوں۔''

''ہاں، یہ سوال اب بھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ ہم اندر ہی اندر سے کلیان جی کو ختم کر چکے، اپنے لوگ لا رہے ہیں۔ جس رام نکیت کی بات تم نے کی تھی، یہ بہت عرصے سے کلیان جی کے لیے کام کرتا تھا لیکن اب وہ ہمارے ساتھ تھا۔ کلیان جی خود ختم ہو رہی ہے، اس کا پتا خفیہ ایجنسی کو بھی ہے۔ لیکن ہم کیا کرنے جا رہے ہیں، یہ خواب ابھی چند لوگوں میں ہی ہے۔ اب راکیش نہیں رہا تو مجھے بھی دلچسپی نہیں رہی۔''

''ورنہ تم ضرور.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''شاید ایسا ہی ہوتا، اور تم کیا سمجھتے ہو، تم یہ جو سب کچھ کر کے آگئے ہو، کیا یہ اتنا آسان تھا، نہیں بالکل نہیں، اس میں ضرور ہمارے لوگوں کا ہاتھ ہوگا۔ جس میاں بدرالدین کی میں بات کر رہی ہوں، اسے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہوگا۔ اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی کہ تم اس کے پیچھے ہو تو میں پھر خبردار کر رہی ہوں۔ بچ جاؤ اُس سے۔'' پوجا نے دبے دبے جوش سے کہا تو میں دھیرے سے ہنس دیا، وہ مجھے تاؤ... دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں جاؤں اور اسے ختم کر دوں۔ میں نے یہ سب کچھ سن کر پسٹل جیب میں ڈالا اور اٹھتے ہوئے بولا

''اب واپس آ کر ہی بات ہوگی۔'' میں نے کہا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ باہر شہباز موجود تھا۔ ہم اس عمارت سے نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

''میاں بدرالدین..... اس کے بارے میں صرف شک کی اطلاعات تو ہیں لیکن کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی ایسا واقعہ ہے جس سے کوئی بات آگے بڑھتی، اگر تم اسے چیک کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔'' چاچا عبدالمجید نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''اس کے لیے تو ایک لمبا عرصہ درکار ہوگا، اور پھر ان دنوں تو وہ بہت محتاط ہوگا.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولے۔

''یہی نا، دیکھتے ہیں اُسے، کہیں نا کہیں تو غلطی کرے گا نا۔''

''چلیں جیسا آپ کہیں۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا تو مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں جانتا تھا ایسا وہ اس وقت کرتے ہیں جب کسی بھی موضوع پر بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔ میں ان کے پاس سے اٹھ کر شہباز کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کوئی فائل پڑھنے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی فائل اس نے ایک طرف رکھ دی پھر بولا۔

''سناماما، کیا کہا انہوں نے؟''

''شاید وہ اس میں دلچسپی نہیں رکھتے۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولا۔

''تو پھر تمہیں بھی اس میں دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔ سکون کرو، جتنا تم نے کر لیا، بہت ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو مجھے سکون ہی کرنا چاہیے۔'' میں نے سکون ہی سے کہا۔

''تو بس پھر، مسئلہ کیا ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے چند لمحے سوچا، پھر بولا۔ ''تم نے اس پوجا کا جو بھی فیصلہ کرنا ہے کرو، اسے آزاد کرو۔ میں سمجھتا ہوں تم نے اس کا بوجھ لیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ اتنا کچھ کر دیا ہے کہ وہ اب کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہی۔ اس کے اندر چپ ڈال دی ہے۔ اگر وہ کچھ بھی کرے گی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور.....''

''او ماما چپ بول کے تو نہیں بتائے گی کہ اس نے کیا پلان کیا ہے یا وہ کیا سازش کرنے جا رہی ہے، یا پھر کس کو کیا معلومات دے رہی ہے یا وہ.....'' میں نے جذباتی انداز میں کہنا چاہا تو اس نے مجھے ٹوک دیا پھر سکون سے بولا۔

''دیکھ میری بات سن، ہمارا یہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ پوجا کے بارے میں تم نے فیصلہ کرنا ہے، کرو۔ نہیں کر سکتے تو بتا دو، ہم اس کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی بات کو تم نے اتنا بڑا بوجھ بنا لیا ہے۔''

''او کے، اگر تم نے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا ہو تو کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا تو وہ سکون سے بولا۔

''میں اسے آزاد کر دوں گا، اپنے کسی بندے کے عوض.....''

''تو کر دو۔'' میں نے کہا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ زیرِلب مسکرا دیا پھر تصدیق کرتے ہوئے پوچھا۔

''کر دوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''بالکل بھی نہیں۔ کلیان جی کا خاتمہ تو ہو گیا، لیکن اس کی صورت اب نئی بن گئی۔ نام بدل جانے سے کچھ نہیں ہوتا، کچھ نیا بن جاتا ہے۔ چاچا سچ کہتے ہیں، یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا۔ ہم ختم ہو جائیں گے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر بولا۔

''یہی بات میں تمہیں کب کا سمجھا رہا ہوں ماما۔ چل چھوڑ، شام ہونے والی ہے گھر چلتے ہیں، آج تھوڑا وقت اپنی

گھر والیوں کو بھی دے دیں۔''

''چل اٹھ۔'' میں نے کہا اور ہم وہاں سے نکل پڑے۔

وہ شام ہم نے گھر میں گزاری۔ اچھا سا ڈنر کیا، گپ شپ چلتی رہی۔ رات گئے تک ہم لاؤنج میں بیٹھے جاگتے رہے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں سونے کی کوشش میں تھا، جب میرا فون بجا۔ وہ شہباز کا فون تھا۔ میں نے سوچا ذرا سے فاصلے پر اس کا کمرا ہے، یوں فون کیوں کر دیا؟ میں نے اس کی کال پک کر لی۔

''او خیر ہے.....؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ یار، ڈیل ہو گئی ہے۔ اُدھر سے ہمارے دو بندے لائے جا رہے ہیں، جس کے عوض ہم نے پوجا کو دینا ہے۔ ہمیں ابھی نکلنا ہوگا۔''

''تمہارے ساتھ چلنے کو تو میں چلتا ہوں، لیکن جب ڈیل تم نے کی ہے تو میں کیوں؟'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔

''کیونکہ پوجا تمہارے بغیر نہیں مانے گی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''او کے، چل نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا اور بیڈ سے اٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ساوری نے سب سن لیا تھا۔ کیونکہ وہ کروٹ لے کر پھر سے سوتی بن گئی تھی۔ میں تیار ہو کر باہر آ گیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم پھر سے اس عمارت میں تھے جہاں پوجا سے ملے تھے۔ اسی طرح سیڑھیاں چڑھ کر ہم کمرے میں گئے تو پوجا ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے نائٹ بلب کی روشنی میں دیکھا، وہ دروازہ کھلنے کی آواز سے بیدار ہو گئی تھی۔ میں نے زیادہ روشنی کے لیے بلب روشن کیا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

''اس وقت.....؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پوجا، جب سے میں یہاں سے گیا ہوں، ایک بات مجھے بہت پریشان کر رہی ہے۔'' میں نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

''ایسی کون سی بات ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ اگر تجھے چھوڑنا ہی ہے تو پھر میں تیرا احسان کیوں لوں، کسی شرط پر تجھے کیوں چھوڑوں؟ اگر کوئی رحم کرنا ہی ہے تو تجھے بنا کسی شرط کے چھوڑا جائے ورنہ گولی مار کر قصہ ختم کیا جائے۔'' میں نے ایک دم ہی سے کہہ دیا۔

''یہ تیری مرضی ہے۔'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔ شاید اس کا گلا رُندھ گیا تھا۔ تبھی میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''چل اٹھ، میں تجھے سرحد پار کروا دوں۔''

''سچ کہہ رہے ہو یا مجھے گولی مارنے کے لیے باہر لے جا رہے ہو؟'' اس نے انتہائی مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں، سرحد پار بھیجوں گا، آگے تو جانے..... بس اتنا چاہوں گا، میرے وچن کے خلاف اب کچھ مت کرنا، جیسے تو نے کہا ہے کہ سکون کی زندگی جینا چاہتی ہے تو ویسے ہی جینا۔'' میں نے اپنے لہجے میں انتہائی درجے کی جذباتیت بھرتے ہوئے کہا۔ ان لمحات میں مجھے لگا اداکاری کتنا مشکل فن ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں اپنی کہی ہوئی بات کا ردِعمل دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ ایک دم سے رو دی۔ تبھی میں نے کہا۔ ''یہ رونے دھونے کا وقت نہیں، صبح ہونے والی ہے، اس سے پہلے ہم نے پہنچنا ہے، جلدی سے اٹھو۔''

میرے کہنے پر وہ اٹھ گئی۔ اس نے ایک بڑی سی چادر سے خود کو لپیٹا اور میرے ساتھ کمرے سے باہر آ گئی۔ باہر شہباز کھڑا میرا منتظر تھا۔ ہم چلتے ہوئے نیچے لاؤنج میں آ گئے۔

اگرچہ رات کی تاریکی ابھی باقی تھی لیکن سامنے باڑ میں لگی فلڈ لائٹس سے دن کا اُجالا معلوم ہو رہا تھا۔ ایک خاص مقام تک ہم گاڑی میں گئے، اس سے آگے ہم تینوں پیدل چل پڑے۔ ایک بڑی سی ٹیکری تک ہم نے سفر کیا تو وہاں پہلے سے موجود ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، جس سے ہمارا رابطہ تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے سرحد پار رابطہ کیا، تھوڑی... دیر اسی کشمکش میں گزر گئی، یہاں تک کہ سامنے سے پوجا کو بھیج دینے کا کہا گیا۔

''لو پوجا، جاؤ۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ میرے چہرے پر دیکھتی رہی پھر آگے بڑھ کر اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ وہ ہچکیوں میں رونے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود پر قابو پایا اور ہچکیوں کے ساتھ بولی۔

''میں تمہیں مارنے آئی تھی اور تم مجھے آزاد چھوڑ رہے ہو۔ میری اگر زندگی رہی تو اسے یاد رکھوں گی۔''

یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے الگ ہو گئی اور پھر اس شخص کے ساتھ پیدل چل پڑی۔ ہم وہیں دبک گئے۔ اگلے آدھے گھنٹے تک وہیں بیٹھے رہے تو سامنے سے کچھ سائے لہرائے۔ وہ تین افراد تھے۔ وہ ہمارے قریب آتے گئے یہاں تک کہ واضح ہو گئے۔ وہ شہباز کی ٹیم کے دو آدمی تھے جو سرحد پار کہیں پھنسے ہوئے تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چلیں، پوجا

کہیں تو کام آئی۔ میں اگر اسے مار دیتا تو اس کے عوض یہ لوگ نہ آپاتے۔ ہم انہیں لے کر واپس پلٹ پڑے۔ لاہور میں داخل ہوئے تو دن نکل آیا تھا۔ ریلوے روڈ سے بھرپور ناشتا کرنے کے بعد ان لوگوں کو جانے دیا، وہ اپنے گھروں کی جانب چل پڑے اور ہم اپنے گھر کی جانب بڑھے۔

☆☆☆

میرے اگلے دو دن یونہی گھر میں گزر گئے۔ میں جاگنے سے زیادہ سوتا رہا تھا۔ اس دوران ساوری کھانے بناتی رہی اور کھلاتی رہی۔ شانزے نے اسے بہت کچھ بنانا سکھا دیا تھا۔ شانزے نے اپنا سیٹ اَپ اوپر منزل پر بنایا ہوا تھا۔ وہیں اس کی اسسٹنٹ بھی رہتی تھی۔ شبانہ اور فرزانہ کا زیادہ وقت وہیں سیکھنے میں گزر جاتا۔ ایک سکون تھا۔ ایسے سکون سے میں اکثر گھبرا جایا کرتا تھا۔

وہ دوسرے دن کی شام تھی۔ میں لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ساوری کچھ دیر پہلے ہی مجھے چائے کا کپ تھما کر گئی تھی۔ میں نے اسے میز پر رکھ دیا تاکہ تھوڑی سی ٹھنڈی ہو جائے تو میں پیوں۔ میں اس وقت میاں بدرالدین کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے اپنے چند لوگوں کے ذمے لگا دیا تھا کہ اگر کوئی بھی بات معلوم ہو تو مجھے بتائی جائے لیکن ابھی تک کسی نے کوئی ایسی اطلاع نہیں دی تھی جس سے میں کسی بھی شک کا سرا پکڑ کر آگے بڑھ سکتا۔ میں نے چائے کا سپ لیا ہی تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے کپ واپس رکھا اور فون اٹھا لیا۔ وہ کوئی انجان نمبر تھا۔ میں نے فون ریسیو کیا تو دوسری طرف پوجا کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کیسے ہو راج ویر؟''

''میں تو ٹھیک ہوں تم سناؤ، خیریت سے پہنچ گئی ہو؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے اس سے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''ہاں..... سچ پوچھو تو سرحد پار سے پہلے تک مجھے امید نہیں تھی کہ میں خیریت سے پہنچ جاؤں گی لیکن بس پہنچ گئی.....'' اس نے کہا۔

''امید کیوں نہیں تھی، تمہیں مجھ پر شک تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے شک نہیں یقین تھا، تم مجھے سرحد پار جانے نہیں دو گے، اس سے پہلے ہی مجھے مار دو گے مگر راج ویر، تمہارا دل بہت بڑا ہے، تم نے مجھے آنے دیا، اور آج میں اپنے گھر میں آ کر بھی پُرسکون نہیں ہوں۔''

''پُرسکون نہیں ہو..... مطلب؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اچھا سنو پھر.....'' یہ کہہ کر اس نے طویل سانس لی پھر کہتی چلی گئی۔ ''مجھے یقین تھا، تم مجھے مار دو گے۔ اس لیے میں نے تم سے ایک بڑا جھوٹ بولا..... میں تمہارا نقصان چاہتی تھی۔''

''میرا نقصان، کیسا نقصان؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو، یہ تم بھی جانتے ہو، دنیا میں اپنے حریف کو ذہنی شکست دینے کے لیے پہلا حربہ یہی ہوتا ہے کہ اس کے نظریات میں شک ڈال دو، میں نے بھی ڈالا تھا شک.....'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''کچھ بتاؤ گی بھی یا ایسے ہی باتیں کرتی رہو گی۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''وہی بتانے کے لیے ہی تو فون کیا ہے تمہیں۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر بتاؤ۔'' میں نے کافی حد تک سختی سے کہا تو وہ بولی۔

''میاں بدرالدین..... وہ ایک محبِ وطن ہے، میں نے تمہارے دماغ میں شک ڈال دیا، ایسے ہی نئی راہ پر ڈال دیا۔ تاکہ تم بھٹک جاؤ، وہ مر گیا تو میرے ملک کا دشمن مر گیا، وہ زندہ رہا تو تم مر گئے۔ کوئی بھی نہ مرا تو تم لوگ آپس میں لڑ مرو گے۔ لیکن یہاں آ کر میں بے چین ہو گئی۔ تم نے جو میرے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے، میں تمہاری احسان مند ہوں اس لیے سوچا تمہیں سچ بتا دوں۔''

''ایسا نہیں ہے پوجا کہ میں اُس پر چڑھ دوڑتا اور اسے مار دیتا، جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا کہ یہ میرے وطن کا دشمن ہے، تب تک نہیں، کچھ نہیں ہوتا۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ہاں، ایسا ہی ہو گا لیکن اب جو میں بتانے جا رہی ہوں، وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔'' اس نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ایسا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے چولستان میں، کچھ لوگ لانچ ہو گئے ہیں، خاصے مضبوط اور اچھے تربیت یافتہ ہیں۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''کیا کرنے والے ہیں؟'' میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے وہاں کیا کرنا ہے، اس کی تفصیلات تو مجھے

نہیں ملیں، ہاں مگر پتا لگا تو ضرور بتاؤں گی۔ یہ اطلاع پکی ہے۔'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا تو میں نے پھر پوچھا۔

''میں نے مان لیا کہ اطلاع پکی ہے لیکن کیا یہ پتا ہے کہ وہاں کہاں ہوں گے؟ کوئی اتا پتا، کچھ تھوڑی بہت.....''

''نہیں پتا..... لیکن کھوج میں ضرور رہوں گی۔ اور یہ تم سے وعدہ ہے، کم از کم اب تمہارے ساتھ جھوٹ نہیں بولوں گی۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''تمہارا شکریہ پوجا، تم نے مجھے بتا دیا، ورنہ اُن کا تب پتا چلتا، جب وہ کوئی نہ کوئی نقصان کر چکے ہوتے۔'' میں نے اس کا مان رکھنے کے لیے کہا۔

''ایک مزید آفر ہے تمہارے لیے، اگر تم بہت زیادہ دولت مند بننا چاہتے ہو۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا آفر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس خطے میں جو نیٹ ورک بن رہا ہے اس کا حصہ بن جاؤ، یقین جانو، تمہارے ملک کو کوئی نقصان نہیں ہوگا، اس کی جتنی بھی تفصیلات چاہو گے میں دوں گی، دنیا کے کسی بھی ملک میں مجھے مل لو.....'' اس نے دبے ہوئے جوش سے کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

''وہ کہتے ہیں نا چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔''

''کیا مطلب.....؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''یہی کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ واپس جا کر سکون سے اپنے گھر رہو گی، سب کچھ چھوڑ دو گی لیکن یہ آفر.....'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا تو وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔

''جس دن میں نے یہ کہہ دیا کہ اب میں کام نہیں کروں گی، اسی دن مار دی جاؤں گی۔ تم سے زیادہ... کون جانتا ہے یہ بات، ہماری دنیا کتنی ظالم ہے، شاید تمہیں احساس بھی نہیں۔ آخری سانس تک گروی ہوں ان کے پاس۔''

''اچھا چھوڑو..... اپنا خیال رکھو، کوئی اطلاع ہو تو مجھے ضرور دینا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے تصویریں منگوائی ہیں، ملیں تو بھیج دوں گی۔'' اس نے کہا اور پھر چند الوداعی باتوں کے بعد فون کال بند ہوگئی۔

میں نے فون میز پر رکھا تو کئی خیالات میرے دماغ میں اُمنڈ آئے۔ ایک دم سے بستی چراغ شاہ میرے اندر جاگ اٹھی۔ میں نے ٹھنڈی ہوتی..... چائے اپنے حلق میں انڈیلی اور بختاور کو فون ملا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس سے رابطہ ہوگیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

''سناعلاقے میں سب ٹھیک ہے نا؟''

''اب تک تو ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ نہیں۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''نہ جانے مجھے کیوں احساس ہو رہا ہے کہ وہاں کچھ گڑ بڑ ہو سکتی ہے۔'' میں نے جان بوجھ کر ایسے کہا تھا، کیونکہ بعض اوقات آگہی بھی بڑی پریشانی لے آکر آجاتی ہے۔ اب پتا نہیں پوجا کی بات درست تھی یا یہ بھی کوئی جھوٹ تھا، میں خوامخواہ بختاور کو ذہنی طور پر پریشان کر دیتا، تبھی وہ بولا۔

''اگر ایسی کوئی بات ہے تو صاف بتاؤ۔''

''نہیں، بس ایسے ہی خیال آیا، میں نے سوچا کہیں تم وقت کے ساتھ کاہل ہی نہ ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے قہقہہ لگا دیا۔

''وہ ٹھیک ہے، آؤ کبھی اِدھر کا چکر لگا جاؤ، تم لوگ تو بالکل ہی بھول گئے ہو؟'' اس نے کہا تو میں نے پوچھا۔

''کوئی خیر کا کام ہے؟''

''ہاں نا، یہ سانول بڑا خراب ہو گیا ہے، سارا دن گھر میں پڑا رہتا ہے، نوکر چاکر رکھے ہوئے ہیں، نواب بنا ہوا ہے، ابھی کل ہی مجھ سے کہہ رہا تھا، کوئی گاڑی ہونی چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بھی قہقہہ لگا دیا۔

''تو لے دو نا گاڑی اُسے بھی۔'' میں نے پیار سے کہا۔

''آؤ تو لے دینا، ویسے بابا خیر دین بھی بڑا یاد کرتا ہے۔'' اس نے کہا تو میرا دل بھر آیا۔ تبھی میں نے کہا۔

''اچھا میں لگا تا ہوں چکر۔ تم بس اِدھر اُدھر نگاہ رکھنا۔ سو دشمن ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آج ہی سے ذرا علاقے کو دیکھتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر اِدھر اُدھر کی گپ شپ کے بعد فون بند کر دیا۔

میری فون کال کے دوران ہی شہباز آکر میری سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے اسے پوجا والی ساری بات کہی تو وہ سننے کے بعد بولا۔

''یار کس فراڈن عورت کے چکر میں پڑ گیا ہے تو..... چھوڑ اُسے۔''

''ویسے روہی کا چکر لگانے میں کوئی دقت تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو بالکل بھی نہیں ہے، میں سوچ رہا تھا، کہیں باہر کے ملک چلتے ہیں، چار دن ٹھنڈ میں گزار کر آتے ہیں۔'' اس

نے مزے سے کہا۔

''میں روہی سے ہو آؤں تو پھر بناتے ہیں پروگرام۔''

میں نے کہا تو وہ کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

سہ پہر ہو رہی تھی، جب ہم ساوری، شبانہ اور فرزانہ کے ساتھ بستی چراغ شاہ پہنچ گئے۔ وہی صحرا..... وہی بستی، کچے مکان، جھونپڑیاں، اُڑتی ہوئی ریت، بکریوں، اونٹوں اور گائیوں کے ریوڑ، وہی چرواہے، وہی سناٹا۔ یہاں زندگی کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ میں نے گاڑی گھر کے صحن میں جا کر کھڑی کی۔ اس وقت رحماں برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایک اونٹ کے بالوں کا کمبل تھا، جس کو وہ سنوار رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔ اس سے ملنے ملانے کے بعد میں نے پوچھا۔

''بابا خیر دین کہاں ہے؟''

''وہ ڈیرے پر ہے، وہیں رہتا ہے، بہت کم اِدھر صحن میں آتا ہے۔''

''اور سانول؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کافی دیر پہلے بختاور کے ساتھ گیا ہے، وہ آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اور تمہیں یہاں اکیلے چھوڑ دیتا ہے؟'' ساوری نے غصے میں پوچھا۔

''نہ، سارا دن میرے پاس یہاں کی لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔'' صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے بات بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس وقت اس بات کو نظر انداز کیا اور ڈیرے کی طرف چل دیا، میرے پیچھے ساوری بھی آ گئی۔ بابا سامنے چار پائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ مغرب تک ہم اس کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رحماں وہیں ہمارے لیے چائے لے آئی۔ یہاں تک کہ سانول کے ساتھ بختاور بھی آ گیا۔

''اوئے میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی آ جاؤ گے۔'' بختاور نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ سانول بھی خوش دلی سے ملا تو ساوری بولی۔

''تم آؤ نا میرے ساتھ، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

''خیر تو ہے نا؟'' سانول نے حیرت سے پوچھا۔

''آ نا میرے ساتھ، اندر چل۔'' اس نے کہا اور رہائشی حصے کی جانب چل پڑی۔ سبھی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس کی شامت آ گئی ہے۔ ہم کچھ دیر وہیں بیٹھے رہے، پھر کھانے کے لیے بلا لیا گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور بختاور ڈیرے کے سامنے ٹیلوں کی طرف چل دیے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ تارے چمکنے لگے تھے۔ سناٹا ہر سُو پھیلا ہوا تھا۔ میرا بات کرنے کو بالکل بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اور بختاور ٹیلے کے اوپر جا کر بیٹھ گئے۔ تبھی اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے کل لوگ بھیجے تھے اِدھر اُدھر، ابھی تک کوئی ایسا معاملہ سامنے نہیں آیا، سب معمول پر ہے۔''

''اچھی بات ہے اگر کچھ نہیں ہے تو۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''ویسے تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی تم لوگوں کے بارے میں دل پریشان رہتا ہے۔'' میں نے یوں کہہ کر بات ٹال دی۔ میں نے سوچا اب جبکہ میں یہاں پر آ ہی گیا ہوں تو کیوں پریشان کروں۔ موضوع بدلنے کے لیے میں نے کہا۔

''جب میں یہاں آیا تو پہلی بار مجھے زمان موبل ملا تھا، یہاں بیٹھا گیت سن رہا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ۔ کہاں ہوتا ہے، ملا ہے کبھی؟''

''ہاں اِدھر ہی ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے اسے کال ملا دی۔ کچھ ہی دیر میں اس نے فون کال ریسیو کر لی۔ کچھ دیر حال احوال کے بعد جب اسے پتا چلا کہ میں بستی چراغ شاہ میں ہوں تو بولا۔

''اچھا ہوا یار تم آ گئے۔ تم سے کچھ باتیں کرنا تھیں۔''

''تو کرو نا۔'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''میں کل دن میں آؤں گا، پھر باتیں کریں گے۔'' اس نے پہلو تہی کرتے ہوئے کہا تو میں بولا۔

''بھئی آ جاؤ، یہاں ٹیلے پر بیٹھے ہیں جہاں پر ہم پہلی بار ملے تھے۔''

''ویسے اس وقت آنے میں حرج بھی نہیں ہے، اچھا چل میں آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ میں نے فون جیب میں رکھتے ہوئے بختاور کو بتایا۔

''وہ زمان موبل یہیں آ رہا ہے۔''

''چلو آ جائے کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا پھر چند لمحوں بعد بولا۔ ''او علی زین تمہیں جے پور یاد آتا ہے، وہاں کی لڑکیاں، وہاں کا خاص رقص۔''

اس نے پوچھا تو میں چونک گیا، تبھی میں نے دھیرے سے کہا۔

''ہاں یار، کیا کمال کا رقص کرتی ہیں۔''

''ابھی دکھاؤں تمہیں۔'' اس نے کمالِ اشتیاق سے پوچھا۔

''ایسا کیا ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''یار دیکھو تو، پھر مجھے بتانا، تمہیں جے پور یاد نہ کروا دوں تو کہنا۔''

''کمال ہے ایسا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی دکھاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور کسی کو فون ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد جب اس کا رابطہ ہو گیا تو وہ بولا۔

''اے ردھی..... وہ جو تیرے پاس ایک نئی لڑکی آئی ہے، کہاں ہے وہ؟''..... یہ کہہ کر دوسری طرف سننے لگا پھر بولا۔ ''چل بھیج اُسے۔ یہی کوئی آدھے گھنٹے میں آجائے۔''

مجھے لگا وہ مجھے رقص دکھانے کے بجائے، خود دیکھنا چاہتا ہے، اس کے اندر خواہش جاگ اٹھی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ انہی باتوں کے دوران زمان موبل بھی وہیں آ گیا۔ حال احوال کے بعد میں نے پوچھا۔

''ہاں بول..... کیا بات کرنا تھی؟''

''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بات کیسی ہو گی لیکن مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا تو مجھے شہباز یاد آیا، وہ ہوتا تو یہی کہتا کہ ''اوما مابات کر، اُلجھن نہ ڈال.....'' لیکن میں نے تحمل سے کہا۔

''جو بھی کہنا چاہتا ہے، ابھی کہہ دے۔''

''کوئی پندرہ بیس دن سے زیادہ ہی ہو گئے ہیں، سردار نور حیات کے پاس رنگ رنگ کے بندے آ رہے ہیں۔ ان میں یہاں روہی کے لوگ بھی ہیں اور شہر سے آنے والے بھی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''یار وہ ایک قبیلے کا سردار ہے، اس کے پاس لوگوں کا آنا جانا تو لگا رہتا ہے اس میں نئی بات کیا ہے؟'' بختاور نے عام سے لہجے میں تبصرہ کیا۔

''یار میں نے بھی ساری زندگی یہیں گزاری ہے۔ کوئی معاملہ ہوتا ہے تو یوں لوگوں کا آنا جانا شروع ہوتا ہے۔ یہ معمول سے ہٹ کر ہے، عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آج کل کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟'' بختاور نے تشویش سے پوچھا۔

''یہی تو سمجھنے والی بات ہے۔'' زمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''اس کا کوئی اپنا معاملہ ہے تو ہمیں اس سے کیا؟'' میں نے کہا۔

''اس نے کون سا اپنے بچوں کی شادی رکھی ہوئی ہے یا اس کے کسی قبیلے والے کا کوئی مسئلہ ہے، اندر خانے ہی کچھ ہو رہا ہے۔'' زمان نے سمجھاتے ہوئے کہا تو بختاور نے تشویش سے پوچھا۔

''تو پھر کوئی بات سامنے آئی؟''

''یہی تو پتا لگانا چاہیے، ممکن ہے کوئی سازش ہی بن رہی ہو، اپنے خلاف نہ سہی، کسی کے بھی خلاف ہو سکتی ہے۔'' زمان نے اپنا اندازہ بتایا۔

اس سے پہلے کہ زمان موبل کوئی بات کرتا، بختاور کا فون بج اٹھا۔ ردھی نے جو لڑکی بھیجنا تھی، وہ ڈیرے پر آ گئی تھی۔ بختاور نے اسے ٹیلے پر ہی بلا لیا۔ کچھ ہی دیر بعد دور سے ایک ستارہ سا دکھائی دیا، پھر وہ ستارہ شعلہ بنتا چلا گیا۔ وہ شعلہ دراصل ایک بڑی لالٹین تھی۔ تھوڑی دیر بعد تین لوگوں کے ساتھ ایک چھلیلی سی لڑکی سامنے آ گئی۔ اس نے اپنے گرد سیاہ چادر لپیٹی ہوئی تھی، جس میں سے دکھائی دے رہا تھا کہ اس نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا ہے۔ وہ آتے ہی بختاور کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ خاصی خوش شکل تھی، ویسے بھی جوانی کا اپنا ہی حسن ہوتا ہے۔ پہلی ہی نگاہ میں وہ مجھے راجستانی لگی تھی۔ کیونکہ اس کے چہرے مہرے، نقوش اور انداز میں وہاں کی چھاپ تھی۔

''یہاں ویرانے میں کیوں بلا لیا؟'' لڑکی نے ہلکا سا ناک چڑھا کر نخرے سے کہا تو بختاور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''بڑا بھائی آیا ہے لاہور سے، اسے خوش کرنا ہے، بڑا اداس ہے آج۔''

اس نے غور سے میری طرف دیکھا، پھر سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ کہیں علی زین تو نہیں ہے؟''

''ہاں ہے تو وہی، تمہیں کیسے پتا؟'' بختاور نے حیرت سے پوچھا۔

''ردھی بڑی تعریف کرتی ہے، اسے تو میں خوش کر دوں گی۔ میرے ہوتے ہوئے اداسی کیوں؟ اگر اداسی رہ جائے تو واشانہ کہنا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ وہ جب بولی تھی تو اس کی بات اور لہجے سے اور پھر نام سے یقین ہو گیا کہ وہ لازمی راجستان ہی سے ہے۔ تبھی میں نے پوچھ لیا۔

''راجستان سے ہو کیا؟''

''ہاں نا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔

''ارے یار تم اس کا رقص دیکھنا، اس نے پوری روہی میں دھوم مچادی ہے، پاگل کر دیا ہے لوگوں کو۔'' بختاور نے کہا تو میں مسکرا دیا۔

اس کے ساتھ آئے لوگ اپنے اپنے ساز لے کر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنی گرد لپیٹی ہوئی چادر اتار دی۔ اس نے بڑا مختصر گھاگرا اور اس سے بھی مختصر چولی پہنی ہوئی تھی۔ ساز بجنے لگا تو وہ تھرکنے لگی۔ مجھے راجستھان یاد آنے لگا، خاص طور پر جے پور کے ہوٹل جہاں ہر رات ایسے ہی رقص کا اہتمام ہوتا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پسینے سے بھیگ گئی لیکن اس کی جولانی میں کوئی کمی نہیں آئی۔

دو گھنٹے تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گئی۔ وہ ریت پر بیٹھی تو اس کا سانس کا زیر و بم قیامت ڈھانے لگا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جتنے روپے جیب میں تھے سارے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے نوٹوں کی طرف دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔

''نہیں، آپ سے نہیں لینے۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ میرا اور بختاور کا معاملہ ہے۔ اور پھر آپ، آپ سے کیا۔'' اس نے ایک خاص ادا سے کہا اور اپنے بکھرے بال سمیٹنے لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اچانک مجھے خیال آیا۔ تبھی میں نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

''صبح ملو گی؟''

''آپ کہتے ہیں تو ابھی بھی نہیں جاتی، صبح کہو تو.....''

اس نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا جیسے اسے گمان ہو کہ اس نے اپنے حسن کے زور پر کافی کچھ فتح کر لیا ہے۔

''اب یہ تمہاری مرضی ہے واشنا، کل ملو تو گوپے میں آجانا، ادھر ہی ہوں گا، کل صبح ہوتے آجانا۔''

''جی آجاؤں گی۔'' اس نے نرم سی مسکان کے ساتھ کہا تو میں نے نوٹ اس کی چولی میں رکھ دیے۔ اس نے ایک قاتل ادا سے دیکھا اور اٹھ گئی۔ اس کے سازندے بھی اٹھ گئے۔ ہم چہل قدمی والے انداز میں ٹیلے سے اتر آئے۔ تھوڑا سا پیدل چلنے کے بعد بختاور نے پوچھا۔

''علی زین، تجھے یہ واشنا اچھی لگی ہے؟''

''تیری اگر محبوبہ ہے تو پھر نہیں لگی۔'' میں نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ زمان کا قہقہہ بھی نہ رک سکا۔

''او نہیں، بس اس کا رقص تھوڑا اچھا ہے، راجستھان کی یاد دلا دیتا ہے ورنہ، یہ کوئی اتنی اہم نہیں۔'' اس نے بے پروا انداز میں کہا تو میں نے کہا۔

''چل چھوڑ، یہ بتاؤ، یہاں کوئی سیکیورٹی بھی رکھتے ہو یا.....'' یہ پوچھتے ہوئے میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہے نا، بہت سارے لڑکے میں نے تیار کر لیے ہیں، اب کوئی پروا نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور پھر بتاتے لگا کہ کیسے لڑکے تیار کیے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم ڈیرے تک آگئے۔ زمان موبل اپنے گھر جانا چاہتا تھا، اسی وقت بختاور بھی جانے کو تیار ہو گیا۔ وہ دونوں چلے گئے۔ میں ڈیرے سے رہائشی حصے کی جانب چلا گیا، جہاں ساوری چند عورتوں میں گھری باتیں کر رہی تھی۔ میں نے سانول کو اپنے پاس بلایا اور اسے سمجھایا کہ ہر طرح کا خیال رکھے، کوئی بھی دشمن کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس نے میری بات سمجھ لی تو میں جا کر سو گیا۔

☆☆☆

رات بے چینی ہی میں کٹی تھی یوں جیسے نیند اجنبی ہو گئی ہو۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن اچانک اترنے والے خیالوں اور ذہن میں کلبلاتی ہوئی سوچوں نے اضطراب والی کیفیت بنا دی تھی۔ چڑیوں کے چہکنے کے ساتھ ہی میں باہر صحن میں آگیا۔ رحماں اپنے معمول کے کاموں میں مشغول تھی جبکہ ساوری کچن کے باہر چولہے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت عرصے بعد میں نے اسے یوں دیکھا تھا۔ میں اس وقت تیار ہو کر ناشتا کر چکا تھا جب بختاور آگیا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھا چائے پیتا رہا۔ پھر ہم دونوں اٹھ کر گوپے کی طرف چل دیے۔

گوپے پر سناٹا اُترا ہوا تھا۔ بختاور نے گاڑی روکی تو لگا جیسے زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہوں۔ صحن میں اچھی خاصی دھوپ تھی، میں اندر جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بختاور کسی کو فون کرنے لگا۔ وہ فون کر چکا تو میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کچھ لڑکوں کو بلایا ہے، آج دوپہر کا کھانا یہیں کھائیں گے، ایک ہرن پکڑا ہے، وہی بناتے ہیں۔''

''بختاور، اب سن میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سکون سے کہا اور ساری رُوداد سنا دی۔

''اچھا تو ان کے نام ہیں مگھن بھیل اور گومتی..... مجھے پہلے بتاتے میں اب تک انہیں تلاش کر چکا ہوتا۔'' اس نے تشویش سے کہا۔

''نہیں، اصل بات یہ نہیں ہے کہ انہیں تلاش کیا جائے، وہ تو میں لاہور بیٹھا، انہیں تلاش کر سکتا تھا، تمہیں کہتا، تم ایک دو

دن میں انہیں تلاش کر لیتے، لیکن اُن کے پیچھے کون ہے، مجھے وہ بندہ چاہیے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''ہاں..... یہ ہے اصل بات، میں انہیں تلاش کر کے پکڑ بھی لیتا تو اصل بندے نے چھپ جانا تھا۔''

''یہ سب غیر محسوس انداز میں کرنا ہے، جیسے ہمیں پتا ہی نہیں۔'' میں نے اسے سمجھایا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ مجھے لگا اسے حالات کی گمبھیرتا کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سوچتا ہوا اٹھ کر باہر کی جانب گیا اور کسی سے فون پر بات کرنے لگا۔ ایسے میں باہر ایک گاڑی رکی۔ اس میں سے چند لوگ نکلے، پھر ایک ایک کر کے انہوں نے ساز باہر نکالے، آخر میں واشا باہر آ گئی۔ اس نے ویسی ہی بڑی سی چادر لی ہوئی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ واشا سمیت وہ چار بندے تھے اور ہم صرف دو۔ بختاور باہر تھا اور میں اندر بیٹھا ہوا تھا۔ ان تینوں سازندوں نے اپنے ساز کپڑوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ ممکن ہے ان میں کوئی ہتھیار ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، مجھے یوں نہیں آنا چاہیے تھا، اگر ایسا کوئی ماحول بن بھی جاتا تو کچھ لوگ کم از کم یہاں ہوتے۔ میں نے اپنا پسٹل چیک کیا اور اوٹ میں ہو گیا۔ بختاور فون کال کر رہا تھا، اس نے انہیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ وہیں ٹھہر گئے۔ انہیں شاید سمجھ نہیں آئی تھی یا پھر وہ محتاط تھے یا بختاور سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ بختاور نے جب انہیں یوں دیکھا تو اپنی کال ختم کر کے ان سے پوچھا۔

''کیا بات ہے، اندر کیوں نہیں جاتے ہو؟''

''علی بابو آیا ہے؟'' واشا نے پوچھا۔

''ہاں ہاں، وہ اندر ہی ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا تو مجھے اس پر بہت غصہ آیا، وہ سب اندر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تبھی میں نے اندر سے اونچی آواز میں کہا۔

''صرف واشا اندر آئے باقی باہر ہی بیٹھیں۔''

میری آواز پر انہوں نے کوپے کے اندر کی سمت دیکھا، وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، جبکہ واشا نے بختاور کی طرف دیکھا، اس نے اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ حشر ساماں لڑکی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ تبھی میں نے کہا۔

''میں نے تمہیں اس وقت یہاں رقص کے لیے نہیں بلایا، بلکہ صرف باتیں کرنے کے لیے یہاں تنہائی میں بلایا ہے۔''

''وہ تو میں آ گئی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن یہ ساز نے نہیں چاہئیں۔ انہیں کہو، واپس چلے جائیں، اگر تم میرے ساتھ یہاں تنہائی میں کچھ وقت گزارنا چاہو تو؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے چند لمحے سوچا پھر بولی۔

''وہ تب تک باہر بیٹھ کر انتظار کر لیں تو.....؟''

''نہیں انہیں کہو جائیں اور اگر تم جانا چاہتی ہو تو انہی کے ساتھ چلی جاؤ، ہاں ایک آدھ گھنٹے بعد آ کر تمہیں لے جائیں۔'' میں نے سختی سے کہا تو وہ باہر کی جانب چلی گئی۔

میں دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ اس نے باہر جا کر یہی بات کی۔ میں نے دیکھا، بختاور کا چہرہ تن گیا۔ وہ سازندے اسی کشمکش میں تھے کہ وہ واشا کو چھوڑ کر جائیں یا نہیں۔ اتنے میں دو گاڑیاں باہر رکیں، ان میں سے سات آٹھ لڑکے اتر آئے۔ وہ سب ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔ میں گوپے سے نکل آیا۔

''ان تینوں کی تلاشی لو۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔

انہوں نے لمحوں میں اپنے ہتھیار نکال لیے اور ان تینوں کی تلاشی شروع کر دی۔ ان کے پاس سے ایک بلیڈ کے نام پر بھی کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ مجھے تسلی ہو گئی اور میں نے انہیں باہر ہی بیٹھنے کو کہا۔ واشا اندر آ گئی۔ اس نے آتے ہی خود پر اوڑھی ہوئی چادر اتار کر چارپائی پر رکھ دی۔ وہی مختصر سا گہرے نیلے رنگ کا گھاگھرا اور نام نہاد سی چولی۔ اس کا تراشا ہوا بدن میرے سامنے تھا۔

''سامنے چارپائی پر بیٹھو۔''

''اپنے پاس نہیں بٹھاؤ گے؟'' اس نے ہلکی سی مسکان سے پوچھا۔

''نہیں، جو تم لوگ سمجھ رہے ہو، وہ میں کچھ نہیں چاہتا، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں، بیٹھو۔'' میں نے تھوڑا سختی سے کہا تو وہ حیرت زدہ سی سامنے بیٹھ گئی۔ میں نے اپنا پسٹل ہاتھ میں لیا اور بڑے سکون سے چارپائی پر بیٹھا اور سرد سے لہجے میں کہا۔

''جو پوچھوں، اس کا جواب سچ دینا، غلط جواب تمہیں موت سے بھی ہمکنار کر سکتا ہے۔''

''جو پوچھو، سچ بتاؤں گی۔'' اس نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا۔

''تم گومتی ہو؟'' میں نے ایک دم سے پوچھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے چہرے پر سے سب کچھ واضح ہو سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، جیسے یقین نہ کر پا رہی ہو۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں سمجھ پا رہی تم کیا کہہ رہے ہو، میں واشنا ہوں۔'' اس نے کہا تو اس کے لہجے میں کافی حد تک احتجاج تھا۔ میں نے اپنا فون نکالا اور ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے کردی۔

وہ تصویر دراصل گومتی ہی کی تھی، جس میں اُس نے گرے رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی، بال کھلے ہوئے تھے، ناک میں ہلکی سی نتھلی تھی۔ جس وقت میں لاہور سے نکلنے لگا تھا، پوجا نے مجھے وہ تصویریں بھیجی تھیں۔ رات جب میں نے واشنا کو دیکھا تو مجھے شک ہوا، نقوش تو یہی کہانی سنا رہے تھے، تصدیق کے لیے میں نے اگلے دن کی صبح اسے گوپے پر بلایا تھا۔ یہاں آتے ہی ہوش آیا کہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ لڑکے آگئے۔ اس دوران بختاور اندر آکر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ واشنا اس تصویر کو دیکھنے کے بعد میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی اور میں اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔

''کہاں سے ملی ہے یہ تصویر؟'' اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم کیا سمجھتی ہو، یہ بتا دینا اتنا ہی آسان ہے؟'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا تو اس نے پوچھا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''مطلب تم نے مان لیا کہ تم واشنا نہیں، گومتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم مجھ تک پہنچ جاؤ گے لیکن اتنی جلدی اس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔'' اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''کیا ٹاسک لے کر آئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ میری نقل اتارتے ہوئے بولی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، یہ بتا دینا اتنا ہی آسان ہے؟''

''مجھے مشکل کام کرنا اچھا لگتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آزمالو۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو مجھے ایک دم ہی سے غصہ آگیا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر اٹھایا، دوسرا ہاتھ اس کی کمر پر رکھا اور اسے گوپے کی دیوار کے ساتھ دے مارا۔ ہلکے سے دھماکے کے ساتھ وہ دیوار سے لگ کر نیچے گر گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اب کم از کم دس منٹ تک تو اٹھ نہیں سکتی، کوئی نہ کوئی ہڈی تو ٹوٹ ہی چکی ہوگی لیکن میں حیران ہوا جب وہ اگلے چند لمحوں میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس وقت تک میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''بولوگی یا.....'' میں نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہی تھا کہ اس نے مجھے اپنی گرفت میں لینا چاہا، مجھے احساس تھا کہ اتنی جلدی کوئی تربیت یافتہ ہی اٹھ سکتا ہے۔ میں محتاط تھا اس لیے جو داؤ اس نے آزمایا تھا، میں سمجھ چکا تھا، میں نے اسے جھٹکا اور پھر اسے پکڑ کر اچھال دیا، وہ دور فرش پر جا گری۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے ٹھوکر مارتا، اس نے اپنا ہاتھ یوں اوپر اٹھا دیا جیسے کوئی ریسلر اپنی ہار کا اعلان کر رہا ہو۔

''بتاتی ہوں، اگر تم یقین کرو تو.....''

''تم کہو، یقین کرنا نہ کرنا میرا کام ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ وہیں کچے فرش پر بیٹھ گئی، چند لمبے سانس لے کر بولی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم راجھستان ہی سے آئے ہیں۔ یہی کہ ہم محبت کرتے ہیں، شادی کرنا چاہتے ہیں اور بھاگ کر یہاں آگئے۔ ہمارا ابھی تک کوئی ٹاسک نہیں ہے سوائے ایک شخص کی مدد کرنے کے اور وہ ہے سردار نور حیات.....''

''اس نے کوئی مدد مانگی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اس نے چند لوگوں کو ختم کرنے کا کہا ہے، اس کے عوض وہ ہمیں لاہور میں رہنے کو گھر دے گا اور ہمارا سارا خرچ برداشت کرے گا۔'' اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

''لاہور میں کیا کرنا ہے؟''

''ہمیں جو کہا جاتا، وہی کرنا ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''مگھن بھیل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہیں کہیں ہوگا، مطلب روہی میں ہی کہیں، شاید سردار نور کے پاس، اس کا میرے ساتھ صرف فون پر رابطہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اور یہ سازندے.....؟'' میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔

''یہ تو یہیں کے ہیں، ان کو تو پتا ہی نہیں۔ یہ روھی نے دیے تھے۔ اسی کے پاس رہتی ہوں نا۔''

''اور روھی، وہ؟'' میں نے پوچھا تو بختاور بولا۔

''اسے بھی نہیں پتا ہوگا، یہ اور مگھن، دونوں سرحد پار کر کے یہاں ایک قبیلے میں آئے تھے، انہوں نے یہی بتایا کہ وہ بھاگ کر آئے شادی کی اور اب زندگی بچانے کے لیے یہاں آگئے ہیں۔ مجھ سے بھی ملے تو میں نے اسے روھی کے پاس

چھوڑا تا کہ یہ کمائے کھائے۔"

"اوہ..... مطلب گھر کے لوگوں تک آن پہنچے ہیں۔"

میں نے سر سراتے ہوئے کہا، مجھے ان کی سمجھ آ گئی تھی۔ سبھی میں نے گومتی سے کہا۔

"دیکھ، تم لوگوں کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ تم لوگ لاہور جا سکو، اب میرے پاس تمہارے لیے صرف تین آپشن ہیں۔ مر جاؤ، جیل چلی جاؤ یا واپس پلٹ جاؤ، بولو کیا چاہتی ہو؟"

میرے یوں کہنے پر گومتی نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر یوں چارپائی پر ڈھیر ہوئی جیسے اس کی ہمت ہی ٹوٹ گئی ہو۔ اس نے رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جیسا تم چاہو۔"

او کے۔" میں نے کہا اور پھر بختاور کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ یہاں جس قبیلے کے پاس آئی ہے، اس کے بڑے سے بات کراؤ۔"

بختاور میری بات سمجھ گیا تھا۔ اس نے فوراً فون نکالا اور کال کرنے لگا۔ میں بھی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ رابطہ ہو جانے پر اس نے گومتی کے پکڑے جانے کی بابت بتایا اور پھر فون مجھ دے دیا۔

"ہاں اب کیا کہتے ہو؟"

"معاف کر دو بھائیا جی، مجھے کہاں معلوم تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن مجرم تم بن گئے ہو۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"کوئی معافی بھائیا جی۔" اس نے آخری بات کہہ دی۔

"صرف ایک صورت میں، اپنے اس مگھسن بھیل سے کہو، سردار نور حیات کو مارے، اور یہاں سے فوراً واپس راجھستان پلٹ جائے۔ اس سے تم بھی بچ جاؤ گے، تمہارا قبیلہ بھی....."

دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ میں نے بات ہی بہت بڑی کر دی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ جانی چاہیے تھی، ورنہ ان کے لیے بہت بڑا نقصان تھا، کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"اور اگر ان کی طرف سے ردِعمل میں جو ہمارا نقصان....."

"میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔ صاف کہہ دینا کہ میں نے کہا تھا۔" میں نے واضح انداز میں کہا تو وہ دبے دبے جوش میں بولا۔

"ٹھیک ہے بھائیا..... تمہیں جلدی خبر مل جائے گی۔"

"تب تک یہ گومتی میرے پاس ہے۔" میں نے کہا اور فون واپس بختاور کو تھما دیا۔ اس نے کال بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ کھانا بن گیا تھا۔ سبھی گوپے کے اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سازندوں کے ساتھ گومتی کو باندھ کر ایک کونے میں بٹھایا ہوا تھا تا کہ انہیں یہ احساس رہے کہ وہ قیدی ہیں۔ اس وقت ہم کھانا شروع کرنے لگے تھے جب بختاور کا فون بجا۔ اس نے سنا تو اس کا چہرہ کھل گیا۔ فون بند کرتے ہوئے بولا۔

"نور حیات اگلے جہان پہنچ گیا۔"

"تصدیق کر، پھر ان لوگوں کو چھوڑ دے۔" میں نے کہا اور کھانا کھانے لگا۔ وہ مختلف جگہ فون کرنے لگا۔ جب تک میں نے کھانا کھایا، وہ تصدیق کر چکا تھا۔ اس نے گومتی اور سازندوں کو چھوڑ دیا۔ وہ لوگ جب جانے لگے تو گومتی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہوں میں خوف اور حیرت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑی رہی، پھر باہر کی جانب چل دی۔

☆☆☆

بستی چراغ دین میں ایک سکون اتر آیا تھا۔ مجھے لگا جیسے روہی میں ہر طرف سکون پھیل گیا ہو۔ میرا آخری دشمن بھی ختم ہو چکا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی اور میں ڈیرے میں بیٹھا یہی محسوس کر رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ دوسری جانب چاچا عبدالمجید تھے۔ میرے ہیلو کہنے پر بولے۔

"اب تم یہاں روہی میں ہی رہنا، ابھی واپس نہیں آنا۔ مزید بتاؤں گا یہاں رہ کر تم کو کرنا کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سعادت مندی سے کہا تو انہوں نے فون بند کر دیا۔ جیسے ہی میں نے فون بند کیا، شہباز کا فون آ گیا۔ میری آواز سنتے ہی بولا۔

"او ماما، میں نے تو سوچا تھا کہ یورپ، امریکا، آسٹریلیا جائیں گے رہنے کے لیے، وہیں کا موسم انجوائے کریں گے، اب رہو گے ناصحرا میں۔ میری مانتا تو اچھا نہ رہتا۔"

"یہ ریت، یہ صحرا، یہ روہی میری ہے، جنم بھومی ماں کی طرح ہوتی ہے، مجھے یہاں رہنے میں کوئی دقت نہیں۔"

"او ماما، میں تمہارے لیے نہیں کہہ رہا، مجھے بھی تمہارے ساتھ رہنا ہے، میں اور شانزے آ رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میرا قہقہہ فضا میں بلند ہو گیا۔

ممتا

محمد سلیم کرد

کچھ واقعات بڑے عجیب طرح رونما ہوتے ہیں... جس کے نتیجے میں انسان مجبور و بے بس ہو کر رہ جاتا ہے... ایک شخص کا ماجرا جو اچانک ہی ایک افتاد کا شکار ہو گیا... گھنا جنگل اور شکاری بھیڑیے اس کی بو سونگھ رہے تھے... اس مشکل صورت حال میں اسے مدد کی شدید ضرورت تھی اور پھر اسے ایک مددگار مل گیا...

دل کی آنکھوں سے پڑھی جانے والی ایک دل گداز تحریر.....

سورج پہاڑوں کے درمیان ڈوبا جا رہا تھا۔ دور سے آتی ہوئی بھیڑیوں کی صدائیں جنگل کے سناٹے کو پُرہول بنا رہی تھیں۔ امجد کو اپنی کوتاہی پر تاؤ آ رہا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ اٹھتے قدموں میں مزید تیزی لانے کی سعی کر رہا تھا تاکہ اپنی جیپ تک جلد پہنچ پائے، جس میں اس کی سیٹی آٹومیٹک رائفل بھی پڑی ہوئی تھی جسے وہ اپنی کوتاہی اور سستی کی وجہ سے اپنے ساتھ رکھنے کے بجائے جیپ میں چھوڑ آیا تھا۔

اس کے دوستوں نے اسے خبردار کیا تھا کہ اب کبھی بھی جنگل کے دور اُفتادہ حصے کی طرف نکلو گے تو ہمہ وقت مستعد اور مسلح رہنا بے حد ضروری ہے کیونکہ جنگل کے.... اس حصے پر خونخوار بھیڑیوں کا غول پائے جانے کی اطلاعات ہیں۔

امجد کوئی شکاری نہ تھا۔ وہ رائفل صرف اپنی حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھا کرتا تھا۔ شہر کی ہنگامہ خیز زندگی سے جب بھی اس کا دل گھبراتا، وہ سکون کی تلاش میں اکیلا جنگلوں کا رخ کرتا تھا۔ اس دفعہ وہ کافی عرصے بعد جنگل کے اس دشوار حصے کی طرف آنکلا تھا۔

''شاید بھیڑیوں نے میری بو سونگھ لی ہے اور اس ٹھٹھرتی سردی میں ان کی بھوک خوب چمک اٹھی ہے اور میری بھی غفلت تو دیکھو..... رائفل جیپ میں چھوڑ کر خود ویرانے میں نہتا پھر رہا ہوں، حالانکہ دوستوں نے مجھے خطرے سے بھی خبردار کیا تھا۔'' وہ کف افسوس ملنے لگا۔

بھیڑیوں کے بولنے کی آواز لحہ بہ لحہ قریب تر ہوتی سنائی دے رہی تھی۔ اس وقت وہ ایک گھاٹی میں سے گزر رہا تھا۔ جیپ تک پہنچنے میں اسے اندازاً دس سے پندرہ منٹ کا سفر درکار تھا کہ اسے ایک طرف پتھریلی زمین پر دوڑنے کی چاپ سنائی دی۔ امجد نے آواز کے تعاقب میں نگاہیں اٹھائیں مگر چٹانوں کے پار کچھ نظر آنا کہاں ممکن تھا۔ اسے مصمم یقین تھا کہ بھوکے بھیڑیے اپنے شکار کی بُو کے تعاقب میں آرہے ہیں۔ اس کا دل یکبارگی دھڑکا اور دوسرے لمحے وہ تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ غرانے اور دوڑنے کی آوازیں اب اسے اپنے عقب میں آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ اسے لگا کہ جیپ تک پہنچنے سے پہلے بھیڑیوں کا یہ خطرناک غول اسے آلے گا۔ اسے سامنے صنوبر کے وہ دونوں پیڑ بھی ایستادہ نظر آئے جن سے کچھ فاصلے پر موجود ایک دیوہیکل پتھر کی آڑ میں اس کی جیپ کھڑی تھی۔ امجد کی کوشش تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنی جیپ تک جا پہنچے۔ اپنے عقب میں دوڑنے کی آوازیں اب قریب ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ خوف و دہشت سے اس کے پورے جسم میں ایک سرد لہر دوڑنے لگی اور دوڑتے ہوئے جبلی طور پر اس کی گردن پیچھے کی طرف گھوم گئی۔ پیچھے کا منظر خوفناک تھا مگر یہ دیکھ کر اسے قدرے طمانیت کا احساس ہوا کہ دوڑنے کی وہ آوازیں جو وہ اپنے قریب محسوس کر رہا تھا، وہ ایک درمیانی جسامت والی بندریا کی تھیں جو اپنے بچے کو اپنی پیٹھ پر بٹھائے چاروں ہاتھوں پیروں پر چھلانگیں مارتی ہوئی خطرناک بھیڑیوں کے غول سے بھاگتی چلی آرہی تھی۔ امجد کا واپس گردن گھما کر سامنے دیکھنے کی دیر تھی کہ بندریا آندھی اور طوفان کی طرح اس کے پاس سے ہوتی ہوئی گزری اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پہلے سامنے آنے والے صنوبر کے درخت پر چڑھنے لگی لیکن اس کے چڑھنے کے انداز میں وہ پھرتی نظر نہیں آرہی تھی جو بندر جیسے پھرتیلے جانور کا خاصہ ہوتی ہے۔ پیٹھ پر بچہ سنبھالے بندریا کسی طرح پیڑ پر چڑھ گئی اور شاخوں کے درمیان چھپ گئی۔ یہ دیکھ کر امجد کا دھیان جیپ سے ہٹ کر درخت پر ٹھہر گیا۔ بھیڑیوں کا شکار بننے سے فوری طور پر بچنے کے لیے اس سے بہتر اور محفوظ پناہ گاہ اور کوئی نہ تھی۔

امجد کو اچھی طرح اندازہ تھا بندریا کا اپنے بچے کے ساتھ پیڑ پر پناہ لینے کے بعد اب بھیڑیوں کی ساری توجہ اسے پکڑ کر چیر پھاڑ کر کھانے پر مرکوز ہے اور جیپ تک اس کا صحیح سلامت پہنچ پانا قطعاً ناممکن ہے بہ نسبت پہلے سامنے آنے والے پیڑ کے جس پر بندریا اپنے بچے کے ساتھ پناہ لیے بیٹھی تھی۔ امجد طوفانی قدموں کے ساتھ ہانپتا ہوا بالآخر مطلوبہ درخت تک آپہنچا۔ زندگی اور موت کے درمیان محض چند سیکنڈز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ سستی اور تاخیر خطرناک بھیڑیوں کا نوالہ بنا سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے امجد صنوبر کے پیڑ کا جسم تنا پکڑ کر بڑی تیزی کے ساتھ بلندی کی طرف بڑھنے لگا۔ درخت کی چوٹی پر موجود بندریا امجد کو بلندی کی طرف آتا دیکھ کر ڈر کے مارے خوخیانے لگی مگر امجد پر بندریا کے کسی ردِعمل سے زیادہ بھیڑیوں کے حملے کا خوف طاری تھا، وہ بندریا کی ناراضگی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جب قدرے بلندیوں پر آپہنچا تو عین اسی وقت مشتعل بھیڑیوں کا جھنڈ بھی درخت تلے آدھمکا اور پیڑ کی مزید بلندیوں کی طرف بڑھتے ہوئے امجد کو دبوچ کر نیچے گرانے کی سعی لاحاصل میں اونچی چھلانگیں مارنے لگا۔

سورج غروب ہو چکا تھا مگر مشرقی اُفق پر موجود اوائل کی تاریخوں کے چاند کی روشنی میں قدرے تیزی دیکھنے میں آرہی تھی۔ شاخوں کے درمیان چھن چھن کر آنے والی ہلکی چاندنی میں امجد کو پیڑ پر چڑھنے میں دشواری پیش نہیں آرہی تھی، وہ جلد خاصی بلندی پر آگیا اور ایک مضبوط شاخ کا انتخاب کر کے اس پر بیٹھ گیا۔ بندریا اپنے بچے کو سنبھالے اس سے کچھ اوپر والی ایک شاخ پر بیٹھی بے چینی کے ساتھ خوخیا رہی تھی لیکن امجد کو شاخ پر بیٹھا دیکھ کر اس کی بے چینی میں کمی آنے لگی اور آخر وہ پُرسکون اور خاموش ہوگئی۔ امجد کو

اس طرح اس کے ردِعمل کے اظہار کا درست اندازہ تھا بھیڑیوں سے خوف زدہ بندریا کچھ دیر پہلے امجد کی مداخلت کو خطرہ سمجھ رہی تھی جب امجد اس سے کچھ نیچے والی ایک شاخ پر خاموشی سے آبیٹھا تو یہ دیکھ کر وہ مطمئن ہوگئی۔ شاید اسے امجد کی بے بسی کا ادراک ہوا تھا لیکن نیچے موجود بھیڑیوں نے گویا آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ اب بڑے غصیلے انداز میں تھوتنی درخت کی بلندیوں کی طرف اٹھا اٹھا کر چلا رہے تھے اور تنے کے اردگرد بڑی بے قراری کے ساتھ چکر کاٹ رہے تھے۔ بکھرتی ہوئی چاندنی میں امجد کو بھیڑیوں کی تعداد کا اندازہ ہوگیا۔ جھنڈ لگ بھگ پندرہ سے سولہ بھیڑیوں پر مشتمل تھا۔ نیچے اتنے سارے بھیڑیوں کی موجودگی کا احساس روح فرسا تھا۔ امجد کی نگاہیں بھیڑیوں سے ہٹ کر پیڑ کی بلندیوں سے دیوہیکل پتھر کے پار ٹھہر گئیں جہاں اس کی جیپ ٹھہرتی چاندنی میں کھڑی نظر آرہی تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ خوفناک بھیڑیوں کے گھیرے میں لیے ہوئے صنوبر کے پیڑ پر نہتی حالت میں موجود ہے اور اس کی رائفل بھری ہوئی حالت میں جیپ میں بیکار پڑی ہے، بے بسی کے عالم میں اس نے اپنی ہتھیلی پر ایک زور کا مُکا جڑ دیا اور نگاہ اٹھا کر بندریا اور بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ بندریا نے اپنے سفید دانت امجد کی طرف نکالے اور اپنے کندھے پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ننھے منے بچے کو کندھے سے اتار کر اپنی چھاتی سے لگالیا اور بچہ ہنسی سے مشابہ آوازیں اپنے منہ سے خارج کرنے لگا، امجد کو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے ماں اور بچہ دونوں اس کی بے بسی پر تمسخر اُڑا رہے ہوں۔

امجد ایک دفعہ پھر نیچے کی طرف متوجہ ہوگیا جہاں سے بدستور بھیڑیوں کی دل شگاف آوازیں آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔

''لگتا ہے یہ ہمیں چھوڑنے والے نہیں۔'' امجد خودکلامی کے انداز میں بولا پھر بھی وہ دل میں بھیڑیوں کے ٹل جانے کی موہوم سی امید لیے بیٹھا رہا، امجد کے لیے وقت جیسے چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا اور اسے اب سردی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ امجد کو بھیڑیوں کے بارے میں بھی کچھ عام نوعیت کی معلومات تھیں۔ بھیڑیے ہمیشہ جھنڈ کی صورت میں حملہ کرتے ہیں اور تب حملہ کرتے ہیں جب وہ بھوکے ہوں، شکم سیر بھیڑیے کبھی مویشیوں کے ریوڑ پر نگاہ تک نہیں ڈالتے اور یہ عموماً انسانوں پر خال خال حملہ کرتے ہیں یعنی یہ انسانوں پر زیادہ تر اس وقت حملہ کرتے ہیں جب انہیں اپنی بھوک مٹانے کے لیے اور کوئی شکار دستیاب نہ ہو اور اس وقت جو صورتِ حال بنی تھی، وہ بے حد نازک تھی۔

''ارے تم ایک بندریا ہو..... چھلانگیں مار کر یہاں سے اپنے بچے کے ساتھ نکل سکتی ہو، میری طرح آخر تم کیوں اس طرح بے بسی کی تصویر پیش کر رہی ہو۔'' امجد بندریا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا مگر بندریا کی طرف سے کسی ردِعمل کا اظہار سامنے نہیں آیا۔

''جب..... تم..... اپنے بچے کے..... ساتھ..... یہاں..... سے نکلو گی..... تو بھیڑیے بھی..... تمہارے..... پیچھے..... لپکیں گے..... اور اس طرح..... مجھے بھی..... اپنی جیپ تک..... پہنچ کر..... اپنی رائفل..... سنبھالنے کا موقع ملے گا۔'' لفظوں پر زور دیتے ہوئے امجد نے بندریا کی طرف دیکھ کر سمجھانے والے انداز میں فقرہ مکمل کیا۔ اس دفعہ بھی بندریا کی طرف سے کسی بھی جیسی آوازیں سنائی دیں۔

''تم میرا مذاق کیوں اُڑا رہی ہو، میں درست بول رہا ہوں۔'' امجد نے کہا۔ شاخ پر..... سنبھل کر ایک جگہ بیٹھنے سے امجد کے پٹھے اکڑ سے گئے تھے۔ جسم کو آرام دینے کی غرض سے وہ شاخ پر قدرے آگے کی طرف کھسکا۔ پیڑ کے نیچے بھیڑیے بدستور بے چینی کی صورت لیے موجود تھے مگر اب ان کی وحشیانہ چیخ و پکار میں کمی آگئی تھی۔ آسمان پر چاند آہستہ آہستہ اپنا آخری سفر طے کر رہا تھا۔ اچانک امجد کو اپنے ہاتھ پر کسی مائع شے کے ٹپکنے کا احساس ہوا جیسے کوئی قطرہ پنجے کی پشت پر آگرا ہو..... شاخوں کے درمیان چھن چھن کر آنے والی چاندنی اب کمزور پڑتی جارہی تھی۔ کسی روشنی کی بنا ہاتھ پر پڑنے والے قطرے کا نظر آنا محال تھا۔ امجد نے اپنا قلیل فنکشن والا عام سیل فون بھی اس خیال کے تحت جیپ میں چھوڑا تھا کہ جب یہاں سروس دستیاب نہیں تو سیل فون جیب میں رکھنے کا فائدہ کیا۔ اب اس وقت امجد کو سیل فون کی ضرورت اس لیے محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اس کی ٹارچ کی روشنی میں بغیر کسی دشواری کے ہاتھ پر پڑنے والے قطرے کو دیکھ سکتا تھا۔

امجد نے پتلون کی جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور دیا سلائی جلا کر دیکھنے لگا۔

''اوہ..... یہ تو لہو کا قطرہ ہے۔'' وہ دیا سلائی کی لرزتی ہوئی روشنی میں اپنے ہاتھ پر خون کا سرخ دھبا پا کر حیرت سے بول اٹھا اور پھر بالائی شاخ پر موجود ماں اور بچے کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے لگا، عین اسی دوران لہو کا ایک اور سرخ دھبا اس کی سفید شرٹ کی آستین کو رنگین کر گیا۔ ''کون زخمی

ہے؟ ماں یا بچہ؟'' وہ بول اٹھا۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے بجھنے والی تیلی پھینک کر امجد نے دوسری تیلی سلگائی اور شاخ پر سنبھلتے ہوئے قدرے اوپر اٹھ کر دیا سلائی کی ڈگمگاتی روشنی ماں اور بچے پر ڈالی۔ بندریا اپنے قریب جلتی ہوئی ماچس کی تیلی دیکھ کر گھبرانے لگی لیکن امجد کو یہ دیکھنے کا صحیح موقع ضرور ملا کہ دونوں میں سے گھائل کون ہے۔

''ارے..... تم تو کافی زخمی ہو، لگتا ہے بھیڑیوں نے تم پر ایک بڑا خطرناک حملہ کیا ہوگا۔'' امجد بندریا کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر بولا جس کے پیٹ پر ہلکے بھورے بال خون سے لتھڑے ہوئے نظر آرہے تھے اور زخم سے اب بھی خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

''بھوکے بھیڑیوں نے ضرور تمہارے تازہ لہو کی بُو سونگھ لی ہے۔ اب وہ یہاں سے ٹلنے والے نہیں۔'' ایک بار پھر امجد بندریا سے مخاطب ہوا۔ دراصل لہو کے قطرے بندریا کے زخم سے خاصی دیر سے رس رہے تھے لیکن پہلے امجد ٹپکتے ہوئے قطروں کی زد میں آنے سے اس لیے بچا تھا کہ وہ شاخ پر زخم رسیدہ بندریا کی عین سیدھ میں موجود نہیں تھا۔ امجد وقفے وقفے سے دیا سلائی جلا کر اس کی ناتواں روشنی میں زخم خوردہ بندریا کا جائزہ لینے لگا۔ بندریا کے چہرے پر کمزوری کی جھلک نظر آرہی تھی، بچہ اب دوبارہ اس کے کندھے پر بے فکری کے ساتھ مچلتا ہوا نظر آرہا تھا۔ درخت پر چڑھتے وقت بندریا کی جو سستی امجد نے دیکھی تھی اب اس کی اصل وجہ اس کے سامنے آگئی تھی۔

''یہ بے چاری کافی زخمی نظر آرہی ہے اس لیے پیڑ پر میری طرح خاموش بیٹھنے پر مجبور ہے۔'' امجد دوبارہ اپنی جگہ پر آرام سے بیٹھتے ہوئے ترحم آمیز انداز میں سوچنے لگا۔

سردیوں کی یہ طویل رات جیسے گزرنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ چاند ڈوب چکا تھا اور نیچے موجود بھیڑیے بھی اب تنے کے گرد تاریکی میں بھیانک ہیولوں کی صورت میں خاموشی کے ساتھ بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔

''بڑی ڈھیٹ قسم کے ہیں یہ..... لگتا ہے کہ یہ صبح کی روشنی میں بھی ٹلنے والے نہیں۔'' امجد حقارت سے سوچنے لگا۔ وقت بڑی سست روی کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ درخت پر سنبھل سنبھل کر بیٹھنے سے امجد تھک چکا تھا۔ اب وہ نیچے شاخ پر بندریا کی سیدھ میں موجود نہیں تھا اس کی وجہ بندریا کے گھاؤ سے ٹپکتے لہو کے قطروں کی زد سے صرف بچا نہیں تھا بلکہ زیادہ یہ خدشہ لاحق تھا کہ ست پڑتی ہوئی زخم رسیدہ بندریا کہیں گرتے وقت اسے بھی اپنی زد میں لے کر پیڑ کے نیچے موجود بھیڑیوں کے جھنڈ کے درمیان نہ گرائے۔

صبح کی پہلی کرن نمودار ہوگئی۔ رفتہ رفتہ دن کا اُجالا پھیلنے لگا۔ مگر بھوکے بھیڑیے ٹلنے کے بجائے بڑی تندہی کے ساتھ پیڑ کے نیچے غراہٹ کے ساتھ ٹہلنے لگے۔ جیسے انہوں نے دن کی روشنی میں شکار کرنے کا تہیہ کرلیا ہو۔ امجد اپنی بقا کے خیالوں میں مستغرق تھا کہ اچانک پیڑ ہلنے جھلنے لگا، امجد نے نگاہ اوپر کی طرف اٹھائی۔

''ارے بے وقوف کیا کررہی ہو..... مجھے بھیڑیوں کے درمیان گرانا چاہتی ہو کیا؟'' ایک بلند شاخ سے بندریا کو جھولتا ہوا دیکھ کر امجد زور سے چیخا۔ شیر خوار بچہ اس کے کندھے پر نظر آرہا تھا۔ امجد کی ناراضگی پر بندریا خوخیانے لگی اور پھر شاخوں سے جھولتی ہوئی نیچے امجد والی شاخ پر آکر اس کے عین سامنے بیٹھ گئی۔ بندریا کی تیز سانسوں کی آوازیں امجد کو صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''کیا کرنا چاہتی ہو؟ بچے کو سنبھال کر جاؤ اپنی جگہ پر آرام کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔'' امجد نے تیزی کے ساتھ سانسیں لیتی ہوئی بندریا کو اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر خوف زدہ لہجے میں کہا۔ اسے خوف کے ساتھ بندریا سے گھن بھی آرہی تھی۔ وہ کچھ پیچھے کی طرف سرک گیا۔ زخم رسیدہ بندریا کی آنکھیں بوجھل نظر آرہی تھیں۔ اس نے اپنے بچے کو کندھے سے اتارا اور بڑی آہستگی کے ساتھ شاخ پر امجد کی طرف بڑھانے لگی۔ امجد کو اس کی یہ حرکت بڑی عجیب اور سمجھ سے بالاتر محسوس ہورہی تھی۔ وہ اپنی طرف بڑھتا ہوا بندریا کا بچہ دیکھ کر مزید پیچھے کی طرف سرکنے لگا لیکن عقب میں ٹہنیوں کی وجہ سے وہ زیادہ سرک نہ سکا۔ بندریا نے امجد کو کتراتا دیکھ کر اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ یہ دیکھ کر ایک لمحے کے لیے امجد کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ بے زبان مخلوق اپنی اس حرکت سے کچھ کہنے کی کوشش کررہی ہو اور اس کے نہ سمجھنے پر اب وہ اپنی آنکھیں موند کر افسوس کا اظہار کررہی ہو مگر بچہ اس وقت اپنی ماں کے ہاتھ سے نکل کر سیدھا امجد کی گود میں آپہنچا۔ بچے کے نیچے گرنے کے خدشے کے پیش نظر امجد نے بادلِ ناخواستہ بچے کو ہاتھ سے دبوچا۔ اس وقت بندریا اپنی آنکھیں واکر چکی تھی۔ یہ دیکھ کر بندریا کے چہرے پر جیسے اطمینان کی ایک لہر دوڑنے لگی اور پھر وہ اپنے منہ سے ایسی آوازیں خارج کرنے لگی جیسے اب وہ امجد کے اس عمل پر بے انتہا خوشی کا اظہار کررہی ہو۔ بچہ خاموشی کے ساتھ امجد کی گود میں بیٹھ گیا تھا۔ بندریا کے شور پر نیچے موجود بھیڑیوں

کے جھنڈ نے بھی وحشیانہ انداز میں چلّانا شروع کیا۔ بندریا خاموش ہو کر نیچے بھیڑیوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پھر وہ نگاہ اٹھا کر امجد کی آغوش میں بے خوفی کے ساتھ بیٹھے ہوئے اپنے بچّے کی طرف دیکھنے لگی۔ امجد کو اس کی بوجھل ہوتی ہوئی آنکھوں میں ممتا کی شفقت تیرتی ہوئی نظر آرہی تھی پھر وہ شاخ پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ امجد کو یہ سب کچھ عجیب اور حیرت انگیز لگ رہا تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی انوکھا خواب دیکھ رہا ہو۔ سردی کی وجہ سے بندریا کے زخم پر خون جم چکا تھا۔ اب اس کے لہو سے لتھڑے ہوئے بھورے بالوں سے لہو کے قطرے ٹپکنا بند ہو گئے تھے۔ ایک گہری نگاہ امجد پر ڈالنے کے بعد وہ نیچے کی طرف جھانکنے لگی، امجد کو اس کی نگاہوں کا مفہوم کچھ کچھ سمجھ آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں الوداعی تاثرات کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ صنوبر کی شاخوں پر سے جھولتی ہوئی نیچے چھلانگ لگا گئی۔ امجد کی گود میں بیٹھا ہوا ننھا منا بچہ اپنی ماں کو درخت سے نیچے چھلانگ لگاتا دیکھ کر شور مچا کر مچلنے لگا مگر امجد نے اسے اچھی طرح سنبھالا ہوا تھا۔ نیچے چھلانگ لگا کر زخم رسیدہ بندریا بھیڑیوں کے غول سے خاصے فاصلے پر جا گری تھی اور نیچے گرتے ہی وہ فوراً ایک طرف لپک گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پیچھے بھیڑیوں کا جھنڈ بھی غراتا ہوا لپکا۔ درخت کے نیچے اب ایک بھی بھیڑیا موجود نہیں تھا۔ اپنی جیپ تک پہنچنے کے لیے امجد کو راستہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ خوف سے مچلتے ہوئے بندریا کے بچے کو سنبھالتا ہوا صنوبر کے پیڑ سے نیچے اترنے لگا۔ اسے جنگل کے سناٹے میں گھائل بندریا کے پیچھے دوڑتے ہوئے بھوکے بھیڑیوں کی مہیب غراہٹ دور ہوتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی امجد بندریا کا بچہ اٹھائے نیچے زمین پر پہنچ گیا اور ہر طرف ایک نگاہ دوڑانے کے بعد چٹان کی اوٹ میں کھڑی اپنی جیپ کی طرف تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ آخر وہ اپنی جیپ تک آپہنچا۔ اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد اس نے جیپ کا دروازہ کھولا اور سہمے ہوئے بندریا کے بچے کو اس نے فوراً اندر نشست پر ڈالا اور اسی پھرتی کے ساتھ اپنی بھری ہوئی سیمی آٹومیٹک رائفل نشست سے اٹھا کر جیپ کا دروازہ بند کیا۔ اگرچہ اس تمام صورتِ حال سے بندریا کا بچہ خوف زدہ ضرور تھا لیکن بندگاڑی میں وہ محفوظ بھی تھا۔

امجد رائفل سنبھالتا ہوا اس طرف تیزی کے ساتھ قدم

طاہر جاوید مغل کے سحر انگیز قلم کا جادو

کانچ محل

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

حساس معاشرتی پہلوؤں پر ایک جراح کی نشتر کاری.....

رنگین و سنگین احساسات و جذبات کی جنگ اور

عبرت اثر انجام پر مشتمل ایک خوبصورت داستان

جولائی 2021ء سسپنس کے صفحات کی زینت

اٹھانے لگا جس طرف بھاگتی ہوئی زخم رسیدہ بندریا کے پیچھے بھیڑیوں کا جھنڈ لپکا تھا۔ ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ بھیڑیوں کی غراہٹ کی آوازیں بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ رائفل میں دس گولیاں لوڈ تھیں اور مزید فالتو گولیاں بھی امجد کے پاس تھیں۔ چند قدم چلنے کے بعد امجد نے اس خیال کے تحت ہوا میں دو فائر کیے کہ شاید فائر کی گونج سے بھیڑیے خوف زدہ ہو کر بندریا کا پیچھا چھوڑ دیں۔ فائر کی گونج سے جنگل کی پُرسکوت فضا لرز اٹھی تھی۔ امجد کو یہ بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ زخمی بندریا زیادہ دیر تک تیزی کے ساتھ دوڑ کر بھیڑیوں کے جھنڈ سے اپنی جان بچانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

امجد اندازے سے آگے کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔ وہ گھاٹی سے کافی دور نکل آیا۔ یخ بستہ صبح کی نرم اور نکھری دھوپ ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔ سوائے پرندوں کے کسی اور جاندار کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ اچانک جنگل کے سناٹے میں امجد کی سماعت سے بھنبھوڑنے سے مشابہ آوازیں ٹکرانے لگیں۔ امجد ہمہ تن گوش ہوا۔ ایک طرف دور سے آتی ہوئی آوازیں ہلکے انداز میں سنائی دے رہی تھیں، جنہیں سن کر امجد کی نگاہوں کے سامنے ایک ہولناک منظر گھوم رہا تھا۔ وہ بڑے چوکس انداز میں آواز کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا یوں یوں بھنبھوڑنے کی مہیب آوازیں بھی اسے قریب سے محسوس ہورہی تھیں۔ چند منٹ چلنے کے بعد اسے سامنے کچھ فاصلے پر واقع جھاڑیوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ چند ثانیوں بعد آخر وہ منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا جو اس کے تصور میں گردش کررہا تھا۔ بھیڑیے بندریا کی دعوت اُڑانے میں مصروف تھے۔ کوئی ران بھنبھوڑ رہا تھا کوئی پسلیوں کے پنجر میں تھوتھنی گھسائے گرم لہو اور نرم اعضا کے مزے اُڑا رہا تھا۔ یہ خونی نظارہ چند فرلانگ کے فاصلے پر صاف نظر آرہا تھا۔ امجد کو بندریا کی ایسی حالت دیکھ کر ترس آنے لگا اور بھیڑیوں کے لیے دل میں موجود نفرت سوا ہوگئی۔ مسلح امجد درخت پر پناہ لیے ہوئے نہتے امجد کی طرح اس وقت بھیڑیوں سے خوف زدہ بھی نہیں تھا۔ وہ دعوت اُڑاتے ہوئے جھنڈ میں ایک بھیڑیے پر نشانہ باندھنے لگا۔ اپنے شکار کو کھانے میں منہمک بھوکے بھیڑیے امجد کی آمد سے قطعاً بے خبر تھے۔ ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا، نشانے پر لیا ہوا بھیڑیا ایک زوردار دھماکے کے ساتھ دور جا گرا..... بندریا کی مزے کے ساتھ دعوت اُڑاتے ہوئے غول میں ایک دم افراتفری مچ گئی۔

امجد بڑی پھرتی کے ساتھ بھاگتے ہوئے جھنڈ پر گولیاں داغنے لگا۔ کچھ بھیڑیے یکے بعد دیگرے ڈھیر ہوتے گئے اور باقی اپنی جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ چند بھیڑیے مار گرانے کے بعد امجد کا پارا نیچے آگیا تھا۔ سامنے پڑی ہوئی بندریا کی باقیات پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے کے بعد امجد نے واپسی کی راہ لی۔ پیش آنے والی صورتِ حال سے امجد یہ نتیجہ اخذ کررہا تھا کہ درخت پر موجودگی کے وقت زخم رسیدہ بندریا کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کا زخم کسی بھی وقت اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے، وہ درخت پر بھیڑیوں کے ٹل جانے کی اندھی امید میں بیٹھے بیٹھے نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے نیچے گر کر بھیڑیوں کی خوراک بن سکتی تھی۔ اس نے بڑی آسانی کے ساتھ مفت میں بھیڑیوں کا ترنوالہ بننے کے بجائے قربانی کے جذبے سے سرشار ایک جرأت مندانہ قدم صحیح وقت پر اٹھایا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ ایک بے زبان جانور کے ذہن میں ایسے شعور کو بیدار کرنے میں ممتا کا جذبہ کارفرما تھا۔ امجد اس زاویے پر غور کرتا ہوا جیپ تک آپہنچا۔ اسے جیپ میں شور اور اودھم کی توقع تھی مگر جیپ کے اندر خاموشی تھی۔ یکبارگی ایک خیال سے اس کا دل زور سے دھڑکا اس نے بے چینی کے ساتھ جیپ کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکنے لگا۔ اندر ہلچل اور اودھم کے آثار نظر آرہے تھے مگر ہلچل مچانے والی ننھی سی جان فی الحال اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ امجد اضطراری کیفیت میں رائفل جیپ کی اگلی نشستوں پر رکھنے کے بعد خود اندر داخل ہوگیا اور پچھلے حصے کی طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگا..... چند ثانیے بعد یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس بھری کہ وہ پچھلی نشستوں کے نیچے..... بڑے آرام کے ساتھ سو رہا تھا۔ بندریا کے معصوم بچے کو سوتا دیکھ کر امجد کو اس پر بے تحاشا اور پیار آنے لگا۔ امجد جانتا تھا کہ وہ بھوکا نہیں ہے۔ کیونکہ رات کو پیڑ پر ماں نے اسے خوب دودھ پلایا تھا۔

''تمہارا ہر طرح کا خیال رکھنا اب میری ذمے داری بنتی ہے..... تاکہ تمہاری ماں کا کچھ تو احسان چکا سکوں۔'' امجد نے سرگوشیوں کے انداز میں کہا اور پھر اگنیشن میں چابی گھمائی، جیپ کا انجن جاگ اٹھا۔

❖❖❖

لبِ خاموش

نجمہ مودی

حد سے زیادہ کم گوئی خود اپنے لیے باعثِ زحمت بن جاتی ہے... اس کی خاموشی نے اسے ایک بڑی مشکل سے دوچار کر دیا تھا... سراغرساں کی کوشش تھی کہ اس پُراسرار خاموشی کا قفل کسی طرح ٹوٹ جائے...

فیصلہ کن قدم اٹھانے والے ایک جذباتی شخص کی محبت کا انداز.....

وہ ٹریلر پارک چھوٹی سی ایک باقاعدہ بستی تھی جس میں گلیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان گلیوں کے نمبر بھی تھے اور تمام ٹریلرز پر بھی نمبر پڑے ہوئے تھے۔ ٹریلرز درحقیقت چلتے پھرتے مکان تھے جن میں لوگ رہ رہے تھے۔ جب، جس کا دل چاہتا، وہ پہیوں پر کھڑے اپنے مکان کو کسی اور شہر کے ٹریلر پارک میں بھی لے جاسکتا تھا۔

پرائیویٹ سراغ رساں نیلسن جس وقت وہاں پہنچا، بارش شروع ہو چکی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی اور گہرے بادلوں کی

وجہ سے، وقت سے پہلے ہی تاریکی چھا گئی تھی۔ نیلسن کو اپنے مطلوبہ نمبر کا ٹریلر تلاش کرنے میں قدرے دشواری پیش آئی۔ اس کی دستک کے جواب میں ٹریلر کا دروازہ کھولنے والی عورت پہلی نظر میں اسے تیرہ چودہ سال کی لڑکی دکھائی دی لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ تقریباً اٹھائیس تیس سال کی ایک دبلی پتلی، نازک اندام عورت تھی۔ اس کے بال سنہرے تھے۔ ہونٹ بھرے بھرے اور دلکش تھے۔ پہلی نظر میں اس کی شخصیت واضح نہیں ہوتی تھی لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں، اپنی ایک الگ ہی قسم کی کشش تھی۔

''میں نیلسن ہوں۔'' پرائیویٹ سراغ رساں نے اپنی چھتری کی مدد سے خود کو بارش سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ.....!'' عورت گویا ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوگئی۔ ''میں این ایڈمز ہوں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی بارش میں آپ آئیں گے۔'' اس نے جلدی سے ایک طرف ہوکر نیلسن کو اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

اندر پہنچ کر نیلسن کو اندازہ ہوا کہ رہائش کے لیے ٹریلر ایک خاصی تنگ جگہ تھی۔ این کے ساز و سامان سے بھی قدرے غربت اور پرانا پن عیاں تھا۔ چھوٹی سی ایک دیوار گیر تپائی پر چھوٹا سا ایک پورٹیبل ٹی وی رکھا تھا جو خاصی اونچی آواز میں چل رہا تھا۔ این نے جلدی سے اسے بند کیا اور پلاسٹک کی ایک کرسی سے اخبار رسالے ہٹا کر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ ٹریلر کی آہنی چھت پر بارش کی زوردار تڑتڑاہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔

''آپ کو میرے بارے میں پتا کیسے چلا مس این؟'' نیلسن نے چھتری ایک طرف رکھنے کے بعد بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری کے مخصوص صفحات میں آپ کا نام، پیشہ اور فون نمبر دیکھا تھا۔'' این نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ اس کی مسکراہٹ بھی نوعمر لڑکیوں جیسی تھی۔ ''کیا آپ میرے لیے کام کرنے پر تیار ہیں؟''

''ظاہر ہے، میں اسی لیے اتنی بارش کے باوجود، اپنے دیے ہوئے وقت پر یہاں پہنچا ہوں۔'' نیلسن نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اگر مجھے میری شرائط کے مطابق میرا معاوضہ ملے گا تو میں ضرور کام کروں گا؟''

''میں نے تو آپ کی بتائی ہوئی ایڈوانس رقم کا چیک بھی تیار کر کے رکھا ہوا ہے۔'' این فوراً بولی۔

''کام کی نوعیت کیا ہے؟'' نیلسن نے جاننا چاہا۔

''کام کا تعلق میرے منگیتر سے ہے۔ اس کا نام کرٹس کولٹ ہے۔'' این نے جواب دیا۔

''کرٹس کولٹ.....؟'' نیلسن نے گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے دہرایا۔ ''کیا یہ وہی نوجوان ہے جسے اگلے ہفتے بجلی کی کرسی پر بٹھا کر سزائے موت دی جانی ہے؟''

''ہاں، میں اسی کی بات کر رہی ہوں۔'' این کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی آگئی۔ ''شراب کے اسٹور میں کام کرنے والی جس عورت کے قتل کے الزام میں اسے موت کی سزا ہو رہی ہے، کرٹس کولٹ نے اسے ہرگز قتل نہیں کیا۔ یہ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ کرٹس سزائے موت کا مستحق نہیں ہے۔ میں اس کی بے گناہی ثابت کر سکتی ہوں۔''

''میرا خیال ہے، اب اس کام میں دیر ہو چکی ہے۔'' نیلسن دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کیا تم نے عدالت میں کرٹس کے حق میں گواہی دی ہے؟''

''نہیں.....'' وہ اپنی کرسی پر پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''عدالت، جج، وکیل وغیرہ..... کوئی بھی میرے وجود سے واقف نہیں ہے۔ کرٹس چاہتا ہی نہیں تھا کہ کسی کو میرے بارے میں معلوم ہو۔ اس نے کسی بھی مرحلے پر میرا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔''

نیلسن پُرخیال انداز میں ایک لمحے کے لیے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اس لڑکی کے ذہن میں کوئی فلمی قسم کی سچویشن تھی جس میں آخری لمحوں میں سزائے موت کے مجرم کے لیے حکم آجاتا ہے کہ صدر مملکت یا گورنر نے اس کی رحم کی اپیل منظور کر لی ہے اور اس کی سزا معاف ہوگئی ہے۔

''مجھے کرٹس کولٹ کے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' نیلسن بولا۔

''کیا تم نے اخبارات میں اس کے بارے میں نہیں پڑھا؟ ٹی وی پر اس کے بارے میں نہیں سنا؟'' این نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''میں میڈیا میں آنے والی خبروں پر کچھ زیادہ یقین نہیں کرتا۔'' نیلسن نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''تم مجھے تفصیلات بتاؤ۔''

''پولیس کا کہنا ہے کہ کرٹس شراب کے اسٹور کو لوٹنے کے لیے اندر گھسا ہوا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر موجود عورت پر گن تان رکھی تھی۔ اس کا پارٹنر بھی اس کے ساتھ تھا۔ اسی رات وہ اس اسٹور سے پہلے تین پیٹرول پمپ بھی لوٹ چکے تھے۔ اس دوران میں پچھلے کمرے سے اس عورت کا شوہر نکل آیا۔ وہ دونوں میاں بیوی مل کر اسٹور چلاتے تھے۔ پیچھے ہی ان کی رہائش تھی۔ شوہر نے جب دیکھا کہ اس کی بیوی ہاتھ اٹھائے کھڑی ہے اور کرٹس نے اس پر گن تان رکھی ہے تو اس

نے شاید فوری طور پر جذبات میں آکر، کچھ سوچے سمجھے بغیر کرٹس پر حملہ کر دیا۔ کرٹس نے گولی چلا دی۔ شوہر گر گیا۔ بیوی نے جب دیکھا کہ اس کے شوہر کو گولی لگ گئی ہے تو وہ بھی خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ کرٹس پر جھپٹ پڑی۔ کرٹس نے اسے بھی گولی ماردی۔ عورت مر گئی۔ شوہر زندہ ہے لیکن کوما میں ہے۔ اسے نلکی کے ذریعے خوراک دی جاتی ہے۔ وہ کوئی بیان نہیں دے سکتا اور نہ ہی امید ہے کہ مستقبل میں کچھ بول سکے گا۔ وہ مفلوج، معذور اور اپنے گردوپیش سے بے خبر ہے۔''

نیلسن کو یاد تھا کہ میڈیا میں بھی یہی تفصیلات آئی تھیں۔ گزشتہ پچیس سالوں کے دوران میں کرٹس ملک کا پہلا شہری تھا جسے جیوری نے بجلی کی کرسی کے ذریعے سزائے موت سنائی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس معاملے میں تمہاری یا کرٹس کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' نیلسن چند لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔

این کی شفاف نیلی آنکھوں میں ہلکی سی افسردگی کے سائے لہرائے۔ وہ مجروح سے لہجے میں بولی۔ ''میں بعض اوقات راتوں کو گھٹنوں جاگتی رہتی ہوں اور تصور کرتی ہوں کہ بے شک کرٹس کو بجلی کی کرسی پر چند منٹ میں موت آجائے گی لیکن وہ چند منٹ کس قدر اذیت ناک ہوں گے، میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مجھے کرٹس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔''

نیلسن نے دھیرے سے یوں سر ہلایا جیسے بتانا چاہ رہا ہو کہ وہ اس کے کرب کو سمجھ سکتا تھا، محسوس کر سکتا تھا۔ پھر اسے گویا یاد آیا۔ ''اس واقعے کی تفصیلات میں بتایا گیا تھا کہ کرٹس کا ساتھی پکڑا نہیں جا سکا تھا۔ وہ اس وقت باہر گاڑی اسٹارٹ کیے، کرٹس کے انتظار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا جب اندر اسٹور میں گولیاں چلیں۔ وہ فائروں کی آواز سن کر گاڑی بھگا لے گیا۔ پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔''

''ہاں، پولیس نے کرٹس سے بہت پوچھ گچھ کی۔ کچھ سختی بھی کی لیکن کرٹس نے اس کے بارے میں زبان نہیں کھولی۔'' این بولی۔

''لیکن تمہیں معلوم ہے کہ وہ کون تھا؟'' نیلسن نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں۔'' این نے تسلیم کیا۔ ''اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ جب شراب کے اسٹور میں ڈاکا پڑا، اس وقت وہ اور کرٹس تو اس اسٹور سے میلوں دور تھے۔ وہ تو درحقیقت اس وقت ایک گیس اسٹیشن پر تھے اور کرٹس وہاں موجود اسٹور سے سگریٹ خریدنے اندر گیا ہوا تھا۔ اس کا پارٹنر باہر کار میں اس کا انتظار کر رہا تھا جب اس نے ایک پولیس کار کو آتے دیکھا۔

وہ چونکہ اس سے پہلے تین گیس اسٹیشنز کو لوٹ چکے تھے اس لیے پارٹنر یہی سمجھا کہ پولیس ان کا پیچھا کرتی ہوئی آن پہنچی ہے۔ وہ گھبرا کر کار وہاں سے بھگا لے گیا۔ پولیس اس کی نمبر پلیٹ بھی نہیں دیکھ سکی۔ پولیس نے کرٹس کو وہاں پکڑ لیا اور انہوں نے فرض کر لیا کہ شراب کے اسٹور والی واردات بھی وہی کر کے آیا ہے جبکہ کرٹس کے پارٹنر کا کہنا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔'' این کے خیال میں شاید یہ الفاظ ترپ کے پتے سے کم نہیں تھے اور ان کے ذریعے ساری بازی پلٹی جا سکتی تھی۔

''اس بات کی اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں جب تک کرٹس کا پارٹنر خود سامنے آکر یہ بیان نہ دے اور اس کی تصدیق کے لیے کوئی ثبوت پیش نہ کرے۔'' نیلسن نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' این بولی۔ ''لیکن وہ سامنے نہیں آسکتا اسی لیے تو میں نے تمہیں بلایا ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر میری شہرت کیسی ہے لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتا۔'' نیلسن نے واضح کیا۔

''میں تمہیں کب کوئی غیر قانونی کام کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔'' این نے گویا ذرا برا مناتے ہوئے کہا۔ ''کرٹس کو سزا چشم دید گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔''

''ہاں، مجھے معلوم ہے۔'' نیلسن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''وہ چار گاہک تھے جو اس وقت شراب کے اسٹور میں موجود تھے جب یہ واردات ہوئی۔ پولیس نے شناختی پریڈ کرائی تھی اور ان لوگوں نے اس پریڈ میں کرٹس کو پہچان لیا تھا۔''

''چشم دید گواہوں سے بھی بعض اوقات شناختی پریڈ میں کسی کو پہچاننے میں غلطی ہو جاتی ہے۔'' این نے دانشورانہ سے انداز میں کہا۔

نیلسن کے خیال میں یہ بات ٹھیک تو تھی لیکن اس کیس کے معاملے میں یہ بات اس کے دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ اکٹھے چار آدمی بھلا شناخت کے معاملے میں غلطی کیسے کر سکتے تھے؟

''میں نے دراصل تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ تم ان گواہوں سے مل کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرو کہ انہیں مجرم کو شناخت کرنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ انہوں نے جس شخص کو شراب کے اسٹور کے مالک اور اس کی بیوی پر گولی چلاتے دیکھا، وہ درحقیقت کرٹس نہیں، کوئی اور تھا۔ شاید وہ کرٹس سے ملتا جلتا کوئی آدمی تھا۔ ان کی غلط گواہی کی وجہ سے ایک بے گناہ شخص دردناک موت کی سزا پانے جا رہا ہے۔''

''عدالت میں کرٹس کے سب دلائل رد کیے جا چکے ہیں۔'' نیلسن نے نرمی سے کہا۔ ''بالفرض محال چاروں گواہ یہ

بیان دینے پر تیار ہو بھی جائیں کہ ان سے کرٹس کو پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے، تب بھی ضروری نہیں ہے کہ اس کیس کی دوبارہ ازسرِنو سماعت ہو۔''

''ہو بھی سکتی ہے اور کرٹس جیل سے باہر بھی آسکتا ہے۔'' این کے لہجے میں بلا کا یقین بول رہا تھا۔ نیلسن دل ہی دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ کچھ زیادہ ہی خوش فہم لڑکی تھی۔ اسی دوران اس کی نظر این کی کرسی کے نیچے پڑی ہوئی، شراب کی ایک خالی بوتل پر پڑی۔ اسے شک ہوا کہ کہیں این کی خوش گمانی یا خوش فہمی، خمار کی پیداوار تو نہیں تھی؟ اس کے اندازِ گفتگو سے تو نہیں لگ رہا تھا کہ اس کے حواس پر خمار کا غلبہ تھا البتہ اس کی آنکھوں میں خمار کے ہلکے سے گلابی ڈورے ضرور موجود تھے اور چہرے پر خفیف سی تمتماہٹ تھی جس کی وجہ سے اس کی دلکشی میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

این نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ نیلسن بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد وہ نہایت شیریں اور التجائیہ سے لہجے میں بولی۔ ''تو پھر آپ میری مدد کریں گے نا مسٹر نیلسن؟''

''ضرور..... ضرور..... میرا خیال ہے، یہ کام اتنا زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔'' نیلسن نے بلا تامل جواب دیا۔

☆☆☆

''میں اب اپنے آپ کو اس سلسلے میں مزید پریشان کیوں کروں؟'' رینڈی نے اپنا بیلچہ مٹی میں گاڑ کر کھدائی کا کام روکتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ایک زیرِ تعمیر مضافاتی سڑک پر رضا کارانہ طور پر ایک مزدور کی طرح کام کر رہا تھا۔ نیلسن کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی۔ ''کرٹس کو مجرم قرار دیا جا چکا ہے اور اسے بجلی کی کرسی پر بٹھانے کی سزا سنائی جا چکی ہے۔ اب اس معاملے کو نئے سرے سے چھیڑنے کی ضرورت کیا ہے؟''

نیلسن نے ذرا بڑے سائز کی ایک تصویر اس کے سامنے کر دی۔ کرٹس کی یہ تصویر این نے اسے دی تھی۔ اس میں اس کا چہرہ اور جسمانی ساخت وغیرہ بالکل واضح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لکڑی کے ایک جنگلے کے سہارے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں بیئر کا ایک ڈبا تھا۔

''اس تصویر کو غور سے دیکھو اور ایک بار پھر ذہن پر زور دو کہ کیا یہی وہ نوجوان ہے جسے تم نے شراب کے اسٹور میں دیکھا تھا؟ ہو سکتا ہے اس سے کوئی فرق نہ پڑے اور اسے بہر حال موت کی سزا ہو جائے لیکن تمہاری دوبارہ تصدیق سے ایک ایسی شخصیت کے دل کو تھوڑا سا اطمینان ہو جائے گا جو اس بدنصیب نوجوان سے محبت کرتی ہے۔''

''لیکن اگر میں اب اپنا بیان تبدیل کروں گا، جب مقدمے کا فیصلہ سنایا جا چکا ہے تو میں نہایت احمق یا جھوٹا نظر آؤں گا۔'' رینڈی بولا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔

''لیکن اگر میرے اس طرح پوچھ گچھ کرنے سے تمہارے ذہن میں شک کا بیج بویا گیا تو تم زندگی بھر اپنے آپ کو ایک بے گناہ کے قتل میں حصے دار محسوس کرو گے۔'' نیلسن نے اسے دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

رینڈی ایک لمحے کے لیے گویا سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی جینز کی جیب سے بڑا سا ایک رومال نکال کر چہرے سے پسینا پونچھا، پھر تصویر کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے کے جائزے کے بعد وہ پُر یقین لہجے میں بولا۔ ''اسی نے شراب کے اسٹور کے مالک اور اس کی بیوی کو گولی ماری تھی۔ میں اس وقت سینڈرس نامی ایک اور آدمی کے ساتھ، ذرا دور ایک کونے میں کھڑا تھا۔ وہاں روشنی بہت کم تھی۔ اس نوجوان کی نظر ہم پر نہیں پڑی تھی، ورنہ شاید یہ ہمیں بھی گولی مار دیتا۔''

''کیا تم نے واقعی صاف طور پر دیکھا تھا کہ اسی نوجوان کی چلائی ہوئی گولیوں سے وہ میاں بیوی گرے تھے؟'' نیلسن نے اب ایک اور زاویے سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' اس بار رینڈی نے جواب دیا۔ ''میں اور سینڈرس اس وقت بوتلوں سے بھری دیوار گیر الماریوں کا جائزہ لے رہے تھے اور اپنی مطلوبہ بوتلیں تلاش کر رہے تھے جب ہم نے گولیاں چلنے کی آواز سنی اور گھوم کر دیکھا۔ اس وقت یہ نوجوان الٹے قدموں دکان کے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ پھر ہم نے اسے دکان سے نکل کر سامنے کھڑی کار کی طرف بھاگتے دیکھا۔ کار جب وہاں سے روانہ ہوئی تو کرٹس نے ایک اور فائر کیا۔''

''کار کون سی تھی؟'' نیلسن نے دریافت کیا۔

''کالے، یا پھر گہرے سبز رنگ کی فورڈ تھی۔'' رینڈی نے جواب دیا۔

''کیا تم ڈرائیور کو دیکھ پائے؟''

''کسی حد تک۔'' رینڈی بولا۔ ''وہ کوئی دبلا پتلا سا نوجوان معلوم ہوتا تھا جس کے بال گھنگریالے تھے۔ اس کی مونچھیں بھی تھیں۔ بس، میں یہی کچھ دیکھ سکا تھا اور یہی سب کچھ میں نے پولیس کو بھی بتا دیا تھا۔''

نیلسن اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے کے بعد مزید دو چشم دید گواہوں سے ملا۔ انہوں نے بھی وہی بات کی جو رینڈی کر چکا تھا۔ چوتھی اور آخری گواہ ایک عمر رسیدہ خاتون

تھی جس کا نام آئرس تھا۔ وہ اس وقت اپنے کُتّے کو ٹہلاتی ہوئی شراب کے اسٹور کے سامنے سے گزرنے لگی تھی جب کرٹس تیزی سے اسٹور سے نکل کر اس کار کی طرف دوڑا جس میں بیٹھ کر وہ فرار ہوا۔ آئرس نے ربنڈی سے ذرا مختلف الفاظ میں کہا۔ ''کار چلانے والے کے بال کالے اور گھنگریالے تھے۔ اس کی شاید مونچھیں یا داڑھی بھی تھی۔ کرٹس ہی کی طرح۔''

نیلسن نے ایک بار پھر کرٹس کی اس تصویر کا جائزہ لیا جو اسے این نے دی تھی۔ کرٹس کا قد تقریباً پانچ فٹ نو انچ معلوم ہوتا تھا۔ وہ دُبلا پتلا تھا۔ چہرے سے کمینگی ٹپکتی تھی۔ اس کی بدمعاشوں جیسی مونچھیں بھی تھیں۔ بال گھنے، سیاہ اور گھنگریالے تھے۔ نیلسن کے ذہن میں ایک مبہم سے امکان نے سر ابھارا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کار ڈرائیو کرنے والا درحقیقت کرٹس رہا ہو اور اس کے ساتھی نے اسٹور والی عورت کو قتل کیا ہو؟ نیلسن نے یہ سوچا، مگر پھر خود ہی اس امکان کو مسترد کر دیا۔

اس کے بعد نیلسن نے لیفٹیننٹ اسمتھ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ کرٹس کے کیس کی تفتیش اسمتھ نے ہی کی تھی۔ کسی زمانے میں نیلسن خود بھی پولیس ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کر چکا تھا اور اسمتھ کے ساتھ پولیس کار میں گشت کیا کرتا تھا لیکن دس سال پہلے بعض وجوہ کی بنا پر نیلسن نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور پرائیویٹ سراغ رساں بن گیا تھا۔ اب بھی اسے اگر کسی کیس کے سلسلے میں پولیس سے معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی تھی تو زیادہ تر لوگ اس سے تعاون کرتے تھے اور اسمتھ تو ویسے ہی اس کے ساتھ دوستوں ہی کی طرح پیش آتا تھا۔ تاہم وہ رسمی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔

نیلسن جب اس کے دفتر پہنچا تو وہ کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر نیلسن کی طرف دیکھا اور کچھ بولے بغیر اسے، سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گزشتہ دس برسوں کے دوران وہ کافی موٹا ہو گیا تھا۔

''مجھے تم سے ایک کام تھا۔'' نیلسن نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اسمتھ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ظاہر ہے تم میرے پاس کام کے لیے ہی آسکتے ہو۔ آلو گوبھی کی قیمتوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے تو نہیں آسکتے۔''

''مجھے کرٹس کے بارے میں کچھ معلومات درکار تھیں۔'' نیلسن نے اس کے طنز و مزاح کو خاطر میں لائے بغیر خالص پیشہ ورانہ لہجے میں کہا۔

''کرٹس.....؟'' اسمتھ کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ''وہی، جسے اگلے ہفتے بجلی کی کرسی پر بٹھایا جانا ہے؟''

نیلسن نے سر ہلایا اور کہا۔ ''اس کی منگیتر کا خیال ہے کہ کرٹس بے گناہ ہے۔''

''اکثر مجرموں کی منگیتروں اور محبوباؤں کا خیال یہی ہوتا ہے۔'' اسمتھ نے اطمینان سے کہا۔ ''کیا کرٹس کی منگیتر نے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں؟''

نیلسن نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا تو اسمتھ بولا۔ ''میرے خیال میں تو کرٹس کے بے گناہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔''

''جس کار میں وہ فرار ہوا، اس کے ڈرائیور کا حلیہ کرٹس سے ملتا جلتا ہی تھا۔'' نیلسن نے کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ گولیاں درحقیقت اس نے چلائی ہوں اور کار کو بھگا کر لے جانے والا کرٹس ہو؟''

''کرٹس کے وکیل نے یہ نکتہ اٹھایا تھا۔'' اسمتھ نے بتایا۔ ''لیکن جیوری اس سے متفق نہیں ہوئی اور نہ ہی میں متفق ہوا۔ تمہیں بھی مان لینا چاہیے کہ کرٹس ہی مجرم ہے نیلسن۔''

''اگر تم بُرا نہ مناؤ تو کیا میں کرٹس کے کیس کی فائل دیکھ سکتا ہوں؟'' نیلسن نے دریافت کیا۔

اسمتھ نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک سگار سلگایا اور گہرا کش لے کر دھوئیں کے مرغولے کے عقب سے آنکھیں سکیڑ کر نیلسن کی طرف دیکھا اور الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''عجیب بات ہے کہ کیس کی پوری کارروائی کے دوران کرٹس کی منگیتر ایک بار بھی عدالت میں پیش نہیں ہوئی۔ وہ چاہتی تو آکر جھوٹی گواہی بھی دے سکتی تھی کہ واردات کے وقت کرٹس تو اس کے ساتھ تھا۔''

''شاید کرٹس ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ عدالت میں یا منظرِ عام پر آئے اور اس کی حمایت میں کھڑی ہو۔'' نیلسن دھیمے لہجے میں بولا۔

''کیا بات ہے ہمارے فلمی ہیرو کی۔'' اسمتھ کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ ''اور ہماری ہیروئن کیوں سمجھ رہی ہے کہ اس کا ہیرو بے گناہ ہے؟''

''اسے معلوم ہے کہ جس وقت اسٹور کے مالک میاں بیوی کو قتل کیا گیا، اس وقت کرٹس کہیں اور تھا۔'' نیلسن نے جواب دیا۔

''مگر اس لڑکی کے ساتھ نہیں تھا؟'' اسمتھ نے تصدیق چاہی۔

''نہیں۔''

''واہ..... یہ تو تم نیا نکتہ لائے ہو۔'' اسمتھ کا لہجہ اب بھی استہزائیہ تھا تاہم اس نے کرٹس کے کیس کی فائل منگوالی اور نیلسن کے سامنے رکھ دی۔

فائل کے مطالعے سے نیلسن کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ شراب کے اسٹور میں گولیاں چلنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد پٹرولنگ کار میں موجود دو پولیس آفیسر، وائرلیس پر مجرم کا حلیہ وغیرہ سننے کے بعد اسے ڈھونڈتے ہوئے ایک گیس اسٹیشن پر پہنچے تھے جہاں وہ مشین میں رقم ڈال کر سگریٹ کا ایک پیکٹ خرید رہا تھا۔ عین اسی وقت کچھ دور اندھیرے میں کھڑی ہوئی ایک کار تیزی سے، وہاں سے روانہ ہوگئی تھی۔ پولیس آفیسرز اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکے تھے۔ وہ گہرے سبز رنگ کی فورڈ تھی۔ ان کے خیال میں اس کی نمبر پلیٹ پر پہلا حرف ''ایل'' تھا لیکن اس بارے میں بھی وہ پُریقین نہیں تھے۔

''کرٹس نے کسی مزاحمت کے بغیر گرفتاری دے دی تھی اور اسی رات اسے پولیس اسٹیشن میں، شناختی پریڈ میں چار چشم دید گواہوں نے شناخت کرلیا تھا۔ جائے واردات سے تیزی سے روانہ ہونے والی کار کے بارے میں ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ وہ غالباً گہرے سبز رنگ کی، یا پھر سیاہ فورڈ تھی۔ شراب کے اسٹور اور گئی گیس اسٹیشنز سے کرٹس نے جو رقم لوٹی تھی، وہ اس کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ وہ یقیناً اس کار میں تھی جسے اس کا ساتھی بھگا لے گیا تھا۔

''وہ گن کہاں گئی جس سے قتل کیا گیا تھا؟'' نیلسن نے دریافت کیا۔

''جس وقت کرٹس کو اسٹور میں گرفتار کیا گیا، اس وقت اس کے پاس گن نہیں تھی۔'' اسمتھ نے جواب دیا۔ ''وہ گن دکھا کر نہیں، بلکہ ادائیگی کرکے سگریٹ لے رہا تھا۔ گن اس رات پہلے ہی کافی استعمال ہوچکی تھی۔ شاید کرٹس نے احتیاطاً اسے گاڑی میں ہی نہ چھوڑ دیا ہو۔''

نیلسن نے فائل بند کرکے واپس اسمتھ کی طرف کھسکا دی اور اس کا شکریہ ادا کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے وہ رسمی سے انداز میں بولا۔ ''اگر کوئی نئی بات معلوم ہوئی تو میں تم سے رابطہ کروں گا۔''

''مجھے کوئی نئی بات بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اسمتھ نے عدم دلچسپی سے کہا۔ ''میرے نزدیک یہ کیس اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔''

☆☆☆

دوسرے روز این ایڈمز سے اس کے رہائشی ٹریلر میں ملاقات کے دوران گفتگو کرتے ہوئے نیلسن نے کہا۔ ''کسی مجرم کو سزا دلوانے کے لیے دو چشم دید گواہوں کی شہادت کافی ہوتی ہے جو اسے شناختی پریڈ کے دوران پہچان لیں۔ کرٹس کے کیس میں تو دو کے بجائے چار گواہ موجود ہیں۔ میری دیانت دارانہ رائے یہی ہے کہ تم تسلیم کرلو کہ کرٹس مجرم ہے۔ میری خدمات حاصل کرکے تم فیس کے طور پر جو رقم ادا کررہی ہو، وہ ضائع جائے گی۔''

این کرسی پر پاؤں اوپر کیے، اپنی ٹانگوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے، کسی روٹھے ہوئے بچے کے سے انداز میں بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا کچھ سوچ کر بولی۔ ''مسٹر نیلسن! اگر آپ آج رات آٹھ بجے دوبارہ یہاں آنے کی زحمت کریں تو شاید آپ میری بات کے قائل ہو جائیں۔''

نیلسن کے خیال میں این کی یہ خواہش پوری کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ شاید دل ہی دل میں اسے اس لڑکی پر ترس آرہا تھا۔ رات کو آٹھ بجے وہ دوبارہ ٹریلر میں کچن کے سامنے ننھی سی ڈائننگ ٹیبل کے قریب بیٹھا تھا۔ ٹریلر میں روشنی کم ہی تھی۔ اس وقت وہاں این کے علاوہ ایک دبلا پتلا نوجوان بھی موجود تھا۔ اس کی عمر بیس سے تیس کے درمیان تھی۔ وہ رات کے وقت بھی ایسے تاریک شیشوں والا چشمہ لگائے ہوئے تھا جو آئینوں کی طرح چمکتے تھے۔ این نے اس کا تعارف ایلن کے نام سے کرایا تھا لیکن ساتھ ہی وضاحت کردی تھی۔ ''یہ اس کا اصل نام نہیں ہے۔ جس رات کرٹس کو گرفتار کیا گیا، اس رات گاڑی یہ چلا رہا تھا۔''

''لیکن ہم اُس وقت شراب کے اسٹور کے آس پاس بھی نہیں تھے جب اس کے مالک اور اس کی بیوی کو گولی ماری گئی۔'' ایلن نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

نیلسن کے خیال میں ایلن نے آئینوں کی طرح چمکتے شیشوں کا چشمہ اس لیے لگایا ہوا تھا کہ اگر بعد میں کہیں ان کا آمنا سامنا ہو تو نیلسن اسے پہچان نہ سکے۔ بات کرتے ہوئے اس نے بازو ہلایا تو اس کی آستین ذرا نیچے کھسک گئی۔ نیلسن کو اس کے بازو پر کسی ٹیٹو کی جھلک نظر آئی۔ شاید ٹیٹو کو چھپانے کے لیے ہی اس نے ضرورت سے زیادہ لمبی آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے ڈارک براؤن بال اس کے کندھوں تک آرہے تھے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جس وقت شراب کے اسٹور والا واقعہ ہوا، اس وقت تو ہم شہر کے دوسری طرف ایک گیس اسٹیشن کو لوٹنے کے لیے تاڑ رہے تھے۔ ہم دونوں

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

صرف گیس اسٹیشن ہی لوٹتے تھے۔ ہم اپنے خیال میں گیس اسٹیشن لوٹنے کے اسپیشلسٹ بن رہے تھے۔

نیلسن کو یاد آیا کہ اس نے اسمتھ کے دفتر میں کرٹس کے کیس کی جو فائل دیکھی تھی، اس میں بھی یہی درج تھا کہ وہ جب بھی پکڑا گیا تھا، گیس اسٹیشن کو لوٹنے کے جرم میں ہی پکڑا گیا تھا۔ دو تین مرتبہ اسے مختصر سزا ہوئی تھی۔ جس عدالت نے اسے سزا دی تھی، اس نے شاید اس نکتے پر توجہ نہیں دی تھی۔

''شراب کے اسٹور والے واقعے کو تین ماہ گزرے ہیں۔'' نیلسن نے ایلن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ان تین مہینوں میں تمہارے بال اتنے لمبے اور سیدھے کیسے ہو گئے؟ وقوعے کے گواہوں کا کہنا تھا کہ جو کار جائے واردات سے روانہ ہوئی اس کے ڈرائیور کے بال لمبے اور ڈارک براؤن نہیں، بلکہ چھوٹے، سیاہ اور گھنگریالے تھے۔ اس کے علاوہ اس کی مونچھیں بھی تھیں۔''

''میں آپ کو سچ سچ بتاتا ہوں۔ مجھ میں اور کرٹس میں کچھ شباہت تو ویسے بھی موجود تھی۔ ہم دونوں دُبلے پتلے ہیں۔ دونوں کی مونچھیں ہیں لیکن میں نے اس وقت مونچھیں ڈر کے مارے صاف کر رکھی ہیں۔ کرٹس کے بال گھنگریالے اور سیاہ ہیں۔ میں اس کے ساتھ زیادہ شباہت پیدا کرنے کے لیے اپنے بال سمیٹ کر اوپر وگ لگا لیتا تھا۔ چشم دید گواہوں کو چکر دینے اور اُلجھن میں مبتلا کرنے کے لیے ہم دونوں ایک جیسے بن کر واردات کرتے تھے۔ ممکن ہے کچھ لوگ ہمیں جڑواں بھائی سمجھتے ہوں۔''

نیلسن کے خیال میں یہ وضاحت قابلِ قبول تھی۔ بہت سے مجرم، پولیس اور گواہوں کو چکر دینے اور اُلجھن میں ڈالنے کے لیے یہ ترکیب استعمال کرتے تھے۔

''کیا یہ ثابت کرنے کا کوئی طریقہ ہے کہ جب شراب کے اسٹور والا واقعہ ہوا، اُس وقت تم دونوں وہاں سے بہت دور تھے؟'' نیلسن نے دریافت کیا۔

''میرے پاس تو بس میرا بیان ہی ہے۔'' ایلن نے قدرے بے بسی سے کہا۔

نیلسن کے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ایلن نے یہاں آ کر کرٹس کی بے گناہی کی گواہی دینے کی زحمت اس لیے کی تھی کہ اس طرح درحقیقت وہ اپنی بھی بے گناہی ثابت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے سر پر بھی تلوار لٹک رہی تھی۔ اگر وہ پکڑا جاتا تو شراب کے اسٹور والے واقعے کے سلسلے میں شریکِ جرم کے طور پر اسے بھی سزائے موت یا عمر قید ہو سکتی تھی۔

''میں کرٹس کو بجلی کی کرسی پر پہنچنے سے بچانے کی اپنی سی کوشش کروں گا لیکن مجھے کامیابی کی کوئی خاص امید نہیں ہے۔'' نیلسن نے صاف گوئی سے کہا۔

''بہت شکریہ۔'' ایلن کی آواز بھرّا سی گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نیلسن نے محسوس کیا کہ شاید وہ کسی نشے کا بھی عادی تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے وہ قدرے التجائیہ سے لہجے میں بولا۔ ''ایک مہربانی کرنا..... میرے جانے کے دس منٹ بعد تک تم یہیں این کے پاس رہنا۔ مجھے تم پر بھروسا ہے کہ تم مجھے پکڑوانے کی کوشش نہیں کرو گے..... پھر بھی..... میں جس پوزیشن میں ہوں..... میرے لیے ہر ممکن احتیاط کرنا ہی بہتر ہے۔''

وہ ٹریلر سے نکلا تو نیلسن نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ شاید ایلن کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کے لیے دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔

نیلسن گہری سانس لے کر ایلن سے مخاطب ہوا۔ ''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے ایلن سے اس ملاقات اور بات چیت کے بارے میں سب کچھ پولیس کو بتانا پڑے گا۔ یہ میرا اخلاقی اور قانونی فرض ہے۔''

''ضرور بتا دینا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پولیس کو اس سے ایلن کی تلاش میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ پولیس اس کی تلاش تقریباً ترک کر چکی ہے۔ اگر اتفاقاً ہی پکڑا جائے تو اور بات ہے۔ مجھ سے کوئی اس کے بارے میں پوچھے گا تو میں کچھ نہیں جانتی۔''

دس منٹ گزر گئے تو نیلسن جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دوبارہ پولیس آفیسر اسمتھ سے ملا۔ اس نے اسمتھ کو ایلن سے اپنی ملاقات کے بارے میں بتا دیا۔ اس کی توقع کے مطابق اسمتھ نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ نیلسن نے اپنی سی تمام کوششیں کیں لیکن وہ کرٹس کی سزائے موت کو رکوانے کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ ریڈیو پر اس کی موت کی خبر سننے کے بعد وہ این سے ملنے گیا تو اس کی حالت اس سے دیکھی نہ گئی۔ بہت بوجھل دل لے کر وہ واپس آیا۔ اس کے بعد دو راتوں تک وہ چار گھنٹے سے زیادہ نہ سو سکا۔ این کی آنسوؤں سے بھری سرخ اور متورم آنکھیں اس کے تصور میں اُبھرتی رہیں۔

تیسری رات ایک خیال نہ جانے کہاں سے اس کے دماغ میں رینگ آیا اور اسے کچھ قرار سا آ گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ معاملہ ابھی اپنے انجام کو نہیں پہنچا تھا اور جب تک وہ انجام کو نہ پہنچتا، اسے پوری طرح قرار نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے این کی نگرانی شروع کر دی۔ وہ چھوٹے سے ایک ریسٹورنٹ میں ویٹریس کے طور پر کام کرتی

تھی۔ ٹریلر سے نکل کر وہ ٹیکسی میں بیٹھتی اور تقریباً چار میل کا سفر کر کے اپنے ریسٹورنٹ پہنچتی۔ ڈیوٹی ختم کر کے وہ ریسٹورنٹ سے نکلتی، کسی اور ٹیکسی میں بیٹھتی اور ٹریلر پارک واپس آجاتی۔

تین دن اپنی پرانی فوکس ویگن میں اس کا تعاقب کرنے اور اس کے معمول کا جائزہ لینے کے بعد، چوتھے دن نیلسن نے اس کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ ٹریلر پارک کے قریب این کی نظروں میں آئے بغیر اپنی کار میں بیٹھا رہا اور جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہوگئی تو نیلسن گاڑی سے اتر کر ٹریلر پارک کے اندر چلا گیا۔ دھات کی ایک پتلی سی پٹی کی مدد سے این کے ٹریلر کا تالا کھولنے میں اسے کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔

اندر پہنچ کر اس نے ٹریلر کی تلاشی لینا شروع کی۔ تقریباً ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد اسے وہ چیز مل ہی گئی جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ پلاسٹک کا ایک ڈبا تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اسے لوہے کی شیٹ کے پیچھے چھپے ہوئے ایک پینل باکس میں چھپایا گیا تھا جس میں سے باتھ روم کے پائپ گزر رہے تھے۔ اس ڈبے میں مختلف مالیت کے پرانے نوٹوں کی کچھ بے ترتیب سی گڈیاں تھیں۔ مجموعی طور پر تقریباً آٹھ ہزار ڈالر کی رقم تھی۔ کرٹس کی مجرمانہ زندگی کچھ زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس مختصر زندگی میں اس نے لوٹ مار سے جو رقم حاصل کی تھی، یہ اس میں سے بچی ہوئی رقم تھی۔ اس ڈبے کے علاوہ بھی اسے ایک چیز ملی، جسے دیکھ کر اسے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔

سب کچھ اسی طرح واپس رکھ کر اس نے پینل باکس دوبارہ بند کر دیا۔ این ہرگز اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں کسی نے اسے کھولا تھا۔

دوسرے روز سے اُس نے ایک بار پھر این کی نگرانی شروع کر دی۔ وہ ٹریلر پارک سے نکل کر ٹیکسی میں روانہ ہوتی تو نیلسن کی گاڑی اس کے پیچھے ہوتی۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ گھر واپس روانہ ہوتی تب بھی نیلسن اس کا تعاقب کر رہا ہوتا۔ نہایت مستقل مزاجی سے وہ دو ہفتے این کا تعاقب کرتا رہا۔ آخر کار وہ ایک روز ریسٹورنٹ سے نکلی تو اس کی ٹیکسی گھر کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں روانہ ہوئی۔ نیلسن کی فوکس ویگن اُس کے پیچھے تھی۔

کئی میل کا فاصلہ طے کرنے، کئی چھوٹی موٹی سڑکوں اور گلیوں سے گزرنے کے بعد آخر این کی ٹیکسی ایک ایسی گلی میں داخل ہوئی جو آگے سے بند تھی۔ اس کے اختتام پر، سامنے ہی نیلسن کو ایک آٹو ورکشاپ کا بورڈ نظر آیا۔ ورکشاپ کافی بڑی معلوم ہوتی تھی۔ نیلسن ٹیکسی کا پیچھا کرتے کرتے اس گلی میں داخل تو ہو گیا لیکن جیسے ہی اسے اندازہ ہوا کہ گلی آگے بند تھی، اس نے اپنی گاڑی ریورس کر لی اور گلی سے نکل کر قریب ہی ایک محفوظ سی جگہ پر کھڑی کر کے انتظار کرنے لگا۔

چند منٹ بعد اس نے ٹیکسی کو گلی سے نکلتے دیکھا لیکن اب این اس میں نہیں تھی۔ خالی ٹیکسی چلی گئی، نیلسن وہیں گاڑی روکے این کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد سرخ رنگ کی ایک چم چم کرتی فورڈ گلی سے برآمد ہوئی۔ این اس میں موجود تھی۔ وہ اسی طرف روانہ ہوگئی جس طرف سے ٹیکسی میں آئی تھی۔ اس فورڈ کی نمبر پلیٹ پر پہلا حرف ''ایل'' تھا۔

نیلسن جب ٹریلر پارک پہنچا تو اس نے سرخ فورڈ کو این کے ٹریلر کے قریب کھڑی پایا۔ اس نے اپنی گاڑی کی چابی سے فورڈ کے ایک کونے سے ذرا پینٹ کھرچ ڈالا۔ گو کہ اس وقت شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا، اس کے باوجود اسے یہ دیکھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ نئے سرخ پینٹ کے نیچے گاڑی کا پرانا پینٹ گہرا سبز تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی، ایک لمحے توقف کیا، پھر آگے بڑھ کر این کے ٹریلر پر دستک دے دی۔

این نے جلد ہی دروازہ کھول دیا۔ نیلسن کو دیکھ کر وہ مسکرائی لیکن اس کی آنکھوں اور چہرے نے گویا اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ ایک دم ہی اپنی عمر سے کئی سال بڑی دکھائی دینے لگی۔ اس کے چہرے کی بے عنوان سی دلکشی کسی انجانے دکھ کی تاریکی میں چھپ گئی۔ اس کے ہاتھ میں آدھا بھرا ہوا ایک گلاس تھا۔ اس میں یقیناً ڈرنک تھی، کیونکہ اس کے عقب میں چھوٹی سی میز پر ایک بوتل رکھی نظر آرہی تھی۔

''آخر کار میں اصل معاملے کو سمجھ گیا ہوں۔'' نیلسن نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

این شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ''تم یقیناً خدا حافظ کہنے کے بعد بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔'' ایک گہری سانس لے کر اس نے نیلسن کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ نیلسن بہر حال اندر آئے گا۔

اندر پہنچ کر وہ بیٹھ چکا تو این نے اس سے ڈرنک کا پوچھا۔ نیلسن نے انکار کر دیا۔ تب این نے اپنا آدھا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا۔ اس نے بوتل سے مزید .... شراب انڈیل لی۔ گلاس اٹھاتے ہوئے اس نے گویا بادلِ ناخواستہ کہا۔ ''ہاں..... تو وہ کون سا اصل معاملہ ہے جسے تم سمجھ گئے ہو مسٹر نیلسن؟''

''جس ریسٹورنٹ میں تم ملازمت کرتی ہو، وہ یہاں سے کافی دور ہے۔ اگر کوئی ویٹریس روزانہ ٹیکسی میں اپنی ڈیوٹی

پر جائے اور واپس آئے تو اس کی آدھی تنخواہ تو ٹیکسی کے کرائے میں ہی چلی جائے گی۔''

''میری کار ورکشاپ گئی ہوئی تھی مسٹر نیلسن۔'' این نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔'' نیلسن نے سر ہلایا۔

''جب مجھے یہاں ایک جگہ چھپائی گئی کچھ رقم اور ایک وگ ملی تو مجھے کچھ باتوں کا اندازہ ہو گیا۔''

''تم میرے گھر میں گھس کر تلاشی لیتے رہے؟'' این گلاس سے ایک گھونٹ بھرنے کے بعد بولی۔ تاہم اس کے لہجے میں غصے کے بجائے شکست خوردگی تھی۔

''تم دُبلی پتلی ہو لیکن تمہارا قد اچھا خاصا ہے۔ وگ اور نقلی مونچھیں لگا کر تم کرٹس سے مشابہ نظر آ سکتی ہو۔ خاص طور پر اگر صرف ایک جھلک دیکھنے کا موقع میسر آئے تو بہت سے چشم دید گواہ دھوکا کھا سکتے ہیں۔ تم دونوں نے اپنی وارداتوں کے دوران لوگوں کو چکر دینے کے لیے یہ اچھا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ پھر تم نے اپنے جاننے والے کسی نشے باز نوجوان کی خدمات غالباً معاوضے پر حاصل کیں۔ اسے ایلن کے نام سے مجھ سے ملوایا۔ اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ کرٹس کا ساتھی وہ تھا اور واردات کر کے وہ جس کار میں فرار ہوتے تھے، اسے وہ چلا رہا ہوتا تھا لیکن کچھ دن پہلے میں نے یہاں پاس پڑوس کے ٹریلرز میں رہنے والے کچھ لوگوں سے معلومات کیں تو پتا چلا کہ تمہارے پاس گہرے سبز رنگ کی ایک فورڈ ہوا کرتی تھی جو اب نظر نہیں آ رہی۔''

''ایلن اور کرٹس واردات کرنے اور فرار ہونے کے لیے میری کار استعمال کرتے تھے۔'' این نے گویا بات بنانے کی ایک اور کوشش کی۔

''میرا خیال ہے ایلن شاید کبھی کرٹس سے ملا بھی نہ ہو۔'' نیلسن بولا۔

''مسٹر نیلسن! اگر شراب کے اسٹور میں ڈکیتی والی رات کو فرار کے لیے استعمال ہونے والی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں ہوتی اور مجھے پتا ہوتا کہ قاتل کرٹس ہے تو میں اس واردات کے چشم دید گواہوں کو اپنے بیان پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کرنے کے لیے تمہاری خدمات کیوں حاصل کرتی؟''

''ہاں، میں بھی پہلے یہی سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔'' نیلسن نے تسلیم کیا۔ ''لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارا اصل مقصد کرٹس کو بے گناہ ثابت کرانا نہیں تھا۔ تمہیں تشویش یہ تھی کہ کرٹس کہیں جیل میں اپنے ''ساتھی'' کے بارے میں زبان نہ کھول دے۔ تم یہ نہیں چاہتی تھیں کہ گواہ میری وجہ سے اپنا بیان بدلنے پر غور کریں، تم تو درحقیقت یہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنے بیان پر اور بھی پکے ہو جائیں۔ شراب کے اسٹور میں واردات کرنے والی درحقیقت تم تھیں۔ تم نے وگ اور مونچھیں لگائی ہوئی تھیں۔ کرٹس تو فرار کے لیے استعمال ہونے والی تمہاری کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اسٹور کے مالک اور اس کی بیوی پر گولی تم نے چلائی تھی۔ کرٹس نے تو فرار ہوتے وقت یونہی ہوائی ... فائر کیا تھا۔ اس نے صرف اس لیے زبان بند رکھی اور سزائے موت قبول کر لی کہ وہ واقعی تم سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جو آج کے دور میں شاید کوئی کسی سے کرتا ہو۔ شاید اب تمہیں اس پچھتاوے کے ساتھ زندہ رہنا پڑے کہ اُس نے تمہارے حصے کی موت قبول کی۔''

این نے سر جھکا لیا۔ وہ ایک ٹک اپنے خالی گلاس کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب تھا۔ ٹریلر میں حبس بڑھ گیا تھا۔ اس کا ائر کنڈیشنر خراب تھا۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد این نے سر اٹھایا تو اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔

''میں اسٹور کے مالک اور اس کی بیوی کو گولی مارنا نہیں چاہتی تھی۔'' وہ دھیمی اور افسردہ سی آواز میں بولی۔ ''لیکن وہ عورت مجھ پر جھپٹ پڑی تھی۔ پھر اس کا شوہر اندر سے نکلا تو وہ بھی مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لپکا۔ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔''

''تم نے صرف اُس عورت کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ اپنی زبان بند رکھ کر گویا کرٹس کو بھی قتل کر دیا۔ اس نے تمہاری محبت میں جان دے دی۔'' نیلسن بولا۔

''لیکن ان باتوں کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔'' این نے شاید مسکرانے کی کوشش کی۔

''ہاں..... یہ تو ٹھیک ہے..... لیکن وقت تمہیں سزا دیتا رہے گا۔'' نیلسن کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''کرٹس کو تو بجلی کی کرسی پر چند لمحوں میں موت آ گئی ہو گی لیکن تم شاید دھیرے دھیرے برسوں تک مرتی رہو گی۔''

این نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ نیلسن اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹریلر میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ اسے کسی تابوت سے مشابہ محسوس ہونے لگا تھا۔ این شاید اپنے ضمیر کے کچوکوں کی اذیت کو دبانے کے لیے گلاس میں کچھ اور ڈرنک انڈیلنے لگی۔

نیلسن نے ایک الوداعی اور ترحم آمیز سی نظر اس پر ڈالی اور ٹریلر کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

❖❖❖

چوہے کی دُم

انجم فاروق ساحلی

معاملاتِ زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں... کبھی انسان ایسی مالی پریشانی کا شکار ہوتا ہے کہ اس سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا... نازک صورتِ حال میں نازک اور قریبی رشتوں کی جانب ہی دیکھا جاتا ہے... اس نے بھی یہی کیا... مگر اس کی کوشش لاحاصل رہی...

اچانک بھڑک اٹھنے والی چنگاری کا انجام.....

نیلم نے اپنے بیڈروم میں داخل ہو کے الماری میں نصب تجوری کو کھولا تو اسے چکر سا آ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے خالی تجوری کو دیکھنے لگی جو اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

''میرے قیمتی زیورات، ہیروں کا نیکلس، انگوٹھیاں، سنہری تاج، ہیروں سے سجا ہوا ہیئر کلپ کہاں گیا اور نقدی جو ڈھیر کی صورت میں دو کروڑ روپے مالیت کی تھی۔ وہ غائب ہے۔ قیمتی بانڈز بھی نہیں ہیں۔ کسی نے مجھے لوٹ لیا ہے۔ مجھے برباد کر دیا ہے۔ اب میں اپنی سالگرہ پارٹی میں

کیا پہن کر لوگوں کے سامنے جاؤں گی۔ جیولری تو میری شخصیت کا حصہ ہے۔''

وہ دیوانی سی ہو کر بڑبڑانے لگی۔ کتنے ہی لمحے وہ خالی تجوری کو حیرت سے دیکھتی رہی پھر ملازموں کو بلانے کے لیے زور زور سے بیل بجانے لگی۔ تھوڑی دیر میں شرفو، کرمو، رامو، رانی، کامنی، شائلہ اور شاکرہ بھی ملازم اکٹھے ہو گئے۔

''تم لوگوں نے کسی چور، ڈاکو کو تو نہیں دیکھا؟'' نیلم نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کا اشارہ خالی تجوری کی طرف تھا۔ سب نفی میں سر ہلانے لگے۔

نیلم نے فون کر کے نچلی منزل پر مہمانوں کا استقبال کرتے اپنے خاوند شوکت مرزا کو بھی بلا لیا۔ وہ بھی ہکا بکا کھڑا خالی تجوری کو دیکھ رہا تھا۔

''کسی ڈاکو نے مجھے بالکل کنگال کر دیا ہے، میرا سب کچھ چرا لیا ہے۔ چور ضرور کوئی بھیدی ہے۔ اس نے ریکی کرنے کے بعد زیورات اور نقدی کا صفایا کر دیا ہے۔''

شوکت ماہرانہ انداز سے تجوری اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ ''تجوری کھلی ہوئی تھی یا بند؟'' اس نے بیگم کی طرف پلٹتے ہوئے پوچھا۔

''بند تھی، میں نے ہی ابھی اسے کھولا ہے۔'' نیلم نے حسرت سے چابی کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

شوکت کچھ سوچتے ہوئے اچانک بول اٹھا۔ ''یہ ضرور اسی چور کی حرکت ہے جو آج کل ہمارے مکان کے اردگرد چوری کی وارداتیں کرتے ہوئے دو تین عورتوں کو نقدی اور زیورات سے محروم کر چکا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی شوکت نے الماری سے دو فٹ کے فاصلے پر دیوار میں لگی کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ وہ چونک اٹھا اور بیگم کا ہاتھ پکڑ کر قریب لے گیا۔

''یہ دیکھو، کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ سیاہ پوش ڈاکو ادھر سے ہی اندر داخل ہوا ہے جس کی ایک جھلک میں دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے دیکھ چکا ہوں۔ وہ سامنے والے راشد صاحب کے گھر سے باہر نکلا تھا۔ راشد صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی مسز آج کل تنہا ہیں۔''

نیلم کی سہیلیاں بھی اب نچلے ہال سے اوپر چلی آئی تھیں۔ انہیں بھی چوری کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ پھر نیلم نے انسپکٹر عمران سے رابطہ کیا۔ وہ ماہر سراغ رساں تھا۔

انسپکٹر عمران نے کمرے میں داخل ہو کے ماحول کا جائزہ لیا۔ کھڑکی کی چوکھٹ سے نیچے باہر راہداری میں ایک لمبے جوتے کا نشان موجود تھا۔ نشان بارہ انچ کے جوتے کا تھا۔ باہر کا جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر نے مسز شوکت سے استفسار کیا کہ ''انہوں نے آخری بار زیورات اور نقدی کو کب دیکھا تھا اور چابیاں کہاں رکھتی ہیں؟''

نیلم نے کہا۔ ''میں نے کل رات کو تجوری میں نیا نیکلس لا کر رکھا تھا۔ یہ میں نے اپنی سہیلیوں نیلوفر، ماہا، انم اور روبی کے ہمراہ خریدا تھا۔ وہ نیچے کھڑی تھیں اور میں نے اوپر آ کے بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے نیکلس تجوری میں رکھ کے چابی اپنے بیڈ کے خفیہ خانے میں چھپا کر رکھ دی تھی۔''

''چابی اسی جگہ پر تھی؟'' انسپکٹر عمران نے پوچھا۔

''ہاں انسپکٹر صاحب، میں چابی کو اس جگہ چھپا کر رکھتی ہوں۔ میں نے چابی حسب معمول نکال کر تجوری کھولی تو یہ خالی پڑی تھی۔''

اسی وقت شوکت بول اٹھا۔ ''چوروں، ڈاکوؤں کے پاس ماسٹر کی اور کئی دوسرے اوزار بھی تو ہوتے ہیں۔''

انسپکٹر عمران نے تجوری کے قفل کا جائزہ لیا۔ اسے چابی کے ساتھ اطمینان سے کھولا گیا تھا پھر وہ تمام افراد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں چابی چرا کر تجوری کھول کے نقدی اور زیورات کا صفایا کیا گیا ہے کیونکہ تجوری کا لاک اتنا آسان اور روایتی نہیں کہ ماسٹر کی اسے کھول دے۔''

انسپکٹر عمران کی تیز نگاہ ایک ایک چہرے پر پڑنے لگی۔ ملازم شرفو نظروں کی تاب نہ لا سکا اور بول اٹھا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں نے دو بار ایک سیاہ لباس والے آدمی کو کوٹھی کے عقبی باغ میں گھومتے دیکھا ہے لیکن میں ڈر گیا کیونکہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پستول تھا۔ اس کا چہرہ ماسک سے ڈھکا ہوا تھا۔ لباس بھی سیاہ اور قد چھ فٹ کے قریب تھا۔''

''بے وقوف آدمی! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' شوکت اور نیلم دونوں اس پر برس پڑے۔

''بس غلطی ہو گئی جناب۔ میں ڈر گیا کہ اگر بتاؤں گا تو بزدل کہلاؤں گا کہ میں نے آگے بڑھ کے کچھ بھی نہ کیا۔''

☆☆☆

انسپکٹر عمران نے باری باری ملازموں اور نیلم کی سہیلیوں سے تفتیش کی۔ پھر نیلم کے بھائی منیر اور رمیز سے باری باری انسپکٹر عمران نے پوچھ گچھ کی۔ انسپکٹر عمران نے ملازموں اور شوکت سے سوالات کر کے گھریلو حالات معلوم کر لیے تھے۔

نیلم ایک مالدار خاتون تھی جس کا اپنا ذاتی شادی ہال، بیوٹی پارلر اور ایک عدد پلازا بھی آمدنی کا معقول ذریعہ تھا۔ اس کا خاوند شوکت آج کل تنگ دست تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے مل کر پراپرٹی ڈیلنگ کا کام کرتا تھا۔ جو آج کل خسارے میں جارہا تھا۔

نیلم نے مالدار ہونے کے باوجود اخراجات کا بوجھ اپنے خاوند پر لاد رکھا تھا۔ وہ طنز و استہزا کا مظاہرہ بھی کیا کرتی تھی۔ شوکت دل مسوس کر رہ جاتا کہ اس کا واسطہ ایک انتہائی کنجوس عورت سے پڑ چکا ہے جو خاوند کو طنز کے نشتر چبھو چبھو کر خوشی محسوس کرتی ہے۔

نیلم کے بھائی منیر کو جوئے کی عادت تھی اور وہ ہر وقت مقروض رہتا تھا۔ مختلف حیلے بہانے سے بہن سے روپیا اینٹھتا رہتا تھا۔ رمیز کوئی کام کاج باقاعدہ نہیں کرتا تھا۔ وہ شراب فروخت کرنے کا دھندا کرتا تھا اور دو بار کا سزا یافتہ بھی تھا۔ روپے کی اسے بھی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔

انسپکٹر عمران نے نیلم کی کوٹھی کے قریب رہنے والی سہیلیوں نیلوفر اور ماہا سے سیاہ پوش لٹیرے کے متعلق استفسار کیا۔ دونوں نے کہا کہ ''ایک رات وہ اپنے اپنے اسکوٹر پر مکڈونلڈ سے برگر کھا کر واپس لوٹ رہی تھیں تو انہوں نے ایک دراز قد، چوڑے سینے والے نقاب پوش کو ایک گھر کی دیوار پھلانگ کر باہر نکلتے دیکھا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاہ پوش واقعی کوئی پُراسرار لٹیرا ہے۔ فرضی کردار نہیں۔'' انسپکٹر عمران بڑبڑایا۔ نیلم کی ایک نئی سہیلی سائرہ کئی دنوں سے اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ اسے دوبارہ انسپکٹر عمران نے طلب کیا۔

''سائرہ صاحبہ! معلوم ہوا ہے کہ آپ کے مالی حالات بہت خراب ہیں۔ آپ کئی دنوں سے مسز شوکت کے قریب تھیں۔ بلکہ نئی سیکریٹری کی ملازمت بھی جوائن کر چکی تھیں۔ آپ نے مسلسل نگرانی سے یا کھڑکی کھلی رہ جانے پر باہر سے جھانک کر مسز شوکت کو بیڈ شیٹ کے نیچے خفیہ خانے سے چابی نکال کر الماری کی تجوری کھولتے دیکھ لیا تھا۔ نیا میکلس دیکھ کر آپ کے منہ میں پانی آگیا اور آپ نے کل کسی وقت موقع پا کر تجوری کا صفایا کر دیا۔ زیورات اور نقدی کسی کے حالات کو فرش سے عرش تک لے جا سکتے ہیں۔''

''انسپکٹر صاحب! بس کیجیے آپ سراسر فضول الزام تراشی کر رہے ہیں۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں کہ باجی چابی کہاں رکھتی تھیں۔ میرے کمرے کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ کیا کچھ برآمد ہوا؟'' سائرہ کے لہجے میں تیزی آگئی۔

''آپ شرلاک ہومز نہیں بن سکتے جناب۔'' وہ چلا کر بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بعد منیر کو دوبارہ بلایا گیا۔

''منیر صاحب! آپ جوئے میں بڑی بڑی رقمیں ہار گئے تھے۔ آپ کو دھمکیاں مل رہی تھیں کہ ہماری ادائیگیاں کریں ورنہ..... اس لیے آپ نے اپنی بہن کی ریکی کر کے تجوری کا صفایا کر دیا؟'' انسپکٹر عمران نے اپنی تیز نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔

منیر کے چہرے پر شدید ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ پھر اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میری دو بار تلاشی ہو چکی ہے۔ آپ کی ٹیم نے یک ایک چیز کا بغور جائزہ لیا ہے۔ ایک بار پھر کوشش کر کے دیکھ لیں۔''

''ضرور کوشش کروں گا اور لوٹ کا مال اسی کوٹھی سے برآمد ہوگا۔ وہ نقاب پوش بھی یہیں کہیں موجود ہے مہمانوں کے درمیان۔'' انسپکٹر عمران نے تیز لہجے میں میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ کچھ دور بیٹھے مہمان انسپکٹر عمران کو پھیلی نظروں سے دیکھنے لگے۔

پھر رمیز کو بلایا گیا۔ ''رمیز صاحب! آپ بھی شک سے بری نہیں ہیں۔ آپ اپنے بھائی کے معاون تھے۔ روپیہ اور نقدی چھپانے کی ذمے داری آپ کی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''بالکل غلط جناب! میں اپنی غلطیوں سے دوبار کا سزا یافتہ ہوں۔ لیکن بہن کو لوٹنے کا خیال ہی میرے لیے اذیت ناک ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ہمارے خون کا رشتہ اتنا کمزور نہیں جو پیسے کی تلوار سے کٹ جائے۔'' رمیز نے بھی تلملا کر جواب دیا۔

انسپکٹر عمران اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ پھر اس نے پیش قدمی کرتے ہوئے پوری کوٹھی کے کمروں، اسٹور رومز یا الماریوں، برآمدوں، کاریڈورز، عقبی باغ سبھی مقامات کا جائزہ لیا۔ جب وہ واپس پہنچا تو اس کے اسسٹنٹس فرحان، رؤف، ابراہیم اور اسرار سب مہمانوں اور دیگر افراد کو ہال میں جمع کر چکے تھے۔

انسپکٹر عمران حاضرین کے سامنے ایک اونچی گول نشست سے ٹیک لگا کر کھڑا سب کو اپنی نظروں کے حصار میں لے رہا تھا۔ کرسی کے قریب ہی کوئی شے میز پر سیاہ رومال سے ڈھکی ہوئی تھی جسے دیکھ کر اس کی مسکراہٹ گہری ہونے لگی۔

☆☆☆

''آپ تو چوبیس گھنٹے میں مجرم کو پکڑنے کے ماہر ہیں۔ وہ وقت اب ختم ہونے ہی والا ہے۔'' نیلم نے بے صبری سے صبح کے سورج کی کرنوں کو کھڑکی کے راستے اندر جھلملاتے دیکھ کر کہا۔

''بس آپ کے خاوند کا انتظار ہے۔'' اس وقت شوکت تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا انسپکٹر عمران کے بالکل سامنے والی خالی نشست پر آکر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر عمران نے سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر کھنکھار کر کہنے لگا۔

''خواتین وحضرات! یہ کیس ایک ایسی شخصیت سے متعلق ہے جس کے مالی حالات بے حد خراب تھے۔ اس نے تجوری کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے وقتی طور پر ایک سیاہ پوش لٹیرے کا روپ دھارا۔ تاکہ سارا شک اسی ڈاکو پر کیا جائے کہ وہی تجوری لوٹ کر فرار ہو گیا ہے۔ اس سیاہ پوش لٹیرے نے دو تین چھوٹی چھوٹی وارداتیں ضرور کی ہیں مگر اس کا اصل مقصد مسز شوکت کی تجوری کو صاف کرنا تھا۔'' انسپکٹر عمران سانس لینے کے لیے رکا۔

لوگ تجسس اور سسپنس کی کیفیت میں پہلو بدلنے لگے۔ بعض تو ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ سسپنس کی حالت میں ایک ایک لمحہ بھاری گزرنے لگا۔ انسپکٹر عمران نے سلسلۂ کلام جوڑنے سے قبل چند چہروں کو گہری نگاہ سے دیکھا پھر اچانک ہی اس کی نظروں کا رخ بدلا۔

''ہاں تو مسٹر شوکت مرزا! آپ ہی اپنی بیگم کے مجرم ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے، ایسا نہیں ہو سکتا، انہیں کیا ضرورت تھی؟'' حیرت بھری آوازیں ہال میں اُبھریں۔

''مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں ایسا کرتا۔ یہ تو ایک بے ہودہ الزام ہے۔'' شوکت کرسی سے اٹھ کر دہاڑا۔ ''میں ابھی اپنے وکیل اور دوست انسپکٹر کامران کو فون کرتا ہوں۔''

''انہیں ضرور بلوا لیجیے لیکن آپ بچ نہیں سکیں گے۔ میں نے جب آپ کے کمرے کی تلاشی کے دوران آپ کی بڑی الماری کا جائزہ لیا تو درمیانی راڈ پر خون کا ایک نشان لگا ہوا تھا جو آپ کے ہاتھ کے زخم سے نکلا ہوگا۔ میں نے جب الماری کی درزوں وغیرہ کا جائزہ لیا تو حیرت سے اچھل پڑا۔ ایک چوہے کی قربانی نے چور کو بے نقاب کر دیا ہے۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی انسپکٹر عمران نے قریبی میز سے کپڑا ہٹا دیا۔ وہاں ایک مردہ چوہا پڑا تھا۔

''اس چوہے کی دم الماری کی درز میں پھنسی ہوئی تھی۔ چوہا اندر کہیں غائب تھا۔ ایک خیال کے تحت جب میں نے راڈ کو درمیان سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو الماری کی پچھلی دیوار سرک گئی اور دوسری طرف سامنے خفیہ خانہ دکھائی دینے لگا۔ جہاں وہ سیاہ نقاب، سیاہ لباس، سیاہ جوتے، جنہیں کپڑا ٹھونس کر آپ پہنتے تھے مل گئے۔ آپ کا پاؤں دس نمبر کے جوتے میں سما جاتا ہے۔ آپ چور کے جوتے کے سائز کو بڑا ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ وہاں چاقو اور پستول بھی ملے ہیں جن پر آپ کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔''

اس وقت مہمانوں میں سے کوئی بول اٹھا۔ ''انہیں چوہے کی دم کیوں نہ نظر آگئی؟'' انسپکٹر عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس وقت شاید لائٹ چلی گئی تھی اس لیے دُم ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہی اور دم اٹکنے کے بعد سے دوبارہ انہیں خفیہ خانہ کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔''

اس وقت غصے اور مایوسی کے عالم میں شوکت نے پستول نکال لیا لیکن انسپکٹر عمران کے اسسٹنٹ فرحان نے فائر کر کے اس کا ریوالور گرا دیا اور باقی نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ شوکت سر جھکائے کھڑا تھا۔

آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نیلم قریب آکر ایک جلتی نگاہ شوہر پر ڈال کر بولی۔ ''شوکت مرزا! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ مجھ سے کہہ دیا ہوتا، جو آپ کو چاہیے تھا۔''

''تم..... تم سے زیادہ کنجوس عورت شاید ہی اس دنیا میں کوئی ہو۔'' شوکت پھٹ پڑا۔ ''میں مقروض اور پریشان تھا۔ تم نے میرا مذاق اڑایا۔ میری مدد نہ کی اور ٹال مٹول سے کام لیتی رہیں۔ طنز و استہزا کا مظاہرہ تو تم شروع سے ہی کرتی چلی آرہی ہو۔ میں وقت سے سمجھوتا کرتے ہوئے دن گزار رہا تھا۔ پھر آخر پانی سر سے گزر گیا۔ قرض وصول کرنے والے مجھے دھمکیاں دینے لگے۔ مجھے مجبوراً سیاہ پوش لٹیرے کا روپ دھارنا پڑا اور دو تین چھوٹی وارداتوں کے بعد میں نے تمہاری تجوری کا صفایا کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ میں نے تمہیں بیڈ شیٹ اٹھا کر بیڈ کی پٹی کے خفیہ خانے سے چابی نکالتے دیکھ لیا تھا۔ اگر تم نے کبھی مجھے شوہر صحیح معنوں میں سمجھا ہوتا، مجازی خدا مانا ہوتا، میرا احساس کیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔'' شوکت کی آواز رندھ گئی۔ پھر وہ تیز نظروں سے چوہے کی دم کو دیکھنے لگا جس نے سارا کام خراب کر دیا تھا۔

اب نیلم کا سر جھک گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ قصوروار تو وہ بھی ہے۔

❖❖❖

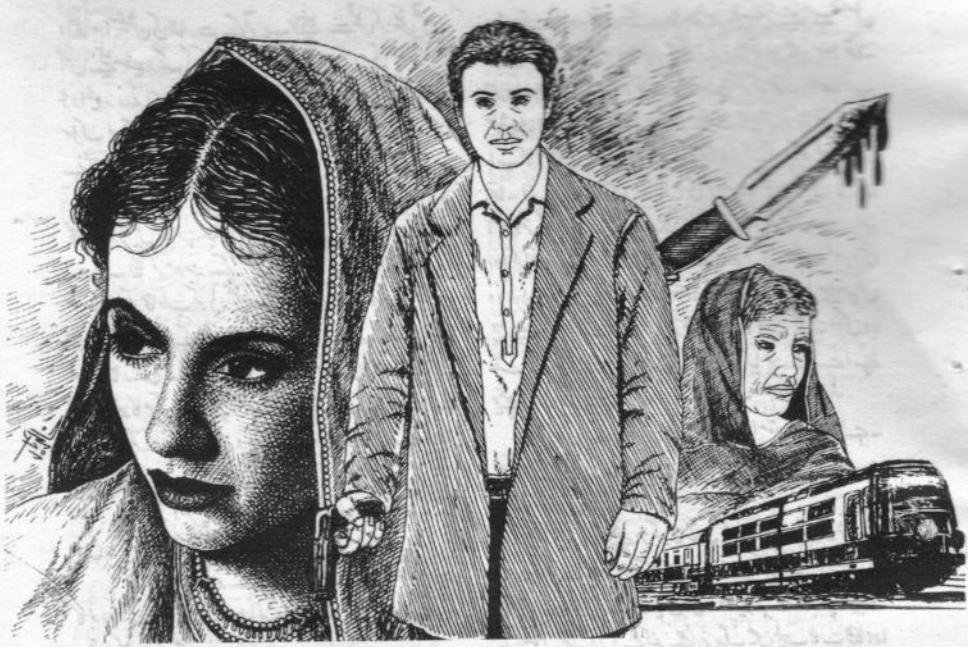

شناسا

عمران قریشی

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے... مگر وہ پوری ملاقات کی متمنی تھی... بنا سوچے سمجھے وہ لمبے سفر پر نکل گئی... راستے اجنبی تھے اور منزل دور ہوتی جارہی تھی کہ ایک اجنبی کی آمد نے اس کے لیے آسانیاں پیدا کردیں...

شناسائی کے مراحل سے گزرنے والے ایک اجنبی کا احوال.....

حمنیٰ کمپارٹمنٹ سے نکل کر لوگوں کے جم غفیر میں جگہ بناتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ غازی آباد کا اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن .... انڈسٹریل ایریے کی بہتات تھی، اس لیے فیکٹریوں میں کام کرنے والے زیادہ تر دور دراز کے علاقوں سے آتے تھے۔ وہ ٹرین کے سفر کو ترجیح دیتے تھے۔ حمنیٰ کو معلوم ہوتا تو وہ متبادل ذریعہ استعمال کرتی۔ اسے شور شرابا اور بھیڑ قطعی پسند نہیں تھی۔ اسٹیشن کی عمارت کے باہر ٹیکسیوں اور رکشوں کا رش تھا۔ وہ آن لائن ٹیکسی کا

انتظام اسٹیشن کی عمارت کے قریب پہنچنے سے قبل کر چکی تھی۔ اس لیے سفید رنگ کی کرولا عمارت کے باہر اس کی منتظر تھی۔ ڈرائیور نے اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ ذیلی سڑک پر پہنچنے کے بعد اس نے ایڈریس دریافت کیا۔ اس نے فہیم کا ایڈریس بتا دیا۔

لنک روڈ فاضل اسکوائر، فلیٹ نمبر اسی۔ ڈرائیور نے گاڑی دائیں جانب جاتی ہوئی سڑک پر موڑ دی۔ وہ سیٹ سے ٹیک لگا کر مومنہ کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ اپنی ماں کو مومنہ کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر غازی آباد آئی ہے تب انہیں بہت غصہ آتا۔ اس نے ہینڈ بیگ .... سے موبائل نکالا اور آفس میں ساتھ کام کرنے والی آئمہ کا نمبر ڈائل کر کے رابطہ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔

''واسکیر انٹر پرائز، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔''

حمنٰی مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آئمہ کی بچی، اگر مومنہ کا فون آئے تو انہیں جھوٹ کہہ دینا کہ میں سائٹ پر ہوں، وہ شام کو فون کر لیں۔''

''تو غازی آباد خیر خیریت سے پہنچ گئی۔ اس سے ملاقات ہوئی۔ میرے خیال میں وہ تجھ سے کم نہیں ہوگا۔'' آئمہ بولی۔

''میں اسے جانچنے پرکھنے کے لیے غازی آباد نہیں آئی ہوں۔ اسے زور زبردستی میرے سر منڈھ دیا گیا۔ رشتے سے انکار کر کے سات بجے والی ٹرین سے واپس آجاؤں گی۔''

''مجھے تیرے انکار کی وجہ سمجھ نہیں آرہی۔ مومنہ بتا رہی تھی کہ اس کا ذاتی شوروم ہے۔ شادی کے بعد روزانہ گاڑیاں تبدیل کرنا، کوٹھی میں نوکر چاکر کام کرتے ہیں، تو بیٹھ کر راج کرنا۔''

''وہ فاضل اسکوائر کے فلیٹ میں رہائش پذیر ہے۔ کھانا پکانا، کپڑے دھونا، سب خود کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ شو روم کا کام بھی ٹائم پاس سے زیادہ نہیں ہے۔ بس یہ یاد رکھنا کہ مومنہ کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں فہیم سے ملاقات کے لیے غازی آباد آئی ہوں۔''

آئمہ نے یقین دہانی کے بعد فون بند کر دیا۔

حمنٰی نے فہیم کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ انکیج جا رہا تھا۔ ٹیکسی انڈسٹریل ایریے میں داخل ہو گئی۔ یہاں فیکٹریوں اور کارخانوں کی قطار تھی۔ صبح کے سوا دس بج رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ تھا۔ لنک روڈ انڈسٹریل ایریے سے متصل رہائشی علاقہ تھا۔ اس کا شمار مہنگے ترین علاقوں میں ہوتا تھا۔ اس کی ماں نے فہیم کا انتخاب کچھ سوچ کر کیا تھا۔ وہ صاحب حیثیت اور صاحب اختیار تھا اور فلیٹ میں تنہا رہتا تھا۔ ماں باپ کا انتقال چند سال قبل ہوا تھا اور آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس کی ماں حمنٰی کی ماں کی دوست تھی۔ ٹیکسی فاضل اسکوائر کی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس نے کرایہ ادا کیا اور نیچے اتر کر عمارت کے اندر آگئی۔ فلیٹ نمبر اسی دوسری منزل پر تھا۔ لفٹ آؤٹ آف آرڈر تھی۔ سیڑھیاں چڑھنے کی مشقت سے اسے سخت کوفت ہوتی تھی۔ ابھی وہ لفٹ کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے، اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔

''ہال کے دوسری طرف لفٹ استعمال میں ہے۔ میں اسی طرف جا رہا ہوں اگر آپ چلنا چاہیں تو میرے ساتھ آجائیں۔''

حمنٰی نے پیچھے مڑ کر مخاطب کی جانب دیکھا۔ نہایت وجیہہ شخصیت کا دراز قد نوجوان سامنے کھڑا تھا۔ اس کی عمر پچیس سے تیس کے درمیان تھی۔ سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے کندھے پر بیگ میں لیپ ٹاپ لٹکا ہوا تھا۔ وہ اس کی شخصیت کے سحر میں تقریباً کھو کر رہ گئی۔ تاہم نوجوان نے اسے زیادہ دیر کھڑے رہنے کا موقع نہیں دیا اور تیزی سے چلتا ہوا سیڑھیوں کے ساتھ بنے برآمدے میں داخل ہو گیا۔ برآمدے میں چند کمروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ انتظامیہ کے کمرے تھے جن کے آخر میں لفٹ کا دروازہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ حمنٰی نے جھجکتے ہوئے اپنے پیچھے نگاہ دوڑائی۔ وہ تنہا اس نوجوان کے ساتھ لفٹ میں داخل ہونے سے ہچکچا رہی تھی۔

نوجوان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''سفر زیادہ لمبا نہیں ہے۔ شاید دو منٹ بھی نہیں لگیں گے پھر بھی اگر مجھ پر اعتبار نہیں تو آپ پہلے لفٹ استعمال کر سکتی ہیں۔''

حمنٰی خجالت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں یہاں پہلی دفعہ آئی ہوں۔ کسی سے جان پہچان نہیں ہے۔ جھجک ہونا فطری بات ہے۔ تاہم آپ مجھے معقول انسان دکھائی دیتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ دوسری منزل تک سفر کر سکتی ہوں۔''

نوجوان نے مسکراتے ہوئے لفٹ میں قدم رکھ دیا۔ حمنٰی کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کے لباس سے آتی یوڈی کلون کی خوشبو لفٹ کے مختصر کمرے میں پھیل گئی۔ نہ جانے کیوں وہ اس کی خوب صورت شخصیت سے متاثر ہو کر تقریباً گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ ورنہ انتہائی درجے کی باتونی لڑکی تھی۔ وہ وائیکر انٹر پرائزز میں تین سال سے ڈیٹنگ کا کام کر رہی تھی۔ تمام دن اس کا سابقہ مردوں سے پڑتا رہتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ نہایت خود اعتمادی سے بات چیت کیا کرتی تھی۔ اسے یاد نہیں کہ وہ کبھی کسی کی ذات سے متاثر ہوئی ہو۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد نوجوان بولا۔ ''لفٹ آپریٹر کے فرائض مجھے انجام دینے ہوں گے۔ کون سی منزل پر جایئے گا، میں بٹن دبائے دیتا ہوں۔''

حمنٰی نے دوسری منزل کے متعلق بتا دیا۔

وہ بٹن دباتے ہوئے بولا۔ ''درحقیقت یہ لفٹ انتظامیہ کے استعمال میں رہتی ہے چونکہ باہر والی لفٹ آؤٹ آف آرڈر ہے اس لیے مجبوراً اسے استعمال کے لیے کھول دیا گیا ہے۔''

حمنٰی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

نوجوان نے دوبارہ پوچھا۔ ''کچھ دیر پہلے آپ نے بتایا تھا کہ یہاں آپ کا جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ پھر دوسری منزل پر کس سے ملنے کے لیے جا رہی ہیں؟''

لفٹ جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔

وہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ''فلیٹ نمبر اسّی میں میرا منگیتر رہائش پذیر ہے۔ مجھے اس سے مل کر شام کی گاڑی سے واپس جانا ہے۔'' بات مکمل ہونے کے بعد اس نے جواب سنے بغیر راہداری میں قدم آگے بڑھا دیے۔ اسے اپنے پیچھے لفٹ کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ توجہ دیے بغیر فلیٹ تک آ گئی۔ دروازے پر نہیم احمد کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو وہ بغیر آواز پیدا کیے کھل گیا۔ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔ ''اندر کوئی ہے؟'' جواب موصول نہیں ہوا۔ حمنٰی نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ لائٹ آف تھی لیکن کھڑکیوں میں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ کمرا خالی پڑا تھا۔ باتھ روم کی لائٹ آن تھی۔ وہاں کوئی تھا۔ باتھ روم کے ساتھ بیڈ روم کا دروازہ تھا۔ اس نے اندر جھانکا۔ بیڈ کے سامنے والی دیوار پر ایل سی ڈی لگا ہوا تھا۔ اس کے دائیں جانب وسیع و عریض کھڑکی تھی۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر فریم میں کسی نوجوان کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یقیناً نہیم کی تھی۔ اس نے جائزہ لیا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے کے نقوش بہتر تھے۔ قد درمیانہ اور بال لمبے تھے۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ مومنہ کا فون تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

مومنہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''

حمنٰی نے بتایا۔ ''آفس میں ہوں۔ خیریت تو ہے؟''

مومنہ کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''لیکن آئمہ بتا رہی تھی کہ تم سائٹ پر ہو، یہ کیا چل رہا ہے؟ مجھے فوراً ویڈیو کال کرو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کہاں ہو؟''

''آپ کو وہم کی بیماری ہے۔ میں سائٹ پر ہی ہوں۔ میرے منہ سے لاشعوری طور پر آفس نکل گیا۔ کچھ دیر بعد آپ کو ویڈیو کال کرتی ہوں۔'' اس نے جواب سنے بغیر فون آف کر دیا اور مسکراتے ہوئے سوچنے لگی۔

لڑکا ہینڈسم ہے لیکن تصویر اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔ نہ جانے کیسی طبیعت کا مالک ہوگا۔ اسے شکی مزاج اور رنگین طبیعت کے نوجوانوں سے نفرت تھی۔ سنجیدہ اور باوقار انسان اسے پسند تھے جیسے لفٹ والا نوجوان۔ فہیم اور اس کی شخصیت میں زمین و آسمان کا فرق دکھائی دیتا تھا۔ مومنہ کو بھی لے دے کے فہیم ہی پسند آیا تھا۔ اس کی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر عامر خان نے چند دن قبل اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ حمنٰی کو اس کی ذات میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم وہ فہیم سے لاکھ درجے بہتر تھا۔ مومنہ نے ایک ہی ملاقات کے دوران اس میں دس عیب تلاش کر لیے تھے۔ کافی عمر کا ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ غالباً دو بچے بھی تھے جو اس کی ماں کے پاس رہتے تھے۔ مکان کرائے کا ہے اور جس کمپنی میں مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہے وہاں تنخواہ کم ہے۔ انہوں نے حمنٰی سے پوچھے بغیر صاف انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ رضامند تھی۔ عامر کی شاندار پرسنالٹی اور سوبر طبیعت سے تمام اسٹاف متاثر تھا۔ عمر میں وہ حمنٰی سے کافی بڑا تھا لیکن وہ اسے قبول کر سکتی تھی۔ اسے بڑی عمر کے مرد پسند تھے اور پہلے سے شادی شدہ ہونے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ طلاق کے بعد رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ فہیم نے پہلے سے شادی نہیں کی ہوئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہو اور بچے کسی یتیم خانے میں پل رہے ہوں۔ اس کی نسبت عامر ایک صاف گو اور مخلص انسان تھا۔ اس نے اپنی شادی اور بچوں کے متعلق مومنہ کو صاف صاف بتا دیا تھا۔ اگر نہ بتاتا تو کیا مومنہ کو اس کے متعلق معلوم ہو سکتا تھا۔ فلیٹ کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ اٹھ کر سٹنگ روم سے ہوتی ہوئی دروازے کی طرف آ گئی۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول

دیا۔ سامنے لفٹ والا نوجوان کھڑا تھا۔ حمنیٰ نے حیرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''مجھے فہیم صاحب سے کچھ کام ہے، کیا وہ اندر ہیں؟''

''نہیں فلیٹ خالی پڑا ہے۔ تاہم باتھ روم کی لائٹ آن ہے لیکن میرے خیال میں اندر کوئی نہیں ہے۔''

نوجوان بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر تم فلیٹ میں کیا کر رہی ہو؟ کیا تمہیں تنہا فلیٹ میں خوف محسوس نہیں ہوتا؟''

حمنیٰ نے غصیلے لہجے میں جواب دیا ''وہ میرا منگیتر ہے۔ اگر فلیٹ سے باہر گیا ہے تو یقیناً واپس بھی آئے گا۔ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔''

نوجوان فلیٹ کے اندر آ گیا۔ اس نے باتھ روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے دروازے پر دستک دی؟''

''نہیں، لیکن فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد میں نے اسے مخاطب کر کے اپنی آمد سے مطلع کیا تھا۔ مجھے جواب موصول نہیں ہوا۔''

''ہٹو، میں دیکھتا ہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر باتھ روم کے دروازے پر دستک دی۔ اندر خاموشی طاری رہی۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ پھر گھبراہٹ کے عالم میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ باتھ روم کے ٹائلوں پر خون کی سرخ لکیر باتھ ٹب تک چلی گئی تھی۔ ٹب کے اندر لاش پڑی تھی۔ اس کے الٹے ہاتھ کی رگ کٹی ہوئی تھی اور ٹب کے پاس پھل کاٹنے والی چھری گری ہوئی تھی۔ حمنیٰ نے تمام منظر نوجوان کی کمر کے پیچھے سے دیکھ لیا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔ آنکھیں خوف کی شدت سے پھٹنے لگیں۔

نوجوان نے باتھ روم کا دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ فہیم کی لاش ہے؟''

حمنیٰ نے ہراساں لہجے میں بتایا۔ ''ہاں، وہی ہے۔ لیکن اسے قتل کس نے کیا؟''

نوجوان بولا۔ ''مجھے خودکشی کا معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ ٹب کے پاس چھری بھی پڑی ہے۔ ہمیں پولیس کے آنے سے پہلے فلیٹ سے دور چلے جانا چاہیے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو مسئلے میں ملوث بھی کیا جا سکتا ہے۔''

دونوں عجلت کے عالم میں فلیٹ سے باہر آ گئے۔ راہداری خالی پڑی تھی۔ لفٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر داخل ہونے کے بعد تیسری منزل کا بٹن دبا دیا۔

حمنیٰ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں واپس ریلوے اسٹیشن جانا چاہتی ہوں۔ غازی آباد مجھے راس نہیں آیا۔''

نوجوان مسکراتے ہوئے بولا۔ ''شام پانچ بجے سے قبل کوئی ٹرین غازی آباد روانہ ہونے والی نہیں ہے۔ تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔''

''تو پھر مجھے کسی ہوٹل میں کمرا لے دو۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔''

نوجوان نے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے بتایا۔ ''فہیم کی لاش ملنے کے بعد چھوٹے سے شہر میں ایمرجنسی نافذ ہو جائے گی۔ غازی آباد سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔ تمہارے لیے میرے فلیٹ سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔''

حمنیٰ خاموش ہو گئی۔ لفٹ تیسری منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ نوجوان نے دروازہ کھولا اور اسے لیے راہداری کے آخر کے فلیٹ کی طرف آ گیا۔ یہ فہیم کے فلیٹ کے اوپر بنا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ چند لمحے شش و پنج میں مبتلا رہنے کے بعد حمنیٰ فلیٹ کے اندر آ گئی۔ سٹنگ روم کے صوفے پر بیٹھنے کے بعد اس نے ہینڈ بیگ میں موبائل تلاش کیا۔ وہ بیگ نہیں تھا۔ اس نے پریشان ہو کر نوجوان کی طرف دیکھا۔

وہ بولا۔ ''شاید کچھ کھو گیا ہے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تلاش کر لوں گا۔''

حمنیٰ کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔ آخری فون اس نے اپنی ماں کو کیا تھا غالباً فہیم کی خواب گاہ سے، پھر موبائل بند کرنے کے بعد شاید اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ رو دینے والے لہجے میں بولی۔ ''میں اپنا موبائل نچلے فلیٹ میں چھوڑ آئی ہوں۔ اگر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو بلاوجہ کی مصیبت گلے پڑ جائے گی۔''

اس دفعہ نوجوان کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ تاہم وہ دلاسا دینے والے لہجے میں بولا۔ ''اتنی جلدی پولیس کے آنے کی امید نہیں، تم یہیں بیٹھو۔ میں موبائل لے کر ابھی واپس آتا ہوں۔'' وہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

حمنیٰ نے تاسف بھرے انداز میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور اس وقت کو کوسنے لگی جب اس نے غازی آباد آنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ آفس میں بیٹھ کر فہیم سے موبائل پر بہ آسانی بات چیت کر سکتی تھی۔ غازی آباد آنے کی وجہ

صرف اتنی تھی کہ وہ تفصیلی ملاقات کے بعد اسے پرکھنا چاہتی تھی۔ اگر وہ اسے متاثر کرنے میں کامیاب ہوتا تب وہ انکار نہ کرتی۔ وہ مومنہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس بدگمانی کے پیچھے کسی حد تک ہاتھ آئمہ کا بھی تھا۔ گزشتہ سال اس کی شادی جس شخص سے ہوئی تھی، وہ نہایت تلخ مزاج اور شکی طبیعت کا تھا۔ آئمہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ میٹرک پاس ہے۔ شادی سے قبل کسی پرائیویٹ فرم میں چھوٹی موٹی نوکری کرتا تھا۔ بعد از شادی اس نے نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کے شوہر نے شادی سے پہلے اپنے متعلق جو دعوے کیے تھے۔ وہ سب جھوٹ ثابت ہوئے تھے۔

وہ انہی سوچوں میں تھی کہ فلیٹ کا دروازہ کھول کر نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مضطرب لہجے میں بولا۔

''پولیس فہیم کے فلیٹ میں داخل ہو چکی ہے اور انہوں نے تمہارے موبائل پر قبضہ کر لیا ہے۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ تم میرے ساتھ نیچے چل کر سب کچھ تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے بیان کر دو۔ قتل تم نے نہیں کیا پھر ڈرنے یا جھجکنے کی کیا ضرورت ہے۔''

حمنٰی خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہیں کروں گی۔ جب وہ مجھے فہیم کے قتل سے منسوب کریں گے تب میری عزت نیلام ہو جائے گی اور میں کسی سے نظریں نہیں ملا سکوں گی۔''

نوجوان بولا۔ ''قتل کا ثبوت پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر انہوں نے اخلاقی حدود پھلانگنے کی کوشش کی تو میں انہیں ان کی اوقات یاد دلا دوں گا۔'' حمنٰی نے کوئی جواب نہیں دیا اور نوجوان اس کا ہاتھ تھامے فلیٹ سے نکل کر لفٹ کی طرف آ گیا۔ اس نے دوسری منزل کا بٹن دبا دیا پھر لفٹ کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ لفٹ دوسری منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ نوجوان نے دروازہ کھول کر باہر قدم رکھا۔ حمنٰی نے اسے پوری طاقت سے دھکا دے کر دروازہ بند کر دیا۔ نوجوان چاروں شانے چت زمین پر گرا پھر نہایت پھرتی کے ساتھ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس اثنا میں دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے چلاتے ہوئے حمنٰی کو تنبیہہ کی۔

''تم پولیس کی گرفت سے نکل کر فرار نہیں ہو سکتیں، اگر ہو بھی گئیں تو وہ تمہیں مفرور قرار دے کر تمام پولیس اسٹیشنوں کو تلاش کے آرڈر جاری کر دیں گے۔''

حمنٰی نے توجہ دیے بغیر نچلی منزل کا بٹن دبا دیا اور لفٹ تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگی۔ اس کے دماغ میں کوئی خاص لائحہ عمل نہیں تھا۔ وہ تو بس غازی آباد سے دور چلے جانا چاہتی تھی۔ لفٹ پہلی منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ وہ باہر نکل کر راہداری میں سے ہوتی ہوئی ہال کمرے میں آ گئی۔ وہاں معمول کی چہل پہل تھی۔ لگژری فلیٹوں کے اس احاطے میں پولیس کا دھڑلے کے ساتھ داخل ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے داخلے کے لیے یقیناً عقبی راستے کا تعین کیا ہوگا۔ وہ ہال کمرے سے نکل کر عمارت کے خارجی گیٹ کی طرف آ گئی۔ گیٹ کے سامنے ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ اس نے پہلی ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ ٹیکسی نہایت سُبک رفتاری سے گاڑیوں کے ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کے پرس میں اچھی خاصی رقم کے علاوہ اے ٹی ایم کارڈ بھی موجود تھا۔ اس لیے اسے فکر نہیں تھی۔ خدشہ یہ لاحق تھا کہ کہیں پولیس ناکا بندی کروا کے داخلی خارجی راستوں پر پہرا نہ لگا دے۔

اسٹیشن کی عمارت تک پہنچنے میں اسے آدھا گھنٹا لگا۔ حالات معمول پر تھے۔ اس نے ٹیکسی سے اترنے کے بعد عجلت کے عالم میں عمارت کا رخ کیا۔ بکنگ آفس کے قریب رش تھا۔ مسافر ٹکٹوں کے حصول کے لیے باقاعدہ ہاتھا پائی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم عورتوں والی طرف چند خواتین دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے کھڑی ہو گئی لیکن پھر اچانک ہی اس کی نگاہ بکنگ کلرک کے ساتھ بیٹھے پولیس اہلکار پر پڑی اور وہ ہڑبڑا کر بکنگ آفس کے سامنے سے ہٹ کر عمارت کے مین گیٹ کی طرف آ گئی۔ فرار کے راستے مسدود کر دیے گئے تھے لیکن بس کا ذریعہ ابھی باقی تھا۔ موبائل پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ ورنہ ٹوڈی کے سفر کو بس پر ترجیح دیتی۔ وہ جس ٹیکسی کے ذریعے فلیٹ سے اسٹیشن کی طرف آئی تھی۔ وہ عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو قریبی بس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور نے بتایا۔ ''شہر میں بسوں کی ہڑتال ہے۔ آپ بیرونِ شہر جانے کے لیے ٹوڈی استعمال کر سکتی ہیں۔''

حمنٰی نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

حمنٰی کے فرار ہونے کے بعد نوجوان نے فہیم کے

کمرے کا رخ کیا۔ علاقے کے پولیس انسپکٹر سے اس کی جان پہچان تھی لیکن کمرے میں جو حوالدار اپنے ساتھیوں کے ساتھ تفتیش کر رہا تھا، وہ اس سے ناواقف تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد انسپکٹر کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں بتایا۔ ''میں فلیٹ نمبر ایک سو پچیس کا رہائشی ہوں۔ میرا خودکشی کے اس کیس سے کوئی تعلق نہیں لیکن نادانستگی میں ایک بے قصور لڑکی معاملے میں ملوث ہوگئی ہے۔ وہ غازی آباد کی رہائشی نہیں ہے بلکہ آج صبح دس بجے والی گاڑی سے یہاں آئی ہے۔''

حوالدار نے حمنیٰ کے موبائل کو اس کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس کا نام حمنیٰ خان ہے تو وہ پوچھ گچھ کے لیے ہمیں مطلوب ہے۔ اس کا موبائل ہمیں بیڈ روم سے ملا ہے۔ موبائل میں سرفہرست نہیم احمد کا نمبر موجود ہے اور فلیٹ کے باہر نہیم احمد کی نیم پلیٹ آویزاں ہے۔''

نوجوان بولا۔ ''نہیم احمد اس کا منگیتر ہے۔ چند دن قبل ان دونوں کی منگنی ہوئی ہے۔ کچھ باتیں جو میں کھولنا نہیں چاہتا ہوں۔ وہ شاید پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد سامنے آجائیں گی۔ آپ صرف اس بات کو ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ قتل کا نہیں خودکشی کا کیس ہے اور میرے اندازے کے مطابق خودکشی رات کے کسی پہر ہوئی ہے جبکہ حمنیٰ آج صبح دس بجے والی ٹرین سے غازی آباد آئی ہے۔''

حوالدار نے پوچھا۔ ''وہ ہے کہاں؟ ہمیں اس کا بیان اپنے افسران کے سامنے پیش کرنا ہوگا۔ بصورتِ دیگر ہم جو قتل کے عوامل تلاش کر رہے ہیں ان میں اسے شامل کرلیں گے۔''

نوجوان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''وہ آپ کی دہشت سے خوف زدہ ہو کر فرار ہوگئی ہے۔ میں جلد اسے بیان دینے کے لیے پولیس اسٹیشن لے آؤں گا۔ برائے مہربانی آپ فون کر کے ریلوے اسٹیشن کے بکنگ آفس میں اپنا آدمی متعین کردیں۔''

حوالدار نے نوجوان سے اس کا نام پوچھا۔

''میرا نام احمد خان ہے اور میں انسپکٹر افضل خان کا دور پار کا رشتے دار ہوں۔ میرا موبائل نمبر ان کے پاس محفوظ ہے۔ اگر آپ کو مزید معلومات حمنیٰ خان کے حوالے سے درکار ہوں تو اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔''

حوالدار نے کوئی جواب نہیں دیا اور احمد کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے راہداری میں کھڑے ہو کر موبائل پر انسپکٹر سے بات چیت کرتے ہوئے اسے معاملے کی پیچیدگیوں سے آگاہ کیا اور تعاون کی درخواست کرنے کے بعد موبائل بند کردیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ حمنیٰ فرار کے لیے ٹرین کا انتخاب کرے گی۔ بظاہر چالاک اور جہاندیدہ دکھائی دینے والی حمنیٰ فطرتاً سادہ اور معصوم تھی۔ مختصر ملاقات کے دوران ہی وہ اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ چونکہ وہ ٹرین سے غازی آباد آئی تھی اس لیے ٹرین کے ذریعے ہی واپس جانے کو ترجیح دے گی۔ اگر ایک دفعہ وہ غازی آباد سے باہر جانے میں کامیاب ہوگئی تب احمد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں جن نکات کو مدِنظر رکھ کر اس نے معاملے کو دبانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کھل کر سامنے آجائیں گے۔ عمارت سے باہر نکل کر وہ پارکنگ میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف آگیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔ غازی آباد سے فرار کے لیے وہ اور کون سا متبادل ذریعہ استعمال کرسکتی تھی۔ ٹرین کے ذریعے فرار ہونا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہاں پولیس کا اہلکار متعین تھا۔ بس سروس ہڑتال کی وجہ سے متاثر تھی۔ اس کے پاس لے دے کر ٹوڈی کے ذریعے فرار ہونے کا راستہ باقی بچا تھا۔ اس لیے احمد نے گاڑی کا رخ ٹرمینل کی طرف کردیا۔ بس سروس متاثر ہونے کی وجہ سے یہاں رش بہت زیادہ تھا۔ ٹرمینل میں داخل ہونے سے قبل اس نے چہرے کو سرجیکل ماسک کے ذریعے چھپایا اور پہلے دکھائی دینے والے آفس میں داخل ہوگیا۔ اس نے انسپکٹر کا حوالہ دینے کے بعد لیہ جانے والی گاڑیوں کے متعلق دریافت کیا۔

بکنگ کلرک نے بتایا۔ ''چند گھنٹے قبل ایک بکنگ ہوئی ہے۔ تاہم ان میں عورت کوئی نہیں ہے۔ چار مردوں نے ٹوڈی بک کروائی ہے۔ وہ آفس سے نکل کر اگلی سروس کے آفس کی طرف آگیا۔ یہاں بکنگ کلرک کی سیٹ پر نوجوان خاتون براجمان تھی۔ احمد نے اپنا تعارف کروانے کے بعد لیہ جانے والی سروس کے متعلق پوچھا تو عورت نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''پندرہ منٹ قبل بکنگ ہوئی ہے۔ بیس بائیس سالہ لڑکی نے ٹوڈی لیہ تک کے لیے بک کروائی ہے۔ چونکہ ٹوڈی کا ڈرائیور میرا شوہر ہے۔ اس لیے میں کسی حد تک تفصیل سے بھی آگاہ ہوں۔ لڑکی کا نام حمنیٰ خان ہے اور کچھ گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔''

احمد نے پوچھا۔ ''کیا سروس کو معطل کر کے ٹوڈی کو واپس ٹرمینل میں بُلایا جاسکتا ہے۔ وہ لڑکی قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب ہے۔''

عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے شوہر کا فون نمبر ملانے لگی۔ احمد نے اشارے سے اسے روکتے ہوئے

بتایا۔ ”وہ حواس باختہ لڑکی یقیناً واپس آنے میں پس و پیش سے کام لے گی۔ اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اسے پولیس کے حوالے کیا جارہا ہے۔ اپنے شوہر کو سمجھا دو کہ اسے لاعلمی کے دوران شہر سے باہر واقع ہائی نیٹ ریسٹورنٹ کی جانب لے جائے۔ میں وہاں اس کا انتظار کروں گا۔“

عورت نے نمبر ملایا اور رابطہ ہونے کے بعد اپنے شوہر سے دھیمے لہجے میں بات چیت کرنے لگی۔ اسے معاملے سے آگاہ کرنے میں کچھ دقت پیش آئی لیکن آخرکار معاملہ طے ہو ہی گیا۔ اس نے احمد کو بتایا۔ ”گاڑی ابھی تک شہر سے باہر نہیں جاسکی۔ ریسٹورنٹ آبادی سے کچھ دور واقع ہے۔ آپ ان کے پہنچنے سے قبل رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔“

احمد نے اس کے شوہر کا موبائل نمبر لیا اور اپنی گاڑی کی طرف آگیا۔ اسے ہائی نیٹ ریسٹورنٹ کی طرف جانے والے اس متبادل راستے کے متعلق معلوم تھا جو شہر سے ہٹ کر ذیلی سڑک سے ہوتا ہوا کم وقت میں ہائی وے پر جا نکلتا تھا۔ اس راستے کے ذریعے وہ جمنی سے پہلے ریسٹورنٹ تک پہنچ سکتا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے موبائل پر انسپکٹر سے رابطہ کیا۔ رسمی بات چیت کے بعد اس نے حوالدار کو ہائی نیٹ ریسٹورنٹ کی طرف سادہ لباس میں بھجوانے کے لیے کہا۔ انسپکٹر نے وجہ پوچھی تو احمد نے بتایا لڑکی بہت خوف زدہ ہے۔ وہ بیان دینے سے انکاری بھی ہوسکتی ہے۔ اس کی لاعلمی کے دوران بیان لینا ہوگا۔ انسپکٹر نے اسے یقین دلایا کہ وہ جلد از جلد حوالدار کو ریسٹورنٹ کی طرف بھجوائے گا۔ احمد نے موبائل بند کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی پھر مین سڑک پر آنے کے بعد اسے ذیلی سڑک پر موڑ دیا۔

☆☆☆

ہائی نیٹ ریسٹورنٹ کی عمارت چھوٹے سے ٹیلے کے اوپر واقع تھی۔ تمام عمارت نفیس ترین چمک دار شیشوں پر مشتمل تھی اور چھت دیار کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ یہ شہر کا مہنگا ترین ریسٹورنٹ تھا۔ دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ کھانے کا وقت تھا۔ اس لیے ریسٹورنٹ میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ احمد نے جب ہال کمرے میں قدم رکھا۔ اسی وقت ایک فیملی نے ایک ٹیبل خالی کی۔ وہ ٹیبل شیشے کی دیوار کے پاس تھی جہاں سے ٹیلے کے گرد گھومتی ہوئی سڑک اور نیچے پھیلا وسیع و عریض میدان صاف دکھائی دیتا تھا۔ ویٹر کے پوچھنے پر اس نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ اس اثنا میں وہ کار پارکنگ کا بھی جائزہ لیتا رہا۔ وہاں سفید رنگ کی کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد ویٹر کافی لے آیا اور وہ

دل پزیر، دل نشیں اور دل گداز تحریروں کی خالق

مصنفہ دلشاد نسیم

کا شاہکار ناول

صراطِ عشق

ان شاء اللہ جولائی 2021ء سے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کے صفحات کی زینت بننے جارہا ہے

معاشرے میں پھیلے ان گنت مسائل اور ان کے مؤثر حل کا بے حد خوب صورت اور دل خوش کن انداز میں قلمی اظہار.....

یقیناً قارئین کے ادبی ذوق کے لیے باعثِ تسکین ہوگا

کافی پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ جب اس کا حمنٰی سے اچانک سامنا ہوگا تب اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ فرار ہونے کی کوشش کرسکتی تھی لیکن جھوٹی سی ملاقات کے دوران اس نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کی شخصیت سے کافی حد تک متاثر ہوئی تھی۔ اگر حالات بہتر رہتے تو شاید دل کا حال زبان پر بھی آجاتا۔ وہ حال دل اس کی زبانی سننے کا متمنی تھا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اب تو اس کا منگیتر بھی دنیا میں نہیں رہا تھا۔ نہ جانے اتنی خوب صورت منگیتر کے ہوتے ہوئے اس نے خودکشی کیوں کی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسے قتل کیا گیا ہو لیکن اس کے متعلق معلوم کرنا پولیس کی دردسری تھی۔ اسے سر کھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو صرف حمنٰی کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ کافی ختم ہوگی لیکن ٹوڈی نہیں آئی۔ مجبوراً اس نے جیب سے موبائل باہر نکالا اور بکنگ کلرک کے شوہر کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بعد اسے آواز سنائی دی۔

''یونیک ٹوڈی سروس.....؟'' احمد نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے اس سے لوکیشن دریافت کی۔

ڈرائیور نے بتایا۔ ''شہر سے باہر نکلتے ہی گاڑی کا پچھلا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ متبادل ٹائر تبدیل کرنے میں کچھ وقت لگ گیا اور اب وہ ریسٹورنٹ کے قریب پہنچنے والا ہے۔''

احمد نے بل کھاتی ہوئی سڑک کی طرف دیکھا۔ سفید رنگ کی کار اوپر آرہی تھی۔ اب اسے شدت سے حوالدار کی آمد کا انتظار تھا۔ گاڑی نے ٹیلے کے گرد چکر لگایا اور پارکنگ کی طرف آگئی۔ اس نے چہرے پر پہنے ماسک کو درست کیا اور ٹیبل پر ریزرو کا بورڈ لگانے کے بعد ریسٹورنٹ کے دروازے سے ہوتا ہوا پارکنگ کی طرف آگیا۔ حمنٰی یقیناً ڈرائیور سے باز پرس کررہی تھی کہ اس کی وجہ سے اسے دیر ہوگئی ہے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا گاڑی کی طرف چلا آیا۔ ڈرائیور گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے متلاشی نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ احمد نے اس کے قریب جاکر پولیس کا لفظ ادا کیا پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

اسے حمنٰی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بتارہی تھی۔ ''ٹوڈی بک ہے اور وہ اسے پولیس کے حوالے بھی کرسکتی ہے۔''

وہ چہرے سے ماسک اتارتے ہوئے بولا۔ ''اسی پولیس کے حوالے جس سے فرار ہوکر تم لیہ جارہی ہو۔''

حمنٰی کا منہ حیرت کی شدت سے کھل گیا۔

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر تم نے پولیس کو بیان دیے بغیر غازی آباد سے فرار ہونے کی کوشش کی تب تمہیں باضابطہ طور پر اشتہاری قرار دے کر تمام تھانوں میں گرفتاری کے آرڈر بھجوا دیے جائیں گے۔ کیا تم پولیس سے جان چھڑوا سکتی ہو۔ وہ آج نہیں تو کل تمہیں گرفتار کرہی لیں گے۔''

''تمہارا تعلق پولیس سے ہے تو پلیز مجھے لیہ جانے دو۔ میری ماں پریشان ہورہی ہوگی۔ میں اسے بتا کر نہیں آئی ہوں۔''

''نہیں، میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ تاہم میں پولیس کی عزت ضرور کرتا ہوں۔ بلاوجہ انہیں پریشان کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ اگر ان سے تعاون کیا جائے تو جرائم کی شرح میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔ رہی تمہاری والدہ کی بات تو تم میرے موبائل سے فون کرکے انہیں اپنی خیریت سے مطلع کرسکتی ہو۔''

حمنٰی انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ اگر دیر ہوئی تب فون استعمال کروں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''وہ تمہارا بیان قلمبند کرنے کے لیے یہاں آنے والے ہیں۔ میں سب کچھ خود سنبھال لوں گا۔ تم ان سے مکمل تعاون کرنا۔''

حمنٰی نے پوچھا۔ ''فہیم کے متعلق کچھ پتا چلا؟''

''نہیں تفتیش جاری ہے۔ لیکن میں نے حوالدار کے دماغ میں یہ بات ڈال دی ہے کہ وقوعہ رات کے کسی پہر ہوا ہے۔ اور چونکہ تم رات کو غازی آباد میں نہیں تھیں اس لیے تمہارا بیان لینے کے بعد تمہیں لیہ جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔''

اسے اپنے موبائل پر حوالدار کا فون موصول ہوا۔ اس نے موبائل آن کیا اور حوالدار کو میز کے متعلق بتانے کے بعد گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ پھر حمنٰی کے ساتھ چلتا ہوا ریسٹورنٹ کے اندر آگیا۔ ریزرویشن والی میز پر حوالدار اور اس کے دو ساتھی براجمان تھے۔ ان کے قریب پہنچنے کے بعد دونوں اہلکار کرسیوں سے کھڑے ہوگئے۔ احمد نے حمنٰی کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

حوالدار نے قریب رکھی ہوئی فائل کھولی اور قلم تھام لیا۔ احمد اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیان جلد از جلد مکمل کرنے کی کوشش کرنا، ہمیں شہر میں کچھ کام ہے اور شام والی گاڑی سے حمنٰی کو واپس لیہ جانا ہے۔''

حوالدار بولا۔ ''بس صرف چند سوالات ہیں۔ بیان میں خود ترتیب دے لوں گا۔'' اس نے قریب ہوتے ہوئے پہلا سوال پوچھا۔

''آپ کا مکمل نام.....؟''

''حمنی احمد خان..... ولد نصیر احمد خان۔''

''غازی آباد آمد کا وقت بتایئے؟''

''صبح دس بجے پنجر ایکسپریس سے.....'' حمنی مکمل تعاون پر آمادہ تھی۔

''فہیم احمد سے کیا تعلق تھا؟''

''میرا منگیتر تھا۔ تاہم باقاعدہ رسم ابھی ادا نہیں کی گئی تھی۔''

''اپنی رہائش گاہ کا مکمل ایڈریس لکھوایئے۔''

حمنی نے لیہ کا ایڈریس لکھوا دیا۔

''منگیتر کا ایڈریس اور ماں باپ کا نام بتایئے۔''

حمنی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''ہماری جان پہچان محدود تھی۔ ویسے میری ماں بتاتی ہے کہ اس کے ماں باپ حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے اور وہ غازی آباد میں اکیلا رہتا ہے۔''

حوالدار نے پوچھا۔ ''جب آپ نے کمرے میں قدم رکھا تب صورتِ حال کیا تھی؟''

''میں کچھ زیادہ نہیں دیکھ پائی، بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی ماں کا فون آ گیا۔ ان سے بات چیت مکمل ہوئی تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ان صاحب کو سامنے کھڑے پایا۔''

''تو آپ کو خودکشی کے متعلق کچھ معلوم نہیں؟''

''حمنی نے انکار میں سر ہلایا۔

''آپ نے اپنے منگیتر سے آخری دفعہ بات چیت کب کی اور اس وقت اس کی دماغی کیفیت کس نوعیت کی تھی؟''

''یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے ہمارے درمیان بات چیت نہیں ہوئی تھی۔''

''ملاقات کا مقصد بیان کریں؟''

حمنی متذبذب لہجے میں بولی۔ ''میں رشتے سے انکار کے لیے غازی آباد آئی تھی۔ ایک ایسے انسان کو میں اپنا جیون ساتھی کیسے بناتی جس کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی کہ وہ مومنہ کی سہیلی کا اکلوتا لڑکا ہے اور غازی آباد میں گاڑیوں کا کاروبار کرتا ہے۔''

حوالدار نے پوچھا۔ ''مومنہ کون ہے؟''

''میری ماں.....'' حمنی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''میں انہیں پیار سے مومنہ کہہ کر بلاتی ہوں۔''

حوالدار نے چند مزید سوالات پوچھے۔ پھر فائل حمنی کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہاں نیچے اپنے دستخط کر دیجیے۔''

حمنی نے بلا تامل دستخط کر دیے اور حوالدار فائل سنبھالے ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد احمد طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''معمول کی کارروائی تھی۔ تم ایسے ہی پریشان ہو رہی تھیں۔ اب آزاد ہو جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو۔''

حمنی نے شیشے کی دیوار سے باہر پارکنگ میں نگاہ دوڑائی۔ ٹوڈی والا نہ جانے کب کا رفو چکر ہو چکا تھا۔ وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''پولیس کی وجہ سے واپس جانے کا تمام پروگرام دھرم بھرم ہو گیا ہے۔ اب مجھے ٹرین کا انتظار کرنا ہوگا۔''

احمد مسکراتے ہوئے بولا۔ ''چونکہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ اس لیے دوپہر کا کھانا میں تمہیں کسی اچھے ہوٹل میں کھلاؤں گا۔''

حمنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ احمد نے بل ادا کیا اور گاڑی کی طرف آ گیا۔

☆☆☆

کھانے کے لیے اس نے جس ہوٹل کا انتخاب کیا، وہ شہر کا مہنگا ترین ہوٹل تھا۔ کھانے کے دوران اسے انسپکٹر کی کال موصول ہوئی۔ کچھ دیر بات چیت کے بعد اس نے موبائل آف کرتے ہوئے حمنی کو بتایا۔

''تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق فہیم نے رات تین بجے کے بعد خودکشی کی۔ جب تم غازی آباد سے بہت دور لیہ میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھیں۔ اس لیے انسپکٹر نے تمہیں خارج از تفتیش کر دیا ہے لیکن ایک اور حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا ہے کہ وہ تمہارا منگیتر نہیں ہے بلکہ اس کا نام جمال شاہ ہے۔ خودکشی کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔''

حمنی حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''پھر فہیم کہاں ہے؟ اور جمال شاہ اس کے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟''

احمد نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''تفتیش مکمل ہونے کے بعد ہی کچھ معلوم ہو گا۔ بہرحال تمہارا منگیتر زندہ ہے۔ جلد واپس آ جائے گا۔ انکار یا اقرار کے لیے تمہیں اس کا انتظار کرنا ہوگا۔''

حمنی غصیلے لہجے میں بولی۔ ''مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں مومنہ کو انکار کر دوں گی۔ اس ایک دن کی دوڑ دھوپ نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے سبز قدم نہ جانے آگے کیا گل کھلائیں گے۔ میرے خیال میں انکار بہتر ہے۔''

''تمہارے انکار کا کوئی معقول جواز مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔ اگر اس سے بہتر کوئی اور ساتھی تمہاری زندگی میں موجود ہے تو صاف صاف اسے بتا کیوں نہیں دیتیں۔ ناواقفیت والا جواز معقول نہیں۔''

حمنی سرد لہجے میں بولی۔ ''مجھے جواز پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد از جلد واپس لیہ جانا چاہتی ہوں۔ تمہاری ممنون ہوں گی اگر میرا موبائل مجھے واپس دلوادو۔''

احمد بولا۔ ''ٹھیک ہے، میرے خیال میں معاملہ صاف ہونے کے بعد تمہارا یہاں رہنا اب فضول ہے۔'' اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ ابھی ٹرین کی روانگی میں دو گھنٹے باقی ہیں۔ میرے خیال میں اگر یہ دو گھنٹے میرے فلیٹ میں گزارے جائیں تو مناسب رہے گا۔''

حمنی نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں تم مجھے اسٹیشن چھوڑ دو۔ میں وہاں انتظار کرلوں گی۔''

احمد نے کندھے اچکائے اور اٹھ کر ہوٹل کی پارکنگ کی طرف آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے حمنی کو اندر بیٹھنے کے لیے کہا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر ناراض نہ ہو تو کیا میں اس خالی ہونے والی نشست کے لیے اپنے کوائف تمہاری والدہ کو بھجوا سکتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ فہیم اب واپس نہیں آئے گا۔ جمال شاہ کو تو اسی نے کیا ہے۔''

حمنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم کوشش کر کے دیکھ سکتے ہو، مجھے یقین ہے مومنہ انکار کر دے گی۔''

احمد بھی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم نے درخواست بھیجنے کی اجازت دے کر در پردہ اقرار کر لیا ہے۔ تمہاری والدہ سے ہاں کروانا میرے لیے مشکل نہیں۔''

حمنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس مختصر ملاقات کے دوران اس سلجھے ہوئے سنجیدہ طبیعت کے مالک شخص کو پسند کرنے لگی تھی۔ فہیم کا قصہ تو ختم ہو ہی چکا تھا۔ غازی آباد سے واپس جاتے ہوئے وہ کچھ اچھی یادوں کو ہمراہ لے جانا چاہتی تھی۔ اس لیے مسکراتے ہوئے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ احمد نے پولیس اسٹیشن سے اس کا موبائل لیا اور پھر گاڑی کا رخ اسٹیشن کی طرف کر دیا۔ حمنی، آئمہ کو فون کر کے مومنہ کے متعلق بات چیت کرنا چاہتی تھی لیکن چارجنگ نہ ہونے کی وجہ سے موبائل آف ہو گیا تھا۔

احمد نے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا اپنا موبائل اٹھایا اور اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''ہو سکے تو مومنہ کو حالات سے آگاہ کرنے کے بعد میری سفارش بھی کر دینا۔ مجھے کچھ نمبر مزید مل جائیں گے۔''

حمنی نے موبائل اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور آئمہ کا نمبر ملانے لگی۔ تب اس کی نگاہ متعلقہ نمبروں کی تفصیل پر پڑی۔ وہاں اس کا نمبر موجود تھا۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟''

''انسپکٹر سے لیا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد رابطے کے لیے کچھ امید تو پاس ہونی چاہیے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا ہوں۔''

حمنی سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''فہیم کی طرح ہمارے درمیان بھی واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ اس کے باوجود اگر مومنہ نے انکار نہ کیا تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔'' اس نے جواب سنے بغیر آئمہ کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ حمنی کی آواز سنتے ہی آئمہ چیخ پڑی۔

''کہاں ہو تم اور یہ بتاؤ مومنہ کا فون تو نہیں آیا؟''

آئمہ غصے بھرے لہجے میں بولی۔ ''میرے خیال میں دس دفعہ تو ضرور کہا ہوگا اور کم و بیش اتنی ہی دفعہ میں نے تمہیں فون کیا، تمہارا موبائل بند پڑا ہوا تھا۔''

''میں بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ فون پر بتا نہیں سکتی، واپس آنے کے بعد بتاؤں گی، مومنہ کیا کہہ رہی تھیں۔''

آئمہ نے بتایا۔ ''تمہاری غیر موجودگی کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھیں۔ سائٹ والے بہانے سے وہ مطمئن نہیں ہوئیں تو ڈسٹری بیوشن چلی آئیں اور انہیں معلوم ہو گیا کہ تم غازی آباد میں ہو۔ وہ اب تمہاری آمد کی منتظر ہیں، اپنی خیر مناؤ۔''

حمنی طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''میرے خیال میں اب اس جنجال پورے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ میں مومنہ سے خود بات کرتی ہوں۔ تم میرے فون کا انتظار کرنا۔'' اس نے موبائل بند کر دیا۔ گاڑی ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ حمنی نے مومنہ سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ موبائل پر وہ

انہیں کچھ بھی سمجھا نہیں سکتی تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد بات کرنا بہتر تھا۔ دونوں گاڑی سے اُتر کر عمارت کے اندر آگئے۔ چھ بجنے والے تھے۔

وہ پلیٹ فارم کی بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے بُرے حالات میں میرا بہت ساتھ دیا۔ میں تمہارا احسان بُھلا نہیں پاؤں گی۔ اس کے باوجود تمہیں کسی بھی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا مجھے گوارا نہیں۔ میرا نمبر تمہارے پاس ہے، مجھے فہیم کے متعلق آگاہ کرتے رہنا۔''

احمد بولا۔ ''مجھے غلط فہمی میں مبتلا رہنا اچھا لگتا ہے اور تم مجھے مومنہ سے بات کرنے سے روک نہیں سکتیں۔ رہی فہیم کی بات۔ تو اسے اب بھول جاؤ۔ اگر اس نے تم سے دوبارہ تعلق قائم کرنے کی کوشش کی تو میں اسے آڑے ہاتھوں لوں گا۔'' اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے موبائل حمنٰی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ آئمہ کا فون تھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے مومنہ کی غصیلی آواز سنائی دی۔

''تمہیں مجھ سے پوچھے بغیر غازی آباد نہیں جانا چاہیے تھا۔ فوراً واپس آجاؤ۔ میں فہیم کو بھی فون کر چکی ہوں، وہ کال ریسیو نہیں کر رہا۔''

''میں واپس آرہی ہوں، میرا انتظار کیجیے۔'' حمنٰی نے کہا۔

مومنہ بولی۔ ''تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے؟ اگر رشتے سے متفق نہیں تھیں تو مجھے صاف بتا دیتیں۔ میں خود انکار کر دیتی۔ غازی آباد جانے کی کیا ضرورت تھی۔''

حمنٰی نے بتایا۔ ''اب تو میرے خیال میں بات چیت کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ معاملہ خود ہی اختتام پذیر ہو گیا۔ میں سات بجے والی ٹرین سے واپس آرہی ہوں۔'' کچھ مزید بات چیت کے بعد اس نے موبائل بند کر دیا۔ احمد قریبی اسٹال سے چائے لے آیا اور دونوں چائے پینے لگے۔

☆☆☆

ٹرین کی روانگی سے چند منٹ قبل حمنٰی نے فہیم کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ انگیج تھا۔ موبائل آف کرتے ہوئے اس کی نگاہ سرسری طور پر کال کی تفصیل پر پڑی۔ سرِفہرست اس کا نمبر تھا۔ وقت صبح دس بجے کا تھا۔ یعنی اس نے صبح احمد کو فون کیا تھا۔ اس کے پاس احمد کا فون نمبر نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ فون کیوں کرتی۔

احمد نے اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ارے یہ تو میرے خیال میں تمہارا نمبر ہے۔ کیا تم نے کال کی تھی؟''

حمنٰی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی مطلوبہ ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوئی اور پلیٹ فارم پر آکر رک گئی۔

احمد اس کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''دماغ پر زور ڈالو۔ تمہیں سب کچھ خود ہی سمجھ آجائے گا۔''

حمنٰی سوچ میں پڑ گئی۔ دس بجے صبح وہ غازی آباد ریلوے اسٹیشن پر تھی اور ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے فہیم کو فون کیا تھا۔ وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ''تم فہیم ہو، میں نے صبح اسے ہی کال کی تھی۔ اس کے بعد موبائل پولیس کے ہتھے لگ گیا تھا۔'' ٹرین نے روانگی کی وسل دی۔

احمد ہنستے ہوئے بولا۔ ''میرا پورا نام سید فہیم احمد ہے۔ کال کی تفصیل میں نے تمہیں جان کر دکھائی تاکہ معاملہ کھل جائے۔ اب تمہیں یہ شکوہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے درمیان جان پہچان نہیں ہے۔ تم نے آج کا تمام دن میرے ساتھ گزارا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اچھی رائے ہی قائم کی ہوگی۔ مومنہ کو سفارش کر دینا۔''

حمنٰی نے پوچھا۔ ''لیکن تم فلیٹ نمبر اسی میں رہائش پذیر تھے۔ کہیں جمال شاہ کی خودکشی والا معاملہ بھی جھوٹ پر مبنی تو نہیں تھا؟''

احمد نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے کل فلیٹ چھوڑ دیا تھا۔ مومنہ سے مشورہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے مجھے نچلی منزل پر فلیٹ لینے کے لیے کہا۔ لیکن وہاں ہجوم بہت تھا اور میں کچھ تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ اس لیے میں نے اوپر والی منزل کا انتخاب کیا۔ انتظامیہ کی سستی کی وجہ سے میرے نام کی تختی کو دروازے سے ہٹایا نہیں گیا۔''

ٹرین نے دوبارہ وسل دی اور حمنٰی اٹھ کر بوگی کی طرف آگئی۔ بوگی پر چڑھنے سے قبل اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹرین آگے کی طرف رینگنے لگی۔

وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اعزازی نمبر ضرور دلواؤ گی۔ اب کی دفعہ بات چیت کرنے کے لیے میں لیہ آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔''

ٹرین نے پلیٹ فارم کو چھوڑ دیا اور حمنٰی مسکراتے ہوئے اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف آگئی۔

❖❖❖

انہیں کچھ بھی سمجھا نہیں سکتی تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد بات کرنا بہتر تھا۔ دونوں گاڑی سے اُتر کر عمارت کے اندر آ گئے۔ چھ بجنے والے تھے۔

وہ پلیٹ فارم کی بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے بُرے حالات میں میرا بہت ساتھ دیا۔ میں تمہارا احسان بُھلا نہیں پاؤں گی۔ اس کے باوجود تمہیں کسی بھی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا مجھے گوارا نہیں۔ میرا نمبر تمہارے پاس ہے، مجھے فہیم کے متعلق آگاہ کرتے رہنا۔''

احمد بولا۔ ''مجھے غلط فہمی میں مبتلا رہنا اچھا لگتا ہے اور تم مجھے مومنہ سے بات کرنے سے روک نہیں سکتیں۔ رہی فہیم کی بات۔ تو اسے اب بھول جاؤ۔ اگر اس نے تم سے دوبارہ تعلق قائم کرنے کی کوشش کی تو میں اسے آڑے ہاتھوں لوں گا۔'' اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس نے موبائل حمنٰی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ آئمہ کا فون تھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے مومنہ کی غصیلی آواز سنائی دی۔

''تمہیں مجھ سے پوچھے بغیر غازی آباد نہیں جانا چاہیے تھا۔ فوراً واپس آجاؤ۔ میں فہیم کو بھی فون کر چکی ہوں، وہ کال ریسیو نہیں کر رہا۔''

''میں واپس آ رہی ہوں، میرا انتظار کیجیے۔'' حمنٰی نے کہا۔

مومنہ بولی۔ ''تم نے مجھے بہت پریشان کیا ہے؟ اگر رشتے سے متفق نہیں تھیں تو مجھے صاف بتا دیتیں۔ میں خود انکار کر دیتی۔ غازی آباد جانے کی کیا ضرورت تھی۔''

حمنٰی نے بتایا۔ ''اب تو میرے خیال میں بات چیت کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ معاملہ خود ہی اختتام پذیر ہو گیا۔ میں سات بجے والی ٹرین سے واپس آ رہی ہوں۔'' کچھ مزید بات چیت کے بعد اس نے موبائل بند کر دیا۔ احمد قریبی اسٹال سے چائے لے آیا اور دونوں چائے پینے لگے۔

☆☆☆

ٹرین کی روانگی سے چند منٹ قبل حمنٰی نے فہیم کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ انگیج تھا۔ موبائل آف کرتے ہوئے اس کی نگاہ سرسری طور پر کال کی تفصیل پر پڑی۔ سرفہرست اس کا نمبر تھا۔ وقت صبح دس بجے کا تھا۔ یعنی اس نے صبح احمد کو فون کیا تھا۔ اس کے پاس احمد کا فون نمبر نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ فون کیوں کرتی۔

احمد نے اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ارے یہ تو میرے خیال میں تمہارا نمبر ہے۔ کیا تم نے کال کی تھی؟''

حمنٰی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی مطلوبہ ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوئی اور پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔

احمد اس کی پریشانی سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ ''دماغ پر زور ڈالو۔ تمہیں سب کچھ خود ہی سمجھ آ جائے گا۔''

حمنٰی سوچ میں پڑ گئی۔ دس بجے صبح وہ غازی آباد ریلوے اسٹیشن پر تھی اور ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے فہیم کو فون کیا تھا۔ وہ چلاتے ہوئے بولی۔ ''تم فہیم ہو، میں نے صبح اسے ہی کال کی تھی۔ اس کے بعد موبائل پولیس کے ہتھے لگ گیا تھا۔'' ٹرین نے روانگی کی وسل دی۔

احمد ہنستے ہوئے بولا۔ ''میرا پورا نام سید فہیم احمد ہے۔ کال کی تفصیل میں نے تمہیں جان کر دکھائی تاکہ معاملہ کھل جائے۔ اب تمہیں یہ شکوہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے درمیان جان پہچان نہیں ہے۔ تم نے آج کا تمام دن میرے ساتھ گزارا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اچھی رائے ہی قائم کی ہوگی۔ مومنہ کو سفارش کر دینا۔''

حمنٰی نے پوچھا۔ ''لیکن تم فلیٹ نمبر اسی میں رہائش پذیر تھے۔ کہیں جمال شاہ کی خودکشی والا معاملہ بھی جھوٹ پر مبنی تو نہیں تھا؟''

احمد نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے کل فلیٹ چھوڑ دیا تھا۔ مومنہ سے مشورہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے مجھے نچلی منزل پر فلیٹ لینے کے لیے کہا۔ لیکن وہاں ہجوم بہت تھا اور میں کچھ تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ اس لیے میں نے اوپر والی منزل کا انتخاب کیا۔ انتظامیہ کی سستی کی وجہ سے میرے نام کی تختی کو دروازے سے ہٹایا نہیں گیا۔''

ٹرین نے دوبارہ وسل دی اور حمنٰی اٹھ کر بوگی کی طرف آ گئی۔ بوگی پر چڑھنے سے قبل اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ٹرین آگے کی طرف رینگنے لگی۔

وہ چلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم مجھے اعزازی نمبر ضرور دلواؤ گی۔ اب کی دفعہ بات چیت کرنے کے لیے میں لیہ آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔''

ٹرین نے پلیٹ فارم کو چھوڑ دیا اور حمنٰی مسکراتے ہوئے اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف آ گئی۔

❖❖❖

اکیسویں قسط

الائو

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الائو... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے سے قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دست قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الائو کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الائو ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھنائونے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے

ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

پاکستانی ڈاکٹر سیف الدین، امارات کے ایک ہاسپٹل میں جاب کر رہا ہے، یوں دیگر ممالک سے آئے ہوئے ٹاپ پروفیشنل افراد میں بھارت سے تعلق رکھنے والے دو ڈاکٹرز رمیش اگروال اور رنبیر سنگھ بھی ہیں۔ کھلے دل کا مالک اور دوست نواز رنبیر سنگھ، ڈاکٹر سیف کا ایک اچھا دوست ہے لیکن ڈاکٹر رمیش اگروال ایک کینہ پرور آدمی ہے۔ پاکستان کے خلاف اس کے دل میں شدید نفرت بھری ہوئی ہے اور وہ ڈاکٹر سیف سے بھی اسی لیے عداوت رکھتا ہے کہ اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یوں رمیش جان بوجھ کر سیف کے سامنے اس کے ملک پاکستان کی برائیاں کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان ہونے والے ایک کرکٹ میچ کے دوران جب بھارت کے ہاتھوں پاکستان کو شکست ہوئی تو بغضی ڈاکٹر رمیش اگروال کو پاکستان کے خلاف زہر اُگلنے کا خوب موقع ملا اور تب ہی ڈاکٹر سیف یہ برداشت نہ کر سکا اور زبانی کلامی اسے منہ توڑ جواب دے دیا۔ نوبت ہاتھا پائی تک آتی اگر دیگر کولیگز ان کے درمیان نہ آتے، اُنہوں نے بھی رمیش کو ہی اس کی بداخلاقی اور بدزبانی پر کوسا تھا جن میں رنبیر سنگھ سرفہرست تھا۔ بہ ظاہر بات آئی گئی ہوگئی لیکن رمیش نے دل میں رکھ لی۔ انہی دنوں سیف پر ایک بھیانک انکشاف ہوا کہ اسپتال میں چند جرائم پیشہ خفیہ طور پر انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری میں ملوث تھے۔ اسپتال کے تیرہویں چودھویں فلور میں غلطی سے جانے پر سیف کو رمیش دانستہ کچھ باکسز کی جھلک دکھاتا ہے اور ساتھ ہی اسے بڑی کینہ توز اور مشتعلانہ نظروں سے گھورتا ہے، سیف نہیں جانتا کہ اس باکسز میں اس کے چھوٹے معصوم بھائی عادل کو رمیش نے اپنی دشمنی کے غبار تلے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے فروخت کر دیا ہے۔ اس دوران سیف پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں، مگر قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور اس کی جگہ اسی کا ہم وطن احسان مارا جاتا ہے، دوسرے حملے میں اس کا بھارتی دوست رنبیر سنگھ ہلاک ہو جاتا ہے۔ سیف پاکستان لوٹتا ہے اور اسے بھائی کی گمشدگی کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر سیف پنجاب (پاکستان) کے ایک سرحدی گاؤں کا باشندہ ہے۔ باپ زمین کے کچھ ٹکڑوں کا مالک ہے۔ بعد میں وہ پھیپھڑوں کی بیماری کی وجہ سے کوچ کر جاتا ہے۔ سیف کا چھوٹا بھائی عادل، ماجد کا دوست ہے اور ماجد، سیف کی کلاس فیلو ڈاکٹر حمیرا کا بھائی ہے۔ حمیرا کے باپ امجد کا لاہور میں کاروبار ہے۔ حمیرا اور سیف آپس میں ملتے ہیں اور ان کے درمیان پسندیدگی، پھر اُنسیت اور اس کے بعد تعلقِ خاطر محبت میں بدل جاتا ہے۔ وطن لوٹنے پر عادل کی گمشدگی پر سیف اس کی تلاش میں لگ جاتا ہے اس دوران اسے عادل کی لاش دیکھنا پڑتی ہے۔ ایسی لاش جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اندر سے خالی تھی۔ بدنصیب عادل کو لاش میں بدلنے سے پہلے مکروہ کھیل کے دوران اسے اہم اندرونی جسمانی اعضا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ سیف بھائی کی قبر کی مٹی اُٹھا کر قسم کھاتا ہے کہ جن لوگوں نے ایسا بے رحمانہ کھیل کھیلا ہے، وہ انہیں تصویرِ عبرت بنا کے چھوڑے گا۔ اس کے بعد سیف کی زندگی کا ڈھب بدل کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں طارق مجید نامی ایک کرائم رپورٹر جو بیک وقت لڑائی بھڑائی میں بھی طاق ہے اور اس کی پارٹنر رومانہ عرف رومی، جس نے کرمنالوجی میں ماسٹر کیا اور انٹرپول سے متعلق تھی، آج کل یہ دونوں آرگن پائریسی اور انسانی اعضا کی اسمگلنگ کے ٹاسک پر کام کر رہے تھے۔ سیف جیسے عام مسیحا کو ان دونوں ''ٹاپ پروفیشنل'' کی ہم راہی مل جاتی ہے تو وہ کندن بننے لگتا ہے۔ تاہم حالات کی تلخیاں اور زہرناکیاں اس کی نفسیات پر عجیب اثر بھی ڈالتی ہیں جہاں وہ ایک طارق اور رومی جیسے ٹاپ پروفیشنلز ساتھیوں کی سنگت داری میں جنگجو بننے لگتا ہے وہیں اس میں بدلہ سنجی بھی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اب ان تینوں اور انسانی اعضا کی غیر قانونی پیوندکاری کرنے والے بین الاقوامی خونی سوداگروں کے بیچ ایک دھواں دھار رن پڑ چکا ہے۔ ان تینوں ساتھیوں کی مضبوط تگڈم..... ان خونی بیوپاروں کو ننگی کا ناچ نچاتی ہے، جن کا نیٹ ورک پاکستان میں بھی اس گھناؤنے کالا زار میں مصروف کار ہے۔ پاکستان میں ان کا سرغنہ فیروز شاہ المعروف گوہر شاہ اور اس کے خاص کارپرداز تاج کے ساتھ جنگ جاری تھی۔ سیف کو پتا لگتا ہے کہ ڈاکٹر رمیش نے اپنی بھیانک دشمنی نکالنے کے لیے انہی دونوں مذکورہ افراد کو عادل کا پتا دیا تھا۔ ڈاکٹر رمیش اگروال خونی سوداگروں کی ''ہائیر اتھارٹیز'' سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اس کا باس سرجن امرناگ بھی شامل ہے۔ یہی لوگ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے نیٹ ورک کو چلا رہے ہیں اور ان خونی بیوپاریوں میں..... شنکر چانکیہ، سہراب مجوٹہ، بنکاک اور دیگر چند ممالک کے زونل چیف احکامات دیتے اور انسانی اعضا کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر خصوصی چارٹرڈ طیارے ہائر کرنے اور مذکورہ بیمار افراد کو کروڑوں روپوں کے عوض اعضا لگانے کے پابند ہیں۔ پاکستان میں گوہر شاہ کے ساتھ جنگ کے دوران یہ لوگ حمیرا کے گھر والوں کے بھی دشمن بن جاتے ہیں۔ سیف کا دوست ایس پی شاداب اس کی مدد میں شامل ہے۔ حمیرا اور اس کا باپ ان کے ڈر سے یو کے شفٹ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سیف اور حمیرا کی راہیں جدا ہو جاتی ہیں۔ ان تینوں ساتھیوں کی کوششوں کے سبب..... پاکستان میں ان خونی بیوپاریوں کے نیٹ ورک کا قلع قمع ہونے لگتا ہے لیکن سیف کو ابھی اپنے بھائی کے قاتلوں کی تلاش ہے۔ رومی اور سیف امارات کا رخ کرتے ہیں، یہاں اپنے بھائی کے ایک دشمن سرجن امرناگ کو سیف عبرت ناک موت سے ہمکنار کرتا ہے لیکن اصل دشمن ڈاکٹر رمیش اگروال فرار ہو کے بھارت جا کر اپنے گرو گھنتال شنکر چانکیہ کے چرنوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے تعاقب میں رومی اور سیف بھارت کا رخ کرنے والے ہیں لیکن بدقسمتی سے رومی تو بھارت چلی جاتی ہے لیکن سیف نہیں جا سکتا۔ طارق اور رومی کے مشورے اور ہدایات کے مطابق ناچار سیف امارت سے

پاکستان کا رخ کرتا ہے کہ طیارے کو کچھ نامعلوم دہشت گرد ہائی جیک کر لیتے ہیں۔ اندر کچھ ناخوش گوار واقعات کی وجہ سے طیارے کو کریش لینڈنگ کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ راجستھان کے صحرا میں تباہ ہو جاتا ہے۔ سیف اور اس کی دو بدنصیب مسافر ساتھی مالا اور شکنتلا زندہ بچتے ہیں مگر وائے نصیب کہ یہ تینوں صحرائی لٹیروں کے چنگل میں جا پھنستے ہیں۔ قبیلے میں آتے ہی ان تینوں کے ساتھ زیادہ برا سلوک نہیں ہوتا۔ سیف کیونکہ ڈاکٹر تھا اس لیے سہارا کی خصوصی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ مالا سے یہاں کا ماحول اور حالات برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ موقع دیکھ کر وہ فرار ہو جاتی ہے اور عبرت ناک انجام سے دوچار ہو کے ہلاک ہو جاتی ہے۔ سیف اور شکنتلا بھی یہاں سے جلد نکل جانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے ہی مہاراجا کا دیہانت ہو جاتا ہے۔ سیف محل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ قدرت اسے ان خونی سوداگروں کے پاس پہنچا دیتی ہے جو جسونت رائے کے بھتیجے کے اعضا کو آکس باکسز میں رتلام اسپتال پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ سیف کو کملیش کا آدمی سمجھتے ہیں۔ راستے میں پولیس ریڈ کے نتیجے میں سیف دھر لیا جاتا ہے۔ سیف کے بارے میں معلومات حاصل کر کے جسونت اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ سیف کی مدد سے کملیش اور اس کے ساتھی پکڑے جاتے ہیں پھر کمشنر جسونت کو اطلاع دیتا ہے کہ سیف پڑوسی ملک کا خطرناک جاسوس ہے اسے ہمارے حوالے کیا جائے۔ یہ سن کر سیف چونک پڑتا ہے۔ جسونت رائے نے کمشنر سے اس کی جان چھڑا دی تھی۔ کملیش نے بتایا کہ اس گھناؤنے کاروبار کے پیچھے شنکر چانکیہ تھا۔ وہ لوگ اسپتال کا رخ کرتے ہیں اور مریضوں کے بھیس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے وہ مرتے مرتے بچے۔ انہوں نے جسونت رائے کو آکے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ رچنا جو سیف کی ساتھی تھی۔ اب انہیں ممبئی کا رخ کرنا تھا۔ آج کل جیمز اکسی کانفرنس میں شرکت کے لیے ممبئی کے مقامی ہوٹل میں مقیم تھی۔ سیف کی بالآخر طارق سے ملاقات ہو گئی مگر اس کی حالت بے حد دگرگوں تھی۔ سیف اور طارق شنکر کو اغوا کر کے طارق کی کھولی میں لے آئے تھے۔ اس قدر بھاگ دوڑ نے دونوں کو تھکا دیا تھا۔ شنکر کی نگرانی پر رچنا کو مامور کر کے سیف بھی گہری نیند سو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں ..... ایک دم سناٹے میں آ گیا تھا۔

رچنا کا یرغمالی شنکر چانکیہ سمیت ''غیاب'' کا صاف مطلب تھا کہ وہ ہمیں ''ہاتھ'' دکھا گئی تھی۔ یوں طارق اور میرے ساتھ گویا وہی معاملہ ہوا تھا کہ 'دُکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوئے انڈے کھائیں.....'

پھر بھی ایک تسلی کی خاطر میں نے رچنا کو آوازیں دیں اور باہر نکل کر بھی اسے ڈھونڈا لیکن مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمارے ساتھ بُرا ہو چکا ہے۔

جان جوکھم میں ڈالنے والی محنت طارق اور میں نے کی تھی، رچنا اس کا کریڈٹ لے کر شکار جھپٹ کر لے جا چکی تھی۔

یوں اب میں تصور میں رچنا کے کامیابی سے معمور مسرت انگیز چہرے کو دیکھ رہا تھا جو اپنے باس جسونت رائے سے شاباشی لیتے ہوئے اپنی مرمریں پیٹھ تھپکوا رہی ہوگی اور ہم ادھر اپنا سر پیٹنے والے تھے۔

میں طارق کی طرف آیا تو وہ بھی نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔

''صبح بخیر دوست!'' میں نے اپنی کیفیات چھپاتے ہوئے مسکرا کر اس سے کہا۔

''صبح بخیر!'' اس نے بھی ہولے سے مسکرا کے جواب دیا۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو دوست؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت بہتر ہوں، تمہارا شکریہ یار! تم نے بروقت میرا چھوٹا سا آپریشن کر کے میری زندگی بچالی، تم نے تو دوستی اور اپنی ڈاکٹری کا حق ادا کر دیا۔'' وہ ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

''لیکن رچنا مجھ سے زیادہ ایک بڑا آپریشن کر چکی ہے۔'' میں نے پوری تسلی سے اسے بتایا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار اُبھر آئے اور وہ اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔

''کیا مطلب؟''

''وہ ہماری رات بھر اور دن چڑھے تک کی گہری نیند سے فائدہ اُٹھا کر یرغمالی شنکر چانکیہ کو اپنے ساتھ لے جا چکی ہے۔''

''کیا؟''

''جی ہاں! اور یہ بات یقینی ہے کہ اب جسونت رائے کے سامنے ہماری برائیاں اور اپنی بہادری کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کر کے اپنے انعامات کی تعداد بھی بڑھوا رہی ہو گی۔''

''یار، سیف! کیا اول فول بکے جا رہے ہو، تمہارا دماغ چل گیا ہے؟'' وہ جھلا کر بولا۔ ''ہمارا بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا نقصان ہو گیا اور تمہیں مذاق سُوجھ رہا ہے۔''

''یہ مذاق نہیں ہے زندہ دلی ہے میرے دوست!''
میں مدبّرانہ لہجے میں بولا۔ ''بھلا اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ، سانپ تو اپنا کام کر کے جا چکی۔''

''توبہ ہے یار.....!'' اس نے سر جھٹکا۔ پھر جیسے اُسے اُدھار اُتارنے کا موقع ہاتھ آیا، مجھے گھور کر بولا۔

''یہ سب تمہارا ہی کیا کرایا ہے، تمہی اسے ساتھ لائے تھے۔ تمہاری ہی ساتھی تھی وہ..... تم شاید بھول گئے تھے کہ وہ رومی نہیں ہے۔''

''میں ساتھ کب لایا تھا؟'' میں نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ ''وہ تو اس کم بخت جسونت رائے نے اسے میرے ساتھ کر دیا تھا، جس طرح ڈوجا اور ریٹا کی کہانی میں نے تمہیں سنائی تھی۔ میں کیا کرتا!''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' طارق نے ایک ہاتھ ہلایا۔ ''اب آپس میں اُلجھنے کا کیا فائدہ۔ کیا کریں اب.....؟'' وہ سوچنے لگا۔

''تم اِدھر ہی رکو، میں جسونت رائے کے ہاں جا کر اسے ساری حقیقت بتائے دیتا ہوں۔''

''جانے کی ضرورت نہیں، اسے فون کرو۔'' طارق نے کہا۔

''ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔'' کہتے ہوئے میں نے جسونت رائے کا دیا ہوا سیل فون نکالا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ ڈیڈ پڑا تھا۔

''ارے.....! اسے کیا ہوا؟ یہ تو مر گیا!'' میں چلّایا۔

''کون؟''

''میرا سیل فون۔''

''جسونت رائے نے کال کر کے ڈیڈ کروا دیا ہوگا۔ اب وہاں جانے کی بھولے سے بھی غلطی مت کرنا۔ رچنا اپنا کام کر چکی ہے اور جسونت رائے کے لیے ہم، بالخصوص تم بے کار ہو چکے۔'' طارق ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''اور..... اس بار وہ تمہارے ساتھ کوئی ڈراما نہیں کرے گا، اور سیدھا پولیس یا آرمی کے حوالے کر دے گا۔ سچ مچ..... کیونکہ وہ اپنا مطلب حاصل کر چکا۔''

اس کی بات غلط نہ تھی۔ ہمیں بری طرح چوٹ پڑ چکی تھی۔

''خدا غارت کرے اس حرام زادی رچنا کو.....'' میں بے بسی اور ناکامی کے احساس تلے طیش بھرے لہجے میں بولا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ رچنا جیسی چنڈال میرے سامنے ہو اور میں اُس کا خون پی جاؤں۔

''دفع کرو، اب خون جلانے کا کیا فائدہ.....'' طارق ہنس کر بولا۔ ''اب ہمیں اپنے اصل شکار کی طرف توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔''

''نہیں۔'' میں نے غصے سے دانت پیسے۔ ''کم از کم جسونت رائے سے بات تو کر لوں، تم مجھے اپنا فون دو میں اس سے بات کرتا ہوں، مجھے نمبر یاد ہے اس کے سیل فون کا۔''

میری بات پر طارق نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولا۔ ''میرے دوست پیارے اور معصوم دوست سیف! کہہ رہا ہوں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب رہے۔ شنکر چانکیہ بھی ان خونی سوداگروں میں سے ایک اہم مہرہ تھا۔ وہ اب اپنے جانی دشمن کی قید میں جا چکا۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اب جسونت رائے اس کا کیا حشر کرنے والا ہے۔ وہ اسی کے قابل بھی تھا۔ رہی بات رچنا کی شکایت کرنے کی تو جسونت اس کا باس ہے، وہ تم سے زیادہ اسی کی بات پر بھروسا کرے گا۔ اب تم غصہ چھوڑو اور اس چیپٹر کو کلوز کر دو، فی الوقت یہی بہتر ہے۔''

طارق نے مجھے دوسرے طریقے سے سمجھانے کی کوشش چاہی تو میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تاہم میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ رچنا سے جہاں بھی ٹکراؤ ہوا، اس سے چھل فریب اور دھوکے کا بدلہ ضرور لوں گا۔

''میں نے نیٹ پر کچھ کتابیں کھنگالی ہیں اور نئے پرانے نقشے بھی، ان کے ذریعے نربدا اور بھگواڑ کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔'' مجھے چپ دیکھ کر طارق آئندہ کا لائحہ عمل پیش کرنے لگا۔

میں اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا بیان جاری تھا۔

''نربدا نام کے دو علاقے ہیں۔ ایک تو نقشے پر موجود ہے اور دوسرا غائب۔ جو موجود ہے۔ ممبئی اور مدھیا بھارت کی سرحد پر واقع ہے، میرا خیال ہے یہ ہمارا مطلوبہ علاقہ نہیں..... اب جو نربدا شنکر چانکیہ نے بھگواڑ کے ساتھ بتایا ہے وہ اتر پردیش کے ایک پہاڑی مقام پر واقع ہے، جو ایک مسلم بستی..... ہوگر خان کے نزدیک پڑتی ہے، جسے ہوگرالی کے پہاڑی جنگلات سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ اب اس کے لیے ہمیں اتر پردیشیہ کا سفر کرنا پڑے گا۔''

''اور یہ سفر کتنا طویل ہوگا؟'' میرے منہ سے تھکے تھکے اور بیزار کن انداز میں برآمد ہوا۔ تاہم یہ پوچھنے کا میرا

ایک مقصد تھا جو میں طارق کے جواب کے بعد بتانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

”کم از کم یہاں سے وہاں تک کا فاصلہ ایک ہزار دو سو کلومیٹر ہے۔“

”اتنے سفر کے بعد ہمیں کیا خبر کہ شنکر چانکیہ نے ہم سے سچ بولا ہے کہ جھوٹ؟“ بالآخر میں نے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”کون بے وقوف ایسا کر رہا ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”ہم ایک بار پھر ہاربر ہاؤس کا رخ کریں گے۔“ طارق نے جیسے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔

”کیا؟“

”ہاں! گوہر شاہ بھی اپنے چیلے تاج کے ساتھ وہاں آیا تھا اس کی شادی پر...... اور یہاں ہم سے ایک فاش غلطی یہ ہو گئی کہ ہم نفسیاتی طور پر شنکر چانکیہ کو چھاپنے کے چکروں میں اُلجھے رہے اور اس دباؤ میں رہے کہ گوہر شاہ اور اس کے چیلے تاج کو بھول گئے، کہ وہ بھی ضرور وہاں موجود رہے ہوں گے۔ اتنی جلدی تو ان کی واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔“

”ایسی بات بھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں اب اُس وقت تک کیا معلوم تھا کہ وہ می اس مردار کے قبضے میں ہے۔ یہ تو ہم نے شنکر چانکیہ پر ہاتھ ڈالا تو بعد میں پتا چلا، اگر چہ اس کی بھی کوئی عملی تصدیق ابھی تک نہیں ہو پائی ہے، یوں بھی شنکر چانکیہ پر ہاتھ ڈالنے کے بعد ہمارے پاس کب اتنا موقع بچا تھا کہ ہم اسی وقت گوہر شاہ پر بھی ہاتھ ڈالتے، نیز وہ کون سے کمرے میں مہمان بنا ہوا ہے، وغیرہ۔“

”تمہاری بات قابلِ غور ہے اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ ایک مخبرانہ قسم کی مہم ہاربر ہاؤس میں ہونی چاہیے۔ آخر پتا چلے کہ گوہر شاہ ابھی تک وہاں موجود ہے یا نہیں، یہ بھی کہ اب شنکر چانکیہ کے اغوا کے بعد وہاں کے تازہ ترین حالات کیا ہیں؟“

”ہم......“ میرے منہ سے سوچتے ہوئے برآمد ہوا۔ ”لیکن تمہاری حالت کیا اس نئے ایڈونچر کی اجازت دیتی ہے؟“

”یہ ایڈونچر تم کرو گے۔“ طارق نے کہا۔ ”بلکہ دیکھا جائے تو یہ سارا اب تک کا ایڈونچر تمہارے ہی کریڈٹ میں جاتا ہے۔ مجھ سے ملے تو تمہیں دو تین ہی روز ہوئے ہیں۔“

”یہ بات ہے تو میں تیار ہوں۔“ میں نے فوراً کہا۔ میرے اندر ایکا ایکی ایک جوش سا بھر گیا تھا۔

”شاباش، میرے سپوت! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔“ طارق نے بزرگانہ لہجے میں کہا اور ساتھ ہی بذلہ سنجی سے مسکرا بھی دیا۔

”کاش! گوہر شاہ ابھی تک وہیں ہو۔“ میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ ”میں تو اس کی وہیں کسی نپ لوں گا۔“ (گردن دبوچ لوں گا)

”لیکن یار! میں تمہیں تنہا اس حالت میں یہاں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

میری بات پر اس کے چہرے پر ہلکے کرب کا شائبہ بھی اُبھرا تھا اور تب ہی اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی تیزی سے کوندا۔

”ایک اور بات بھی کھٹک گئی میرے ذہن کو۔“

”وہ کیا؟“ اس نے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”رچنا اور جسونت رائے پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ رچنا ہمارے ٹھکانے سے واقف ہے۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ......“ میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تھا، یا پھر شاید اپنی بات پوری کرنے کے لیے مجھے مناسب الفاظ نہیں مل پائے تھے مگر طارق میری بات کا مقصد فوراً بھانپ گیا تھا۔

”ہاں! یہ بات بھی قابلِ غور ہے۔ جسونت رائے کوئی گُل کھلا سکتا ہے۔ وہ پولیس بھی بھیج سکتا ہے یہاں۔ اگر چہ اس نے ...... اپنے مقصد کی خاطر پہلے ایک ڈراما ضرور کیا تھا مگر تمہاری بات پر بھروسا کون کرے گا؟“

”اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم...... دوسری کوئی مہم شروع کرنے سے پہلے یہ ٹھکانا فوراً چھوڑ دیں۔“

”اب سر پر پڑی ہے تو حرکت کرنے کی کوشش کرنا پڑے گی۔ تمہارے خدشے نے واقعی مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہمیں یہ ٹھکانا۔ چھوڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

میں کھولی سے باہر آ گیا۔ اس نئی صورتِ حال نے واقعی ہمیں تشویش اور فکر میں مبتلا کر کے رکھ دیا تھا۔

طارق کی حالت ابتر تھی۔ جس نوعیت کا اسے زخم آیا تھا میرے حساب سے اسے کچھ دن بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی۔ یہ تو شکر ہوا کہ اللہ کی مرضی اور میری کوشش سے اس کی جان بروقت بچ گئی۔

باہر دن پوری آب و تاب کے ساتھ نکلا ہوا تھا۔ ساحلی علاقہ ہونے کے سبب ہوا تو مرطوب تھی مگر عجیب سی نمی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ گرمی اور دھوپ اپنی جگہ قائم تھی۔ وڑے نما کھولیوں کی اس باہی گیر بستی میں زندگی اپنی پوری شد و مد کے ساتھ جاگ چکی تھی۔ ننگ دھڑنگ بچے اور ان کو سنبھالتی نہلاتی ہوئی کالی سانولی مائیں مصروف تھیں۔ ایک عجیب سی چیخ و پکار کا سماں تھا۔

میں ان کے درمیان بنے آڑے ترچھے راستوں پر چلتا ہوا، مین روڈ پر آ گیا۔ ایک ٹیکسی روک کر اس سے طارق کے بتائے ہوئے ہوٹل کی جانب چلنے کا کہا۔

اس نے کرایہ بتایا، نیز اندر سے سواری اُٹھانے کا الگ۔ مجبوری تھی، ورنہ میں اس ابن الوقت ڈرائیور سے اچھی خاصی بحث کرتا۔

طارق کی کنڈیشن کے بارے میں، میں نے اسے اس وقت ہی بتایا جب میں نے اسے ٹیکسی سے اُترنے اور کھولی کے اندر آنے کی درخواست کی۔

''نا بھئیو نا، سامان اُٹھانا ہمارا کام نہیں ہے، سواری کو باہر بھیجو اور بس۔'' ٹیکسی ڈرائیور جو ایک دبلا پتلا اور جھلسی ہوئی رنگت کا چالیس پینتالیس سالہ آدمی تھا، اندر ہی بیٹھے بیٹھے بولا۔

''او بھائی! سامان نہیں اُٹھانا ہے، اندر ایک بیمار آدمی ہے، اسے میرے ساتھ سہارا دے کر باہر لانا ہے۔''

''او، اچھا، یوں بولو نا بھئیو! چلو پھر۔'' اس نے ایک دم کہا اور دروازہ کھول کر ٹیکسی سے اُتر آیا۔

میں اسے اندر لے آیا۔ اس نے جو طارق کو اس حال میں دیکھا تو حیران ہوا اور بولا۔

''ارے بھئیو! اسے تم ہوٹل لے جا رہے ہو؟ اسے تو اسپتال لے جانا چاہیے۔''

اس کے کچھ زیادہ ہی بھلے مانس بننے پر میرا دانت پیسنے کو جی چاہا مگر اس سے کہا۔

''اسے اسپتال ہی تو لے جایا گیا تھا، وہیں اس کا آپریشن بھی ہوا تھا چھوٹا سا، اُنہوں نے رُخصتی دے دی اسپتال سے۔''

''اچھا جی! پھر بھی، تمہارا کوئی گھر گھاٹ نہیں ہے؟ مسافر ہو تم؟'' طارق کو غور سے دیکھنے کے بعد وہ مجھے اُوپر سے دیکھتے ہوئے پھر بولا۔ ''ویسے اس گندی سندی بستی کے بھی رہنے والے نہیں دکھتے ہو۔ آخر ہو کون تم دونوں؟''

''او بھائی! تُو نے کیا ہمارا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔'' میں نے بیزار ہو کر اس سے کہا تو طارق ٹیکسی ڈرائیور سے بولا

''بھائی! ہم رپورٹر ہیں، یہاں کے لوگوں کی زندگی پر ایک فیچر لکھنے آئے تھے اور کل سے یہاں مقیم تھے، چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا مجھے۔''

''او اچھا..... اچھا، تبھی میں کہوں اس بستی کے تو نہیں لگتے۔ آجاؤ، بھئیو!'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ اس کے اور میرے سہارا دینے کے بعد ہم طارق کو کھولی سے باہر لے آئے اور ٹیکسی کا عقبی دروازہ کھول کے طارق کو پسنجر سیٹ پر لٹا دیا۔

ہمارے اردگرد بچے اور چند عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ مجھے سخت کوفت ہونے لگی۔

اس کے بعد میں دوبارہ کھولی میں آیا۔ تھوڑا بہت جو بھی میرا اور طارق کا سامان تھا، وہ اُٹھا لیا۔

ڈکی میں سامان رکھ کر میں ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ ٹیکسی اسٹارٹ ہو کے آگے بڑھی تو پیچھے اس کے بچے بھی شور مچاتے ہوئے بھاگے۔

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی سڑک پر رواں دواں تھی۔ حالات کی ہلچل ہی ایسی تھی کہ کئی ضروری اور اہم باتیں ذہن سے محو ہو جاتیں۔

ایک اور خدشے کا تو مجھے احساس ہی نہ رہا تھا۔ وہ یہ کہ میں یہاں بھارت میں ایک بھگوڑے اور غیر قانونی حیثیت سے تھا۔ اگر کسی وجہ سے میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو میرا بھانڈا پھوٹنے میں دیر نہیں لگے گی۔

طارق اور روی کی اور بات تھی، وہ باقاعدہ قانونی طریقے سے بھارت کی سرزمین میں داخل ہوئے تھے، جبکہ میں حادثاتی طور پر.....

بہرکیف..... اب جو بھی کچھ تھا، اسے فیس کرنا تھا اسی لیے مجھے کچھ زیادہ ہی احتیاط کی ضرورت تھی۔ رہی بات جسونت رائے کے ڈرامے کی، جس کی رُو سے میں مر چکا تھا، لیکن میری اصلیت چھپی تو نہیں رہ سکتی تھی، جب تک کہ ایسی کوئی سچویشن نہ کری ایٹ ہوتی۔

انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک ٹیکسی ڈرائیور کی آواز نے چونکا دیا۔

''لو بھئیو! تمہارا ہوٹل آ گیا۔'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ذرا دیر رُکنے کی درخواست کی اور خود اندر آ گیا۔

ہوٹل کا نام ستارہ تھا۔ اگرچہ یہ ایک ماند ستارہ تھا مگر ہمارے لیے کسی حد تک ''روشن'' ہی تھا۔ یہ ساحل کے قریب

واقع تھا۔ اس ہوٹل کے انتخاب کرنے کا ہمارا (طارق کا) ایک مقصد تھا۔ یہاں زیادہ کاغذات کا جھنجھٹ نہیں تھا۔ ماسوائے خانہ پُری کے۔

خستہ حال اور بوسیدہ سے استقبالیہ پر ایک آدمی موجود تھا۔ کمپیوٹر اور نیٹ کے دور میں بھی اسے ایک موٹا سا لیجر ٹائپ رجسٹر اور قلم سنبھالے دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔

کاؤنٹر مین نے روکھی پھیکی نظروں سے مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ خود ہی بتا دو کمرا چاہیے یا کچھ اور.....؟''

''جی مجھے ایک کمرا چاہیے، گراؤنڈ میں ہو تو زیادہ بہتر ہے۔'' میں نے کہا۔

''مل جائے گا کمرا..... اپنا شناختی کارڈ دیں۔'' اس نے رجسٹر کھول کے مجھ سے کہا۔ یہ ایک مسئلہ تھا جس کا حل میں اور طارق پہلے ہی سوچ چکے تھے۔ میں نے کہا۔

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ ہم رپورٹر ہیں۔'' میں نے اس متوقع صورتِ حال کے لیے طارق کی سمجھائی ہوئی پلاننگ کے مطابق جواب دیا۔ ''ہمارے ساتھ ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ جس میں ہمارا کچھ قیمتی سامان، کیمرا اور کاغذات گم گئے ہیں۔ رپورٹنگ کا کارڈ بچ گیا ہے وہ میرے ساتھی کے پاس موجود ہے جو باہر ٹیکسی میں موجود ہے۔ اس کی مرہم پٹی ایک اسپتال سے کروا دی گئی ہے۔''

''کمرا ڈبل بیڈ کا چاہیے؟'' اس نے روبوٹ کے سے انداز میں پوچھا۔ میرا دل اندر سے مارے خوشی کے اچھل پڑا پھر طارق کی جان کاری اور ذہانت پر اش اش کر اُٹھا۔

''جی جی ہاں!'' میں نے اپنی مسرتوں کو دباتے ہوئے کہا۔

طارق کی ہدایت پر میں نے اسی کا نام اور پتا لکھوا دیا جو ممبئی کی ہی کسی دور اُفتادہ اسٹریٹ کا تھا۔

اس کے بعد ایک بیزار سے ویٹر کو کمرے کی چابی دے کر میرے ساتھ کر دیا۔ سامان جو ایک بیگ اور سوٹ کیس پر مشتمل تھا، وہ پہلے ہی میرے ساتھ تھا (اس میں بھی طارق کا ہی زیادہ سامان تھا)۔ اسے سنبھالے ہوئے میں کمرے میں آ گیا، اس کے بعد اسی ویٹر کو ٹکڑی ٹپ کا آسرا دے کر باہر لے آیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو شکریے کے ساتھ کرایہ دے کر چلتا کیا۔ پھر طارق کو میں اور ویٹر سہارا دیے ہوئے اندر کمرے میں لے آئے۔

بعد میں، میں نے طارق کا رپورٹنگ کا کارڈ بھی کاؤنٹر مین کو دکھا دیا تھا۔ تب بھی اس نے بس ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی۔

''شکر ہے خدا کا..... میں تو سمجھا تھا بڑی پنچایت پڑ جائے گی۔'' میں نے ویٹر کو وعدے کے مطابق ٹکڑی ٹپ دے کر روانہ کیا اور دروازہ بند کر کے طارق کے قریب بیٹھا تو وہ بولا۔

''بھارت میں آبادی زیادہ ہے اور اسی تناسب سے غربت بھی بہت ہے، اقتصادی حالات اس سے بھی زیادہ ابتر، لوگ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے بڑے سے دھندوں میں بھی مارا ماری کرتے رہتے ہیں۔ قانون سب یہاں دھرے رہ جاتے ہیں۔''

طارق نے تبصرہ کیا تو میں نے بھی تلخی سے کہا۔ ''ہمارے پاکستان جیسا ہی حال ہے۔ وہاں بھی تو یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''بالکل.....'' اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ پھر بولا۔ ''کاش! دونوں ممالک دفاع کے نام پر اسلحے کی دوڑ کے بجائے اپنے اپنے ملک کی اقتصادیات، عوامی بنیادی مسائل اور غربت کی طرف توجہ دیں تو دونوں ہی ملک جنت بن جائیں۔ دنیا کے ماہرین دعوے سے یہ بات کہہ چکے ہیں کہ اب جنگ ہتھیاروں کی نہیں ہو سکتی، یہ ایٹمی دور ہے۔ وہ بھی ایسا کہ ناگاساکی اور ہیروشیما میں گرنے والے ایٹمی بموں سے سو گنا زیادہ تباہ کن۔ جنگ کی صورت میں کوئی نہیں زندہ بچے گا۔

جذبات کی عینک اُتار کر سوچیں تو بہت سی کڑوی حقیقتیں ہمیں اپنے گریبانوں میں نظر آ جائیں گی۔ بات تلخ ضرور ہے مگر ہے سچ..... صحت عامہ سے متعلق کوئی مسئلہ درپیش ہو، مثلاً کوئی وبا پھوٹ پڑے تو دونوں ممالک بے بس نظر آنے لگتے ہیں۔ اربوں روپوں کی مالیت سے میزائل اور بم بنا بنا کر سمندر میں پھینکے جا رہے ہیں، کبھی آکسیجن کی ضرورت پڑ جائے تو..... ہوا کے ایک بلبلے کو بھی ترسے ہوئے ہوتے ہیں۔''

''ہاں، دوست! یہی کچھ میں بھی محسوس کرتا ہوں اور کڑھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہاں میں ایک تصحیح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہمارا بھارت سے اہم مسئلہ مقبوضہ کشمیر کے حوالے سے ہے۔ چلو، حکومت چاہے جیسی بھی سہی، لیکن کیا بھارت کی عوام دل نہیں رکھتی، آنکھیں اور کان نہیں رکھتی؟ وہ کشمیریوں کے بہتے بے بس اور مظلوم عوام کے دُکھ درد کو کیوں نہیں محسوس کرتی؟ کشمیریوں پر جس قدر ظلم بھارتی افواج نے کیا، یہ وہ پوری دنیا دیکھ رہی ہے۔ اس کی مذمت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس مسئلے پر بھارت سے ہماری کبھی نہ

کبھی جنگ ضرور چھڑ سکتی ہے۔''

''بس یار، اللہ خیر ہی کرے۔'' طارق نے کہا۔ ''دیکھا جائے تو پوری دنیا کے ہی مسلمانوں پر آفت آئی رہتی ہے۔ فلسطین کو ہی دیکھ لو، اسرائیل کس قدر ظلم و ستم کا بازار وہاں گرم کیے ہوئے ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں، پوچھے بھی کون؟ یہودی وہاں بے گناہ فلسطینی مسلمانوں پر کس قدر درندگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اسپتالوں کو بھی نہیں چھوڑا، آبادیوں پر وحشیانہ بمباری، کیا ہے یہ سب؟ اس سے پہلے افغانستان روسی جارحیت کا شکار رہا اور اب تک وہاں کسی نہ کسی صورت میں جنگ کے بادل منڈلاتے ہی رہتے ہیں، پھر شام، عراق، لبنان، لیبیا اس کے بعد برما میں کس قدر مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہوا۔ آخر ہم مسلم اُمہ ایک اتحاد کیوں نہیں بنا لیتے؟''

طارق کہتا چلا گیا۔ میرے چہرے پر بھی دکھ اور تلخیوں کے ملے جلے آثار اُبھر آئے تھے۔

وہ دن ہم نے وہیں گزارا۔ شام ہوئی تو میں طارق کی چند ہدایتیں اور دعائیں لے کر اپنی مہم پر نکل پڑا۔

باندرہ ویسٹ تک جانے کے لیے میں نے طارق کی کھٹارا کار کا انتخاب نہیں کیا تھا اور اس نے بھی منع کیا تھا۔ کیونکہ باندرا ویسٹ میں جس تراشیدہ درختوں کے میدانی علاقے میں اور واج ٹاور کے پاس شنکر چانکیہ کا ''ہار بر ہاؤس نامی محل تھا وہاں تک صرف پرائیویٹ گاڑیاں ہی جا سکتی تھیں۔

اگرچہ یہ مسئلہ بھی ٹیکسی کے ذریعے حل ہو جاتا مگر اس میں بھی طارق نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں (احتیاط کے پیشِ نظر) باندرا ویسٹ پہنچ کر دوسری ٹیکسی کرا لوں۔ مسئلہ اس مذکورہ میدانی علاقے تک پہنچنے کا تھا۔ وہاں ایک ٹیکسی کو دیکھ کر شنکر چانکیہ کے آدمی اس کی چیکنگ کر سکتے تھے، کیونکہ وہ ایک ''پرائیویٹ پراپرٹی'' کے طور پر علاقہ ممنوعہ ہی کہلاتا تھا۔

اس کا طریقہ بھی اگرچہ طارق نے مجھے سُجھا رکھا تھا اسی لیے میں مطمئن تھا۔

میں باندرا ویسٹ کے لیے ... ٹیکسی کروانے کے لیے مین روڈ پر نکلا تو حمیرا کے خیال نے مجھے پھر بے چین کر دیا۔ وہ بھی اسی شہر کے ایک فائیو اسٹار مورت نامی ہوٹل میں رہائش پذیر تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں پانچ دن کے میڈیکل سیمینار پر مدعو ہے۔ آج اسے تیسرا دن تھا۔

حالات کی کشمکش ہی کچھ ایسی رہی تھی کہ میں باوجود کوشش کے اس سے ملنے ہی نہ جا سکا تھا۔

حالات اپنی جگہ لیکن مصلحت میں نے بھی یہ دوری برقرار رکھی ہوئی تھی۔ یہاں میں مخدوش حالات کا شکار تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ حمیرا بھی اس کا شکار ہو لیکن دل کی دیوانگی کا کیا کیا جائے کہ وہ اس طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ محبوب کی دیارِ غیر میں خبر آمد ویسے ہی بے چین کیے دیتی ہے۔

میں بھی بے چین تھا، اگرچہ میں نے شنکر چانکیہ والے معاملے کو نمٹانے کے بعد سیدھا وہیں جانے کا سوچا تھا مگر رچنا کے ''ہاتھ'' دکھا جانے پر یہ معاملہ اور طرف جا نکلا تھا..... یوں ایک بار پھر حمیرا سے ملنے کا معاملہ کچھ کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا۔

میں درحقیقت پوری فرصت سے ہی اس سے ملنا چاہتا تھا، جس کی اُمید اب مجھے کم ہی نظر آتی محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ مجھے ایک نیا مشن پڑ گیا تھا۔ یہاں میں ایک عجیب موڑ کا شکار ہو گیا، روانہ میں گوہر شاہ کی سرکوبی اور رومی کی تلاش کے لیے ہوا تھا اور اب..... حمیرا کا خیال بار بار کچھ زیادہ ہی بے چین کرنے لگا تھا۔

میں نے وقت دیکھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا میں نے مورت ہوٹل کی لوکیشن وغیرہ کے سلسلے میں نیٹ کے علاوہ ٹیکسی ڈرائیور سے بھی پوچھ رکھا تھا۔ وہ یہاں سے تقریباً دس، گیارہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔

میں نے سوچا حمیرا سے ملاقات کہیں رہ ... ہی نہ جائے، وہ پانچ دن کے لیے یہاں انڈیا آئی تھی اور آج اسے تیسرا دن تھا۔ خونی سوداگروں کے خلاف مہمات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، دل کہہ رہا تھا کہ حمیرا سے ایک ملاقات ہی سہی، منزلیں تو ہماری کب کی جدا ہو چکی ہیں، ایک ذرا ملاقات کے بعد وہ اپنے راستے پر ہو گی اور میں اپنے.....

میں نے اچانک ٹیکسی رُکوائی اور اسے ہوٹل مورت چلنے کا کہا۔

ہوٹل پہنچنے تک میرا دل بے طرح دھڑکتا رہا اور دماغ اَن گنت سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ حمیرا یوں اچانک مجھے دیکھے گی تو اس پر کیا بیتے گی؟ خود مجھ پر کیا گزرے گی جب میں اسے اپنے اس قدر قریب پاؤں گا۔ ہم ایک دوسرے سے کیا باتیں کر سکتے تھے، ماسوائے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے..... کہیں ایسا تو نہیں عشق و وفا کا ایک نیا اعادہ کوئی تجدید وفا ہونے جا رہا ہو۔ یا پھر اس ملاقات کے بعد..... سب ویسا ہی رہا... جیسا کہ اب تک چلا آ رہا تھا، یعنی اُس کی ڈگر اور، میری اور..... کچھ تو ہونے والا تھا اس ملاقاتِ ایک ذرا میں.....

ڈرائیور کو کرایہ دے کر میں نے فارغ کیا اور ہوٹل مورت کا چند لمحے کھڑے ہو کے جائزہ لیا۔

گھنیری شام کے بیچ ہوٹل کی عمارت مجھے کبھی ماند پڑتے تارے اور کبھی چمکتے دمکتے موتی کی طرح دیکھنے لگی۔

میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیات تھیں۔ ایک عرصے بعد حمیرا سے مل رہا تھا، اسے دیکھنے والا تھا، اس کے رُوبرو ہونے والا تھا، وہ کیا کہتی، میں کیا سنتا، شکوے شکایات تو ہونے تھے، میری طرف سے نہیں، اُس کی طرف سے..... کہ یہ بھی محبت، چاہت اور پیار کا حصہ تھے۔ نہ ہوں تو یہ جذبہ دل ہی پھیکا سا محسوس ہونے لگتا ہے۔

عمارت شہر کے قلب میں اور پُررونق جگہ پر کارنر پر کھڑی تھی۔ یہ ہوٹل پانچ منزلہ تھا۔ اس کی شیشے کی دیواریں یوں ایستادہ تھیں جیسے شیشۂ دل ہوں کہ ایک ذرا ٹھوکر لگی اور کرچیاں بکھر کر رہ جائیں۔ میں اس کے خوب صورت گیٹ کی جانب دھیرے دھیرے بڑھنے لگا، وہاں باوردی دربان بھی تھے اور کچھ مسلح محافظ بھی۔

چمکتے اور چکنے وسیع و عریض سنگِ سیاہ کے بنے فرش کے چند قدم طے کر کے میں شیشے والے گیٹ کی جانب بڑھا۔

ایک دربان نے مجھے شستہ انداز میں جھک کر سلام پیش کیا اور دوسرے نے دروازہ وا کر دیا۔

اندر قدم رکھتے ہی سینٹرل اے سی کی ٹھنڈک نے دماغ میں تروتازگی کی لہر دوڑا دی۔ اندر وسیع لابی تھی، جس کے مختلف گوشے بنا رکھے تھے، کہیں صوفے اور تیلیں بچھی تھیں اور ایل ای ڈی نصب تھا، کہیں کرسیاں میزیں اور دوفٹ کی سنگِ مرمر کی دیواروں کی دیدہ زیب پارٹیشنز میں بھی یہی کچھ دھرا تھا۔

دائیں بائیں خوب صورت بل کھاتے زینے تھے اور مختلف کمروں کی طرف جاتی ہوئی راہداریاں تھیں۔ ویٹرز اور ویٹرس سوٹ پوش تھے۔ پگڑ اور شیروانی والے بھی ویٹرز نظر آ رہے تھے۔ انتظامیہ کے افراد سوٹ پوش تھے اور ان کے ہاتھوں میں سیل فونز دبے ہوئے تھے۔ چھت پر جا بجا دلکش فانوس تھے۔ استقبالیہ کی جانب دائیں بائیں ایک چوڑے ستون اور دیوار کے ساتھ ڈیجیٹل نوٹس بورڈ بھی نظر آ رہے تھے، جن میں آج ہونے والی پارٹیوں اور دیگر تقریبات کی تفصیل جلتے بجھتے لفظوں کے بلبوں کی صورت چمک رہے تھے۔

''یس، پلیز! مے آئی ہیلپ یو؟'' استقبالیہ پر موجود مرد اور عورت میں سے عورت نے مجھ سے پیشہ ورانہ اخلاق سے پوچھا۔

''مجھے ڈاکٹر حمیرا سے ملنا تھا۔ وہ یو کے سے یہاں ایک میڈیکل سیمنار کے لیے رہائش پذیر ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''جسٹ اے موومنٹ۔'' اس نے کہا اور اپنے سامنے رکھے مانیٹر پر کچھ دیکھتی رہی۔ اس کے بعد فون کھڑکا دیا۔ فون کان سے لگائے میری جانب تکتے ہوئے میرا نام پوچھا۔

''ڈاکٹر سیف خان۔'' میں نے کہا۔

''جی، میڈم! وہ آپ سے کوئی ڈاکٹر سیف خان ملنا چاہتے ہیں۔'' استقبالیہ گرل نے فون پر کہا۔ ایسے میں میرا دل جانے کیوں جیسے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

یہاں شاید سیکیورٹی سخت تھی اسی کے پیشِ نظر مجھے حمیرا کا روم نمبر بتانے کے بجائے پہلے اس سے رابطہ کیا گیا تھا۔

''یہ لیں بات کریں۔'' اس نے کہتے ہوئے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اپنے خشک پڑتے حلق اور ہونٹوں کو لعابِ دہن سے تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے فون لے کر کان سے لگایا اور دھیرے سے بولا۔

''حمیرا! یہ میں ہوں ڈاکٹر سیف۔'' کہتے ہوئے میں نے کوشش چاہی تھی کہ میرا لہجہ ایک تو لڑکھڑانے نہ پائے اور دوسرا اس میں کسی قسم کا کوئی جذباتی رنگ نہ غالب محسوس ہو۔ استقبالیہ پر میں یہ سب ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے خود کو نارمل ہی رکھا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ میرا اندر ایک زبردست ہلچل کا شکار تھا۔

میری آواز سنتے ہی دوسری جانب سے حمیرا کی ایسی آواز اُبھری تھی جیسے وہ خود سے نہیں بولی ہو، ایک لرزتی ہوئی آواز خود ہی اس کے حلق سے برآمد ہو رہی ہو۔

''سس..... سیف! کک..... کیا واقعی یہ تم ہی ہو؟''

''بالکل میں ہی ہوں اور..... تم سے میں خود ہی مخاطب ہوں۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''میرے خدا! فون انہیں دو جلدی۔'' وہ شاید میری آواز ہی نہیں لہجہ بھی پہچان چکی تھی۔ پھر اس سے رہا نہ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا یہ اس کے لیے ایک زبردست سرپرائز تھا۔

میں نے فون استقبالیہ گرل کو دیا۔

''جی میڈم؟'' اس نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔

''او کے۔'' دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''ڈاکٹر سیف! آپ روم نمبر ایک سو چار میں چلے جائیں، فرسٹ فلور۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور زینے کی جانب بڑھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد میں مطلوبہ روم کے کوریڈور میں تھا اور..... دیگر کمروں کے نمبر دیکھتا ہوا جب ایک سو چار والے کمرے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا اور..... سر نکال کر باہر جھانکنے والی حمیرا ہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آرہا، اندر آجاؤ۔'' اس نے میرے قریب آتے ہی یہ کہہ کر دروازہ پورا کھول دیا۔ ظاہر ہے اسے یقین آتا بھی کیسے، ہمارے درمیان تو صرف ای میل کا ہی تبادلہ ہوا تھا اور یہ اُسے کب پتا تھا کہ میں بھی ادھر بھارت میں ہی تھا۔

راستہ پاتے ہی میں اس کے قریب سے گزرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ حمیرا کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے اس کے وجود سے وہی مہک اُٹھتی محسوس ہوئی تھی جو میرے لیے نا آشنا نہ تھی۔ میں اس خوشبو کا دیوانہ تھا۔ یہ اس کے اپنے بدن کی مہک تھی۔ اُجلی، پاکیزہ اور صاف وشفاف.....

کمرا کشادہ اور شاندار تھا، بالکل ویسا ہی جیسا کہ ایسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا ہونا چاہیے تھا۔ اندر چند قدم..... چلنے کے بعد میں مڑا تھا۔

وہ دروازہ بند کر کے میرے قریب آ کھڑی ہوئی تھی اور ہم ایک دوسرے کو جیسے آنکھوں ہی آنکھوں کے راستے اندر جذب کرنے لگے۔

میں غور سے اس کے چہرے کو تکے جا رہا تھا اور اس کی مہجور نگاہوں کے ان آب دار موتیوں کو بھی محسوس کر رہا تھا جو یوں مجھے اچانک اپنے سامنے، رُوبرو پا کر اس کی دلکش آنکھوں سے گھٹے گھٹے چمکتے رہ گئے تھے۔

صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے ایک پل کے لیے نہیں بھولی تھی اور اب اچانک اپنے سامنے پا کر وہ ایک ٹک سی ہو کر مجھے جی بھر کے دیکھنا چاہ رہی تھی، یوں جیسے ہماری یہ ملاقات پل بھر کی ہو، پھر ملیں نہ ملیں کہ کب ملیں..... ابھی سے ان حسین و پُرمسرت اور مستعار سہی، ساعتوں کو جی بھر کے اپنے اندر اُتار لیں کہ بعد غریب الوطنی..... میں یہ حسین یاد بن کر سرمایہ جسم وجاں بنی رہیں۔ کچھ یہی حالت وکیفیات اگرچہ میری بھی تھیں، لیکن باوصف ان سب کے مجھے اپنے اندر ایک کھٹک کا سا بھی احساس ہوا تھا۔

وہ مجھے بیک وقت کسی شدید قسم کے دباؤ اور ایک دیدنی سی مسرت انگیزی میں بھی مبتلا محسوس ہوئی تھی۔ اس نے موسم اور فرصت کی مناسبت سے ہلکا پھلکا مگر دلکش لباس زیب تن کر رکھا تھا، ہلکے کریم کلر کا ٹراؤزر تھا اور اس پر آدھی آستینوں والی گلابی رنگ کی قمیص تھی، بالوں کا اسٹائل بھی بدلا ہوا تھا، مگر بھلا لگ رہا تھا۔

''تم، ٹینس ہو رہی ہو شاید.....'' میں نے ہولے سے اس طلسمِ خواب وخیال کو توڑا۔

''میں.....'' وہ جیسے گومگو سی کیفیت تلے بولی۔ ''ہاں، نہیں، نہیں تو..... تم بیٹھو نا۔'' وہ جیسے کسی خواب سے ایک دم ہی جاگی، ساتھ ہی یہ کہتے ہوئے اس نے بے اختیار میرا ہاتھ اپنے مرمریں ہاتھوں میں لے لیا اور یہی وہ وقت تھا جب مجھے لگا جیسے میں..... اپنے ماضی کے کھنڈر محل میں اس کے ساتھ پہنچا ہوں۔ ہم دونوں اس کھنڈر محل میں ننگے پاؤں فرش پر چل رہے ہیں۔

چونکا تو اس وقت جب وہ مجھے ایک آرام کرسی پر بٹھا چکی تھی اور خود میرے سامنے والے ایک سنگل صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

کھڑے تھے تو ایک ٹک ایک دوسرے کو نظروں میں بھرتے رہے تھے، اب رُوبرو بیٹھے تب..... ایک دوسرے میں نگاہوں کے راستے کھو گئے..... بے خودی سی بے خودی تھی اور..... عالم یہ تھا کہ بس کوئی بات نہ ہو، صرف یہ تھی تھی سی ساعتیں ہوں اور ہم دونوں ہوں۔ یہی کچھ ہو بھی رہا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ..... ایک عرصے بعد ملے تھے اور..... سمجھ بھی نہیں آرہا تھا کہ کیا بات کریں؟ کیسے کریں اور کہاں سے شروع کریں.....؟ وجہ یہی تھی کہ ہم عجیب حالات میں جدا ہوئے تھے اور اب بھی عجیب ہی حالات میں ملے تھے۔ بچھڑے تھے تو ایک دوسرے کے لیے مہجور دل کو سیپ بنائے محبتوں کے موتی چھپا کے بچھڑے تھے اور اب شاید لُٹانے کے لیے پھر ملے تھے۔ ہمارا کوئی عام رشتہ نہیں تھا، محبت کا رشتہ تھا۔ ایسی محبت کا سکوت توڑنے کے بہانے تو کئی تھے، ایک بہانہ اس نے آزمایا اور دوسرا میں نے آزماتے ہوئے اس سے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں تھوڑا سا پانی پی لینا چاہیے۔''

''اوہو، ہاں! میں تو..... میں تو..... تم سے کچھ کھانے پینے کا پوچھنا ہی بھول گئی تھی۔'' وہ زبردستی کی مسکان اپنے لبِ لرزاں پر طاری کیے اُٹھی اور قریب دھرے فریج سے..... پانی کی بوتل نکال لائی۔ اس نے مجھے ایک گلاس بھر

کے دیا، کچھ فرش پر بچھے دبیز قالین پر گرا، میں نے گلاس تھام لیا اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گیا۔

''اور پیو گے؟'' وہ دوبارہ بھرنے لگی۔

''تم پیو۔'' میں نے کہا۔

وہ بیٹھ کر پانی پینے لگی۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا، وہ کانچ کے گلاس کے کناروں سے مجھے تکتی رہی اور پانی پیتی رہی۔

میں نے دوبارہ استفسار کیا تو اس بار میرے لہجے میں محبت کی نرمی کے علاوہ ایک فکر ایک تشویش بھی شامل تھی۔

''حمیرا! تم ٹھیک تو ہو نا.....؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس نے کہا۔ وہ خود کو سنبھالنے لگی تھی۔ اس کے ڈھلتے کنول سے چہرے پر اب فکر و تشویش عنقا ہونے لگی اور خوشی و مسرتوں کے رنگ دھیرے دھیرے سہی، غالب آنے لگے تھے۔

''تم مجھے دیکھ کر کچھ متفکر اور متوحش سی نظر آنے لگی ہو۔'' میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''میں سمجھا کہیں تمہیں میرے ایک دم سامنے آنے پر کوئی تشویش.....''

''ہرگز نہیں۔'' وہ ایک دم بولی۔ ''بے شک میں تمہیں اچانک اور غیر متوقع سامنے پاکر ایک شاک سے گزری ضرور... ہوں لیکن..... تمہیں اتنے عرصے بعد دیکھ کر مجھے بے پناہ... خوشی بھی ہو رہی ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا، کیا کہوں کیا بات کروں؟'' ایک ذرا متوقف ہونے کے بعد دوبارہ بولی۔

''لیکن..... تم یہاں کیسے؟ تم تو پاکستان میں تھے؟''

''کہانی تو وہی پرانی ہے، چند ابواب سے تم بھی اچھی طرح واقف ہو مگر یہ کہانی ہے ذرا لمبی.....'' میں نے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''سنانے بیٹھا تو بیٹھا رہ جاؤں گا۔ تم سے ملنا تھا، ایک نظر دیکھنا تھا، سو چلا آیا۔''

''بس، ایک نظر کے لیے ملنا تھا مجھ سے.....؟'' اس کے لہجے ہی میں نہیں بلکہ آنکھوں میں بھی ایک پیار بھرا شکوہ در آیا تھا۔

''ایسی ہی بات سمجھو۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا اور بے اختیار ایک طویل ہنکاری بھرتے ہوئے آگے بولا۔ ''یہ دل بھی عجیب شے ہے، سوچا تھا تمہاری جدائی کی قربانی دوں گا، تاکہ تم مجھ سے الگ رہ کر ایک پُرسکون زندگی گزار سکو مگر جیسے ہی مجھے معلوم ہوا کہ تم بھی ادھر ہی ہو، قریب میں..... یہ کم بخت دلِ ناداں بے چین و بے اختیار ہی یہاں کھنچا چلا آیا۔''

''یہ تمہاری بھول تھی سیف! کہ میں تم سے جدا ہو کے ایک پُرسکون زندگی گزاروں گی۔'' وہ ایک دم جیسے مغموم سے لہجے میں بولی۔ اسے آزردہ پا کر میں بے چین ہو گیا اور اس کے بولنے کا منتظر رہا۔

''ایک غلطی میری بھی تھی جو کہ میری مجبوری سہی، میں پاپا کے اصرار سے مجبور ہو گئی تھی، پھر تمہارا بھی یہی خیال تھا تم پاپا کے خیال سے اگری بھی کرتے تھے، لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ پاپا نے میری خاطر پاکستان سے اپنا سارا کاروبار وائنڈ اپ کیا اور یو کے آ کر سیٹل ہونے کی کوشش کرنا چاہی، کافی حد تک سب ٹھیک بھی رہا، مگر میں محسوس کرنے لگی تھی کہ پاپا میں اب وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی، وہ چپ چپ، اُداس اور غم زدہ سے رہنے لگے تھے، ایک تو یقینی طور پر انہیں ماجد کی دائمی جدائی مارے ہوئے تھی اور دوسرے اپنا ملک چھوڑنے کا دُکھ نہیں بھولتا تھا، بھائی کی جدائی کو تو میں بھی اب تک نہیں بھلا پائی تھی مگر پاپا کو غم زدہ دیکھ کر میں اپنا غم چھپائے رہتی تھی، قدرت کو شاید ابھی مجھے مزید کڑے امتحانوں سے دوچار رکھنا تھا کہ پاپا کو یہی دُکھ اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ ایسے بیمار پڑے کہ پھر دوبارہ بستر علالت سے نہیں اُٹھ پائے۔ ان کے انتقال کے بعد میں تنہا رہ گئی۔ بالکل اکیلی..... ایسے میں دل کے پرانے زخم، دیرینہ واسطے، وہ راستے جن پر کبھی میں تمہارا ہاتھ تھامے چلا کرتی، وہ سب یاد آنے اور بے چین کرنے لگے۔ اب تو میں تہی داماں ہو گئی تھی، ایسے میں بچھڑے ہوؤں کی اور بھی زیادہ یاد آتی ہے۔ میرا دل بہت بھاری ہو گیا ہے سیف! سنبھالے نہیں سنبھلتا..... کک..... کہیں ایسا نہ ہو کہ.....''

وہ اتنا کہہ کر رو پڑی۔ اس کی آہوں اور سسکیوں کے درمیان یہ ساری داستان سن کر خود میں..... بھی دل گیر ہو گیا۔ یک ٹک اسے روتا سسکتا دیکھتا رہا، دل چاہا کہ اسے خود سے لپٹا کر اس کے سارے دکھ اور غم لے کر اپنے میں جذب کر لوں۔

عجیب بات تھی کہ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پایا تھا نہ ہی اس سے ایک لفظ حوصلے اور تسلی کا بھی کہہ پایا۔ شاید میں خود بھی چاہ رہا تھا کہ وہ روتی رہے، اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور چند ثانیے بعد ایسا ہوا بھی..... اس نے اپنے پلّو سے آنسو... پونچھ لیے۔

''میں بھی خوشی کے موقع پر کیا دُکھڑے لے کر بیٹھ گئی۔ سوری سیف! تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو منگواتی ہوں۔''

کہتے ہوئے وہ صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور روم

سروس کو فون کرنے کے لیے وہ قریب رکھی تپائی پر رکھے فون کی جانب بڑھتے ہوئے میری کرسی کے قریب سے گزری تو میں نے یکدم اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ رک گئی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ایک بار پھر آمنے سامنے، ایک دوسرے کے رُوبرو اور قریب..... بالکل قریب کھڑے تھے۔ اس قدر قریب کہ..... ایک دوسرے کے تنفس کی آواز تک سن سکتے تھے۔ ہم جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کے اندر اُترے جاتے تھے۔ اس کا نرم و گداز ہاتھ ہنوز میرے ہاتھ کی گرفت میں تھا اور جسے اس نے چھڑانے کی بھی کوشش نہیں چاہی تھی بلکہ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے تھمے ہوئے ہاتھ کی گرفت بھی مضبوط ہوگئی ہے۔

گویا اس سے وہ مجھے اور نہ میں اُسے چھوڑنا چاہتا تھا۔ تب ہی میں نے نجانے کس جذبے سے مغلوب ہو کے اسے بے اختیار خود سے بھینچ لیا۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے چوم لیا۔ اس کے حلق سے سسکاری کی مدھم آواز میری سماعتوں میں اُتری تھی۔

''حمیرا! خود کو اب کبھی اکیلی مت سمجھنا۔'' میں نے جذبات سے مرتعش لہجے میں کہا۔ ''میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ تمہیں تنہا چھوڑوں، نہ ہی تمہیں غم زدہ دیکھ سکتا ہوں۔ میرا تمہارے متعلق فیصلہ وہی تھا جو تمہارے پاپا کا بھی تھا، اس سے تم میری سچائی کو پرکھ سکتی ہو۔ لیکن اب یہ سن کر مجھے بھی دُکھ ہوا ہے کہ امجد صاحب بھی دنیا میں نہیں رہے۔''

میں کہتا چلا گیا۔ حمیرا کو بھی میری اس اپنایت اور بے اختیاری نے جذبات انگیز بنا ڈالا۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔

''کیا صحیح تھا کیا غلط اب مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں رہا سیف! میں بس یہ جانتی ہوں کہ اس وقت اپنے محبوب کی بانہوں میں ہوں اور بس.....! مجھے کوئی گلہ ہے نہ شکوہ، کسی سے بھی نہیں، تم سے تو بالکل بھی نہیں۔''

میں نے اس کے پھولوں جیسی قدرتی خوشبو لیے شاخِ گل جیسے نرم و نازک بدن کو اور زیادہ بھینچ کر کہا۔

''حمیرا! گزری تلخیاں سب بھول جاؤ، اپنے غم بُھلا دو، ان کے سہارے جینا بہت کڑا امتحان ہوتا ہے۔ لوگ سہہ نہیں پاتے ختم ہو جاتے ہیں، میں تمہیں ایسا ہوتا نہیں دیکھنا چاہتا۔''

وہ میری بات سن کر دھیرے سے الگ ہوئی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''تو پھر چلو میرے ساتھ، ہم ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں گے۔''

''بالکل کریں گے، جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا مگر پلیز، اب غموں کے بوجھ سے خود کو ہلکا کر ڈالو.....'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔

''میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے۔'' اس نے پھر بے قراری سے پوچھا۔

''اس کا جواب تمہیں تفصیلی دوں گا، تم روم سروس فون کر کے کچھ کھانے پینے کے لیے منگوا رہی تھیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ مسکراتے ہوئے اور پیار بھرے دُلار سے میرے سینے پر ہلکا سا مُکا مارتے ہوئے بولی۔

''بالکل نہیں بدلے، ویسے ہی شریر ہو، بیٹھو۔''

میں دوبارہ اپنی آرام کرسی پر براجمان ہوگیا۔ وہ فون والی تپائی کی طرف بڑھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میرے سامنے میز پر سینڈوچز، اسنیکس، چائے اور کیک وغیرہ رکھ دیے گئے۔ مجھے بھوک تھی، میں وہ کھانے لگا اور ساتھ ہی حمیرا سے بھی کچھ کھانے کو کہا۔ وہ میرا ساتھ دینے لگی۔ فضا کچھ معمول کی ٹھہری تو حالاتِ دوراں کا یارا ہوا اور اسی دوران وہ مجھ سے بولی۔

''اندازہ تو مجھے اخبار کی ایک خبر پڑھتے ہی ہو چکا تھا کہ تم اپنے پرانے مشن کے سلسلے میں اِدھر ہی ہو گے۔''

''ہم..... خاصی ذہین ہو، ویسے اخبار میں تم نے ایسا کیا پڑھ لیا تھا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''چند لوگوں کے بارے میں خبر تھی کہ انہیں بظاہر دشمنی کی بنا پر ہلاک کیا گیا ہے لیکن ان کا سمبندھ انسانی اعضا کا غیر قانونی کاروبار کرنے والوں سے جوڑا جا رہا تھا۔ ان میں شنکر چانکیہ اور جسونت رائے نامی بھارت کے دو بااثر افراد کے نام شامل تھے۔'' اس نے بتایا اور میں چونکا۔ تب میں نے دھیرے دھیرے اسے مختصر مگر جامع الفاظ میں اپنی اب تک کی بپتا سنا ڈالی۔ وہ ایک ٹک یہ سب سنتی رہی تھی۔

''او..... میرے خدا! اس کا مطلب ہے، تم اس وقت بھی ایک اہم مشن پر ہو اور یہی نہیں تمہارے وہ دونوں ساتھی رومی اور طارق بھی.....'' ایک جوش تلے وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی تو میں نے درمیان میں کہا۔

''ہاں! وہ دونوں بھی اسی شہرِ خرابہ میں ہیں مگر بے چاری رومی کا کچھ پتا نہیں۔''

''خدا کرے وہ خیریت سے ہی ہو۔ تم تینوں بہت نیکی کما رہے ہو۔ لیکن میرے پاس تمہارے لیے ایک اور چونکا دینے والی خبر بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' چائے کی طرف بڑھتا ہوا میرا ہاتھ ایک دم رک گیا تو حمیرا وہ کپ مجھے اُٹھا کر تھماتے ہوئے بولی۔

''میں نے آج دوپہر میں نیچے ہوٹل کی لابی میں تاج کو دیکھا تھا اور سخت خوف زدہ ہوگئی تھی۔''

''کیا.....؟ واقعی!'' میں اس کی بات پر بُری طرح چونکا۔ ''اس کی کچھ تفصیل بتا سکتی ہو تم؟''

''آج میں سیمینار سے جلد ہی اپنے ہوٹل لوٹ آئی تھی۔'' وہ کچھ صراحت سے بتانے لگی۔

''سوچا روم میں جا کر لنچ کرنے کے بجائے ڈائننگ ہال میں ہی کر لوں، تب ہی وہ مردود تاج مجھے اچانک نظر آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ہمراہ گوہر شاہ بھی تھا، دو مقامی افراد بھی تھے۔ مقامی افراد میں سے ایک گٹھی ہوئی جسامت کا آدمی بھی تھا جو خاصا دبدبے والا آدمی نظر آتا تھا۔ گوہر شاہ اور وہ دونوں ساتھ ساتھ آگے چل رہے تھے، جبکہ تاج اور دوسرا مقامی آدمی اُن کے پیچھے تھے۔''

''گوہر شاہ کے ساتھ چلنے والے اس آدمی کا حلیہ ذرا تفصیل سے بتانا۔'' میں نے کسی خیال کے تحت سوال کیا۔

''وہ گوہر شاہ کی ہی عمر کا تھا، کالا سیاہ اور سر سے بالکل گنجا۔ ناک بھی گدھ کی چونچ کی طرح لمبی ہو کے آگے کو مڑی ہوئی تھی۔''

''وہ کہاں گئے؟ میرا مطلب ہے، کسی کمرے میں، نیچے یا اُوپری منزل میں.....؟'' میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، جس مشن کے لیے میں..... ہار بر ہاؤس جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا اس کی ابتدا مجھے اِدھر ہی ہوتی نظر آ رہی تھی۔

''وہ لفٹ کی طرف بڑھ گئے تھے۔ اب میں نہ جان سکی کہ وہ کون سی... منزل پر گئے ہوں گے۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ گوہر شاہ کے ساتھ آخر یہ گنجا شخص کون ہو سکتا تھا؟ کیونکہ ان خونی سوداگروں کا گروگھنٹال..... شکر چانکیہ تو ہماری وساطت سے اور دھوکے سے ہی سہی، اپنے جانی دشمن جسونت رائے کے ہتھے چڑھ چکا تھا، تو پھر اب گوہر شاہ نے یہ کس نئے آدمی کی گود میں پناہ لے لی تھی؟ یا پھر یہ کالا گنجا شخص بھی انہیں خونی سوداگروں میں سے ایک تھا؟ ظاہر ہے کم از کم گوہر شاہ کی سنگت میں ہونے والے آدمی کا بھلا اور کون سا دھندا ہو سکتا تھا۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا پھر اس سے بولا۔

''اس کے بعد تم نے دوبارہ انہیں نہیں دیکھا؟ میرا مطلب ہے اور کچھ جو تم نے دیکھا؟''

''وہ شاید ان دونوں افراد کو ائرپورٹ سے لائے تھے۔ کیونکہ ان کے ہمراہ سامان بھی تھا، جو دو عدد ویٹر ان کے پیچھے اُٹھائے لیے چل رہے تھے۔'' وہ بتانے لگی۔ ''میں تو اس مردود تاج کو دیکھتے ہی خوف زدہ ہوگئی تھی اور بھوک بھی اُڑ گئی تھی۔ میں اُدھورا کھانا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔''

''ان کی تم پر نظر تو نہیں پڑی تھی؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں.....''

''تمہیں یقین ہے کہ یہ آج دوپہر ہی کی بات ہے؟''

''بھلا آج کی بات اور وہ بھی چند گھنٹوں پہلے کی میں کیسے بُھلا سکتی ہوں؟''

''ہم.....!'' میں نے کچھ سوچا پھر کہا۔ ''تم یہاں کتنے دن مزید مقیم ہو؟'' میں نے دیکھا میرے یہ پوچھنے پر اس کے چہرے پر ایک تکلیف دہ سی حیرت کے آثار اُبھرے، بولی۔

''کیا تم چاہتے ہو میں چلی جاؤں؟''

''ہرگز نہیں، میں نے روادری میں پوچھ لیا۔'' میں نرم سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''لیکن تمہیں بہرحال واپس یو کے لوٹنا تو ہوگا نا؟''

''ہاں! لیکن اب اتنی جلدی نہیں، تمہارا مستقبل کے بارے میں کیا پلان ہے؟'' میں اس کے سوال کا مطلب سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''ابھی تو یہی کچھ ہے جو تمہیں اب تک نظر آ رہا ہے، مگر تم کچھ انتظار کرنے کی پوزیشن میں ہو؟''

''کچھ انتظار؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''سیف! میں تو ساری زندگی تمہارا انتظار کرنے کو تیار ہوں۔ تم اب کیا چاہتے ہو؟'' وہ جیسے دل کی گہرائیوں سے بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لی، یہاں میں سمجھ رہا تھا پھر وہی منحوس موڑ ہمارے درمیان آنے لگا۔ بہت محتاط ہو کے بولا۔ ''میں شاید اپنے اس اہم مشن کے نزدیک تر ہوں۔ اب فاصلے ہمارے درمیان زیادہ دیر نہیں رہیں گے۔ تم خود کو تنہا مت سمجھنا، میرا تو ابھی تمہارے لیے یہی مشورہ ہوگا کہ تم..... یو کے لوٹ جاؤ اور اپنی زندگی کو پُرسکون انداز میں گزارنے کی کوشش کرو، ہم رابطے میں رہیں گے۔''

''سیف! میرا اب وہاں دل نہیں لگ رہا۔''

''کیوں؟ وہاں تمہاری جاب ہوگی اور پھر اب تو تمہیں اپنے پاپا کا کاروبار بھی خود ہی سنبھالنا پڑتا ہوگا، اچھی خاصی مصروفیت تو ہے تمہاری؟''

''صرف مصروفیت سے کیا ہوتا ہے سیف؟ زندگی

گزارنے کے لیے ایک اکیلی اور تنہا عورت کو اور بھی تو کچھ چاہیے ہوتا ہے۔'' وہ میرے چہرے کو مسلسل تکتے ہوئے بولی پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ گویا ہوئی۔

''پاپا کا کاروبار اب میں نے کیا سنبھالنا تھا۔ وہ سب ختم کر دیا، اب تو بس جیسے چار و ناچار جاب ہی کرتی ہوں ایک ہاسپٹل میں۔ کچھ عرصے بعد مجھے ایسٹنٹی بھی ملنے والی ہے۔''

''تمہارا دوبارہ اپنے وطن پاکستان آنے کو دل نہیں کرتا؟ لاہور یاد نہیں آتا.....؟'' میں نے یونہی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''کرتا ہے، کیسے نہیں کرتا، اپنے وطن کی مٹی سے تو مجھے پیار ہے، اور پھر لاہور تو لاہور ہے..... راوی کا پانی تو میری رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے، اس کی ہریالی کی خوشبو میری سانسوں میں بسی رہتی ہے۔''

''حمیرا!'' میں نے ہولے سے کہا۔ وہ بڑے دھیان سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں مقصد کی طرف آیا اور آگے بولا۔

''میرا خیال ہے یہ سب بہتر ہونے کے لیے جا رہا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ..... ابھی فوری طور پر تو تم نہیں جا رہی ہو نا یو کے؟''

''دو دن بعد میری واپسی تھی۔''

''اگر ضرورت پڑے تو تم کچھ دن مزید قیام کر سکتی ہو؟''

''نو پرابلم.....''

''ٹھیک ہے، ابھی تم میرا یہیں انتظار کرو، میں ذرا ان شیطانوں کو ٹریس کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' کہتے ہوئے وہ بھی متفکر سی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''اللہ کی مدد اور تمہاری دعائیں شاملِ حال ہیں۔ میں ذرا واش روم جانا چاہتا ہوں، تھوڑا ریڈی میڈ میک اَپ کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ اس نے واش روم تک میری راہنمائی کی۔ میں اپنی کٹ لیے واش روم میں آ گیا۔

چند منٹوں بعد نکلا تو میری صورت خاصی بدل چکی تھی۔

''اے مسٹر! کون ہو تم؟'' حمیرا قدرے تُنک کر بولی، میں چونک گیا۔ وہ یک دم ہنس پڑی۔

''کمال ہے، تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔''

''اور تم نے مجھے پریشان.....'' میں بھی ہنس کر بولا۔

''میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کے ابھی تم چیخ چلّا کر نکال باہر کرو گی۔''

''خیر، ایسی بات بھی نہیں۔'' وہ بولی۔

میں اس کے کمرے سے نکل آیا۔ پہلے والے زینے کی طرف جانے کے بجائے میں نے دوسرے زینے کا رخ کیا، وہ مرکزی دروازے کے قریب تھا۔ ایسا میں نے دانستہ کیا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ استقبالیہ والی لڑکی مجھے دوبارہ اسی زینے سے آتے ہوئے دیکھے۔

وہاں سے میں نظریں بچاتا ہوا، لابی میں آ گیا۔ یہاں عام لوگ بھی کچھ ہلکا پھلکا کھانے پینے یا باتیں کرنے کے لیے آ کر بیٹھتے تھے، یعنی ضروری نہیں تھا کہ صرف ہوٹل کے اقامتی افراد ہی بیٹھتے ہوں۔

میں ایک صوفے پر جا کر براجمان ہو گیا۔ میرے آگے فینسی قسم کی گول میز تھی۔ اس پر منرل واٹر کی بوتل، گلاس اور ٹشو پیپر گولڈن کلر باکس رکھا تھا۔

میرے بیٹھتے ہی ایک باوردی ویٹر ادب سے آن حاضر ہوا۔ میں نے اسے چائے اور کچھ بسکٹ لانے کا کہہ دیا۔

ذرا دیر بعد ہی وہ یہ سب لے آیا۔ اب میں چائے کے بہانے بیٹھا گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ حمیرا سے میں نے پوچھ لیا تھا کہ وہ چاروں کس زینے پر چڑھ کر اُوپر گئے تھے۔

اگرچہ صورتِ حال اب بھی واضح نہ تھی، یعنی کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ لوگ اُوپر کون سی منزل کے کس کمرے میں تھے؟ بقول حمیرا کے، فرسٹ فلور پر زیادہ تر روم تھے جبکہ سیکنڈ پر سوئٹس بنے ہوئے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ لوگ کسی سوئٹ میں ہی موجود ہوتے، مگر کس میں.....؟'' یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اب یہاں موجود بھی تھے یا نہیں، کیونکہ حمیرا کے کہنے کے مطابق اس نے ان چاروں مذکورہ افراد کو لنچ ٹائم میں ہوٹل کے اندر داخل ہوتے دیکھا اور اب رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔

چائے کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ آخر کیسے اندھیرے میں تیر چلایا جائے جو نشانے پر لگے۔ سرِدست مجھے اس کی کوئی راہ نہیں سجھائی دے رہی تھی۔

یہاں بیٹھنے کا بھی میرا فقط اتنا ہی مقصد تھا کہ کیا خبر وہ لوگ واپسی کے لیے پلٹتے اور پھر میں اُن کے پیچھے لگ جاتا مگر کب تک؟

جب اندھیرے میں کوئی تیر چلانے کا موقع نہ ملا تو

میں کچھ سوچ کر دوبارہ حمیرا کے روم میں آ گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اب کیا کرو گے؟''

''تم کچھ کر سکتی ہو؟''

''کیا؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''تم یہاں قیام پذیر ہو اور تمہارے یہاں قیام کے مقصد سے استقبالیہ والے واقف ہوں گے۔ یوں تمہارے سوال پر کسی کو شبہ بھی نہ ہوگا۔ لہٰذا تم کسی طرح ان چاروں کا نہیں تو دو افراد، گوہر شاہ اور تاج کے بارے میں پتا کرنے..... کی کوشش کرو کہ ان کا سوئٹ یا روم نمبر کون سا ہے؟''

میری بات پر حمیرا کچھ سوچتی رہی پھر فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''یہاں کی ہیڈ ویٹریس سوشیلا سے میری دوستی ہو گئی ہے، اسے جب معلوم ہوا تھا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں تو اس نے اپنے ایک میڈیکل پرابلم کے لیے مجھ سے مشورہ مانگا تھا۔ اسی سے پوچھ سکتی ہوں۔''

''گڈ! ڈاکٹری کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی پی آر ہر جگہ بن جاتی ہے، چلو جاؤ شاباش! اب اس کا فائدہ اُٹھاؤ..... میں اِدھر ہی بیٹھ کر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ تھوڑی سی تیاری کے بعد نیچے چلی گئی۔

مجھے حمیرا سے پوری اُمید تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کر کے ہی لوٹے گی۔ گوہر شاہ اور تاج اس کے بھی بھائی کے قاتل اور ان کی بربادی کے ذمے دار تھے۔

ساڑھے آٹھ بجے وہ آ گئی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی میں ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جوشیلے انداز میں بولی۔

''اس کالے گنجے کا نام..... بھولا ناتھ ہے، دوسرا اس کا ساتھی چرن ہے۔ آج ہی یہ دونوں نربدا سے آئے ہیں۔''

''گوہر شاہ اور تاج.....؟'' میں نے سوال کیا۔ ہم دونوں بیٹھ چکے تھے۔

''ان دونوں کے بارے میں سوشیلا کو علم نہیں، نہ ہی وہ دونوں اس ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔'' اس نے جواب میں کہا۔

''میں سمجھ گیا، یہ دونوں مردار ابھی تک ہاربر ہاؤس میں ہی مہمان ہیں اور بھولا ناتھ کو ائرپورٹ سے ریسیو کرنے گئے ہوں گے۔ خیر، ان کا روم نمبر؟''

''وہ سیکنڈ فلور کے سوئٹ نمبر سترہ۔ اے میں مقیم ہیں۔''

''ابھی تک وہیں ہیں؟'' میں نے اپنے دل کی تیز پڑتی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! وہ اندر ہی موجود ہیں اور کسی اہم میٹنگ میں مصروف بھی، دروازے پر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا ہینگنگ سائن لگا رکھا ہے۔ انہوں نے لنچ بھی اُوپر ہی منگوا لیا تھا اور سہ پہر سے ہی میٹنگ میں مصروف ہیں۔''

یہ سن کر میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میرے ازلی دشمن میرے قریب تھے۔

حمیرا اور اس کی فیملی کو جن لوگوں نے دربدر کیا تھا، وہ بالآخر اسی کی کوشش اور وساطت سے سامنے آ گئے تھے۔ اس پر حمیرا کی بھی ہمت سوا ہونے لگی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ پولیس کو خبر کر دیتے ہیں۔'' حمیرا نے اسی جوش سے مجھے مشورہ دیا اور میں اس کی معصومیت پر مسکرا دیا۔ ''قانون، ان جیسے خونی سوداگروں کے لیے اپنے انجام سے بچنے کا ایک بہانہ ہے۔ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''لیکن تم اب تنِ تنہا اس حال میں اور وہ بھی دیارِ غیر میں انہیں کیسے کیفرِ کردار تک پہنچاؤ گے؟'' حمیرا پریشان کن حیرت سے بولی۔

''اب تک اور کیا کرتا آیا ہوں میں حمیرا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں اکیلا کب ہوں؟ خدا میرے ساتھ ہے۔''

''مگر کیا تم انہیں کمرے میں جاتے ہی ہلاک کر ڈالو گے؟''

''یہ میرا کام ہے۔ تم دیکھتی جاؤ اور جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا۔''

''میں پیچھے نہیں ہٹنا چاہتی۔ میرے بھائی کے قاتل اور ہمیں دربدر کرنے والے یہی تو ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' حمیرا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ میں نے مسکرا کر حوصلہ افزا انداز میں اس کا شانہ ہولے سے تھپتھپایا۔

''دعا کرو، میں ابھی آتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں اس کے کمرے سے نکل گیا۔ بات سے بات نکلتی ہے اسی طرح راہ سے راہ..... کہاں تو میں ہاربر ویسٹ جانے کی تیاری سے نکلا تھا اور راستے میں..... حمیرا سے ملنا قرار پایا، یہاں آیا تو میرا مقصد سامنے تھا۔ یہی تقدیر کے کھیل ہیں اور یہی اس کی طرفہ کاری.....

میں اُوپری منزل پر آ گیا پھر سوئٹ نمبر سترہ۔ اے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہاں ڈونٹ ڈسٹرب کا ہینگر سائن جھول رہا تھا۔ اندر میرے دو ازلی دشمن موجود تھے۔

دل میں ایک جوش کا طوفان سا اُٹھتا تھا کہ دروازہ توڑ ڈالوں اور دُرانہ وار اندر داخل ہو کے گوہر شاہ اور تاج کو واصل جہنم کر ڈالوں۔

بہت آسانی کے ساتھ میں نے اپنے اس جوشِ جنوں پر قابو پایا اور..... دو چکر اسی کوریڈور کے لگانے کے بعد..... حمیرا کے روم میں آ گیا۔

''کیا رہا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''ان کی ابھی تک اہم میٹنگ چل رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ان کی یہ خفیہ میٹنگ بہت طویل نہیں ہو گئی؟''

''ہاں! دوپہر سے ابھی تک پانچ سے چھ گھنٹے تو کہے جا سکتے ہیں۔'' میں بولا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ چاروں جا چکے ہوں اور..... ہینگر سائن اسی طرح لگے رہنے دیا ہو۔'' حمیرا نے بات بُجھائی۔ میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ چونک کر بولا۔

''تمہاری بات بھی رد نہیں کی جا سکتی۔ کیا خبر ایسا ہی ہوا ہو۔ اُن کے بیچ اتنی طویل میٹنگ نہیں ہو سکتی۔''

''میں سوشیلا سے معلوم کرنے کی کوشش کروں؟''

''بار بار اُن کے متعلق پوچھنے پر کہیں وہ تم پر کسی قسم کا شبہ ہی نہ کرنا شروع کر دے؟'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''یہ تو ہے، مگر اب کیا کریں؟ کیا اسے بھی راز میں شامل کر لیں۔ ہم کوئی غلط کام تو نہیں کر رہے ہیں۔''

''بھول کر بھی ایسا نہیں سوچنا۔'' میں نے فوراً کہا۔

''سوشیلا کو چھوڑو، مجھے کچھ سوچنے دو۔'' میں گومگو سے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک راہ کھلی تھی مگر آگے ایک دم بند گلی آ گئی تھی۔ سب کچھ صفر ہو کے رہ گیا تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے اب اپنی سابقہ راہ ہی اختیار کر لینی چاہیے۔'' میں جیسے سوچنے کے دوران ہی خود سے بڑبڑایا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''مجھے باندرا ویسٹ کا ہی رخ کرنا پڑے گا۔ یہ دونوں وہیں ہار برباؤس گئے ہوں گے۔''

''لیکن یہ تو بھیڑیوں کی کچھار میں گھسنے کے مترادف ہوگا۔'' حمیرا پریشان ہو گئی۔

''اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، تم بس میری کامیابی کی دعا کرتی رہو۔''

''وہ تو میں ہر وقت کرتی ہوں مگر سیف! یہ خطرے سے خالی نہیں۔''

''میں اب تک اسی قسم کے خطرات مول لیتا رہا ہوں، تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد تم سے دوبارہ ملنے کی کوشش کروں گا۔'' کہتے ہوئے میں رخصت ہونے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک دم اُداس اور متوحش سی ہو گئی اور چند قدم چل کر میرے قریب..... بالکل قریب آن کھڑی ہوئی اور میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

''سیف! میں اکیلی ہو گئی ہوں، اب میں اپنا دل بھی ویران نہیں کرنا چاہتی۔ تمہیں دوبارہ دیکھنے کے بعد میرے اندر اُمید کی جو جوت جاگی ہے وہ اگر خدانخواستہ دوبارہ بجھ گئی تو شاید میں بھی.....'' کہتے ہوئے اس کی کشادہ دلکش آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میں نے مسکرا کے اس کے اشکوں کو اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں کی پوروں سے پونچھا اور لہجے میں مضبوطی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

''حمیرا! اللہ پر بھروسا رکھو، اس نے ہمیں دوبارہ ملایا ہے تو ایک دن ہم دونوں کو ہمیشہ کا ساتھ بھی دے گا۔ مجھے یقین ہے۔ تم بس دعا کرو اور حوصلے سے کام لو۔'' کہتے ہوئے میں نے بڑے پیار سے اس کا نرم و گداز گال ہولے سے تھپتھپا دیا۔ وہ سسک کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں اس کے روم سے نکل چکا تھا۔ دوسرے زینے سے میں جیسے ہی نیچے لابی میں آیا تو بُری طرح ٹھٹک گیا۔

میرے سینے میں دل کی دھڑکنوں کی رفتار بھی یکلخت تیز ہوتی چلی گئی۔ تقدیر شاید اب ایک بار پھر میرا ساتھ دینے پر تُل گئی تھی، ورنہ رچنا کے ''ہاتھ'' دکھانے کے بعد میں تو اس طرف سے بھی مایوس ہو چلا تھا۔

لابی سے میں نے انہی چاروں کو تیز تیز قدموں سے باہر جانے والے دروازے کی جانب بڑھتے دیکھا۔

''تو گویا یہ ابھی فارغ ہوئے ہیں۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔ اگر مجھے حمیرا کے کمرے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو یہ چاروں نکل چکے ہوتے اور مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔

دیکھنا اب یہ تھا کہ یہ چاروں کہاں کا رخ کرتے ہیں۔

میں بھی تیزی کے ساتھ ان کے پیچھے ہی ہوٹل مورت

سے باہر نکل آیا۔

وہ پارکنگ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان میں گوہر شاہ اور تاج کو میں پہچان چکا تھا، جبکہ کالے گنجے شخص اور اس کے آدمی کو میں نے حمیرا کے بتائے ہوئے حلیے سے پہچانا تھا۔

اگرچہ مجھے یقین تھا کہ اُن کی نظر مجھ پر پڑی بھی تو کم از کم گوہر شاہ اور تاج مجھے نہیں پہچان پائیں گے کیونکہ میں نے حمیرا کے کمرے میں ہی ہلکا پھلکا ریڈی میڈ میک اَپ کر لیا تھا، لیکن پھر بھی میں انہیں اپنے اُوپر کسی قسم کا شک نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس اپنی گاڑی نہیں تھی۔ وہ چاروں ایک لمبی سی سیاہ کار کے قریب جا کھڑے ہوئے تھے۔

میں ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ اس کا ڈرائیور بھی شاید سواری ہی کے انتظار میں ڈرائیونگ سیٹ پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا تھا۔ مجھے اپنی جانب تیزی سے لپکتا دیکھ کر وہ تن کر بیٹھ گیا۔

میں دوسری طرف سے دروازہ کھول کر اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ ساتھ ہی میں نے اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ وہ ایک بھاری جثے کا مالک تھا، چہرے پر سیاہ داڑھی تھی۔ مونچھیں بھی تھیں، بال چھوٹے مگر گھنے اور کرلی تھے۔ رنگت صاف تھی۔

بیک ویو مرر پر قرآنی آیات کے طغرے اور ایک تسبیح جھولتی دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک مسلمان تھا۔

''ارے بھئی کیا کرتا ہے؟ جانا کہاں ہے؟ خیریت تو ہے بھائی!'' اس نے چونک کر اور قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ سامنے والی سیاہ کار جو پارکنگ سے نکل رہی ہے، اسی کا تعاقب کرنا ہے۔'' میں نے ٹیکسی کی ونڈ اسکرین سے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ چاروں سوار ہو چکے تھے اور اب ان کی کار پارکنگ شیڈ سے نکل رہی تھی۔

''ہیں، کیا کرتا ہے؟ کوئی مار ماری کا چکر ہے، نہ بابا نہ..... اپن ایسے کام میں نہیں پڑیلا۔''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ایک فیملی میٹر ہے۔ میں تمہیں ڈبل کرایہ دوں گا۔'' میں نے کہا۔

کار سڑک کی جانب بڑھ چکی تھی اور میری نظریں بھی اسی جانب گھوم رہی تھیں۔

''خدا کے لیے جلدی کرو۔''

تلاشِ گمشدہ

میری بیوی گزشتہ روز شہر کے سب سے بڑے شاپنگ سینٹر میں شاپنگ کرتے ہوئے اچانک گم ہو گئی ہے۔ میری بیوی کا رنگ گورا، بال گھنگھریالے، قد لانبا، کمر پتلی، ناک ستواں، ہونٹ پتلے، آنکھیں نشیلی، پلکیں گھنی، ابرو ترا شیدہ اور لباس جدید فیشن کا ہے۔ ہاتھ میں براؤن رنگ کا چرمی پرس ہے جس میں حق مہر کی رقم موجود ہے۔ جن صاحب کو ملے، ان سے درخواست ہے کہ موصوفہ کے پرس میں سے صرف فلیٹ کی چابی نکال کر ہوٹل کرسٹل کے کمرا نمبر 44 میں پہنچا دیں۔

☆☆☆

ایک نوجوان گدھا کل شام انارکلی بازار سے گزرتے ہوئے خواتین کے ہجوم میں کہیں گم ہو گیا ہے، گدھے کا قد پانچ فٹ، رنگ بھورا، مزاج رنگیلا، خصلت بُری اور آواز بے سری ہے۔ جن صاحب یا صاحبہ کو ملے وہ اسے بلدیہ کے پھوجے ٹھیکیدار کو پہنچا دیں۔

کاشان عباس کی مری سے التجا

''او! مسلمان ہو، الحمدللہ..... چل بھئی امجد بھائی، اپنے مسلمان بھائی کی مدد کر ہی لے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے ترنگ میں کہا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

''امجد!'' میں چونک کر بڑبڑایا۔ ''کہیں تم واقعی امجد خان، لیکن امجد خان صاحب کو تو مرحوم ہوئے کافی عرصہ بیت گیا؟'' میں نے کہا۔

''ہاہاہا..... کیا کرتا ہے؟ میں جو ہوں اس مہان کلاکار کی جگہ۔''

''کیا کرتا ہے؟'' شاید اس نئے امجد خان کا تکیہ کلام تھا۔ میں نے بھی ترنگ میں آ کر اس سے اسی انداز میں کہا۔

''تو پھر جلدی اپنی کلاکاری دکھاؤ نا، کیا کرتے ہو؟''

''یہ لو.....'' کہتے ہوئے امجد خان نے ٹیکسی اس سیاہ کار کے پیچھے لگا دی۔ اسے ایک دم جوش میں آتا دیکھ کر میں نے گھبرا کر کہا۔

''ذرا خیال رہے، انہیں اپنے تعاقب کا شبہ نہ ہونے پائے۔''

''کیا کرتا ہے؟ مجھے کیا اناڑی سمجھا ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' میں نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ''لیکن احتیاط کے پیشِ نظر کہا ہے میں نے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی توجہ سامنے والی کار اور اپنی ڈرائیونگ پر مرکوز کردی۔

میں اب سیاہ کار کی سمت دیکھ کر ان کی منزل کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ خیال یہی تھا کہ یہ لوگ ہاربر ہاؤس کی طرف جارہے ہوں گے اور یوں تھوڑی دیر بعد ہی میرا خیال درست ثابت ہوا۔ ان کی کار کا رخ مضافات کی طرف باندرا ویسٹ کی جانب ہوگیا تھا۔

''اوئے کیا کرتا ہے؟ یہ تو پالی ہلز، باندرا کی طرف جارہے ہیں؟'' ڈرائیور نے مخصوص لہجے میں کہا۔

''بالکل!'' میں نے فوراً کہا۔

''ہُنہہ..... پر یہ تو تفریح کے لیے جارہے ہوں گے وہاں، تم نے کیا ان کے رنگ میں کوئی بھنگ ڈالنا ہے۔'' وہ بہت باتونی تھا اور مجھے کوفت ہونے لگی، مگر اسے بہلاتے ہوئے بولا۔

''ارے نہیں امجد خان! میں نے کیا رنگ میں بھنگ ڈالنا ہے۔ میں بس ان کی کچھ جاسوسی کرنا چاہتا ہوں۔''

''اوے کیا کرتا ہے؟ تُو کوئی بدمعاش ہے۔ تُو تو مجھے بھی لوٹ لے گا۔'' کہتے ہوئے اس نے بھڑک کر ٹیکسی کو بریک لگا دیے۔ رات کے سناٹے میں کار کے ٹائر زور سے چرچرائے۔ ہمیں ایک جھٹکا لگا اور کار رک گئی۔ امجد خان کی اس حرکت پر میں پریشان ہوگیا۔

''امجد خان! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں کوئی بدمعاش نہیں ہوں۔ بے شک تم میری تلاشی بھی لے لو، میری جیب سے ایک چاقو تک نہیں نکلے گا۔''

''میں تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ باہر اُترو اور مجھے تلاشی دو، میں ضرور تمہاری تلاشی لوں گا۔'' وہ بولا۔ ''میں شر کو بالکل پسند نہیں کرتا خواہ وہ کسی کے ساتھ بھی ہو۔'' اس نے امجد خان والے ہی لہجے میں کڑک کر کہا۔

''دیکھو، وہ لوگ نکل جائیں گے، وہ بہت خطرناک مجرم ہیں اور زندہ انسانی اعضا کا کالا دھندا کرتے ہیں۔'' بالآخر مجھے بتانا پڑا۔ ورنہ تاخیر ہوجاتی۔

میری جیب سے اسے چاقو تو نہیں ملنا تھا مگر ایسے آلات ضرور اسے مل جاتے جو مجھے ایک جاسوس ہی گردانے کے لیے کافی ہوتے۔

''اوئے کیا کرتا ہے؟ کیا تُو سچ بول رہا ہے؟ کیونکہ میں نے اخبارات میں ایسے خونی لوگوں کے بارے میں پڑھ رکھا ہے اور جب بھی ان سے متعلق ایسی کوئی خبر پڑھتا ہوں، ان پر سو لعنتیں بھیجتا ہوں۔'' وہ ایک دم بولا۔

''بالکل ٹھیک کرتے ہیں آپ مگر خدا کے لیے ابھی کار تو آگے بڑھا دو جلدی۔'' میں نے اس کی منت کی۔ اگرچہ میں ان چاروں انتہائی مطلوب افراد کی منزل کا اندازہ لگا چکا تھا لیکن پھر بھی انہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

امجد خان یک دم فلمی جوش میں آگیا اگلے ہی لمحے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''اگر تم سچ کہتے ہو تو ان کے ٹھکانے پر پہنچتے ہی پولیس کو مطلع کردیں گے۔'' اس نے کہا۔

''ایسے لوگوں کے لیے پولیس تحفظ کا ایک بہانہ ہوتی ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

میرے لہجے میں اس نے بھی کسی گھاگ آدمی کی طرح تجربے کی بُو سونگھ ہی لی اور بولا۔

''کیا کرتا ہے؟ ایک دم ٹھیک بولا۔ یہ بڑی مچھلیاں ہیں۔ ان کے پاس چارے کی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن پھر تم آخر ان مردود دں کو کس طرح کیفرِ کردار تک پہنچاؤ گے؟ آخر تو قانون کو ہاتھ میں لینا اچھی بات تو نہیں ہوتی ہے نا۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے امجد بھائی!'' میں نے اس کی تائید میں کہا اور آگے بولا۔ ''ویسے میرے اور میرے ساتھیوں نے ان کے خلاف مربوط منصوبہ بندی کر رکھی ہے اور ہم اسی کے تحت ان خونی سوداگروں کے گرد جال بُن رہے ہیں، تاکہ ٹھوس ثبوت اور شواہد ہاتھ لگتے ہی انہیں قانون کے حوالے کردیا جائے کہ یہ لوگ پھر قانون کے شکنجے سے نکل نہ سکیں۔''

''او..... کیا کرتے ہو؟ یہ تو زبردست بات کہی تم نے بھیا!'' وہ پھر جوش تلے بولا۔ ''خونی سوداگر..... نام بھی تم نے ان کا بالکل صحیح رکھا ہے۔ بے گناہ اور معصوم انسانی جانوں سے کھیلنے والے یہ واقعی خونی سوداگر ہی ہیں۔ اب تو میری مدد بھی تمہارے ساتھ ہے اور میں تم سے اس کا معاوضہ بھی نہیں لوں گا بلکہ جہاں تک میری ضرورت پڑے قسم مولا کی..... پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

''تمہارا بہت شکریہ امجد بھائی!'' میں نے اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا۔ ''کرایہ تمہارا حق ہے، مدد تمہارا

شکریہ.....''

''ارے کیا کرتے ہو؟ کیا زبردست قادر خان والا فلمی مکالمہ بولا ہے۔'' امجد ہنس دیا۔

گاڑی باندرا ویسٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

باندرا ویسٹ پہنچے تو آخر یہ تسلی ہوتے ہی کہ سیاہ کار شنکر چانکیہ کی محل نما رہائش گاہ ''ہار بر ہاؤس'' کی جانب مڑ چکی ہے تو میں نے پروگرام کے مطابق امجد خان کی ٹیکسی ہار بر ہاؤس کی طرف جانے کے بجائے..... وہاں سے واچ ٹاور کے قریب واقع جیٹی کی طرف مڑوالی۔

جیٹی کے قریب پہنچ کر میں نے امجد خان کو ٹیکسی روکنے کا کہا اور کھڑکی سے ہی باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

ذرا ہی دور لکڑی کے پل نما پلیٹ فارم پر روشنیاں چمک رہی تھیں، اس جیٹی پر ایک چھوٹے سے شہر کا گماں ہوتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی تھی۔ یہاں ایک قدرے ویران ساحلی علاقے میں امجد خان کو ٹیکسی گھمانے کا کہا اور نیچے اُتر آیا۔

مجھے ساحلی گودی پر بنے بار، ریسٹورنٹ اور اسی طرح کے متعدد اسٹورز نظر آرہے تھے۔

تب میں امجد خان کی طرف گھوما۔ وہ بھی ٹیکسی کا انجن بند کر کے نیچے اُتر آیا تھا۔ خوب ہوا چل رہی تھی اور ساحل پر بڑا اچھا ماحول اور موسم بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کرایہ دینے لگا تو وہ پھر ایک دم اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''اوئے کیا کرتے ہو؟ یہ جہاد ہے اور میں اس کا معاوضہ لوں گا تم سے، ہرگز نہیں۔'' پھر تھوڑے توقف سے بولا۔ ''بلکہ مجھے بتاؤ، میری مزید کسی مدد کی ضرورت ہے تو۔ ان کمینے اور سفاک لوگوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' وہ تن گیا۔

میں اس کے سلوک اور جذبۂ انسانیت سے بے حد متاثر ہوا۔ بولا۔

''امجد خان! تم واقعی ایک بہادر اور انسان پرور آدمی ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے دوست! لیکن..... میں نہیں چاہتا کہ کسی کو اپنے ساتھ مصیبت میں ڈالوں، ویسے بھی میرے ساتھی میرے ساتھ ہیں، تم فکر مت کرو اور یہ کرایہ تمہارا حق ہے۔ لو رکھ لو۔''

''اوئے کیا کرتا ہے؟'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''بھائی بھی کہتا ہے اور ایسی باتیں بھی کرتا ہے۔ ہرگز نہیں، مجھے بتاؤ، آگے اور کہاں جانا ہے؟ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''امجد بھائی!'' میں نے اسے دوسرے انداز میں سمجھاتے ہوئے محبت سے مسکرا کر بولا۔ ''یہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور ان سے نمٹنے کا ہمارا ایک الگ طریقہ ہے اور اس طریقے کی ہمیں خاص ٹریننگ دی گئی ہے، یہ آج کی بات نہیں ہے، کافی عرصے سے میں اور میرے ساتھی ان کی بیخ کنی کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ مشن رازداری کا بھی متقاضی ہے۔ میں تنہا یہ سنبھال لوں گا، ورنہ تم خود سوچو میرے ساتھی میرے ساتھ نہ ہوتے۔''

وہ میری بات سمجھنے کے انداز میں اپنا سر ہلانے لگا، پھر چند ثانیے ہونٹ بھینچنے کے بعد بولا۔

''ٹھیک ہے، میری دعائیں تمہارے اس نیک مقصد کی کامیابی کے لیے ساتھ رہیں گی۔''

''اب کی ناتم نے پتے کی بات، مجھے سب سے زیادہ اسی چیز کی ضرورت ہے۔'' میں مسکرایا۔ وہ جانے لگا، میں نے اس کے انکار کے باوجود کرایہ اسے تھمادیا۔

وہ چلا گیا۔ میں ریسٹورنٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اندر جا کے معلوم ہوا کہ وہ بار تھا۔ وہاں کچھ انڈین اور غیر ملکی مرد عورتیں بھی تھیں۔ مثلاً گورے وغیرہ۔ دو ایک لڑکیوں نے میری جانب دیکھ کر مسکراہٹیں پھینکی تھیں۔ میں نے بھی مسکرا کر جواب پھینکا۔ ان میں ایک سری لنکن عورت بھی تھی۔

اسے شاید وہاں کوئی ''ساتھی'' نہیں مل رہا تھا۔ وہ بدستور میری جانب دیکھ کر مسکراتی رہی، یہاں تک کہ اس نے مجھے ایک معنی خیز سا اشارہ بھی کر دیا۔

میں نے سوفٹ ڈرنک کا آرڈر دیا اور ایک کونے والی میز پر جا بیٹھا۔ یہاں باہر کھلنے والی کھڑکی سے سمندر اور واچ ٹاور کا نظارہ ہوتا تھا۔ ادھر ہی سے مجھے ''ہار بر ہاؤس'' کی عمارت کا اسٹیئر باکس نظر آرہا تھا، جو خاصا بلند تھا۔ اس پر بتیاں روشن تھیں۔

سوفٹ ڈرنک لینے کے بعد میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ یہاں آنے کا میرا مقصد ایک دو گھنٹے مزید ٹائم پاس کرنا تھا۔

رات خوب گہری ہونے کے بعد تک میں ایسے ہی دو تین بار اور ایک کافی پوائنٹ جیسے ریسٹورنٹ کو بھگتا چکا تھا۔

یہاں زیادہ تر گودی پر کام کرنے والے مزدور اور ورکرز تھے۔ چند ایک ٹولیوں کو مست چال کے ساتھ قہقہے لگاتے ہوئے واچ ٹاور کی طرف جاتے دیکھا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر آگیا۔

میں ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتا تھا۔ اگرچہ مجھے اب بھی پہچان لیے جانے کا خطرہ نہ تھا لیکن پھر بھی میں تنہا اس طرف جا کر خود پر شبہ نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

''ہائے ہیرو! کہاں کا ارادہ ہے؟'' دفعتاً ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

مڑ کر دیکھا تو وہی سری لنکن لڑکی میری جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے جسم پر چاندی سے رنگ کا ستا سلکی اور پھسلواں سا سیلولیس تھا۔ رنگت سانولی مگر پُرکشش تھی، عمر کا اندازہ مجھے بیس بائیس سال کا ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے بال ساحلی ہواؤں کے سنگ لہراتے ہوئے بھلے لگ رہے تھے۔

میں رُک گیا تھا۔ وہ مسکراتی لہراتی میرے قریب آ گئی۔

''تنہا ہو؟'' اس نے مترنم آواز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''نئے لگتے ہو یہاں، مزدور بھی نہیں لگتے، شاید ورکر سیکشن میں نئے نئے بھرتی ہوئے ہو۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' میں نے بدستور ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

''کمپنی چاہیے؟'' اس نے میری جانب ذرا جھک کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

''بالکل، کیوں نہیں۔''

''چلو آؤ پھر، ہٹ میرا قریب ہی ہے۔'' وہ میرا ہاتھ یوں بے تکلفی سے تھام کر بولی جیسے میری اس سے پرانی شناسائی ہو۔ میں گڑبڑائے بغیر اور بڑے سکون سے بولا۔

''میرا تو اِس وقت اُس طرف جانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے اس طرف اشارہ بھی کر دیا جس طرف چند افراد ٹولی کی شکل میں واچ ٹاور کی طرف جا رہے تھے۔

''ہُمم..... خاصے رومینٹک ہو۔'' وہ دلفریب انداز میں مسکرائی۔

''کیا خیال ہے پھر؟'' میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''آئم ریڈی۔'' وہ بھی مسکرائی۔ اس نے میرا تھام رکھا تھا، سو میں نے بھی تھام لیا۔

''میرا نام شرنا ہے۔'' اس نے چلتے چلتے اپنا نام بتایا۔

''اور میرا اشوک.....'' میں نے اپنا غلط نام بتایا۔

ابھی وہ میرے ساتھ چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک بار کے قریب سے گزرتے ہوئے رک کر بولی۔

''کیا خالی ہاتھ اس طرف چلو گے؟ کوئی بوتل وغیرہ نہ لے لیں؟''

''ضرور، کیوں نہیں۔'' میں نے جی کڑا کر کے کہا اور وہ مجھے مذکورہ بار کی جانب کھینچ کر لے گئی۔

یہ نسبتاً چھوٹا بار تھا۔ اندر چند لوگ موجود تھے۔ ایک جانب اسنوکر کھیلا جا رہا تھا اور دوسری طرف پوکر کی گیم جمی ہوئی تھی۔ ان میں سے چند نے ہماری جانب سرسری سی نظر ڈالی تھی۔ لیکن اسنوکر کھیلتے ہوئے چار میں سے دو افراد..... کچھ زیادہ ہی غور سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ ہم بار کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔

اس نے بارٹینڈر کو اپنی پسند کی برانڈ بتائی اور وہ اس نے ایک شیلف سے نکال کر رومال سے پونچھ کر کاؤنٹر پر رکھ ماری۔ میں نے پیسے ادا کیے اور مڑا، اسی وقت ایک شیلف کے شیشے سے میں نے شرنا کو بوتل پکڑے ہاتھ کا اشارہ کرتے پایا۔

میں شاید اس حرکت کو نہیں سمجھتا اگر اس اشارے کے ساتھ ہی اسنوکر ٹیبل پر موجود دو افراد کو میں نے اسٹک رکھتے ہوئے اور یک دم دروازے کی جانب گھومتے دیکھا نہ ہوتا۔

یہ وہی دونوں افراد تھے جو مجھے شرنا کے ساتھ دیکھ کر چونکے تھے۔ پل کے پل میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ مجھے یہی لگا کہ یہ اسی شرنا کے ہی ساتھی ہوں گے اور مجھے آگے جا کر کسی ساحلی ویرانے میں لوٹنا چاہتے ہوں گے۔

میں نے بے اختیار ایک گہری سانس کھینچی۔ شرنا شاید اپنا کوئی ''شر'' دکھانے کے پورے موڈ میں مجھے نظر آ رہی تھی۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار نام کی شے تک نہ تھی، ماسوائے اسپائی آلات کے.....

میں بہرحال محتاط ہو گیا۔ ہم آگے چلتے رہے۔ اس نے چلتے چلتے وہسکی کی بوتل کا ڈھکن اُڑایا تو جھاگ کا ایک غبار سا اُبلا، وہ اس نے منہ سے لگا کر چند گھونٹ بھرے اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''لو تم بھی شغل کرو۔''

''نہیں، میں..... نے اس وقت کافی پی ہے، آگے جا کر تمہارا ساتھ دوں گا۔'' میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا اور..... کسی بہانے ان دونوں اول الذکر افراد کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں اب ہمارے عقب میں دائیں جانب سے

چلے آرہے تھے۔ وہ بظاہر آپس میں باتیں کررہے تھے۔

''تم کیسے مرد ہو، ابھی تک گھونٹ بھرا نہ مجھے کس کیا۔'' وہ ترنگ میں بولی۔

''میں ذرا یہاں نیا نیا بھرتی ہوا ہوں نا..... کچھ نروس سا ہورہا ہوں۔ آگے جاکر میں شاید دلیر بن جاؤں۔'' میں نے کہا۔ وہ ہنس پڑی۔

''خاصے دلچسپ ہو تم اشوک!''

سمندری ہوائیں رات کے اس پہر بہت بھلی معلوم ہورہی تھیں۔ آسمان صاف تھا اور ذرا دور بحرِ بیکراں کے اوپر چاند عجیب ہیبت ناک منظر پیش کررہا تھا۔ آسمان پر تارے چمکتے ہوئے عجب سماں بکھیر رہے تھے۔ واچ ٹاور قریب آرہا تھا اور میری محتاط نظریں تعاقب میں آتے ہوئے ان دونوں مذکورہ افراد کے علاوہ ہم سے تھوڑا آگے چلنے والی ٹولی کا بھی دھیان رکھے ہوئے تھیں۔

ان کا رخ واچ ٹاور کی طرف ہی تھا، جو خاصا قریب آچکا تھا، یہی نہیں اس طرف سے جاتی ایک سنگل پٹی کی سڑک بھی مل کھاتی، ایک طرف کو ساحلی جھاڑیوں سے گزر کر اندھیرے میں غائب ہورہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سڑک ہاربر ہاؤس کی طرف جاتی تھی۔

شرنا ایک مقام پر پہنچ کر مجھے اس ٹولی سے پرے لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔

''اس طرف چلتے ہیں وہاں تنہائی ملے گی۔'' وہ بولی۔

''لل..... لیکن مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے گھبرانے کی ایکٹنگ کی۔ ''اسی طرف ہی چلتی رہو جہاں یہ لوگ جارہے ہیں۔'' کہتے ہوئے میں نے ٹولی کی طرف اشارہ کیا۔

''اوہو..... تم..... ادھر.....'' اس نے مجھے کھینچا۔ کچھ سوچ کر میں بھی اسی طرف ہی مڑ گیا۔

وہاں ساحل پر سمندر کی موجوں کے سر پٹخنے کی شرائے دار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس طرف مجھے چند چھوٹی بڑی گیلی چٹانوں کے ہیولے بھی نظر آنے لگے۔

وہ مجھے ان میں سے ایک کے درمیان لے گئی۔ اس طرف مڑتے وقت میں نے ایک بہانے سے عقب میں گردن موڑ کر دیکھا تھا۔

وہ دونوں افراد اب تیزی کے ساتھ ہماری طرف بڑھنے لگے تھے۔

شرنا مجھے..... دو چٹانوں کے درمیان نسبتاً کھلی جگہ پر لے جانا چاہتی تھی... مگر اس طرف جاتے ہوئے میں ایک پتھریلی آڑ میں چلا گیا، کیونکہ اسی وقت مجھے لگا کہ وہ دونوں ہمارے اس طرف جاتے ہی اب اور زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھے آرہے تھے۔

میں نے خطرہ بھانپتے ہی شرنا کے ہاتھ سے بوتل چھین لی اور جیسے ہی ایک آدمی کا سر تاریکی میں نظر آیا، وہ بوتل میں نے بڑے زور سے اس کے سر پر بجادی۔

اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور دوسری شرنا کی، مگر یہ اضطرابی چیخ تھی۔

وہ آدمی منہ کے بل اپنے پھٹے ہوئے سر کو تھامے ہوئے گرا جبکہ دوسرا اچھل کر سامنے آگیا۔

اس کے ہاتھ میں پستول کی جھلکتی چمک نے مجھے چونکا دیا مگر مرعوب پھر بھی میں نہیں ہوا اور وہی بوتل میں نے پھینک کر اس کے چہرے پر رسید کردی۔ اپنے پہلے ساتھی کی طرح اس کے لیے بھی یہ حملہ یقیناً غیر متوقع اور اچانک ہی تھا۔

یوں وہ بھی مار کھا گیا اور لڑکھڑا کر گرا تو پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ریتیلی زمین پر گرا۔ پھینکی ہوئی بوتل اس کے چہرے کو کڑی ضرب لگاتی ہوئی پتھر سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔

چونکہ میرا دھیان اسی طرف تھا اور اعصاب بھی تنے ہوئے تھے، میں نے لپک کر گرا ہوا پستول اُٹھانا چاہا تو اسی وقت شرنا نے جنگلی بلی کی طرح غراتے ہوئے مجھ پر جھپٹا مارا۔

میں نے اس کے پیٹ پر لات رسید کردی۔ وہ لومڑی کُتیا کی طرح ''چیاؤں..... چیاؤں'' سے انداز میں کراہتی چیختی، پرے جا گری۔

پستول میں اُٹھا چکا تھا اور اب وہ ایک ہاتھ میں پکڑے قدرے اُونچی پتھریلی جگہ پر اپنی ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ تاروں بھری روشنی میں..... وہ تینوں ریتیلی سی زمین پر پڑے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پڑے ہلتے جلتے کراہ رہے تھے۔

''مجھے لوٹنا چاہتے تھے تم تینوں.....'' میں نے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں ان سے للکارنے کے انداز میں کہا۔

وہ کراہتے ہوئے اُٹھنے لگے۔ میں دوبارہ گرجا۔

''خبردار.....! اب دوبارہ کوئی حرکت مت کرنا، اور یہاں سے فوراً رفو چکر ہوتے نظر آؤ۔ ورنہ ابھی فائر کرتا ہوں۔''

پھر انہیں یہ دکھانے کے لیے کہ میں پستول چلانا بھی

اچھی طرح جانتا تھا، ایک گولی ان کے درمیان داغ ڈالی۔ وہ ڈر کے اُٹھے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

''چلو، مفت کا ہتھیار ہاتھ آگیا۔'' میں نے پستول کے دستے کو چومتے ہوئے کہا اور..... اسی سڑک کی جانب بڑھ گیا۔

رات کے سناٹے میں گولی چلنے کی دھماکے دار آواز پر ممکن کے اول الذکر ٹولی کے افراد چونکے ہوں مگر میں وہاں سے نکل چکا تھا اور اب تیز تیز قدموں سے ہارہاؤس کی عقبی عمارت کی جانب بڑھا چلا جارہا تھا جو قریب آچکی تھی اور یہاں حسب توقع مجھے کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

البتہ دوسری شمالی سمت کی دیوار کی جانب روشنیاں جلتی محسوس ہورہی تھیں۔ میں آگے جاکر دیوار سے لگ گیا اور اندر گھسنے کی کوئی خفیہ سی جگہ تلاش کرنے لگا۔

جلد ہی میری مراد بر آئی اور میں نے ایک دریچے تک رسائی حاصل کرلی، اس پر فولادی گرلیں اور اندر شیشہ لگا ہوا تھا۔ شیشے کے پیچھے پردہ جھول رہا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر طارق کی خصوصی طور پر عنایت کی ہوئی اسپائی کٹ سے آئرن کٹر نکال کر دو تین گرلیں ہلکی آوازوں کے ساتھ کاٹ ڈالیں اس کے بعد اندرونی بولٹ کی جانب والے حصے کا شیشہ بھی گلاس کٹر سے نکال کر اس کا تھوڑا سا ٹکڑا کاٹ دیا۔

دونوں آلے سنبھالنے اور کٹ کو پینٹ کی بیلٹ سے اُڑسنے کے بعد میں نے ہلکا سا ہاتھ مار کے ٹوٹا ہوا شیشہ نکال لیا اور اندر اُنگلیاں ڈال کے بولٹ کھول دیا۔ پستول دوسری جانب اُڑسا ہوا تھا۔

کھڑکی آدم گزار تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے پہلے پردے کا ایک کونا ہٹایا اور اندر جھانکا، تو مسرت کی لہر میرے تھکے ہوئے وجود میں سرایت کرگئی۔

یہ کسی کمرے کی کھڑکی نہیں تھی۔ سامنے کوریڈور تھا، جو یران نظر آرہا تھا۔ اندر ہلکی روشنی تھی۔

میں وقت ضائع کیے بغیر اندر کود گیا۔ چند ثانیے دبکا، گردوپیش کی ممکنہ سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بعد گربہ قدمی سے آگے بڑھا۔

کوریڈور مختصر تھا۔ اس کے دائیں جانب کی دیوار تو بالکل سپاٹ تھی، جبکہ بائیں جانب بھی صرف ایک کمرے کا دروازہ نظر آتا تھا۔ میں دروازے کی جانب بڑھنے کے بجائے دبے پاؤں سرے پر پہنچا اور دائیں بائیں جھانکا۔

کہیں دور قریب میں چند ایک کی آواز اُبھری تھی، یہ ایسی ہی تھی جیسے کسی کو پکارا گیا ہو، پھر خاموشی چھا گئی۔ دفعتاً..... کہیں قریب ہی سے کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد..... کوئی زور سے بولا۔ آہنگ تو سنائی دے گیا پر بات سمجھ نہ آسکی۔ غور کرنے پر عقدہ کھلا کہ..... اول الذکر کمرے کی کھڑکی سے ہی یہ آواز آئی تھی، جو بیرونی طرف تھی، وہاں میں نہیں کھڑا ہوسکتا تھا، اس میں دیکھ لیے جانے کا خطرہ تھا، تاہم یہ تسلی ہونے کے بعد کہ مذکورہ کمرے میں کچھ لوگ موجود تھے، میں یک دم پلٹا اور..... دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا۔

اگرچہ یہاں بھی کسی حد تک دیکھ لیے جانے کا خطرہ موجود تھا، تاہم یہ راہداری مختصر ہونے کی وجہ سے میں آنے والے سے باخبر ہوسکتا تھا۔

میں نے دروازے کو تھوڑا سا اندر کی جانب دھکیلا تو وہ تھوڑا سا کھل گیا۔ سامنے بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔ ہر لمحہ میرے لیے خدشات کی دھمک لاتا محسوس ہورہا تھا، خطرہ اب گویا ننگی تلوار کی صورت میرے سر پر جھولنے لگا تھا لیکن خطرہ پالے بغیر کوئی پہاڑ سا مقصد کب حاصل ہوتا ہے۔

''جسونت رائے کے پالی ہلز والے ٹھکانے پر حملہ کرنے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا بھولا ناتھ صاحب!'' ایک برساتی ہوئی آواز میری سُنتی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی اور یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی چلی گئی۔ یہ گوہر شاہ کی آواز تھی۔

میں نے ذرا اور ہمت کی اور تھوڑا اور دروازہ کھول کے اندر جھولتے بھاری پردے کے پیچھے جا کھڑا ہوا، ساتھ ہی عقب میں دروازہ بھی اسی طرح بے آواز بند کردیا۔

''ہوں..... یہ بات تو میں بھی سمجھ رہا ہوں۔'' جواب میں بھاری لہجے میں کسی نے کہا۔ یہ شاید وہی تھا جسے گوہر شاہ نے ابھی ذرا دیر پہلے بھولا ناتھ کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

''لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس اکیلے آدمی نے..... کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا.....؟'' بھاری لہجے والے نے درمیان میں استفسار یہ کہا۔

''ڈاکٹر سیف الدین.....!'' یہ گوہر شاہ تھا۔

''ہاں! وہی.....'' بھاری لہجے والا بولا۔ ''اس اکیلے اور عام سے ڈاکٹر نے اتنا بڑا معرکہ کیسے سر کرلیا کہ ہمارے اس قدر اہم ساتھی شنکر چانکیہ کو آسانی کے ساتھ یرغمال بنا کے جسونت رائے کے سپرد کردیا؟''

''وہ اکیلا کہاں ہے، بھولا ناتھ صاحب؟'' گوہر شاہ کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ ''پاکستان میں اسے ایک بڑے

پولیس آفیسر سمیت کئی اہم شخصیات کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔''

''میں تم سے پاکستان کی نہیں یہاں کی بات پوچھ رہا ہوں۔'' بھولا ناتھ کے لہجے میں حقارت اور بھیڑیے جیسی غراہٹ تھی۔ جس سے مجھے بھولا ناتھ کی شخصیت کا اندازہ ہوا اور ساتھ ہی گوہر شاہ کی اوقات کا بھی وہ ان کے سامنے کیا وقعت رکھتا ہے۔

''دیکھا جائے تو یہ بیج تمہارا ہی بویا ہوا ہے اور..... اب..... یہاں بھی وہ ہمارے سر ہو گیا۔'' بھولا ناتھ بدستور بپھرے ہوئے لہجے میں گوہر شاہ سے بولا تو اس کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ب..... بھولا ناتھ صاحب! میں یہی بتا رہا ہوں کہ ان کے علاوہ بھی اس کے دو ساتھی، ایک کرائم رپورٹر طارق اور انٹرپول آفیسر رومانہ..... اس کے ہمراہ رہے ہیں، بلکہ وہ اس سے پہلے ہی یہاں ہمارے سنڈیکیٹ کے بخیے اُدھیڑ نے آچکے تھے، یہ مردود سالا، سیف نجانے کس طرح جسونت رائے کے ہتھے لگا اور پھر کیسے اسے اس کے بھتیجے کے بارے میں علم ہوا اور اس نے اسے ہمارے پیچھے لگا دیا۔ یوں جسونت رائے نے، اسی کی مدد سے اپنے شنکر چانکیہ پر ہاتھ ڈالا تو اس کے آدمی بھی اس کے ساتھ تھے۔''

''طارق اور رومانہ اب کہاں ہیں؟'' بھولا ناتھ نے اُکھڑے لہجے میں سوال کیا۔

''ان میں سے ایک تو میرے قبضے میں ہے، رومانہ، جبکہ طارق غائب ہے، میں اور شنکر اسے تلاشنے کی کوشش میں تھے کہ یہ واقعہ ہو گیا۔''

رومی کے ذکر پر میرے کان کچھ مزید کھڑے ہو گئے۔

''اسے تم نے عیاشی کے لیے اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے؟'' بھولا ناتھ کا لہجہ بدستور پُرطیش تھا۔

''ہرگز نہیں، وہ..... وہ.....''

''کیا وہ..... وہ.....؟''

''اس کے پاس ایک اہم سی ڈی ہے۔ وہ میں اس سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' گوہر شاہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح چونکا۔ سی ڈی؟ کون سی؟ اس میں کیا تھا؟ وہ رومی نے کہاں سے حاصل کی تھی اور طارق نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا۔

مجھے ایک بار پھر طارق پر غصہ آنے لگا کہ وہ کم بخت ہمیشہ ادھوری بات کرتا اور ایک چھپائے رکھتا تھا۔

اسی وقت کوئی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے ہمت کی اور پردے کا کونا سرکایا تو سامنے کا منظر واضح ہو چکا تھا۔

صوفوں پر یہی چاروں براجمان تھے جن کے تعاقب میں یہاں آیا تھا میں..... اب جو اندر داخل ہونے والے دو چست لباس پہنے مسلح افراد کو میں دیکھ رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''آدمی تیار ہیں۔ جیسا حکم کریں۔''

''چرن! تم ان کے ساتھ جاؤ اور مجھے بتاؤ تیاری کتنی تسلی بخش ہے۔'' بھولا ناتھ نے اپنے ساتھ بیٹھے آدمی سے تحکمانہ کہا اور وہ اُٹھ کر ان دونوں کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

''اُس سی ڈی میں ایسا کیا تھا؟'' ان کے کمرے سے نکلتے ہی بھولا ناتھ نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے گوہر شاہ سے استفسار کیا۔ تاج بھی اسی کے ساتھ چپکا بیٹھا تھا۔

سی ڈی کے ذکر پر میں جیسے سرتاپا ساعت بن گیا۔

''اس میں..... اس میں.....'' گوہر شاہ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

''تمہارے حلق میں گولی ٹھوک دوں گا، بولو.....'' بھولا ناتھ سفاکی سے غرایا۔

''اس میں..... ٹی ٹھری اور ٹی فور جیسے اہم راز تھے.....'' بالآخر گوہر شاہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی..... کسی نااہلی کا ذکر کر ہی ڈالا۔

''کیا.....؟'' بھولا ناتھ جیسے حلق کے بل چیختا ہوا ایک دم ہی صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہی نہیں اُس نے اپنے لباس سے ایک لمبی نال والا خوف ناک پستول بھی نکال لیا۔ جس کا رخ سامنے صوفے پر حواس باختہ بیٹھے گوہر شاہ کی طرف تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا تاج بھی ساکت ہو گیا تھا۔

''غغ..... غلطی میری نہیں تھی۔'' گوہر شاہ نے خوف سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ میں نے آج تک اسے مطلق العنان اور دوسروں پر حکم چلانے والے شخص کے ہی روپ میں دیکھا تھا، لیکن آج پہلی بار میں اسے کسی ڈرے سہمے ہوئے چوہے کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔

''وہ..... وہ اُس نے، شنکر چانکیہ کے قبضے سے چرائی تھی، شنکر چانکیہ نے ہی مجھے یہ ذمے داری سونپ رکھی تھی، کیونکہ ایک طرح سے رومی اور اس کا ساتھی طارق اور ڈاکٹر سیف میرے ہی شکار تھے۔'' یقینی موت کو سامنے دیکھ کر وہ

ایک ہی سانس میں کہتا چلا گیا۔

''تم پاکستان سے یہاں گھاس چرنے آئے تھے؟'' بھولا ناتھ بدستور اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورتا ہوا دہاڑا..... ''تمہاری وجہ سے یہ تینوں مصیبتیں بھی یہاں آگئیں، تم جانتے ہو وہ سی ڈی ہمارا شمشان گھاٹ بن سکتی ہے۔''

''پاکستان میں ان تینوں نے مجھے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا تھا۔'' گوہر شاہ صفائی پیش کرنے لگا۔ ''ہمارے کئی اہم ساتھی پولیس کے ہتھے چڑھ گئے اور میں پاکستان سے یہاں شنکر چانکیہ کے کہنے پر ہی آیا تھا بلکہ ''بگ فور'' کے تحت ہر زونل چیف کو ایسا کرنے کی خاص ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ ایسی صورتِ حالات میں.....''

''شٹ اَپ.....'' بھولا ناتھ پھر دہاڑا۔ ''تم اپنی بزدلانہ کمزوری اور نااہلی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے ہو، جانتے ہو اگر یہ بات ''بگ فور'' تک پہنچ گئی تو..... وہ تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی بہت بُرا حشر کر کے دکھ دیں گے، وہ ہمیں ماریں گے نہیں، لنگڑا لولا کر کے بھکاری بنا کے ممبئی کے فٹ پاتھ پر پھکوا دیں گے۔ تم نے ہمیں بھی ایک بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔''

''جناب! آپ اس کی فکر.....'' تاج نے درمیان میں اپنے باس (گوہر شاہ) کا نمک حلال کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ..... بھولا ناتھ نے اسے بھی ڈپٹ کر چپ کرا دیا اور..... غصے سے دوبارہ صوفے پر جا بیٹھا۔

لمبی نال والا پستول اس نے اپنے قریب صوفے پر ہی پھینکنے کے سے انداز میں رکھ دیا۔ وہ چند لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے شاید اپنے پُرغیظ اشتعال پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب اُس کی چڑھی ہوئی سانسیں معمول پر آنے لگیں تو اس کے اُبلے ہوئے مکروہ سیاہ گنجے چہرے پر اب طیش سے زیادہ فکر و تشویش کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ ایسے میں بھولا ناتھ کا پارا ڈاؤن کرنے کی غرض سے گوہر شاہ نے بھی چپ سادھ لینے میں ہی عافیت جانی تھی۔

میں کھڑکی کے قریب پردے کے عقب میں ان کی باتیں ہی نہیں بلکہ حرکات و سکنات پر بھی نظر رکھے ہنوز سرتاپا سماعت بنا چھپا کھڑا تھا۔

''بھولا ناتھ صاحب! اس میں سارا قصور میرا بھی نہیں ہے، یہاں آکر مجھے کچھ اور حقائق کا بھی علم ہوا ہے۔''

''کیسے حقائق؟'' بھولا ناتھ خود کو سنبھال چکا تھا۔

''شنکر چانکیہ نے ہی مجھے بتایا تھا کہ امارات اور پاکستان میں ہمارا نیٹ ورک تباہ ہونے کی ایک بڑی وجہ ڈاکٹر رمیش اگروال ہے..... وہ اس پاکستانی ڈاکٹر سیف کے ساتھ امارات میں ایک ہی ہاسپٹل میں جاب کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان..... ملکی تعصب پر بحث اور کبھی تلخ کلامی ہوتی رہتی تھی، حالانکہ ہمارے سنڈیکیٹ میں صرف اپنی جاب کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس میں حب الوطنی، ملکی تعصبیت اور ذاتی دشمنی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن ڈاکٹر رمیش اگروال نے بگ فور کے ان اُصولوں کو توڑا ہے۔

اس نے سینڈیکیٹ کے اختیارات کو اپنے ذاتی مفادات میں استعمال کیا اور ایک پلاننگ کے تحت اپنے دشمن ڈاکٹر سیف کے چھوٹے بھائی عادل کو نشانہ بناتے ہوئے ہمیں بھی یوزٹو کرنے کی کوشش کی اور ہمارے ہی ذریعے عادل کو ٹارگٹ کروایا، پھر اسے اغوا اور بعد میں کراکوٹ کے میدانی علاقے میں جو جبار ماہی کی ملکیت تھا، میں بنے اسپتال منتقل کر کے اس کا آپریشن کروا کے اعضا ایک چارٹر طیارے میں بنکاک بھجوا دیے، اس کی بھنک کسی طرح اس کے بڑے بھائی ڈاکٹر سیف کو پڑ گئی اور وہ ہمارے لیے سراپا انتقام بن گیا۔ اس کے بعد بھولا ناتھ صاحب.....! وہی ہوا، سیف نے اپنے ساتھیوں اور بعض بہی خواہوں کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف جھنڈے گاڑ دیے اور آخرکار پاکستان سے امارات تک ہمیں برباد کر کے رکھ دیا، یہی نہیں ڈاکٹر رمیش کو خود بھی امارات چھوڑنا پڑا امر ناگ مارا گیا۔ اور سیف یہاں..... آگیا۔''

اتنا کہہ کر گوہر شاہ نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ اپنے معصوم بھائی عادل کے بارے میں اگرچہ یہ سارے سنگدلانہ حقائق سے میں بھی آگاہ تھا مگر اب انہی خونی سوداگروں کی زبانی سن کر میری رگوں میں لہو مثلِ لاوا دہکنے لگا، میرا جی کیا اسی وقت..... اندر ان کے درمیان کود جاؤں اور..... بھولا ناتھ کا صوفے پر رکھا ہوا لمبی نال والا خوف ناک پستول اُٹھا کر سب سے پہلے گوہر شاہ اور تاج کا خاتمہ کر ڈالوں..... لیکن میں نے اپنے جارحانہ ارادے سے خود کو بڑی کوشش سے باز ہی رکھا۔ یہ خود پریشانیوں کا شکار تھے، جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میرا ''مشن'' درست سمت پر گامزن تھا۔

ابھی مجھے یہ جاننے کی بھی ضرورت تھی کہ آخر اس بلڈی سنڈیکیٹ میں ان سارے مہروں کی جو حیثیتیں مختص کر رکھی گئی ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ ڈاکٹر رمیش سمیت گوہر

شاہ اور بھولا ناتھ، شنکر چانکیہ وغیرہ، یہ سب اس سنڈیکیٹ میں کیا عہدہ رکھتے تھے؟

''ذرا میری بات پر غور کرنے کی کوشش کریں، دور مت جائیں، اپنے شنکر چانکیہ کو ہی دیکھ لیں، اس نے اپنے دیرینہ دشمن جسونت رائے جیسے آدمی سے ایک خطرناک پنگا لے کر اسے بھی اپنے پیچھے بلکہ سینڈیکیٹ کے درپے لگا لیا۔ اپنی ذاتی دشمنی کا غبار نکالنے کے لیے اس نے یہاں جسونت رائے کے لاڈلے اور اکلوتے بھتیجے وجے کے ساتھ وہی سلوک کیا جو وہاں پاکستان میں ڈاکٹر رمیش اگروال نے اپنی دشمنی میں ڈاکٹر سیف الدین کے بھائی عادل کے ساتھ کروایا۔ دیکھا جائے تو یہ دونوں ہی سنڈیکیٹ کی ہائر اتھارٹیز ''بگ فور'' کے مجرم ہیں، ان دونوں نے اپنی ذاتی دشمنی میں ہائر اتھارٹیز کے سب سے بنیادی اور اہم اُصول کی سخت ترین مخالفت کی ہے۔ ڈاکٹر سیف تو چلو معمولی آدمی تھا، مگر باوجود اس کے اس نے ہمیں ناکوں چنے چبوا ڈالے ہیں، جبکہ یہاں جسونت رائے کی حیثیت سے کون واقف نہیں، وہ ممبئی کا ایک بہت بڑا ''ڈان'' کہلاتا ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ میرا کتنا قصور ہے؟''

گوہر شاہ اپنے دفاع میں اس حد تک مدلّل تقریر کرنے کے بعد خاموش ہو گیا۔

میں نے دیکھا، بھولا ناتھ کے چہرے پر جہاں کچھ دیر پہلے برہمی یکا یک ایک فکر و تشویش میں بدل گئی تھی، اب ایک بار پھر اس کے چہرے کا رنگ گرگٹ کی طرح بدلا تھا اور ایسا بدلا کہ اس نے مجھے ایک جھٹکے سے دوچار کر دیا۔

طیش اور فکر کے بعد جو رنگ اس پر جم کر رہ گیا تھا، اس میں اب ایک عجیب سی طمانیت اور گہری اور پُرسوچ خاموشی تھی، جس کی ایک پرت تلے، مسرت کا کوئی احساس بھی دبا ہوا تھا اور اسی بات نے میرے اندر ایک پُراسراری کھٹک پیدا کر دی تھی۔

اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے گوہر شاہ اور تاج کی یک ٹک نظریں بھی بھولا ناتھ پر جمی ہوئی تھیں۔

''تمہاری باتیں غور کرنے کے قابل ہیں۔'' بالآخر یہ کہتے ہوئے بھولا ناتھ نے اپنی جیب سے ایک سگار نکال کر سلگایا۔ اس کے اتنا ہی کہنے سے گوہر شاہ اور تاج کے سُتے ہوئے چہرے ایک دم کھل اُٹھے تھے۔

اسی وقت بھولا ناتھ کا آدمی چرن کمرے میں داخل ہوا اور مؤدبانہ بولا۔ ''جناب! سب الرٹ ہیں اور سارے انتظامات بھی درست ہیں۔ اب آپ کے حکم کی دیر ہے۔''

''تم جاؤ اور مارٹن کو یہاں بلا لاؤ۔'' بھولا ناتھ نے گمبھیر اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ چرن اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

میں اس ایک دم بدلی بدلی صورتِ حال کو کسی ایسے اسراریت کے پردے میں دیکھ رہا تھا جو بہت جلد میرے سامنے آشکارا ہونے والی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ میرا اندر بھی اسی جوش تلے دبے دبے انداز میں دھڑکنے لگا۔ تاہم مارٹن کے نام پر میں چونکا تھا، یہ نام میں نے رچنا کے منہ سے سنا تھا، جس کے مطابق وہ جہنم واصل راٹھوری کے بعد شنکر چانکیہ کا خاص آدمی تھا۔

چرن جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہمراہ ایک دراز قامت شخص بھی تھا۔ وہ کسرتی جسم کا مالک اور چہرے سے ہی بہت طاق و مشاق نظر آ رہا تھا۔ اس نے چست لباس زیب تن کر رکھا تھا اور یقیناً وہ ہر قسم کے اسلحے سے لیس بھی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے بھی جنگجوانہ پن ظاہر ہوتا تھا۔

''مارٹن! میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔'' بھولا ناتھ نے اس سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ اس نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ چرن البتہ بھولا ناتھ کے بازو کی طرف ذرا عقب میں چوکس کھڑا رہ گیا۔

''مارٹن! یہاں اب صورتِ حالات بدل چکی ہے۔'' بھولا ناتھ نے اس سے کہا۔ مارٹن کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا تھا، یوں جیسے وہ ہر قسم کے نازل ہونے والے ایسے حکم کے لیے تیار بیٹھا ہو جو اس کے لیے غیر متوقع بھی ہو۔

بھولا ناتھ نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ہینڈ فری نکال کر اپنے کان پر چڑھایا اور اپنے لباس کے اندر سینے کے دائیں مقام میں ہاتھ لے جا کر باہر نکالا، جیسے اس نے اندر چھپی کسی آٹو جینک ڈیوائس کا کوئی بٹن پش کیا ہو، اس کے بعد وہ ہولے سے کسی فریکوئنسی کو دہراتے ہوئے بولا۔

''بھولا ناتھ کالنگ..... کیا میں بگ فور سے مخاطب ہو سکتا ہوں؟''

اس کے کان میں لگے آلے میں شاید کسی نے کچھ کہا تھا جو ظاہر ہے، میں نہیں سن سکتا تھا مگر جسے سنتے ہی بھولا ناتھ مؤدبانہ انداز میں بولنے لگا۔

''یس بگ فور.....! شنکر رائے کے سلسلے میں ایک اہم رپورٹ دینا تھی۔'' دوسری طرف سے شاید اسے ''یس''

کا جواب ملا تھا لہٰذا وہ بتانے لگا۔

''ہائر اتھارٹیز کے حکم پر جب میں نربدا سے یہاں ممبئی پہنچا تو چند اور حقائق بھی جاننے کو ملے..... اب میں شنکر چانکیہ کو جسونت رائے کے جنگل سے چھڑانے کے لیے جسونت رائے کے پالی ہلز والے ٹھکانے پر ہلا بولنے والا تھا تو یہ حقائق بعض ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ سامنے آئے تو میں نے پہلے یہی ضروری سمجھا کہ..... آپ کے علم میں لے آؤں، کیونکہ..... زوتل چیف شنکر چانکیہ..... ریڈ پرپل کا مرتکب ہوا ہے بلکہ یہی نہیں، ڈاکٹر رمیش اگروال نے بھی اسی اُصول کو توڑا ہے اور جس کی بنا پر ہمارے اس عظیم سنڈیکیٹ کو پاکستان اور نہ صرف امارات میں ناقابلِ تلافی نقصان اُٹھانا پڑا ہے بلکہ..... یہاں بھارت میں بھی سنڈیکیٹ کو زبردست خطرات سے ان دونوں نے دوچار کر ڈالا ہے۔''

بھولا ناتھ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ ادھر خود میرے اندر زبردست دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی، خونی سوداگروں کے یہاں کچھ اور خفتہ گوشے میرے سامنے ظاہر ہونے لگے تھے۔

بھولا ناتھ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خاموش نہیں تھا بلکہ بہت غور اور دھیان سے دوسری جانب ملنے والی ہدایات یا گفتگو سننے میں مگن تھا۔

یہاں گوہر شاہ کی صفائی پیش کرنے اور کچھ حقائق سے پردہ اُٹھانے کے بعد صورتِ حالات ایک دم بدل گئی تھی، اب تک یہی ثابت ہو سکا تھا میرے سامنے کہ بھولا ناتھ، نربدا سے یہاں ہائر اتھارٹیز کے حکم سے ہی آیا تھا تاکہ شنکر چانکیہ کے مسئلے کو حل کر سکے۔ اب دیکھنا تھا کہ کیا ہونے والا تھا؟

''او کے..... چیف! میں سمجھ گیا.....'' تھوڑی دیر بعد ہی بھولا ناتھ نے پوری تسلی کے ساتھ کہا۔ پھر اوور اینڈ آل کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر کے..... کان سے آلہ نکالا اور لباس کے اندر رکھ لیا۔

میں یک ٹک متوجہ تھا کہ اب بھولا ناتھ اور گوہر شاہ کیا کرنے والے تھے؟ جبکہ ادھر گوہر شاہ اور تاج کی مستفسرانہ سی نظریں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

بھولا ناتھ نے ایک طویل ہنکاری خارج کی اور مارٹن سے بولا۔

''تم نے سن لیا ہوگا کہ میں نے شنکر چانکیہ کے بارے میں بگ فور کو کیا بتایا ہے۔ اب کیا تم..... بگ فور کا جواب سننا پسند کرو گے؟''

''بالکل.....'' مارٹن عرف مارٹی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تو سنو، شنکر چانکیہ چونکہ ریڈ پرپل توڑنے کا مرتکب ہوا ہے، اسی لیے اب اس کے لیے سنڈیکیٹ کوئی ہمدردانہ جذبات نہیں رکھتی، وہ اپنے جانی دشمن جسونت رائے کے جنگل میں جا چکا ہے اور جسونت رائے کو بھی ہم سے کوئی غرض نہیں ہے، اسے اپنا شکار مل چکا اور معاملہ ختم..... لہٰذا بگ فور بلاوجہ اضافی مسائل پالنے کی متحمل نہیں ہوتی، بجز اس کے کہ ان کے کسی آدمی کا کوئی مفاد نہ ہو۔ شنکر چانکیہ کا چیپٹر کلوز کر دیا گیا ہے۔''

بھولا ناتھ نے آخر میں جیسے دھماکا کیا، مگر یہ میرے لیے ہی دھماکا ثابت ہوا تھا، کیونکہ اس اعلان کے بعد وہاں موجود کسی کے چہرے پر ایک ذرا بھی افسوس یا معترض ہونے کی رمق تک نہ اُبھری تھی۔ یوں جیسے سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہو۔

''اب چونکہ یہ ہار بر ہاؤس نام کی ملکیت ہمارے ہی توسط سے تھی، اس کی نیلامی کا اعلان بھی جلد ہی اخبار میں دینا ہوگا، یہ ٹھکانا بھی اب ختم سمجھو۔ یہ کام تمہیں سنبھالنا ہوگا مگر خفیہ طریقے سے، تم سمجھ گئے مارٹی؟'' بھولا ناتھ نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑیں۔

''میں سمجھ چکا باس!'' مارٹی مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''ہم اب نکلیں گے باقی باتیں ہوٹل مورت میں ہوں گی۔'' یہ آخری جملہ بھولا ناتھ نے گوہر شاہ کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ پھر آخر میں اپنے ساتھی چرن سے مخاطب ہو کر بولا۔

''چرن! تم یہیں رہو گے اور یہاں سے سوائے چند ایک آدمیوں کے باقی سب کو اپنے ساتھ لے کے کالی گاپ والے ٹھکانے پر پہنچو، ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔''

وہ چاروں فوراً رخصت ہونے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور میں پیچھے ہٹا، نجانے کیا ہوا میرا پاؤں جھولتے پردے میں یا پھر کسی اور شے سے اٹکا کہ میں..... ہل کر رہ گیا، اور..... اندر آ رہا۔ وہ سب مجھے دیکھ کر جہاں کے تہاں رہ گئے۔ خود میری بھی یہی حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں.....

☆☆☆

ابھی میں سنبھالا لے کر پلٹ کر بھاگنے ہی لگا تھا کہ..... چرن اور مارٹی نے یکلخت پستول نکال کر مجھ پر تان

لیں، تاج اور گوہر شاہ نے بھی یک بیک یہی کیا تھا۔

''خبردار! ذرا بھی حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔''

میں ایک گہری سانس لیے کھڑا رہ گیا۔

''اپنے دونوں ہاتھ فوراً سر سے بلند کرلو۔'' مارٹی نے درشتی سے کہا۔ وہ سب میرے چہرے کو برہمی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے گھورے جارہے تھے۔

ان کا حکم ماننے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا، میں نے ایسا ہی کیا، کچھ تسلی تھی کہ ریڈی میڈ میک اَپ کی وجہ سے یہ مجھے فوری طور پر پہچان تو نہیں سکتے تھے، لیکن گوہر شاہ اور بالخصوص تاج سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ میری حرکات و سکنات یا لب و لہجے سے مجھے فوراً پہچان لیتے۔

''کون ہو تم؟ اور یہاں کیسے آئے؟'' بھولا ناتھ نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''چور ہوں اور کھڑکی کے راستے آیا ہوں۔'' میں نے تسلی سے جواب دیا۔ کوشش چاہی تھی کہ میری آواز اور لہجہ کم از کم گوہر شاہ اور تاج کو محسوس نہ ہو پائے۔

''مارٹی! اسے لے جا کر گولی مار دو۔'' بھولا ناتھ نے فوری حکم صادر کیا تو میں گھگیا کر بولا۔

''رحم کردو جی، ایک ذرا سی حرکت پر گولی کی سزا؟ یہ تو ظلم ہے۔ چوری تو میں کر ہی نہ سکا، بہتر یہی ہے کہ میں جس راستے آیا ہوں اسی راستے خاموشی سے لوٹ جاؤں جس راستے سے وہ لوگ خاموشی سے لوٹ گئے، پر سمجھ نہیں آیا یہ سسرے بغیر کوئی کارروائی کے کیسے خالی ہاتھ لوٹ گئے، پتا نہیں چوری کرنے بھی آئے تھے یا نہیں۔ ہاں! وہ تینوں اُوپر..... اُوپر.....'' کہتے ہوئے میں نے اُنگلی سے چھت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سب اُوپر دیکھنے لگے۔

''اُوپر ہی چلے گئے تھے۔''

''کون تھے وہ لوگ؟'' بھولا ناتھ نے نیچے منہ کر کے گرج کر پوچھا۔ اس کی پیشانی پر اب سلوٹیں نمودار ہوگئی تھیں۔ اسی طرح میں دیگر لوگوں کو بھی چونکانے کا سبب بنا۔ وہ سب آنکھیں سکیڑے میری جانب دیکھنے لگے۔

میں نے تو بس ہوا میں ایک تیر چلایا تھا تاکہ فوری موت سے بچ سکوں اور کچھ کرنے کا موقع ہاتھ آجائے۔

''وہ جی، پتا نہیں، تین افراد تھے، ان میں ایک جوان عورت بھی تھی۔'' مجھے جھوٹ بولنے کا مزید موقع دیا گیا تو میں بھلا کیسے چپ رہتا۔ ''انہوں نے مجھے دیکھا تو نہیں تھا، مگر میں نے یہی سمجھا تھا شاید وہ ادھر کے ہی آدمی ہیں، مگر

جولائی 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور ملک صفدر حیات کی تھانے داری

کانچ محل

ظاہر جاوید مغل کے قلم سے آخری صفحات پر دلوں کو گرماتی تحریر..... ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں پر محوِ سفر..... ایک بے باک مگر گھائل عشق اور حسن کی فتنہ سامانیوں کی طویل داستان

فخرِ آدمیت

تا قیامت انسانیت جس پر فخر کرے..... ایسے انسان بہت نایاب ہوتے ہیں زویا اعجاز کے قلم سے تاریخ کے ایک بہت خوب صورت پہلو پر روشنی.....

شہ زوج

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پُرخطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان..... عمر عبداللہ کے قلم کا شاہکار

سسپنس کلاسک

محی الدین نواب کی خوب صورت تحریر کا انتخاب

اس کے علاوہ

نجمہ مودی، تنویر ریاض، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، صبا مغل، منظر امام، اعتزاز سلیم وصلی، اور شاہ زین رضوان کی خوب صورت تحریریں

ان کی حرکتیں مشکوک تھیں۔ میں نے راستہ بدل لیا اور اس کھڑکی کی طرف آ گیا۔''

''چرن! تم اس کی تلاشی لو اور مارٹی! تم ساتھیوں کو لے کر باہر اُوپر نیچے پھیل جاؤ۔ ان تینوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرو، بھاگیں تو گولی مار دو۔'' بھولا ناتھ نے حکم صادر کیا۔ میں اندر خوش تھا کہ میں انہیں پھیلانے اور توڑنے میں کامیاب رہا تھا۔

چرن میری تلاشی لینے کے لیے میری جانب بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس نے میری جامہ اور پاجامہ سمیت تلاشی لے ڈالی تو پھر میرا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور میری عارضی طور پر چلی ہوئی چال اُلٹی ہو جائے گی۔

چرن پستول تانے میری طرف بڑھا۔ یوں کہ..... وہ ایک طرح سے میری ڈھال بھی بن گیا، یعنی میں اب صرف اسی کی پستول کی زد میں تھا۔ گوہر شاہ اور تاج کے پستول اس کے آگے چھپ گئے تھے۔ مارٹی اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ جا چکا تھا۔

چرن مجھے عام سا چور سمجھے ہوئے میری تلاشی لینے کے لیے قریب آیا، اس کی گھورتی برماتی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

لہٰذا..... اس نے جیسے ہی ایک ہاتھ میرے لباس کی جیب میں ڈالا تو میں نے..... برق کی سی پھرتی کے ساتھ اس کے پستول والے ہاتھ پر اپنا دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ کا مُکا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ شاید مجھ سے تیزی دکھانے میں تھوڑی سستی ہو گئی تھی، یہی وجہ تھی کہ میرے پستول پر ہاتھ رکھتے اور مُکا جڑتے ہی اس نے لبلبی دبا دی۔

گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ گولی میرے بجائے فرش پر لگی، وہ بھی اچٹتی ہوئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کا پستول میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ چرن مُکا کھا کر پیچھے کو لڑکھڑایا۔ میں نے اسی ذرا سے موقع سے فائدہ اُٹھاتے اسے مزید مکے مارے اور خالی ہاتھ سے اپنے لباس سے وہ پستول بھی نکال لیا جو میں نے ساحلِ سمندر سے..... غنڈے کے ہاتھ سے چھینا تھا۔

''خبردار! تم سب میرے دونوں پستولوں کی زد میں ہو.....''

میں نے انہیں للکار دیا۔ چرن بھی سنبھل چکا تھا۔

''تم دونوں پستول پھینک دو۔'' میں نے گوہر شاہ اور تاج سے غراتے ہوئے کہا، مگر وہ متامل رہے، جبکہ میرے دونوں پستول بھولا ناتھ کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔

''میں اس کو گولی مار دوں گا، جانتا ہوں میں یہ تمہارا باس ہے۔'' میں نے دھمکی دہرا دی۔

''تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔'' بھولا ناتھ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے یک بیک دو فائر کر ڈالے۔ دونوں گولیاں بھولا ناتھ کے..... پیروں کے قریب پکے فرش پر بچھے قالین میں لگیں۔ بھولا ناتھ ایک دم بدک کر اچھلا تھا۔ میرا مقصد محض اسے ڈرانا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے..... مجھ پر عقب سے کسی نے بھاری شے سے حملہ کر ڈالا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو سر کے پچھلے حصے میں درد کی ٹیس نے مجھے بلبلا کر رکھ دیا، اسے سہلانے کے لیے جب اپنا ایک ہاتھ اس طرف لے جانے کی غیر ارادی حرکت کی تو معلوم ہوا کہ... میرے ہاتھ ہی نہیں بلکہ دونوں پیر بھی رسن بستہ ہیں۔ ایسے میں سر کی چوٹ جہاں یقیناً اب گومڑ سا بن گیا ہوگا، مزید درد دیتی محسوس ہوئی۔

چند لمحے تو میں ہوش میں آتے ہی اسی چوٹ کی وجہ سے کراہتا ہی رہا۔ پوری طرح ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو ایک کمرے کے فرش پر کونے میں پڑا پایا۔ کمرے میں کوئی بتی جل رہی تھی۔ روشنی تیز تھی، ایک کھڑکی تھی، جو بند تھی، دروازے کی بھی یہی صورتِ حالت تھی۔

میں تھوڑا بہت ہل جل سکتا تھا، وہ کرنے لگا۔ اس طرح جکڑ بندوں میں پڑے ہونے کے سبب میرے پورے بدن میں اینٹھن سی ہونے لگی۔ منہ سوکھ رہا تھا اور حلق خشک..... میں نے سر کی ٹیس کو بھگانے کے لیے اسے دو تین بار جھٹکے دیے تو درد بجائے کم ہونے کے سوا ہو گیا۔ میں نے یہ حرکت ترک کر دی۔ ایک بار پھر کراہا۔

تھوڑا سا ہل جل کے بعد میں پھر ڈھیلا پڑ گیا اور گزرے واقعات کی ترتیب کرتے ہوئے مجھے اس بات پر سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ میں نے..... اپنے عقب میں دھیان کیوں نہیں رکھا؟

یہ میرا اناڑی پن تھا۔ جس سبب ہاتھ آئی بازی دشمن کے ہاتھ چلی گئی تھی۔

اب کفِ افسوس ملنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ یہ لوگ اب میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے اور میں اپنے بچاؤ کے لیے اب کون سی نئی تدبیر سوچ سکتا تھا، جس کے امکانات مجھے قریب دور بھی نہیں نظر آ رہے تھے۔

دفعتاً دروازہ کھلا۔ میں نے تھوڑا سر گھما کر اس طرف دیکھا۔ سر کے عقبی حصے کی ٹیس کچھ کم ہونے لگی تھی۔

دروازے سے بھولا ناتھ اور گوہر شاہ اندر داخل ہو رہے تھے۔ پھر ان کے عقب میں مجھے دو اور افراد آتے دکھائی دیے۔

یہ تاج اور چرن تھے۔ پھر میرے سامنے کے رخ پر، گوہر شاہ اور بھولا ناتھ اور دائیں جانب تاج اور چرن چوکس سے کھڑے میری طرف بڑی کینہ توز نظروں سے گھورنے لگے۔

''کیا حال ہے، ڈاکٹر سیف الدین.....!'' گوہر شاہ کی طنزیہ کاٹ سے بھری ہوئی آواز گونجی اور میں دھک سے رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ مجھے پہچان چکے تھے، مگر کیسے؟ یقیناً میری تلاشی کے بعد برآمد ہونے والے چند اسپائی آلات نے انہیں ''مخصوص'' قسم کی تشکیک میں مبتلا کر دیا ہو گا اور..... پھر میرا چہرہ دھونے میں انہوں نے چنداں دیر نہ لگائی ہوگی۔

''مجھے تو پہلے ہی اس پر شبہ ہو گیا تھا۔'' تاج نے بھی لقمہ دیا تھا۔ اس مردار کے بدہیت ہونٹوں پر بھی زہریلے طنز سے لبریز مسکراہٹ تھی۔

''ہوں ں..... ں..... تو یہ ڈاکٹر سیف.....'' یہ بھولا ناتھ تھا۔

''یہ بہت اہم شکار ہمارے ہاتھ لگا ہے ناتھ صاحب!'' گوہر شاہ مسرت سے بھرپور لہجے میں بولا۔ اس پر بھولا ناتھ اس کی طرف کچھ ایسی نظروں سے گھورنے لگا جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ..... ''تم نے اس کا کیا اچار ڈالنا ہے؟'' شاید یہی کچھ بھانپتے ہوئے گوہر نے جملہ مکمل کرتے ہوئے مزید کہا۔

''میرے پاس اس کی جو قیدی ساتھی ہے، اس میں اس کی جان ہے۔ اب وہ منہ کھولنے میں بالکل دیر نہیں لگائے گی۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا گوہر شاہ!'' میں نے رسن بستہ اور اسیر غنیم ہونے کے باوصف، بذلہ سنجی سے کہا۔ ''میں رومی کا منہ کھلوانے کے لیے جبوری کا رول پلے کر سکتا ہوں۔''

''یہ اتنا بے پروا کیوں ہے؟'' اچانک بھولا ناتھ نے قدرے حیران ہو کے کہا۔ اس کی برمائی نظریں میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دشمن نفسیاتی مار مارنے لگا تھا۔

''یہ بننے کی ایکٹنگ کرتا ہے اور پلے اس کے کچھ نہیں ہے۔ انتہائی بے وقعت اور..... عام سا آدمی، جو دوسروں کے کاندھوں اور سہاروں سے چلتا ہے۔'' گوہر شاہ نے حقارت ..... آمیز لہجے میں کہا۔

پھر اس سے پہلے میں اسے کوئی کرارا جواب دیتا، بھولا ناتھ نے گوہر شاہ سے یہ کہتے ہوئے خود ہی میرا ''قرض'' اُتار دیا۔

''اگر یہ بے وقعت اور..... عام سا آدمی، جو دوسروں کے کندھوں اور سہاروں سے چلنے والا شخص ہے تو پھر تم پاکستان سے بھاگ کر یہاں شنکر چانکیہ کے چرنوں میں اپنا منہ چھپانے کیوں آ گئے تھے؟ تمہاری اس بات پر میرا تو جی کرتا ہے اپنے پستول کی لمبی نال تمہارے منہ میں گھسیڑ کر لبلبی دبا دوں۔'' گوہر شاہ شرمندہ ہو کے بغلیں جھانکنے لگا۔

''ہاہاہا..... ہاہاہا.....!'' ادھر میں نے دل کھول کر قہقہہ لگایا تو اپنے باس کی بے عزتی پر تاج غصے سے بپھر گیا اور میری طرف گھورتے ہوئے دانت پیس کر خونخوار لہجے میں ان سے بولا۔

''اسے میرے حوالے کر دو، اس کی ساری چوکڑیاں بُھلا دوں گا۔''

''ابے جا را تب خور کُتے!'' میں نے جکڑ بند ہونے کے باوجود اسے للکارا۔ ''پاکستان میں تو تُو میرا..... ایک بال بھی نہ کھینچ سکا، یہاں تُو نے کون سا تیر مار لینا ہے؟''

''اس کی بے خوفی اور بھرپور اعتماد اشارہ کرتا ہے کہ یہاں بھی اس نے اور اس کے چھپے ہوئے ساتھیوں نے ہمارے لیے زمین تنگ کرنے کی..... پوری پلاننگ کر رکھی ہے۔'' بھولا ناتھ بدستور گہرے لہجے میں بولا۔

''ناتھ صاحب! آپ تو خوامخواہ ہی اس سے مرعوب ہوئے جا رہے ہیں۔'' تاج نے جھلا کر بھولا ناتھ سے کہا اور یہی وہ وقت تھا جب بھولا ناتھ کا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور کمرے کی دم بخود سی فضا میں زوردار ''چٹاخ'' کی آواز گونج گئی۔

تاج کے حلق سے کراہ خارج ہوئی تھی اور بھولا ناتھ کے بھاری ہاتھ کا تھپڑ کھانے کے بعد وہ چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔

''پاکستان سے بری میں لائے ہوئے اپنے اس لوسی کتے کو لگام دو گوہر شاہ!'' بھولا ناتھ نے پُرغیظ لہجے میں..... کہا۔ ''ورنہ، اگلی بار میں اس سے گولی سے بات کروں گا اور وہ میری اس سے آخری بات ہوگی۔''

''تاج! اپنے آپے میں رہو۔'' گوہر شاہ نے تاج کو گھور کر تنبیہ کر ڈالی۔ میں پھر چپکا۔

''ایک دم چپکا س.....! کیا کہنے بھولا ناتھ صاحب تمہارے..... تم تو یار بہت دلچسپ آدمی ہو۔ کیا خوب پہچانا اِن دونوں کو.....''

میری بات نے گوہر شاہ اور تاج کو بلبلا کر رکھ دیا، مگر وہ بھولا ناتھ کے سامنے بے بس تھے۔ ان کے مقابلے میں بھولا ناتھ میں بہرحال ایک کوالٹی تھی کہ وہ..... میرے حوالے سے بلاوجہ کسی طیش اور غصے کا اظہار کرنے کے بجائے دیگر توجہ طلب امور پر غور کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

''یہ دونوں ہی گیدڑوں بلکہ گدھوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔'' موقع تاک کر میں نے تاؤ دلانے والی ''اسکیم'' جاری رکھی۔ ''انہی کی راہ پا کر ہی تو ہم نے سب سے پہلے پاکستان پھر امارات میں تم لوگوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور اب یہاں بھی.....''

''تم کبواس بند کرواپنی.....'' بھولا ناتھ دہاڑا۔

''بند کردی۔'' میں نے کہا۔

''چرن! اسے اسی وقت گولی مار دو.....'' بھولا ناتھ نے اچانک سفاکانہ حکم جاری کر دیا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بھولا ناتھ صاحب!'' گوہر شاہ نے فوراً اس سے کہا۔

''ہمیں اس کے ایک اور اہم ساتھی طارق تک بھی پہنچنا ہے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے چاند کو چمکنے کے لیے سورج کی روشنی کی محتاجی ہوتی ہے۔''

''ابے، گلیلیو گلیلی کی اولاد! تو ماہرِ فلکیات کب سے بننے لگا؟ کیا تیرا دماغ چل گیا ہے؟'' بھولا ناتھ نے گوہر شاہ کو لتاڑا مگر وہ بھی ایک ہٹیلا ہی تھا۔ اپنی ہی کہتا رہا۔

''میں اس کے ذریعے اس کے دوسرے ساتھیوں کے ٹھکانوں کا پتا چلاؤں گا۔ یہ ان کا لاڈلا ہے اور رومی کا تو یہ محبوب ہے۔ اسے میرے زیرِ عتاب دیکھ کر رومی فٹ سے اس اہم سی ڈی کے بارے میں اپنی زبان کھول دے گی۔''

گوہر شاہ کے اس آخری الفاظ کے سفید جھوٹ پر میں اندر سے تیر ان رہ گیا، کیونکہ وہ ہی نہیں اس کا چیلا، تاج بھی یہ حقیقت اچھی طرح جانتا تھا کہ میں رومی سے نہیں بلکہ حمیرا سے محبت کرتا تھا، تاہم..... مجھے گوہر شاہ کی چالاکی سمجھنے میں بھی مطلق دیر نہ لگی کہ وہ اس طرح بھولا ناتھ کو جوش دلا کر مجھے اپنی گرفت میں کرنا چاہتا تھا، اس میں ایک تو اس کا مقصد وہی تھا جو بیان کیا جا چکا، جبکہ دوسرا مقصد مجھ سے ذاتی طور پر انتقام بھی لینا شامل تھا اور یہی تاج کی بھی مرضی تھی، کیونکہ بھولا ناتھ کی شہ پر میری جوابی لفظی کارروائی نے ان دونوں کی انا اور تکبّر کو بری طرح جھنجوڑ ڈالا تھا، یوں یہ دونوں مردار بالخصوص تاج مجھ سے زبردست انتقام لینا چاہتے تھے۔

اس میں دونوں ہی فوائد انہیں نظر آ رہے تھے۔ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ خود میں بھی یہی چاہنے لگا تھا کہ انہی کے ہتھے چڑھ جاؤں اس طرح کم از کم میں رومی کے پاس تو جا پاؤں گا۔ آگے پھر اللہ مالک تھا۔

بھولا ناتھ کو سوچتا پا کر گوہر شاہ نے سمجھا لوہا گرم ہے تو اس نے ایک ضرب مارنی چاہی۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں، ناتھ صاحب!''

''میں تمہاری بات کی صحیح یا غلط پر غور نہیں کر رہا ہوں۔'' بھولا ناتھ نے ڈپٹ کر اس کی خوش فہمی دور کی۔

''اس کے بارے میں بعد میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ نوے فیصد امکان یہی ہے کہ کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے..... اسے گولی ہی مار دی جائے چلو اب یہاں سے..... چانکیہ کا معاملہ دیکھتے ہیں۔''

بھولا ناتھ کی بات پر میں نے دیکھا کہ گوہر شاہ اور تاج کے چہرے پر اُوس پڑ گئی تھی۔ وہ لوٹ گئے۔

ایک طرح سے خود میں بھی..... ان کی چال کی ناکامی پر متاسف ہوا تھا۔

بہرکیف، شکر تھا کہ انہوں نے مجھ پر ابھی کسی قسم کا کوئی تشدد نہیں کیا تھا، جس کا یہ بھی صاف مطلب نکلتا تھا کہ بھولا ناتھ واقعی مجھے گولی مار کے میرا قصہ ہی ہمیشہ کے لیے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ وہ شاید خطرات پالنے کا عادی نہیں تھا۔

کیا مجھے اب اپنی موت کا انتظار کرنا چاہیے؟ اس سوال نے مجھے اندر سے بُری طرح تھرتھرا کر رکھ دیا۔

پھر کافی وقت بیت چلا۔ اس عرصے میں مجھے کھانے کو دیا گیا نہ ہی پینے کو..... قربانی کا جانور تو میں تھا نہیں کہ کھلا پلا کر مجھے چھری تلے دیتے، شاید اسی لیے مجھے بھوکا پیاسا ہی مارنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔

میرے اندازے اور کھڑکی سے باہر نظر آنے والے مقدور بھر آسمان کی رنگت سے مجھے وقت کے پہیے کے گھومتے رہنے کا اندازہ ہوتا رہا، حتیٰ کہ رات ہو گئی۔ گویا

میری موت کا وقت نزدیک آچکا تھا اور پھر مزید رات کے ایک پہر بیت جانے کے بعد دروازے پر اچانک آہٹ ہوئی، مجھے وہ آہٹ گویا عزرائیل ہی کی محسوس ہوئی تھی۔

میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔

☆☆☆

میری دم بہ خود سی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے کمرے میں بلب روشن تھا۔

دروازے کی نچلی درز سے باہر راہداری تاریک ہونے کے سبب کچھ نظر نہیں آتا تھا، مگر دروازے پر آہٹ ہوئی تھی، ایسے میں اچنبھا لازمی تھا کہ آنے والے راہداری میں روشنی ضرور کرتے، تو پھر کیا یہ واقعی موت کا فرشتہ تھا؟ جسے اندھیروں اور روشنیوں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

میں نے بھی بہ غور دروازے پر کان دیے رکھے۔ کچھ ایسی آہٹ محسوس ہوئی جیسے باہر سے کوئی دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میرا دل اب رُک رُک کر دھڑکنے لگا، ایک روح فرسا خیال یہ بھی ابھرا کہیں گوہر شاہ یا تاج اپنے انتقام کی آگ میں جھلس کر مجھے تاریک راہوں میں ہلاک کر کے اسے ٹھنڈی تو نہیں کرنا چاہتے تھے؟ اس تصور سے ہی میں کانپ گیا۔ میرا منہ آزاد تھا، میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر ایسا کوئی خطرہ محسوس ہوا تو میں چیخنا چلّانا شروع کر دوں گا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا، میں جیسے پتھر بنا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سرتاپا سیاہ چست لباس میں ملفوف تھا۔ چہرے پر تو بڑا تھا اور اس میں فقط اس کا منہ، اور آنکھوں کے سوراخ نظر آرہے تھے، لیکن چست لباس میں اس کے دل نواز جسمانی نشیب و فراز نے مجھے بُری طرح چونکا کر رکھ دیا۔ وہ سرتاپا حسین اور دلکش نسوانیت کا پیکر تھی۔

کون تھی؟ میں اس کے قریب آنے اور بولنے کا منتظر رہا۔

''شش..... شی۔'' اس نے اندر آتے ہی..... اپنے ایک ہاتھ کی اُنگلی منہ والی جگہ پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی یقینی تلقین کر ڈالی اور میں نے اس پر حرف بہ حرف عمل کیا۔

اس نے آہستگی سے عقب میں دروازہ بند کیا اور دبے پاؤں میرے قریب آئی، اس کے انداز و اطوار میں بڑی بے قراری اور اپنائیت تھی، پھر پاس آتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

سیاہ چست لباس میں ڈھکی ہونے کے باوجود مجھے اس کے قرب کی مہک شناسا لگی۔

''سیف!''

اس نے ہولے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور تب ہی بے اختیار میرے منہ سے بھی اس کا نام برآمد ہو گیا۔

''رومی۔''

یہ میرے لیے غیر متوقع تھا۔ رومی کا اچانک یوں میرے سامنے اور قریب آنا مسرت خیز تھا اور حیرتیں بے شمار۔

وہ مجھ سے لپٹی رہی، میرا بھی یہی جی کیا لیکن میں جکڑ بندوں میں تھا۔ وہ نہایت جذباتی ہو رہی تھی اور تب ہی میں نے اسے یاد دلایا کہ میں خطرناک دشمنوں کی قید میں ہوں اور بندھا ہوا بھی..... یہی نہیں وہ خود بھی خطرے کی گود میں آگئی ہے۔

اس نے سنبھالا لیا اور سب سے پہلے اپنے سر سے توبڑا ہٹایا۔ وہ رومی ہی تھی۔ ایک خاصا وقت میں نے اس کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ میرے دُکھ کی ساتھی رہی تھی۔ کئی موقعوں اور نازک لمحات میں ہم ساتھ اور قریب بھی رہے تھے۔ زندگی اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم ایک ساتھ اَن گنت خطرات سے نبرد آزما بھی ہوئے تھے۔

لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس کا حسین اور پُرشوخ نظر آنے والا دلکش چہرہ داغ دار تھا۔ متورم اور کہیں کہیں پڑے ہوئے سیاہ دھبوں نے میرے اندر کرب کی لہر جگا دی تھی۔ ابھی یہ سب پوچھنے کا وقت نہ تھا، وہ میرے جکڑ بند کھولنے لگی۔

چند منٹوں میں ہی اس نے یہ کام نمٹا دیا۔

''رومی! یہ تمہارا چہرہ.....؟'' میں اتنا ہی کہہ پایا۔ شاید دکھ تلے میرے حلق میں رقت اُتر آئی تھی۔

''یہ چہرہ میرا ہی ہے، بس! دشمنوں کی کرم نوازی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص اور زندہ دل لہجے میں بولی اور پھیکے پن سے مسکرا دی اس کی آنکھوں کے وہ دیے مجھے بجھے بجھے سے محسوس ہوئے جو کبھی ہر وقت روشن دکھائی دیا کرتے تھے۔

''کیا سوچنے لگے؟'' مجھے ایک ٹک سوچتا اور چپ پا کر وہ ہلکے سے بولی۔

''سچ سچ بتاؤ رومی! ان بدذاتوں نے تم پر کس قسم کا تشدد کیا ہے؟'' کہتے ہوئے مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔ یوں جیسے میرے اندر کوئی ایکا ایکی بیدار ہونے والا جنگجو بول رہا ہو۔

''عورت کے جسمانی زخم تو ہر کوئی سمجھ لیتا ہے مگر روح

کے گھاؤ کوئی کوئی مرد سمجھتا ہے، تم شاید ایسے ہی مرد ہو سیف!'' زخم ہرا ہو جانے پر رومی مچل جانے والے لہجے میں بولی۔ ''انہوں نے میرے چہرے کو ہی نہیں میری روح کو بھی زخمی کیا ہے، میں تاج سے اس کا انتقام ضرور لوں گی۔''

کہتے ہوئے یکا یک اس کے لہجے اور آنکھوں سے مجھے ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی تپش محسوس ہونے لگی۔

''تاج..... ! میں اب اسے عبرت ناک موت دیے بغیر یہاں سے نہیں نکلوں گا۔'' میں ایک دم غضب ناک لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''ابھی نکلنے کی کرو.....'' اس نے قدرے سنبھلتے ہوئے کہا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''شکر ہے ان مرداروں نے تم پر تشدد نہیں کیا۔'' وہ بولی۔

''لل..... لیکن تم یہاں اچانک کیسے؟'' میں ابھی تک حیران تھا۔

''کہانا، ابھی نکلنے کی کرو۔'' وہ بولی۔

''چلو۔'' میں نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دبے پاؤں دروازے کی جانب بڑھے۔ رومی کے ہاتھ میں اب..... ایک عجیب ساخستہ پستول نظر آرہا تھا۔

''یہ کیا شے ہے؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''تیر پھینکتا ہے یہ۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پھر مجھے بھی اشارہ کیے ہوئے راہداری میں آگئی۔

یہاں سے وہاں تک یہ طویل راہداری سنسان پڑی تھی۔

''ہمارے شکار یہاں موجود ہیں۔ ان کا بھی بندوبست کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے اور میں ان کا ہی پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔'' وہ نیچی آواز میں بولی۔ ''مجھے طارق کی تلاش تھی، میں یہی سمجھی شاید انہوں نے طارق کو ہی یرغمال بنایا ہوا ہے۔ وہ لوگ دوسرے کمرے میں تمہارے ہی متعلق باتیں کررہے تھے۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ طارق کے بجائے تم اُن کی گرفت میں ہو۔ یہ میرے لیے غیر یقینی تھا۔''

''طارق کی فکر نہ کرو، وہ خیریت سے ہے اور میں اس سے مل چکا ہوں۔'' میں نے اس کی تسلی کروائی۔ ''وہ لوگ کون سے کمرے میں موجود ہیں؟'' ساتھ ہی میں نے پوچھا۔

''وہ سامنے والے رہداری کے سرے کی دائیں جانب کے کمرے میں۔'' رومی نے سامنے اشارہ کیا۔

''ان کا ایک بڑا گرگھنٹال بھی وہاں موجود ہے، بھولا ناتھ۔'' میں نے بتایا۔

''ہاں! شکر چانکیہ کے بعد اسی کا نام سن رکھا ہے میں نے یہاں۔'' وہ بولی۔

''ان سب کو جہنم واصل کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی نہیں، میں ان کے خلاف قانونی گھیرا تنگ کرنے والی ہوں اور ان کے بہت سے رازوں سے واقف ہو چکی ہوں۔''

اس کی بات پر میرا حلق کڑوا ہو گیا۔ بولا۔ ''تم نے پھر قانون کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اس قدر چوٹ کھانے کے بعد بھی..... ! نہیں جانتیں تم کہ قانون ان جیسے بااثر اور خونی سوداگروں کے لیے تحفظ کا دوسرا نام ہے۔'' میں نے اسی کڑواہٹ سے کہا۔

''انٹرپول کا قانون سخت ہے اور ہر جگہ ہر بات سے ماورا ہو کر چلتا ہے۔'' اس نے تاویل پیش کی۔ میں نے اسے سر کے نفی اشارے سے رد کر دیا۔ تب ہی اچانک اس کی بات پر مجھے یاد آگیا اور میں نے پوچھا۔

''تمہارے ہاتھ ان کے خلاف ٹھوس ثبوت کی کوئی ٹی تھری اور ٹی فورنامی سی ڈی لگی ہے؟''

''ارے.....!'' وہ چونکی۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

میں نے مختصراً اسے اب تک کے حالات سے آگاہ کر دیا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ بھولا ناتھ مجھے اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے گولی مار دینے کا ارادہ رکھتا ہے اور سورج نکلنے میں چند ہی گھنٹے رہ گئے ہیں۔

''بس، اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' وہ بولی اور قدم آگے بڑھایا۔

یہی وہ وقت تھا جب ایک سے زائد قدموں کی آواز اُبھری۔ یہ عقب سے آئی تھی۔

''کوئی آرہا ہے، دیوار سے لگ جاؤ۔'' اس نے کہا اور مجھے لیے دیوار سے چپک گئی۔

اسی وقت..... چٹ، چٹ کی دوبارہ آوازیں اُبھریں اور یہاں سے وہاں تک یہ طویل راہداری روشن ہوتی چلی گئی۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے
نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

لڑکی تیزی سے لائن سے باہر آئی تاکہ پیڑ کے کندھے سے نہ ٹکرائے اور ایک طرف کو گرنے لگی۔ وہ ڈگمگایا اور ان بڑی بڑی نیلی آنکھوں کو دیکھنے لگا جو اسے گھور رہی تھیں۔ اس نے اپنا گلابی لباس ٹخنوں سے نیچے کیا اور کھڑی ہوگئی۔

''تم ٹھیک تو ہو؟''

اس نے اردگرد دیکھا تو اسے اپنا پرس فرش پر پڑا نظر آگیا۔ اس نے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ قطار میں

احتیاط سے معاملاتِ دل نبھانے والے غافل کی آخری بے احتیاطی.....

بے احتیاطی

سیریناراض

حسین چہرے... طلسماتی طاقت رکھتے ہیں اور سامنے والے کو اپنا گرویدہ بنا دیتے ہیں... ایک حسین پری کا قصہ... ہر نظر اس کے چہرے کی شیدائی تھی... اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ ایک خوبصورت اور بڑے گھر میں اپنی زندگی کے دن گزار دے...

کھڑے ہوئے لوگ پیچھے ہٹ گئے اور پیٹر نے پرس اٹھا کر اسے پکڑا دیا۔ اس لڑکی نے آنکھیں جھپکا کر اسے دیکھا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پیٹر نے اٹھنے میں اس کی مدد کی۔

''مجھے افسوس ہے۔''

''نہیں، معذرت تو مجھے کرنی چاہیے۔'' لڑکی نے نرم آواز میں کہا۔ ''میں بغیر دیکھے آگے آ گئی۔''

اس دبلی پتلی لمبی لڑکی نے اپنا لباس سیدھا کیا۔ اس لباس میں اس کے جسمانی خطوط پوری طرح نمایاں تھے۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے بال درست کیے۔ اسے دیکھ کر پیٹر کو کسن گرل کا خیال آیا جسے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں خوب صورتی اور فیشن کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

پیٹر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کا خوب صورت چہرہ، چھوٹی سی ٹھوڑی اور لپ اسٹک لگے بھرے بھرے ہونٹ دیکھ کر اس کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے اپنے پھوہڑپن پر یقین نہیں آ رہا۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ اس نے دیوار پر لگے کلاک پر نظر ڈالی اور سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کل دوبارہ آنا پڑے گا۔'' اس وقت ایک بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔

پیٹر نے اپنا کوٹ سیدھا کیا اور بولا۔ ''نہیں، میں یہاں وائس پریذیڈنٹ ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ ہم تمہارا کام فوراً کر دیں گے۔ کم از کم میں تمہارے لیے اتنا تو کر سکتا ہوں۔''

لڑکی تھوڑا سا ہچکچائی لیکن وہ اسے اپنے ساتھ اس کیشیئر کے پاس لے گیا جو بینک کے مرکزی دروازے کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ جب ایک بوڑھا شخص کھڑکی کے پاس سے ہٹا تو پیٹر نے کیشیئر کو اشارہ کیا۔

''اب اس خاتون کی باری ہے۔''

نوجوان کیشیئر نے سر ہلایا اور پیٹر نے لڑکی کو کھڑکی کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے ہٹ گیا تاکہ لڑکی اپنا کام کر سکے۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور کھڑی ستواں ناک نے اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافہ کر دیا تھا۔

اس نے رسید اور کچھ نوٹ اپنے پرس میں رکھے اور پیٹر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کام پر واپس جانے کی جلدی ہے۔''

''تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟''

لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اب وہ اس کے بالکل قریب کھڑی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

پیٹر نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''میں چھٹی کر کے گھر جا رہا ہوں۔ اگر کہو تو تمہیں اپنی کار میں لے جا سکتا ہوں۔ اس طرح تم جلدی اپنے کام پر پہنچ جاؤ گی۔''

اس لڑکی نے دوبارہ کلاک کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اگر میں پیدل گئی تو وقت پر نہیں پہنچ سکتی۔''

وہ لڑکی اس کی نئے ماڈل کی کار میں بیٹھ گئی تو پیٹر کو محسوس ہوا کہ اس کے لباس سے پرفیوم کی مہک آ رہی ہے۔

''کہاں جانا ہے؟ اس نے پوچھا۔

'نیو میسن بلانچ ڈپارٹمنٹ اسٹور، کنال اسٹریٹ۔''

پیٹر نے گاڑی آگے بڑھائی اور بولا۔ ''میرا نام پیٹر ہوسٹن ہے۔''

''مجھے ایملی بروک کہتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پیٹر نے سوچا یہ لڑکی کتنی خوب صورت ہے اور اس کی آواز سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔

''تم بینک میں وائس پریذیڈنٹ ہو؟''

''ہاں، صرف میں ہی نہیں میرے ساتھ ایک اور بھی ہے۔ ہماری ذمے داریاں الگ الگ ہیں۔ وہ حساب کتاب کا ماہر ہے۔''

''میں کاسمیٹکس کاؤنٹر پر کام کرتی ہوں۔ میک اَپ کا سامان بیچنے کے علاوہ بعض اوقات مجھے خواتین کا میک اپ کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی مارکیٹنگ کا ایک طریقہ ہے۔ بہت سے مرد اکثر اس کا مشاہدہ کرنے آتے ہیں۔''

پیٹر مسکرایا۔ 'کیا یہ مجھے بھی دعوت دے رہی ہے؟'

اس نے گاڑی کنال اسٹریٹ پر موڑی اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم کل میرے ساتھ لنچ کرنا پسند کرو گی؟ میں کم از کم تمہارے لیے اتنا تو کر سکتا ہوں کیونکہ تمہیں میری وجہ سے چوٹ لگی تھی۔''

وہ مسکرائی اور اس کے بائیں ہاتھ کو دیکھا اور اس کی شادی کی انگوٹھی کو پھر سر ہلا دیا۔ ''ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔'' وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''تمہاری ساکھ کا معاملہ ہے۔''

پیٹر نے اسٹور کے دروازے کے سامنے کار روکی۔ ''تمہاری ساکھ مسٹر ہوسٹن۔'' وہ دوبارہ مسکرائی۔ ''اور میری بھی۔''

پیٹر نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور بولا۔

"کل دوپہر مجھے یہیں ملنا۔"

وہ کار سے اُتری۔ پیٹر اس کے ساتھ کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے گی۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی اور اس نے کہا کہ وہ کل دوپہر اسے اسٹور کے عقبی دروازے پر ملے گی جو آئی بروئیل اسٹریٹ پر کھلتا ہے۔

وہ مڑی اور اسٹور کے سامنے والے دروازے میں داخل ہوگئی۔ پیٹر اس کے اندر جانے کا انتظار کرتا رہا پھر وہ بھی گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس نے گاڑی کے شیشے چڑھائے اور اپنی بیوی کے سخت چہرے کا تصور کیا جو اپنا سامان باندھے اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ رات کی بارش کے باوجود سہ پہر میں گرمی اور رطوبت بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی بیوی اور بیٹی جھیل کے پار نارتھ شور جا رہی تھیں جہاں انہیں جولائی اور اگست کے گرم ترین مہینوں میں قیام کرنا تھا۔

اس نے کار اپنے گھر کے عقب میں کھڑی کی اور پچھلے راستے سے ہوتا ہوا پورٹیکو میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ کھانا پکانے والی عورت بیسی تحقیقی ہال میں تھی۔

"مادام، فرنٹ روم میں انتظار کر رہی ہیں۔"

ساٹھ سالہ بیسی اس کی بیوی کے خاندان کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اس روز اس نے اپنا بہترین لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی اور پیٹر کو یاد آ گیا کہ بیسی کو نارتھ شور کے صنوبر کے درختوں سے بھرے جنگل کتنے پسند ہیں۔

اس کی بیوی اور بیٹی لیونگ روم میں تیار بیٹھی ہوئی تھیں۔ "تمہیں دیر ہوگئی۔" اس کی بیوی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "کہیں فیری بوٹ نکل نہ جائے۔"

جب پیٹر نے چودہ سال قبل نیو اورلینز کے شپنگ میگنٹ ایلن چاریونیٹ کی بیٹی سے شادی کی تھی تب بھی ایڈیلا اتنی خوب صورت نہیں تھی لیکن وہ آج کی طرح بل ڈاگ جیسی بھی نہیں لگتی تھی۔ شادی کے وقت بھی وہ موٹی اور پستہ قد تھی۔ اس کے بال وقت سے پہلے سفید ہو رہے تھے، اس کی آواز بھی کرخت اور کڑوی ہوگئی تھی۔ اس کا ہر جملہ سن کر یوں لگتا جیسے وہ اپنے شوہر کو ڈانٹ رہی ہو۔

چار سالہ ایمی نے صوفے سے چھلانگ لگائی اور دوڑتی ہوئی باپ کے پاس آئی۔ اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ پیٹر نے اسے اٹھا لیا اور اس نے اپنی بانہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔

ایک رومانی جملہ

"میں رات بھر تمہارے فراق میں جاگتا رہتا ہوں اور رات بھر اپنے خوابوں میں تمہیں ہی دیکھتا رہتا ہوں۔"

دریافت طلب بات صرف اتنی ہے کہ رات بھر جاگنے والا رات بھر کسی کو خواب میں کس طرح دیکھ سکتا ہے؟

☆☆☆

کسی محاورے کا اس سے بہتر استعمال ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب ہمارے پڑوس کی ایک خاتون سے کہہ رہے تھے۔ "یہ تو درست ہے کہ آج صبح ہی آپ میرے پاس معائنہ کرانے آئی تھیں لیکن اس وقت مجھے آپ کے گھر کے قریب رہنے والے مسٹر شاہد کو دیکھنے آنا پڑا تو میں نے سوچا کہ چلو، آپ کو بھی دیکھتا چلوں تاکہ ایک ہی تیر سے دو شکار کیے جا سکیں۔"

حافظ آباد سے بشریٰ افضل کی عنایت

غلط فہمی

دماغی اسپتال کے ایک مریض کا دعویٰ تھا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہے۔ اسی دوران میں ایک نیا مریض داخل ہوا۔ وہ بھی خود کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہتا تھا۔ اس کی آمد پر اسپتال کے ڈاکٹر سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ طے کیا کہ ان دونوں کو یکجا کر کے ایک دوسرے کا ردِعمل دیکھا جائے۔ ممکن ہے لڑائی جھگڑے کے بعد دونوں اپنے دعوے سے باز آجائیں۔ چنانچہ دونوں مریضوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

اگلے روز جب ایک ڈاکٹر نے کمرا کھولا تو پہلے مریض نے باہر آ کر کہا۔ "ڈاکٹر! میں شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ شکر ہے کہ اب میری غلط فہمی دور ہوگئی ہے۔ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہیں ہوں۔"

"شاباش۔" ڈاکٹر نے خوش ہو کر کہا۔ "اب تم یقیناً یہ بھی بتا سکتے ہو کہ تم کون ہو؟"

"میں دراصل لیڈی ماؤنٹ بیٹن ہوں۔" مریض نے جواب دیا۔

اسلام آباد سے انجم جمیل کا تعاون

''ڈیڈی، ڈیڈی۔ ہم کشتی پر جارہے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں اپنی۔ تم خوب تفریح کروگی۔''

ایڈیلا نے شوہر سے کہا۔ ''اب اسے نیچے اتارو اور سامان کار میں رکھو۔''

اپنی آگے والی سیٹ پر باپ کے ساتھ بیٹھی جبکہ ایڈیلا اور بیبی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ایڈیلا نے ہوا کے لیے کھڑکیوں کے شیشے نیچے کردیے۔

''مجھے پرفیوم کی خوشبو آرہی ہے۔'' ایڈیلا نے سونگھتے ہوئے کہا۔

پیٹر نے آہستہ سے کار کی رفتار بڑھائی۔

''میں تم سے مخاطب ہوں مسٹر۔''

''کیا؟''

''مجھے پرفیوم کی خوشبو آرہی ہے۔''

پیٹر نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم نے پرفیوم لگایا ہے؟''

اپنی نے دانت نکال دیے۔ ''میں پرفیوم کی بو سونگھ رہی ہوں۔'' ایڈیلا نے پھر کہا۔ ''کیا تم نے کسی آوارہ عورت کو میری کار میں بٹھایا تھا؟''

''کئی بار۔'' پیٹر نے جواب دیا۔ ''اس نے پیچھے مڑ کر اپنی بیوی کو دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ کار ایسی عورتوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔''

''تم مذاق میں مت ٹالو۔''

آدھ منٹ بعد وہ بولی۔ ''میری ڈیڈی سے بات ہوئی تھی۔ وہ زرد بخار سے بہت خوف زدہ ہیں۔''

پیٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولی۔ ''ہمیں فوراً اس گرمی سے دور ہوجانا چاہیے۔''

کار ناہموار سڑک پر اچھلنے لگی اور ایڈیلا نے پیٹر کو ڈانٹا کہ وہ سڑک پر دھیان دے۔ چند منٹ بعد اس نے شکایت کی کہ وہ بہت آہستہ کار چلا رہا ہے۔

''یاد رکھنا، بیبی کی پہن ڈیلی روزانہ صبح چھ بجے ناشتا اور کھانا بنانے کے لیے آئے گی۔ اسے ہر حال میں صبح آٹھ بجے گھر جانا ہوگا جہاں وہ کھانا بناتی ہے۔''

بندرگاہ پر پہنچ کر پیٹر نے سامان اٹھانے کے لیے ایک مزدور کو بلایا جبکہ بیبی، ایڈیلا اور اپنی فیری بوٹ میں سوار ہونے کے لیے قطار میں لگ گئیں۔ اپنی بوٹ میں سوار ہونے سے پہلے پیٹر کے گلے لگ گئی اور اس کے گال کو بوسہ دیا۔ جب بوٹ روانہ ہوئی تب بھی وہ اسے ہاتھ ہلاتی رہی۔

شہر واپس آتے ہوئے پیٹر نے سیٹ سے کمر لگا کر آنکھیں بند کرلیں اور ایملی بروک کا تصور کیا۔ اس کی نیلی آنکھیں، سرخ ہونٹ، حسین چہرہ، نرم مسکراہٹ اور لمبے سیاہ بال سب اس کی نظروں کے سامنے آگیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی جب اسے یاد آیا کہ اس نے کس انداز میں اس کی شادی کی انگوٹھی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔''

جمعے کے روز پیٹر مقررہ وقت پر ڈپارٹمنٹ اسٹور کی عقبی سڑک پر پہنچ گیا۔ ایملی نے اس روز بھی گلابی رنگ کا مختلف لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے کالر پر فرل لگی ہوئی تھی اور وہ اس کے جسم پر پوری طرح فٹ تھا۔ اس نے پیٹر کی کار دیکھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کہاں جانا ہے مسٹر وائس پریذیڈنٹ؟''

پیٹر اس بارے میں صبح سے سوچ رہا تھا۔ وہ اسے لے کر سٹی پارک ایونیو پر واقع ایک پرانے کیفے میں گیا جہاں انہوں نے کستورا مچھلی کا سوپ اور چکن رائس کھایا۔

''مائی گڈنیس۔'' ایملی نے کہا۔ ''باہر سے تو یہ جگہ تنگ لگتی ہے لیکن کھانا بہت عمدہ ہے۔''

''کبھی یہ جگہ باہر سے بھی اچھی تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کھانا بہت اچھا ہے۔''

اس کیفے میں کل دس میزیں تھیں اور وہاں صرف تین جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔

''ایک شادی شدہ مرد کے لیے یہ مناسب جگہ ہے۔'' اس نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کافی ختم کرنے کے بعد اس نے اپنی کہنی میز پر رکھی اور بولی۔ ''اب تمہارا کیا پلان ہے؟''

''کیا مطلب؟''

وہ مکاری سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں پیٹر۔''

اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ ''کل ڈنر پر چلیں گے۔''

''تم ہفتے کی شب اپنی فیملی کے ساتھ ڈنر نہیں کرتے؟''

''وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''پھر تو یہ مناسب رہے گا۔''

پیٹر نے نجی آہستہ سے سر ہلا دیا۔ ایملی اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔ ''اب تم مجھے اسٹور واپس چھوڑ آؤ۔ اس سے پہلے کہ دیر ہوجائے۔''

جب وہ کار میں اس کے برابر بیٹھی تو پیٹر نے اس کے پرفیوم کی مہک محسوس کی اور سوچنے لگا کہ ہفتے کے روز کہاں ڈنر کرنا چاہیے۔ ایسی جگہ جہاں کوئی اسے پہچان نہ سکے۔

''مارگنی میں ایک سی فوڈ ریستوران ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ بھی چھوٹی جگہ ہے۔''

وہ اپنی نیلی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''فرنچ مین اسٹریٹ پر کیفے فرینکلن، یہ بالکل رسارٹ اسٹریٹ کے برابر میں ہے۔''

''گڈ، اسٹریٹ کار لائن کے قریب۔ میں کل شام سات بجے وہاں ملوں گی۔ تمہاری کار میں جانا ٹھیک نہیں۔''

ہفتے کے روز جب وہ ڈنر کے بعد ہوٹل سے باہر آئے تو وہ بولی۔ ''اب کہاں جانا ہے؟''

پیٹر خاموش رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ ''میں تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاسکتی۔ میری مکان مالکن مرد مہمانوں کو آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہم ڈانس کے لیے بھی نہیں جا سکتے۔ کوئی تمہیں میرے ساتھ دیکھ لے گا۔'' اس کی آواز میں شوخی تھی۔ ''کیا تمہاری فیملی آج رات واپس آرہی ہے؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ گرمی کی چھٹیاں گزارنے جھیل کے پار مینڈول گئے ہوئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مسٹر وائس پریذیڈنٹ، کیا تمہارے گھر میں گراموفون ہے؟''

''ہاں، کیا تم میرے ساتھ رقص کرنا پسند کرو گی مس گبسن گرل؟''

ایملی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''میں نے مسٹر گبسن کے لیے ماڈلنگ نہیں کی لیکن میسن بلانچ فیشن فوٹو گرافر کے لیے ماڈلنگ کرتی ہوں۔ یہ اشتہار عنقریب منظر عام پر آنے والا ہے۔''

وہ رات کی تاریکی میں عقبی دروازے سے گھر میں داخل ہوئے، پیٹر اسے لونگ روم میں لے گیا جہاں میز پر بالکل نیا گراموفون رکھا ہوا تھا۔ ایملی نے اپنا پرس اس کے برابر میں رکھا اور باکس میں رکھے ہوئے ریکارڈز دیکھنے لگی۔ ''کوئی تیز سروں میں تیز تال کے ساتھ موسیقی؟'' اس نے پوچھا۔

پیٹر نے سر ہلایا۔ اس نے دو گلاسوں میں شیری ڈالی اور ایک گلاس ایملی کو دے دیا۔ اس نے ایک گھونٹ لیا اور ایک ریکارڈ نکال کر گراموفون میں لگا دیا پھر پیٹر کی طرف مڑی اور اپنے بازو پھیلا دیے۔ پیٹر نے بھی اپنا بازو اس کی کمر میں ڈالا اور اسے اپنے قریب کرلیا۔ دُھن تیز ہوئی تو انہوں نے بھی قدم سے قدم ملا کر رقص شروع کر دیا۔ وہ پوری طرح اس کے بازوؤں میں سما گئی پھر بوسوں کی برسات شروع ہوگئی۔

جب وہ اسے بیڈ روم میں لے جانے لگا تو ایملی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اتوار کی صبح ایملی بستر میں ہی تھی جب ڈیلی ناشتا بنانے آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دوپہر کا کھانا بھی بنا دیا۔ وہ ان دونوں کے لیے کافی تھا۔ اس نے ڈیلی کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم خاصے خوش خوراک ہو، اسی لیے میں ہمیشہ زیادہ کھانا بناتی ہوں۔''

ایملی بستر سے اتر کر باتھ روم میں چلی گئی۔ غسل کے بعد اس نے پیٹر کا گاؤن پہنا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی پھر اس نے اپنے بال سنوارے اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی۔

''کیا بارش ہو رہی ہے؟''

بادل گرجنے کی آواز آئی اور بارش شروع ہوگئی۔

''ہمیں کچھ دیر رکنا ہوگا۔'' پیٹر نے کہا۔

''میرے پاس پہننے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' ایملی بولی۔

''تم مجھے اس حال میں بھی اچھی لگ رہی ہو۔''

پیر کے روز دوبارہ بارش شروع ہوگئی اور ان دونوں نے سارا دن گھر پر ہی گزار دیا۔ وہ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے اور بارش کے ساتھ بوسوں کی برسات بھی شروع ہوگئی۔ انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن دونوں جانتے تھے کہ اس افیئر کو خفیہ رکھنا ہے۔

ایملی نے کہا۔ ''ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ معاملہ آگے چل کر کیا شکل اختیار کرتا ہے۔''

''ہاں۔''

''تم مجھ سے تنگ آسکتے ہو۔''

''تم مجھ سے تنگ آسکتی ہو۔'' پیٹر نے اس کی نقل اتاری۔

''میں ایسا نہیں سمجھتی پیٹر۔''

''میں بھی نہیں۔''

انہوں نے باہر نکل کر چار جولائی کا جشن بھی نہیں منایا۔ گھر میں بیٹھ کر ہی پٹاخوں کی آوازیں سنتے رہے۔

انہوں نے ایک پروگرام بنایا کہ وہ ایملی سے جمعے کے روز چھ بجے سٹی پارک کے پیر سٹائل پویلین میں ملے گا جو

اس کے بورڈنگ ہاؤس سے صرف ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔

پیٹر اسے تیار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ایملی نے غازہ، پاؤڈر، آئی شیڈو اور گلابی لپ اسٹک لگائی، وہی گلابی لباس پہنا جو اس نے ہفتے کی رات ڈنر کے لیے زیب تن کیا تھا اور کلین گرل کے اسٹائل میں بالوں کا جوڑا بنایا۔

وہ اسے گھر چھوڑنے گیا اور سٹی پارک کے گیٹ پر اُتار دیا اور اسے بورڈنگ ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب انہیں پروگرام کے مطابق جمعے کو ملنا تھا۔ پیٹر جانتا تھا کہ وہ ایملی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ جمعے کے انتظار میں وہ ایک ایک دن بے قراری سے گنتا رہا اور ٹھیک وقت پر طے شدہ جگہ پر پہنچ گیا۔ ایملی کو دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس نے کریم کلر کا چست لباس پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ وہ اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گئی اور بیگ اپنے قدموں میں رکھ لیا۔

پیٹر نے سوالیہ انداز میں بیگ کی جانب دیکھا تو وہ بولی۔ ''اس میں کپڑے ہیں۔ میں نے مکان مالکن کو بتا دیا ہے کہ اپنے دوست کے گھر ویک اینڈ گزاروں گی۔''

''تمہارے ساتھ جو لڑکیاں کام کرتی ہیں، کیا وہ بھی تمہاری سماجی زندگی کے بارے میں متجسس ہیں؟''

''وہاں میری کوئی دوست نہیں ہے۔ ان کے بوائے فرینڈ میری چاپلوسی یا ان لڑکیوں کے سامنے میری تعریف کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ لڑکیاں مجھے پسند نہیں کرتیں۔''

''اور تمہاری فیملی؟''

''وہ انڈیانا میں ہے۔''

''ہماری ملازمہ ڈیلی نے آج رات ہماری دعوت کا انتظام کیا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اس ویک اینڈ پر کچھ لوگ آرہے ہیں۔''

گھر پہنچ کر ایملی نے اپنا بیگ پیٹر کے بیڈروم میں رکھا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ ڈیلی نے کافی پُرتکلف کھانا بنایا تھا۔ چکن سوپ، بھنی ہوئی بطخ، کارن بریڈ، آئس ٹی اور سوئٹ ڈش۔ کھانے کے بعد پیٹر نے پوچھا۔

''کیا تم چہل قدمی کے لیے باہر جانا چاہو گی؟''

''تم مجھے باقی گھر دکھاؤ۔''

اس نے ایملی کا بازو پکڑا اور زینے کی طرف چل دیا۔ اس کی بیوی کے بیڈروم میں ایملی نے سنگھار میز پر سے ایک فیملی پورٹریٹ اٹھائی اور بولی۔ ''تو یہ ہے تمہاری بیوی اور بیٹی۔ بہت پیاری بچی ہے۔''

''آؤ میرے ساتھ۔ میں نے کچھ نئے ریکارڈز خریدے ہیں۔ تیز دھنوں والے۔''

وہ کافی دیر تک رقص کرتے رہے پھر پیٹر اسے اپنے بیڈروم میں لے گیا۔ ایملی کے سو جانے کے بعد اس نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور اس کے ذہن کے پردے پر ایک چھوٹی لڑکی کا چہرہ آگیا۔ وہ اینی تھی جسے وہ بہت شدت سے یاد کررہا تھا۔

اتوار کے دن جب وہ ایملی کو چھوڑنے جارہا تھا تو راستے میں اس نے اس کے پرفیوم کے بارے میں پوچھا۔

''یہ فرانسیسی پرفیوم Lautomne ہے۔ اسی خوشبو میں مردوں کا کولون بھی ملتا ہے۔''

جب وہ اپنی منزل پر پہنچے اور ایملی اپنا بیگ اٹھانے لگی تو پیٹر نے اپنا بٹوا نکالا اور اسے بیس ڈالر کا نوٹ دیتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم میرے لیے مردوں کے کولون کی ایک بوتل خرید سکتی ہو جس کی خوشبو تمہارے پرفیوم جیسی ہو۔ میں اسٹور میں نہیں جانا چاہتا۔''

''اچھا خیال ہے۔''

گھر واپس جاتے ہوئے پیٹر سوچ رہا تھا کہ ایک مسئلہ تو حل ہوا۔ اس کی بیوی گھر میں قدم رکھتے ہی ایملی کے پرفیوم کی خوشبو سونگھ لے گی تو وہ اس سے کہہ سکتا ہے کہ یہ اس کے نئے کولون کی خوشبو ہے۔''

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ پیٹر ہر جمعے کی شام ایملی کو اپنے گھر لے آتا اور وہ دو راتیں اس کے بیڈروم میں گزار کر اتوار کو واپس چلی جاتی۔ یہ کھیل تقریباً دو مہینے جاری رہا۔ وہ اگست کا تیسرا اتوار تھا جب پیٹر نے ایملی کو بتایا۔ ''میری بیوی اور بیٹی اگلے ہفتے واپس آرہی ہیں۔''

ایملی نے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے سر ہلایا پھر بیڈروم کی چھت کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو گرا اور اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''وقت بہت جلدی گزر گیا۔''

''یہ ایک جادوئی موسم تھا۔'' ایملی نے کہا۔

''ہمیں اپنے افیئر کو خفیہ رکھنا ہوگا۔''

''یہ میری زندگی کا سب سے بڑا راز ہے۔'' ایملی نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ چند لمحوں بعد وہ بولی۔ ''ہم کیا کریں گے؟ کس طرح ایک دوسرے سے ملیں

گے؟''

''ہمارے پاس سوچنے کے لیے ایک ہفتہ ہے۔'' پیٹر نے کہا۔

جمعرات کی شام ایملی اس کے گھر کے عقبی دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلابی رنگ کا سوٹ کیس تھا۔ ''میں اسٹریٹ کار سے آگئی۔'' اس نے سوٹ کیس زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ گھر میں داخل ہوگئی۔ پیٹر نے اس کا سوٹ کیس اٹھایا اور اس کے پیچھے ہال میں چلا آیا۔

''میں نے اس مسئلے کا ایک حل سوچا ہے۔'' وہ اس کے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''یہ واحد راستہ ہے۔''

پیٹر نے سوٹ کیس نیچے رکھ دیا۔ ''جب تمہاری بیوی گھر آئے تو مجھے اس سے ملوانا اور اسے بتانا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور اس سے طلاق لے رہے ہو۔''

پیٹر کی ٹانگوں کی جان نکل گئی۔ ایملی نے اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھی تو بولی۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ بینک میں ہمارا ٹکراؤ محض ایک اتفاق تھا؟''

وہ اپنے پنجوں کے بل کھڑی ہوئی اور اس نے پیٹر کا بوسہ لیا۔ ''تمہارے پاس وہ سب کچھ ہے جو میں ہمیشہ سے چاہتی ہوں۔'' اس نے دوبارہ اس کے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور اسے مضبوط بنانا ہے۔''

''یہ میری بیوی کا مکان ہے۔ یہاں اس کا خاندان نسلوں سے رہتا آیا ہے۔''

''اوہ۔'' ایملی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بڑے مکان میں رہنا چاہ رہی تھی۔'' اس نے پیٹر کا بازو پکڑا۔ ''ہمیں بہت جلد اپنے مکان کا انتظام کرنا ہوگا۔''

اس رات پیٹر کوشش کے باوجود بھی نہ سو سکا۔ وہ چت لیٹا ہوا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ ایملی اس کے پہلو میں سو رہی تھی۔ اس نے تین مرتبہ پوچھنا چاہا کہ اس جملے سے اس کا کیا مطلب تھا جب اس نے کہا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ بینک میں ہمارا ٹکراؤ محض ایک اتفاق تھا؟''

لیکن وہ اس کا جواب جانتا تھا۔

ایملی نے اسے یہ کہہ کر حیران کر دیا تھا کہ وہ اس کی بیوی کے واپس آنے تک یہیں قیام کرے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی موجودگی میں پیٹر اپنی بیوی کو اس کے بارے میں بتائے اور اس کی بیٹی کو بھی معلوم ہو جائے کہ اس کا باپ ایملی سے کتنی محبت کرتا ہے۔

اپنی کا خیال آتے ہی پیٹر بے چین ہوگیا۔ وہ بستر سے اتر کر اس کے کمرے میں گیا اور اس کا تکیہ اٹھا کر اپنے چہرے سے لگا لیا۔ وہ اس کی خوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی پیاری بیٹی۔ اس نے اسے اپنے پاس ہی محسوس کیا جیسے اس نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے ہیں۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اس نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا ہے۔ کیا وہ اپنی سے جدائی برداشت کر پائے گا؟ وہ کس طرح اس کی زندگی تباہ کر سکتا ہے؟

جمعے کے روز ڈیلی کے جانے کے بعد ایمی نے کہا۔ ''میں نے اپنے سپروائزر کو یہ بتانے کے لیے کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارا فون استعمال کیا ہے۔''

کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے پیٹر کا ہاتھ کانپا۔ وہ بھی بینک فون کر کے بتا چکا تھا کہ وہ بیمار ہے۔

''تم اپنی بیوی سے نہیں بلکہ مجھ سے محبت کرتے ہو پیٹر۔ بالکل آسان سی بات ہے۔''

''آسان؟ اس میں کچھ بھی آسان نہیں ہے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''ہم کبھی اپنے بیڈ روم یا بستر الگ نہیں کریں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ہم تھیٹر اور فلم دیکھنے جا سکیں گے۔ کسی بھی کلب میں ڈانس اور ہوٹل میں کھانا کھا سکیں گے۔ کسی سے چھپانے کی ضرورت نہیں ہوگی اور نہ ہی یہ کوئی راز ہوگا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو۔''

رات کا کھانا کھانے اور کئی گھنٹوں تک ایملی کے منصوبے سننے کے بعد وہ دونوں لیونگ روم میں آگئے۔ جہاں پیٹر نے ایک ایسا تیز مشروب تیار کیا جو ایملی کو خاموش اور اس کے ہاتھوں کی لرزش روک سکے۔

اس نے آئس باکس سے ٹھنڈا پانی نکالا۔ بار کاؤنٹر پر دو گلاس رکھے۔ ان میں سونف کے ذائقے کی فرانسیسی شراب، اسپرٹ اور چینی کے کیوب ڈال دیے اوپر سے ٹھنڈا پانی انڈیل کر اسے خوب ہلایا۔ اس دودھیا مشروب سے ایک خوشگوار مہک آرہی تھی۔ اس نے ایک گلاس ایملی کو پکڑا دیا۔

''اسے سبز پری کہتے ہیں۔ سنا ہے کہ یہ ذہن یا طرزِ عمل کو متاثر کرتی ہے۔''

''بہت مزے دار ہے۔ اس کا ذائقہ سونف جیسا ہے۔''

ایملی نے ناک سکیڑی اور دوسرا گلاس بھر لیا تاہم پیٹر نے ایک گلاس پر ہی اکتفا کیا۔ وہ اس کے اثرات سے

واقف تھا لیکن اس نے ایملی کو یہ بات نہیں بتائی۔ اسے بہت حیرت ہوئی جب ایملی نے چوتھا گلاس مانگا لیکن اس کے بعد اس کے بے ہوش ہونے پر وہ بالکل حیران نہیں ہوا۔

ایملی اتنی ہلکی پھلکی تھی کہ وہ اسے بڑی آسانی سے بستر تک لے گیا۔ اس کے جوتے اتارے اور کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کا خوب صورت چہرہ ہلکی روشنی میں پُرسکون لگ رہا تھا اور لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

پیٹر نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے یوں لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اور اینی، سٹی پارک کی مصنوعی جھیل میں کشتی پر سوار ہیں۔ اینی دن کی روشنی میں اسے دیکھ کر مسکرا رہی ہے پھر اندھیرا چھا جاتا ہے اور وہ چلانے لگتی ہے۔ ''ڈیڈی، مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔''

پیٹر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یہی سمجھا کہ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ وہ اٹھا اور بستر پر جا کر ایملی کے برابر میں لیٹ گیا۔ اس نے ایک بار پھر سونے کی کوشش کی۔ سبز پری بستر پر مدہوش تھی۔ پیٹر نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنی کاردمیں ڈوبا چہرہ دیکھا۔ یوں لگا کہ اس کی زندگی ختم ہوگئی ہے۔ اب وہ کبھی اپنی پرانی ڈگر پر نہیں آسکتی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ کیا وہ واقعی سو رہا تھا یا یہ اس کا وہم تھا پھر اس نے ایک توپ کے چلنے کی آواز سنی۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بجلی کڑک رہی تھی۔ اس کی شدت نے پورے گھر کو ہلا دیا۔ تیز بارش کھڑکیوں سے ٹکرانے لگی۔ طوفان شدت اختیار کر گیا تھا۔ پیٹر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اب ایملی کمر کے بل لیٹی ہوئی تھی اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

پیٹر کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے متلی محسوس ہونے لگی۔ جب اس نے اپنا تکیہ اٹھا کر ایملی کے چہرے پر دباؤ ڈالا اور اپنا وزن تکیے پر ڈال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ مزاحمت نہ کرے لیکن وہ ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ اس نے تکیہ پکڑ لیا اور اسے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ اس پر سوار رہا جب تک کہ وہ ساکت نہ ہوگئی۔ اٹھنے سے پہلے بھی وہ کافی دیر اس پر سوار رہا پھر اس نے تکیہ اس کے چہرے پر ہی رہنے دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا جب تک کہ اس کی سانس معمول پر نہ آگئی۔

پیٹر نے آہستہ سے اس کے چہرے پر سے تکیہ ہٹایا اور دیکھا کہ اس کی آنکھیں اور منہ کھلا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ ایک مجسمے کی طرح بے جان تھا۔ اس نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے گلے پر رکھا اور دو انگلیوں سے اسے دبایا۔ اس کی نبض ڈوب چکی تھی، وہ اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ''یہ میں نے کیا ہے؟ اوہ میرے خدا۔''

وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا باتھ روم تک گیا۔ اسے بہت زور کی قے آئی۔

''یہ میں نے کیسے کر دیا؟ میں قاتل نہیں ہوں۔''

اس نے اپنا منہ دھویا اور واپس کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ایملی کے چہرے پر دوبارہ تکیہ رکھ دیا۔ چھت کی لائٹ جلائی اور ایملی کا سوٹ کیس پیک کیا۔ اس نے یہ اطمینان کر لیا کہ ایملی کی تمام چیزیں بشمول کپڑے، ہیئر برش، ٹوتھ برش، میک اپ کا سامان اور جوتے وغیرہ سوٹ کیس میں رکھ دیے ہیں پھر وہ سوٹ کیس لے کر لیونگ روم میں آیا اور اسے آتش دان میں پھینک دیا۔ اس نے آتش دان میں مزید لکڑی اور کوئلہ ڈالا تاکہ تیز آگ میں سوٹ کیس جل کر راکھ ہو جائے۔

صبح کے تین بجے اس نے اپنی کار مکان کے عقبی حصے میں کھڑی کی اور ایملی کو اس کی ڈکی میں ڈال دیا۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا پورٹ اسٹریٹ پہنچا جہاں دریا کے پشتے کے سامنے متروکہ گوداموں کی ایک قطار تھی۔ ان میں سے ایک میں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ وہ قطار کے آخر میں ایک ٹوٹے پھوٹے گودام پر گیا اور اس نے عمارت کے عقب میں ایک گودی کے پاس کار روک دی۔

اس نے ڈکی کھولی اور ایملی کی لاش اٹھا کر گودی کے نیچے رکھ دی پھر ڈکی بند کی اور گودام کے گرد چکر لگانے لگا۔ اسے کوئی بڑا جوہڑ نظر نہیں آیا جب تک کہ اس کی کار کے ٹائر کیچڑ میں نہ ڈوب گئے۔ اس کے چہرے اور پیشانی پر پسینا بہنے لگا اور ہاتھ نم ہوگئے۔ اس نے اپنی کار پیچھے کی اور اس کے پہیے چند سیکنڈ تک گھومتے رہے جب تک کہ کار اس گڑھے سے باہر نہ آگئی۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس نے نہانے سے پہلے پورے گھر کا جائزہ لیا۔ اس نے چادریں اور تکیے کے غلاف تبدیل کر کے انہیں بن میں ڈال دیا اور وہ کپڑے بھی جو اس نے پہن رکھے تھے۔ اس نے ایک بار پھر پورے گھر کا جائزہ لیا اور اپنے کمرے میں بستر کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ کسی صورت بھی وہاں نہیں سو سکتا تھا۔ اس لیے دوسرے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ہفتے کے روز پیٹر کو اپنی فیملی کو لینے کے لیے ملن برگ

جانا تھا۔ اس سے پہلے اس نے اپنی کار کو اندر باہر سے اچھی طرح دھویا۔ وہ جب وہاں پہنچا تو فیری بوٹ آچکی تھی۔ اس کی بیوی، اینی اور بیسی پلیٹ فارم پر چلتی ہوئی اس کی طرف آرہی تھیں۔ اینی نے اسے دیکھا تو دوڑتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

''ڈیڈ، ڈیڈی۔'' اس نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور بولی۔ ''میں تمہیں بہت یاد کررہی تھی۔''

میں نے بھی تمہیں بہت یاد کیا میری بچی۔ تم نے خوب تفریح کی ہوگی؟''

''ہاں، میں نے سوئمنگ پول اور جھیل میں تیراکی کی اور کتابیں پڑھیں۔''

کار میں بیٹھتے ہوئے ایڈیلا نے کہا۔ ''مجھے اسی پرفیوم کی مہک دوبارہ آرہی ہے۔''

''نہیں، یہ میرا نیا کولون ہے۔ کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟''

''نہیں، اس کی خوشبو عورتوں کے پرفیوم جیسی ہے۔''

جب اس کی کار گھر کے قریب پہنچی تو پیٹر کے سینے میں درد کی لہر اٹھی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ کبھی ایملی کو نہیں دیکھ پائے گا۔

اتوار کے اخبارات میں صفحہ اول پر ایملی کے قتل کی خبر شائع ہوئی۔ نیو اورلینز ایگل، نے سرخی لگائی۔ ''نوجوان عورت کا قتل'' اس کے ساتھ اس کے چہرے کا اسکیچ اور تفصیلات درج تھیں۔ ''سفید فام، عمر بیس اور تیئس کے درمیان، قد پانچ فٹ نو انچ، نیلی آنکھیں، گہرے براؤن بال۔''

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ایملی کی لاش ایک راہ گیر نے دریافت کی۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہورہا ہے۔ پولیس کو کوئی شواہد نہیں ملے۔ اس نے لوگوں سے کہا تھا کہ اس نوجوان عورت کو شناخت کرنے میں مدد کریں۔ پیٹر نے اس خبر کو دو مرتبہ پڑھا۔ پھر دوسرا اخبار نیو اورلینز گزٹ، کھول لیا۔ اس اخبار کے رپورٹر نے ایملی کا حلیہ تفصیل سے بیان کیا تھا۔ اس میں بھی وہی اسکیچ تھا۔ پیٹر دونوں اخبار لے کر اندر آگیا۔

جیسے ہی ایڈیلا نے اخبار کھولا وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے کلسن گرلز کے بارے میں کیا کہا تھا؟ یہ ویسا ہی چہرہ ہے۔''

پیٹر نے دونوں ہاتھوں سے کافی کا کپ تھاما اور اسے اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔

''یہ چہرہ۔'' ایڈیلا بولی۔ ''ترغیب آمیز، دل موہ لینے والا اور خطرناک ہوتا ہے۔ ایسے چہرے پر مرد مکھی کی طرح منڈلاتے ہیں۔''

دوسری رات بھی پیٹر نہیں سو سکا۔ اس کا دماغ مسلسل سوچ رہا تھا۔ اسٹور میں ایملی کے ساتھ کام کرنے والے اسے شناخت کرلیں گے۔ اس کے بچنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ اگر ایملی نے اس افیئر کو خفیہ رکھا ہو۔

پیر کے روز پیٹر جلدی کام پر چلا گیا۔ راستے میں اس نے ایک نیوز اسٹینڈ سے صبح کے اخبارات خریدے اور دفتر میں بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ دونوں اخبارات میں ایملی کی کسی فیشن فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں جن کے ساتھ اس کا مختصر تعارف بھی دیا گیا تھا۔ دوسرے صفحے پر بورڈنگ ہاؤس اور اس کے کمرے کی تصویریں تھیں۔ اس کی مکان مالکن نے ایملی کو اس کے اسکیچ سے پہچانا۔

پولیس نے اس کے کمرے کی تلاشی لی اور اپنے ایک بہترین سراغ رساں کو یہ کیس دے دیا۔ انہوں نے اپنے ہونٹ سی رکھے تھے۔ ان کے پاس صرف ایک سرا تھا کہ ایملی جولائی سے ہر ویک اینڈ کسی اجنبی دوست کے ساتھ گزار رہی تھی جبکہ خود اس کا تعلق انڈیانا سے تھا۔

کیا کیشیئر نے اسے یاد رکھا ہوگا؟ میں کیسے اس سے پوچھ سکتا ہوں؟ بہتر ہے کہ خاموش رہا جائے جب وہ دفتر سے اٹھا تو اس نے جان بوجھ کر کیشیئر کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ اکثر ایسا کرتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے پیٹر اخبار اٹھائے دروازے پر آیا تو وہاں ایک طویل قامت شخص دو باوردی پولیس والوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گلابی رنگ کی نوٹ بک تھی۔ اس پر سنہرے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''میری ڈائری'' اسے دیکھتے ہی پیٹر سمجھ گیا کہ یہ ڈائری کس کی ہوسکتی ہے۔ ایملی کو گلابی رنگ بہت پسند تھا۔

''مسٹر پیٹر ہوسٹن! تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔'' اس آدمی نے سرد لہجے میں کہا۔

پیٹر نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایملی اس تعلق کو خفیہ رکھنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے بے احتیاطی یہ ہوئی کہ اس نے ڈائری کو اپنا رازدار بنالیا اور وہی ڈائری پولیس کو پیٹر کے گھر تک لے آئی۔

❖❖❖

شکستِ فاش

عاطر شاہین

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا خوش بختی اور خوش حالی سے واسطہ کم کم ہی رہا ہوتا ہے... تنگ دستی اور خستہ حالی سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہر شخص ہر ممکن کوشش کرتا ہے... کسی کسی دل میں ایسی خواہشیں اور تمنائیں گھر کر لیتی ہیں جو کسی پل چین نہیں لینے دیتیں... ایسے بدحال اور بدقسمت لوگوں کا ماجرا جو دوسروں کے آشیانے جلا کر اپنا دولت کدہ تعمیر کرنا چاہتے تھے...

ہار اور جیت کی بازی میں شکستِ فاش ان کا مقدر ٹھہری.....

فائقہ کی شادی ایک ہفتہ قبل اُس کے والد کے دوست کے بیٹے حُسام سے ہوئی تھی۔ وہ اِس شادی سے خوش نہیں تھی کیونکہ یہ شادی اُس کی پسند کے خلاف ہوئی تھی۔ وہ احمر کو پسند کرتی تھی اور اسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔

احمر اس کا یونیورسٹی فیلو تھا۔ یونیورسٹی میں ہی اس کی احمر سے ملاقات ہوئی تھی جو بعد ازاں محبت میں تبدیل ہو گئی۔ احمر ایک وجیہہ، دراز قد اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اس کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کے والد کی کریانے کی دکان تھی۔ وہ چار بہن بھائی تھے اور اس کا نمبر آخری تھا۔ بھائی اور ایک بہن کی شادیاں ہو چکی تھیں جبکہ اس سے بڑی بہن راحیلہ کا رشتے اپنے عم زاد سے ہو چکا تھا البتہ احمر کا کہیں بھی رشتہ نہیں ہوا تھا۔ انہیں یونیورسٹی سے فری ہوئے تین ماہ ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اکثر اوقات کسی ہوٹل میں یا کسی پارک میں ملتے رہتے تھے۔

فائقہ کو جب پتا چلا کہ اس کے ڈیڈ شیراز علی اس کا رشتہ اپنے دوست اخلاق حسین کے بیٹے حسام سے کر رہے ہیں تو اس نے احتجاج بھی کیا تھا۔ کافی واویلا مچایا تھا لیکن چونکہ شیراز علی اپنے دوست کو زبان دے چکے تھے اس لیے انہوں نے فائقہ کی کوئی بات نہ سنی اور ان دونوں کا رشتہ طے کر دیا۔ فائقہ جانتی تھی کہ اس کے ڈیڈ زبان کے پکے ہیں۔ وہ اگر کسی کو زبان دے دیتے تھے تو پھر ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے فائقہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے اِس شادی سے انکار کیا تو وہ ان کا مرا ہوا منہ دیکھے گی۔ یہی وجہ تھی کہ فائقہ اپنے باپ کی خاطر حُسام سے شادی کے لیے راضی ہو گئی تھی۔ بعد ازاں ایک مہینے کے بعد اس کی شادی دھوم دھام سے حسام سے ہو گئی تھی۔

فائقہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی ماں کو فوت ہوئے چھ سال ہو گئے تھے۔ اس کے ڈیڈی خوبرو اور جوان تھے۔ اللہ کا دیا ان کے پاس سب کچھ تھا۔ ان کا شمار شہر کے معروف بزنس مین میں ہوتا تھا لیکن انہوں نے دوسری شادی نہیں کی کیونکہ وہ فائقہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسری عورت سوتیلی ماں کے روپ میں آ کر باپ بیٹی کی محبت میں دراڑ ڈال دے۔

فائقہ کو اپنے شوہر حسام سے ذرا بھی محبت نہیں تھی۔ حالانکہ وہ ہینڈسم اور وجیہہ نوجوان تھا۔ اس کا اپنا ٹائروں کا بزنس تھا۔ وہ بھی اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ فائقہ شادی سے پہلے اپنے یونیورسٹی فیلو احمر کی محبت میں گرفتار تھی اور اُسی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی دلجوئی میں پیش پیش تھا لیکن فائقہ کا رویہ اس کے ساتھ نامناسب تھا۔ وہ اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی۔ حسام اسے ہنی مون کے لیے پیرس لے جانا چاہتا تھا لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے یہ توجیہہ پیش کی تھی کہ اس کا ہنی مون پر جانے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔ جب موڈ بنے گا تو وہ بتا دے گی۔ حسام بھی خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے دوبارہ اصرار نہیں کیا تھا۔

فائقہ، احمر کی محبت میں گھلتی رہتی تھی۔ وہ ہر وقت یہی سوچتی رہتی کہ وہ ایسا کیا کرے کہ اس کی حسام سے جان

چھوٹ جائے اور وہ احمر سے شادی کر لے۔ وہ احمر سے شدید محبت کرتی تھی اور ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ احمر نہیں جانتا تھا کہ فائقہ کی شادی ہو چکی ہے۔ شادی سے دو روز پہلے ہی فائقہ نے اپنا سیل فون آف کر دیا تھا۔ اب وہ سوچتی تھی کہ جب احمر کو اس کی شادی کے بارے میں پتا چلے گا تو نجانے اس کا کیا ردِعمل ہوگا۔ اس نے اسے اندھیرے میں رکھا تھا۔

احمر نے کئی مرتبہ فائقہ کے سیل فون پر کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا سیل فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ یہی بات احمر کو تفکرات میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ وہ فائقہ کے گھر جا کر اس کی خیریت دریافت کرے لیکن پھر وہ خود کو روک لیتا کیونکہ اُسے فائقہ کی بات یاد آ جاتی تھی۔ فائقہ نے اسے منع کیا ہوا تھا کہ وہ کبھی اس کے گھر نہ آئے کیونکہ اس کے ڈیڈی لڑکی اور لڑکے کی دوستی کے خلاف تھے۔ ایسے میں جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ احمر، فائقہ کا بوائے فرینڈ ہے تو وہ سخت پا ہو سکتے تھے۔ چنانچہ کئی مرتبہ فائقہ کے گھر جانے کا ارادہ کر کے وہ ترک کر چکا تھا۔

احمر ایک لالچی لڑکا تھا۔ اسے فائقہ سے محبت نہیں تھی۔ وہ اس سے دکھاوے کی محبت کرتا تھا۔ درحقیقت اس نے فائقہ کو اپنی محبت کے جال میں پھنسایا تھا تاکہ اس سے شادی کر کے وہ اس کے باپ کی دولت حاصل کر سکے۔ اس نے فائقہ کے بارے میں ساری معلومات حاصل کی تھیں کہ وہ اکلوتی ہے اور اس کے باپ کی ساری جائداد اُسی کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ احمر اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اُس روز شام کے سوا پانچ بج رہے تھے۔ احمر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا فائقہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی ہوم ٹیوشنز پڑھا کر گھر آیا تھا۔ اس نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ چونکہ وہ یونیورسٹی سے فری تھا اس لیے وہ آج کل جاب کی تلاش میں تھا۔ دفعتاً سرہانے پڑے اس کے سیل فون کی مترنم گھنٹی گنگنا اٹھی تو اس نے کروٹ بدل کر سیل فون کی طرف دیکھا۔ اسکرین پر فائقہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ فائقہ کا نام دیکھ کر احمر کا چہرہ یک لخت کھل اٹھا۔ اس نے جلدی سے سیل فون اٹھا کر کال اٹینڈ کرنے کے بعد کان سے لگا لیا۔

''ہیلو فائقہ، کیسی ہو تم، کہاں ہو تم، تمہارا فون کیوں

بند جا رہا تھا؟'' احمر نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

دوسری طرف لمحہ بھر خاموشی رہی پھر فائقہ کی آواز سنائی دی۔ ''میں ٹھیک ہوں احمر، تم کیسے ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' احمر نے کہا۔ اسے فائقہ کی آواز میں عجیب تاثر محسوس ہوا تھا۔ ''تم نے بتایا نہیں، تمہارا فون کیوں بند تھا۔ اتنے دن کہاں تھیں تم؟''

''کیا تم مجھ سے مل سکتے ہو؟'' فائقہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے دریافت کیا۔

''کیا ابھی؟''

''ہاں۔''

''کہاں؟''

''علامہ اقبال پارک میں آ جاؤ۔ میں وہیں آ رہی ہوں۔'' فائقہ نے جواباً کہا۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔ لیکن خیریت تو ہے نا؟'' احمر کے دماغ میں ہل چل مچی تھی۔ فائقہ نے اس کے سوالوں کے جواب دینے کے بجائے ملنے کا کہا تھا۔

''ملو گے تو بتاؤں گی۔'' فائقہ بولی۔ ''جلدی پہنچنے کی کرو۔''

کال کٹ گئی۔ احمر جلدی سے تیار ہو کر اپنی موٹر بائیک پر علامہ اقبال پارک کی طرف بڑھ گیا۔ اسے پارک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگے تھے۔ موٹر بائیک پارک کر کے وہ پارک میں داخل ہوا تو اسے ایک بینچ پر فائقہ بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ احمر اس کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تم پریشان دکھائی دے رہی ہو فائقہ۔ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟''

''ہاں، میں واقعی پریشان ہوں۔'' فائقہ نے احمر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ٹھٹک گیا۔

''بتاؤ، کیا پریشانی ہے۔ تم ڈیڑھ ہفتے سے کہاں غائب تھیں۔ فون کیوں بند کیا ہوا تھا۔'' احمر نے وہی سوال دہرائے جو وہ فون پر پوچھ چکا تھا جن کے جواب فائقہ نے نہیں دیے تھے۔ فائقہ نے سر جھکا لیا۔

''میری..... شادی ہو چکی ہے۔'' فائقہ کی مدھم، ٹھہری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اسے جیسے کرنٹ لگا ہو۔ کئی لمحے گومگو کی کیفیت میں گزر گئے۔ اسے یکدم چپ سی لگ گئی۔ جیسے وہ قوتِ گویائی سے محروم ہو گیا ہو۔ اسے واقعی شاک لگا تھا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ فائقہ کی اچانک شادی ہو سکتی ہے۔ وہ غیر یقینی سے فائقہ کو دیکھنے لگا جیسے اسے اس کی بات پر یقین نہ آ رہا ہو۔

''ک..... کک..... کیا کہہ رہی ہو۔ تمہاری شادی.....'' احمر غیر یقینی لہجے میں بولا۔ ''کت..... تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟''

فائقہ نے سر اٹھا کر احمر کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''یہ سچ ہے احمر۔ آئی ایم سوری، میں تمہیں بتانے ہی والی تھی کہ.....''

''کب ہوئی شادی؟'' احمر نے اس کی بات کاٹی۔

''ڈیڑھ ہفتہ پہلے۔''

''کس..... کے ساتھ؟''

''ڈیڈی کے دوست کے بیٹے کے ساتھ۔''

''فائقہ۔'' احمر دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''تم نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ تم تو مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ میں بھی تم سے محبت کرتا تھا۔ ہم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے، پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟ تم نے کیسے کسی اور سے شادی کر لی؟''

''میں تو اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں احمر۔'' فائقہ اس کے دکھ پر تڑپ کر بولی۔ ''بس..... میری مجبوری تھی۔''

''اونہہ مجبوری۔'' احمر نے طنز کیا۔ ''میری محبت سے زیادہ اہم تھی؟ تم جانتی ہو میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں اور.....''

''احمر! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''کیا سمجھنے کی کوشش کروں فائقہ۔'' احمر دلگرفتگی سے بولا۔ ''میرے ذہن میں تو اب صرف یہی بات آ رہی ہے کہ شاید..... میرا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے نہیں ہے اس لیے.....''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو احمر۔'' فائقہ نے اس کی بات کاٹی اور ناگواری سے بولی۔ ''میرے دل میں تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں کیوں تم سے محبت کرتی۔ بہرکیف، جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔''

''میری زندگی تو بے کیف ہو چکی ہے نا۔'' احمر نے کہا۔ ''بہرکیف، تم بتاؤ، تمہارا شوہر کیسا ہے۔ کیا تم اس کے ساتھ خوش ہو؟''

''نہیں۔ میں اس شادی سے خوش نہیں ہوں۔''

احمر چونکا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم اس کے ساتھ کیوں خوش نہیں ہو۔''

فائقہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''مجھے اپنے شوہر سے بالکل محبت نہیں ہے۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی جذبات نہیں ہیں۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔'' فائقہ کے لہجے میں نفرت کی رمق واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔

''تو پھر شادی کیوں کی؟''

''کہا نا، میری مجبوری تھی۔ ڈیڈی نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں اس شادی کے لیے راضی نہ ہوئی تو میں اُن کا مرا ہوا منہ دیکھوں گی۔ اسی لیے مجھے اس شادی کے لیے رضامند ہونا پڑا۔'' فائقہ نے بتایا تو احمر نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''یعنی تمہارے ڈیڈی نے تمہیں اموشنلی بلیک میل کیا تھا۔'' احمر نے کہا۔

''ہاں۔'' فائقہ نے جواباً کہا۔

''لیکن تم اپنے شوہر سے کیوں نفرت کرتی ہو۔ کیا وہ بہت بُرا ہے یا ہینڈسم اور خوبصورت نہیں ہے؟'' احمر کو اس کی نفرت والی بات کھٹک رہی تھی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ حسام ہینڈسم اور خوبصورت ہے۔'' فائقہ سچائی سے بولی۔

''تو مجھے کیوں بُلایا ہے تم نے۔ مجھ سے کیا چاہتی ہو'' ... احمر نے غصے سے کہا۔

''میں حسام سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔'' فائقہ بولی تو احمر چونک پڑا۔

''میں..... سمجھا نہیں۔''

''میں حسام سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔'' فائقہ نے اپنی بات دہرائی۔ ''میں نے تمہیں اس لیے یہاں بلایا ہے تاکہ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو۔''

احمر متحیر نظروں سے فائقہ کو دیکھنے لگا۔ تاہم اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ ''م..... م..... میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔ اوہ، نہیں تم یہ تو نہیں چاہتیں کہ میں اسے قتل کر دوں؟''

اُس کی بات پر فائقہ کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ پھر بولی۔ ''نہیں۔ اسے قتل نہیں کرنا۔''

''تو پھر.....''

''میرے دماغ میں ایک پلان ہے۔'' فائقہ شاطرانہ لہجے میں بولی۔ ''اس پلان میں تمہارا رول بہت اہم ہے اور اگر یہ پلان کامیاب ہوگیا تو سمجھو میری جان حسام سے چھوٹ جائے گی۔ یعنی سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔''

احمر نے حلق تر کیا اور بولا۔ ''پلان کیا ہے؟''

''غور سے سنو۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔'' فائقہ نے کہا اور پھر وہ اسے اپنے پلان سے آگاہ کرنے لگی۔ احمر جیسے سنتا جا رہا تھا اُس کے چہرے پر سناٹا چھاتا جا رہا تھا۔

''کیسا ہے میرا پلان؟'' آخر میں فائقہ نے مسرت بھری نظروں سے احمر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پلان تو اچھا ہے لیکن اگر تمہارے شوہر نے پولیس کو انوالو کرلیا تو.....'' احمر نے خدشہ ظاہر کیا۔

''وہ پولیس کو انوالو نہیں کرے گا۔'' فائقہ یقین سے بولی۔ ''وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اس کی عزت یوں سرِعام نیلام ہو۔''

''لیکن فرض کرو کہ اگر اس نے ایسا کیا تو؟''

''میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم بے فکر ہو جاؤ اور پلان پر عمل درآمد شروع کردو۔'' فائقہ نے کہا تو احمر نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

آفس سے نکلنے سے پہلے حسام نے فائقہ کو کال کی اور اسے تیار رہنے کا کہا تو اس نے پوچھا۔

''کیا کہیں جانا ہے؟''

''ہاں۔''

''کہاں؟''

''آج ہم لمبی ڈرائیو پر چلیں گے اور پھر ڈنر کسی ہوٹل میں کریں گے۔'' حسام محبت پاش لہجے میں بولا۔ ''تم تیار رہنا، میں آدھے گھنٹے تک گھر پہنچ رہا ہوں۔ پھر ہم نکل چلیں گے۔''

''حسام۔ میں..... نہیں جاسکوں گی۔'' فائقہ کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی تو وہ چونکا۔

''کیوں۔ کیا ہوا ہے؟''

''وہ..... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا ہے تمہاری طبیعت کو؟ آواز سے تو محسوس نہیں ہو رہا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔'' حسام نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو میری بات پر یقین نہیں آرہا۔ ٹھیک ہے، گھر آکر مجھے دیکھیں گے تو آپ کو یقین ہوگا۔ میری طبیعت واقعی خراب ہے یا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔'' فائقہ نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تو حسام نے چہرے پر مسکراہٹ

بکھیرتے ہوئے کہا۔

''ارے میرا مطلب تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ ناراض نہ ہو۔ مجھ سے تمہاری ناراضگی برداشت نہیں ہوتی۔'' حسام نے شوخ لہجے میں کہا۔

''میں فون رکھوں؟'' فائقہ نے پوچھا۔

''اوکے ڈیئر۔'' حسام نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور ہاں، ڈاکٹر کے پاس تو چلوگی نا؟''

''اب اتنی بھی طبیعت خراب نہیں ہے کہ ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔'' فائقہ نے کہا۔ ''میں نے ٹیبلٹ لے لی ہے، جلد ہی ٹھیک ہوجاؤں گی۔ اب میں فون رکھ رہی ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی فائقہ نے کال منقطع کردی تو حسام نے سیل فون ٹیبل پر رکھ کر ایک گہری سانس لی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

وہ فائقہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ شادی سے پہلے اس نے فائقہ کو ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ اس کے دل کو اچھی لگی تھی۔ پھر جب اسے یہ پتا چلا کہ وہ اس کے والد اخلاق حسین کے دوست شیراز علی کی بیٹی ہے تو وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوا۔ فائقہ اس کے حواس پر ایسی سوار ہوئی کہ حسام نے اسے شریکِ حیات بنانے کے لیے اپنے والدین سے بات کی۔ یوں چند ہی ہفتوں کے بعد اس کا رشتہ فائقہ سے ہوگیا اور پھر مقررہ تاریخ پر شادی بھی ہو گئی۔

حسام خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھتا تھا کیونکہ بچپن سے اب تک اس نے جو بھی چاہا تھا اسے مل گیا تھا۔ فائقہ سے شادی کے بعد تو وہ دل و جان سے اسے چاہنے لگا تھا لیکن وہ اس بات سے انجان تھا کہ فائقہ اس سے شادی سے خوش نہیں تھی۔ اس کے تو تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ڈیڈی اس سے پوچھنے بنا ہی اس کا رشتہ اپنے دوست کے بیٹے سے کردیں گے۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد حسام نے اپنا سیل فون کوٹ کی جیب میں رکھا اور کار کی چابی اٹھا کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ حسام نے چابی ٹیبل پر رکھی اور سیل فون نکال کر اسکرین کی طرف دیکھنے لگا جس پر ایک انجان نمبر چمک رہا تھا۔

حسام نے آنکھیں سکیڑیں اور سوچنے لگا کہ یہ کس کا نمبر ہوسکتا ہے۔ بہرکیف اس نے کال اٹینڈ کرلی اور بولا۔ ''ہیلو.....''

''کیا تم حسام بات کررہے ہو.....؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا تو حسام بے اختیار چونک پڑا۔ اسے کال کرنے والے کا اندازِ تخاطب عجیب لگا تھا۔

''ہاں، میں حسام ہی بول رہا ہوں۔ تم کون ہو اور کس سلسلے میں کال کی ہے؟'' حسام نے ناگوار لہجے میں کہا۔

''ہم۔'' کال کرنے والے نے پہلے ہنکاری بھری پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر حسام! میرا نام رئیس ہے اور مجھے..... تم سے..... تمہاری بیوی فائقہ کے حوالے سے بات کرنی ہے۔'' کال کرنے والے نے کہا تو حسام بے اختیار چونک پڑا۔

''کیا مطلب۔ کون ہو تم اور..... فائقہ کو کیسے جانتے ہو؟'' حسام نے تیز لہجے میں کہا۔

''دیکھو مسٹر حسام۔ میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا۔'' رئیس نے کہا۔ ''میں سیدھا مدعے پر آتا ہوں۔ میں فائقہ سے محبت کرتا ہوں اور..... اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن تم نے اس سے شادی کرلی۔''

''کیا بکواس کررہے ہو۔'' حسام غصے سے پھٹ پڑا۔

''میں بکواس نہیں کررہا۔'' رئیس نے اس کا غصہ نظر انداز کردیا۔ ''یہ سچ ہے۔ میں فائقہ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ میں چند ہفتوں کے لیے ملک سے باہر گیا تھا اور جب واپس آیا تو پتا چلا کہ فائقہ نے تم سے شادی کرلی ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں.....'' رئیس کا لہجہ جذباتی تھا۔ اتنا کہہ کر وہ رک گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

''تم فائقہ کو کیسے جانتے ہو؟'' حسام ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔

''وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی رہی ہے۔''

''کیا وہ..... بھی تمہیں جانتی ہے؟'' حسام نے بالآخر وہ بات پوچھ ہی لی جو کافی دیر سے اس کے دل میں تھی۔

''نہیں۔ وہ مجھے نہیں جانتی۔''

''کیا اسے معلوم ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو؟''

''نہیں۔ وہ میری محبت سے لاعلم ہے۔''

حسام کو ایسے لگا تھا جیسے وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ اسے اُس کی بات پر یقین ہی نہیں آیا۔ تاہم اس نے ضبط کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ہنکاری بھری اور پوچھا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اسے چھوڑ دو۔'' رئیس نے

انتہائی اطمینان سے کہا تو حسام کے دل و دماغ میں جیسے لاوا سا بھر گیا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ تم ہوش میں تو ہو؟''

''ہاں بالکل۔ میں ہوش میں ہوں۔'' رئیس نے نرم لہجے میں کہا۔ حسام کو اس پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ شخص اس کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اسے گولی مارنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگاتا۔

''دیکھو مسٹر رئیس۔ فائقہ میری بیوی، میری عزت ہے۔ اور اب اگر تم نے اپنی گندی زبان سے اس کا نام لینے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' حسام برانگیختگی سے بولا۔ غصے سے اس کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ حسام کال منقطع کرتا، رئیس کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''رکو، رکو۔ فون بند مت کرنا۔''

حسام نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''بکو۔ اب کیا بکنا چاہتے ہو؟''

''ویسے تمہارے اندر تمیز اور لحاظ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔'' رئیس نے اسے مزید تپانے کی خاطر کہا۔ ''خیر مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم فائقہ کو چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو کسی بھی نقصان کے تم خود ذمے دار ہوگے۔''

''شٹ اَپ۔ میں تمہاری دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔'' حسام نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اور رہی بات فائقہ کو چھوڑنے کی..... تو کان کھول کر سن لو۔ فائقہ میری بیوی ہے، میری عزت ہے اور میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔''

''میں تمہیں دو دن کی مہلت دے رہا ہوں۔'' رئیس بہ دستور اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''اچھی طرح سوچ لو، فائقہ کو تو میں کسی نہ کسی طرح حاصل کر لوں گا لیکن تمہیں دوسرے جہان جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ میں دو دن بعد کال کروں گا۔ گڈ بائے۔''

حسام کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رئیس نے کال منقطع کر دی تھی۔ حسام چند لمحے غصے کی حالت میں کھڑا رہا پھر اس نے سیل فون کوٹ کی جیب میں رکھا اور چابی اٹھا کر آفس سے نکل گیا۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے اُس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ یہ قول رئیس کے..... فائقہ اسے نہیں جانتی اور نہ ہی وہ اس کی محبت کے بارے میں آگاہ ہے۔ لیکن نہ جانے حسام کو ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ رئیس دروغ بیانی کر رہا تھا۔ اس کا دل یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ فائقہ، رئیس کو نہیں جانتی ہوگی اور نہ ہی وہ اس کی محبت کے بارے میں لاعلم ہوگی۔ دال میں کالا ضرور ہے۔ جیسے جیسے وہ سوچ رہا تھا وہ تجسّس کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

فائقہ اپنے کمرے میں بیڈ پر نیم دراز تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کی حسام سے بات ہوئی تھی۔ وہ اسے لانگ ڈرائیو اور ڈنر پر لے جانا چاہتا تھا لیکن اس نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جو شخص اسے اچھا نہیں لگتا تھا، جس سے اسے محبت نہیں تھی وہ اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا تھا اور حسام نے اسے دوبارہ جانے پر فورس نہیں کیا تھا۔

اس کا سیل فون دوسرے تکیے پر پڑا ہوا تھا۔ اسے احمر کی کال کا بھی انتظار تھا۔ احمر سے آج صبح ہی اس کی بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ آج حسام کو فون کرے گا اور جو بات چیت ہوگی وہ اسے آگاہ کر دے گا۔ جب اس کی حسام سے بات ہوئی تھی تو فائقہ نے اس کے لب و لہجے سے واضح محسوس کیا تھا کہ ابھی احمر نے اسے کال نہیں کی ہے۔

''پتا نہیں احمر، حسام کو کب کال کرے گا۔'' فائقہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ دفعتاً تکیے پر پڑے اس کے سیل فون کی بیل بج اٹھی تو اس نے بیزاری سے سیل فون کی طرف دیکھا۔ اسکرین پر احمر کالنگ جگ مگا رہا تھا۔ احمر کا نام پڑھتے ہی اس نے جلدی سے سیل فون اٹھایا اور کال اٹینڈ کر کے کان سے لگا لیا۔

''کیسی ہو فائقہ؟'' احمر کی آواز میں جوش تھا۔

''پہلے بتاؤ، تم نے حُسام کو کال کی؟'' فائقہ نے بے قراری سے پوچھا۔

''ہاں۔ میں نے کال کی تھی۔''

''کب.....؟''

''ابھی دو منٹ پہلے۔''

فائقہ تیزی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''اچھا۔ مجھے تفصیل بتاؤ۔'' وہ احمر سے تفصیل سننے کو بے چین و بے قرار تھی۔ پھر احمر اسے تفصیل بتانے لگا۔ جیسے جیسے وہ سنتی گئی اس کی آنکھوں میں چمک ابھرتی گئی۔ تفصیل بتانے کے بعد احمر نے کہا۔

''اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم نے اسے کیسے سنبھالنا ہے۔ خیال رہے وہ پولیس کو رپورٹ نہ کرے۔''

''تم بے فکر رہو، میں اسے سنبھال لوں گی۔'' فائقہ

نے تیقن سے کہا۔ ''میں اسے پولیس کو انوالو نہیں کرنے دوں گی۔''

''اوکے۔ میں فون رکھتا ہوں۔'' احمر نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' فائقہ بولی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''بات سنو احمر.....''

''ہاں بولو۔''

''کیا تم نے اسی نمبر سے حسام سے بات کی تھی جس نمبر سے اب بات کر رہے ہو؟''

''کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔'' احمر استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے نیو نمبر استعمال کیا تھا۔ وہ نمبر میرے ایک دوست کے نام ہے۔ اس لیے بے فکر رہو۔''

فائقہ نے ایک گہری سانس لی پھر خدا حافظ کہہ کر اس نے کال منقطع کر دی۔ سیل فون تکیے پر رکھ کر وہ دوبارہ نیم دراز ہو گئی اور کمبل سینے تک اوڑھ لیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے واقعی اس کی طبیعت خراب ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ جب حسام آ کر اسے دیکھے تو اسے اس کی بات سچ لگے۔

کچھ ہی دیر کے بعد حسام گھر آ گیا۔ فائقہ نے محسوس کیا کہ وہ بے حد سنجیدہ اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ فائقہ کو سلام کرنے کے بعد اس نے بیگ صوفے پر رکھا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ فائقہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ٹیبلٹ لے لی تھی تم نے؟'' حسام نے ٹائی اتار کر صوفے پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' فائقہ مختصراً بولی۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

''پہلے سے بہتر ہے۔''

''ہمم۔'' حسام نے ہنکاری بھری۔ وہ چند لمحے فائقہ کو بہ غور دیکھتا رہا جیسے وہ اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرنا چاہتا ہو۔ پھر وہ صوفے سے اٹھ کر واش روم.... چلا گیا۔

ڈائننگ ٹیبل پر بھی فائقہ نے محسوس کیا تھا کہ حسام کچھ الجھا ہوا، کھویا کھویا سا اور پریشان تھا۔ اس کے والدین نے بھی اس کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ اس کے والد نے پوچھا۔

''حسام! کیا کوئی پریشانی ہے؟ میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تم پریشان اور الجھے ہوئے ہو۔''

حسام چونکا۔ ''نہیں تو..... میں..... ٹھیک ہوں۔''

''ہمم۔'' اس کے والد نے ہنکاری بھری اور پھر سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔ کھانا کھانے کے بعد فائقہ اپنے کمرے میں چلی گئی تو تھوڑی دیر کے بعد حسام ٹیرس پر چلا گیا۔ رئیس کے کہے ہوئے الفاظ نے اسے اضطراب میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اسے فائقہ سے بات کرنی چاہیے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ فائقہ اس کی بات کا غلط مطلب لے اور اس پر برافروختہ ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فائقہ اس سے بدظن ہو۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا لیکن فائقہ کی بے رخی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو فائقہ ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی۔ حسام نے محسوس کیا کہ فائقہ کی طبیعت اب قدرے بہتر ہے اس لیے وہ اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ فائقہ نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز میوٹ کی اور بولی۔

''میں کافی دیر سے محسوس کر رہی ہوں، بلکہ ڈیڈی اور ممی نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے، آپ خاصے پریشان اور الجھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا آفس کی کوئی پرابلم ہے؟''

حسام چند لمحے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر سنجیدہ اور نرم لہجے میں بولا۔ ''ہاں، واقعی میں ایک پرابلم میں گھرا ہوا ہوں۔ آج مجھے ایک بات معلوم ہوئی ہے جس نے مجھے ڈسٹرب کر دیا ہے۔''

''کیا بات معلوم ہوئی ہے؟'' فائقہ نے انجان بن کر پوچھا۔

''کیا تم رئیس نامی کسی شخص کو جانتی ہو؟ جو تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا رہا ہو؟'' حسام نے سپاٹ لہجے میں پوچھا اور صراحت طلب نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

فائقہ یہ نام سن کر حیران ہونے کی اداکاری کرنے لگی۔ پھر وہ ناسمجھی کے انداز میں بولی۔ ''رئیس..... کون رئیس؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

حسام غور سے فائقہ کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ فائقہ کے لہجے سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ واقعی کسی رئیس نامی شخص کو نہیں جانتی۔ ورنہ یہ نام سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل جاتے۔

''جب میں آفس سے نکل رہا تھا تو کسی رئیس نامی شخص کا فون آیا تھا۔'' حسام تحمل سے بتانے لگا۔ ''اس نے کہا کہ..... وہ تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا رہا ہے۔ وہ تمہیں جانتا ہے اور تم بھی اسے جانتی ہو۔ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔۔ تم دونوں شادی کرنا

چاہتے تھے لیکن تمہاری شادی مجھ سے ہوگئی۔''

حسام نے کچھ باتیں گھما پھرا کر کہیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ فائقہ کا کیا ردِعمل سامنے آتا ہے۔ فائقہ بھی حسام کی باتوں پر دل ہی دل میں حیران رہ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ حسام نے اس کا ردِعمل دیکھنے کے لیے بڑھا چڑھا کر بات کہی ہے۔

''واٹ۔'' فائقہ نے اس کی بات کاٹی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا تھا۔ ''کون تھا وہ۔ میں تو اسے نہیں جانتی۔ یونیورسٹی میں تو کئی لڑکے میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ اب میں کس کس کا نام یاد رکھوں گی۔ رہی بات محبت کرنے کی، میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ کیا آپ نے اس کی بات پر یقین کرلیا ہے؟''

فائقہ کے جارحانہ انداز پر حسام سمجھ گیا کہ فائقہ واقعی رئیس نامی شخص کو نہیں جانتی۔

''نہیں۔ میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔'' حسام صراحت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے اسے اچھا خاصا جھاڑا تھا۔ لیکن وہ کوئی ڈھیٹ ہی ہے۔ اپنی بات پر اَڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے مطالبہ کررہا تھا کہ میں.....''

اتنا کہہ کر حسام خاموش ہوگیا کیونکہ یہ بات اچانک ہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فائقہ رئیس کا مطالبہ سُن کر پریشان ہو۔ فائقہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیسا مطالبہ۔ آپ چپ کیوں ہوگئے ہیں؟''

''چھوڑو کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' حسام نے ٹالنا چاہا۔

''نہیں آپ بتائیں۔ وہ کیا مطالبہ کررہا تھا۔ کیا وہ آپ سے پیسے مانگ رہا تھا؟'' فائقہ نے کہا۔

''نہیں، وہ پیسے نہیں مانگ رہا تھا۔'' حسام نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تو.....''

حسام نے چند لمحے تمہید باندھی۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اُس کا مطالبہ ہے کہ..... میں تمہیں چھوڑ دوں، یعنی طلاق دے دوں۔''

''واٹ؟'' فائقہ غیر یقینی نظروں سے حسام کو دیکھے گئی۔ ''تو آپ نے کیا جواب دیا؟ کہیں آپ اس کی بات مانتے ہوئے مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟''

اس کے لہجے میں معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ واقعی کمال کی اداکاری کررہی تھی۔ اس کے لہجے، انداز اور باتوں سے ذرا بھی شبہ نہیں ہوتا تھا۔ حسام دل ہی دل میں اس پر صدقے واری جارہا تھا۔

''کیا میں بے وقوف ہوں جو اس کا مطالبہ مانتے ہوئے تمہیں چھوڑ دوں۔'' حسام نے کہا اور پھر محبت پاش نظروں سے فائقہ کو دیکھتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''تم تو میری زندگی ہو، میری عزت ہو۔ میری شریکِ حیات ہو۔ میں تو تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ تم سے جدا ہونا مجھے سوہانِ روح لگتا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔''

فائقہ دل ہی دل میں حسام کو کوسنے لگی۔ اس کی قسم نے اسے اندر ہی اندر جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُسے اس کی باتوں سے گھن آرہی تھی لیکن اس وقت وہ اس کی باتیں سننے پر مجبور تھی لہٰذا ہونٹ بھینچے اداکاری کرتی رہی۔

''تھینک گاڈ۔'' وہ حسام کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ نے مجھے چھوڑ دیا تو میں مرجاؤں گی۔ پلیز، مجھے کبھی مت چھوڑیئے گا۔ میں بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا میری جان۔'' حسام اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا لیکن فائقہ ہونٹ بھینچے دل ہی دل میں اسے کوس رہی تھی۔

☆☆☆

دو روز گزر گئے۔ شام کے وقت حسام آفس سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوا تو اسے راستے میں ہی رئیس کا فون آگیا۔ حسام چند لمحے سیل فون کی اسکرین پر غور سے نمبر دیکھتا رہا پھر اس نے کال ڈسکنٹ کردی۔ سیل فون دوبارہ ڈیش بورڈ پر رکھ کر وہ توجہ سے ڈرائیونگ کرنے لگا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ سیل فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی۔

حسام نے کوفت بھری نظروں سے سیل فون کی اسکرین کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے کال اٹینڈ کرنے کے بجائے فون ہی آف کردیا۔ وہ جانتا تھا کہ رئیس پھر سے وہی بکواس بازی شروع کردے گا۔ اس نے اسے دو روز کی مہلت دی تھی اور دو روز گزر گئے تھے۔

وہ گھر پہنچا تو اسے فائقہ پورچ کی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ حواس باختہ دکھائی دے رہی تھی۔ حسام کار سے باہر نکل آیا۔

''کیا بات ہے بیگم صاحبہ، کس وجہ سے پریشان ہیں؟'' حسام نے خفیف سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کا فون کیوں بند تھا؟'' قریب پہنچتے ہی اس

نے پوچھا۔ ''میں کافی دیر سے آپ کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی لیکن.....''

''کیا کوئی مسئلہ ہوگیا ہے؟'' حسام چونکا۔

''نہیں۔'' فائقہ بولی۔ ''دراصل..... میرا دل برگر کھانے کو کر رہا تھا اس لیے میں آپ کو کال کر رہی تھی تاکہ آپ آفس سے واپسی پر لیتے آئیں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' حسام مسکرایا۔ ''میں ابھی جا کر لے آتا ہوں۔''

''نہیں رہنے دیں۔'' فائقہ جلدی سے بولی۔ ''آپ کل لے آیئے گا۔ میں کل کھالوں گی۔''

''اوکے۔'' حسام نے کہا۔ اس نے ڈیش بورڈ سے اپنا سیل فون اٹھایا اور پھر وہ فائقہ کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ان کی ماما اور ڈیڈی ڈرائنگ روم میں ہی موجود تھے۔ انہیں سلام کر کے وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ فائقہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر اُن دونوں کے پاس بیٹھنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ فائقہ بیڈ پر بیٹھی اپنے ناخن تراش رہی تھی۔ حسام نے اپنا سیل فون ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور فریش ہونے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ واپس آ کر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ حسام چونک پڑا۔

''میرا فون تو آف تھا۔'' وہ بولتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ فون اٹھا کر دیکھا تو رئیس کال کر رہا تھا۔ حسام نے فائقہ کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے۔ اس نے فائقہ سے دریافت کیا۔ ''کیا تم نے اسے آن کیا تھا؟''

فائقہ گڑبڑائی۔ ''نن..... نہیں۔ میں کیوں آن کروں گی۔ آپ آن کر کے بھول گئے ہوں گے۔''

''ہاں شاید۔'' حسام نے ہونٹ بھینچے۔

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور حسام کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔

''آپ فون سُن کیوں نہیں رہے۔ کس کی کال ہے؟'' فائقہ نے پوچھا۔

''اسی بدمعاش رئیس کی کال ہے۔'' حسام کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''اسی کمینے کی وجہ سے میں نے فون آف کیا تھا۔''

''اوہ۔'' فائقہ گھبرا کر بولی۔ اس کے ناخن تراشتے ہاتھ رک گئے تھے۔ ''وہ پھر کیوں فون کر رہا ہے؟''

''وہی بکواس بازی کرنا چاہتا ہوگا۔'' حسام مطمئن لہجے میں بولا۔ ''میں اس کی بکواس سننے کے موڈ میں نہیں ہوں اس لیے میں اس کی کال نہیں سنوں گا۔''

فون بج بج کر جب بند ہوگیا تو حسام نے اسے پھر آف کر دیا۔ جبکہ فائقہ ہونٹ بھینچے دوبارہ ناخن تراشنے میں مصروف ہوگئی۔ وہ دل ہی دل میں حسام کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی جس نے اپنا سیل فون آف کر دیا تھا۔ اسی نے احمر کو حسام کے گھر آنے کی اطلاع دی تھی۔ جب حسام واش روم میں گیا تھا تو اس نے جلدی سے اس کا سیل فون آن کر دیا تھا اور احمر کو میسج کر دیا تھا کہ وہ دس منٹ کے بعد کال کرے۔ احمر نے دس منٹ کے بعد ہی حسام کو کال کی تھی۔ لیکن حسام کے کال اٹینڈ نہ کرنے کی وجہ سے فائقہ پریشان ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ حسام اتنی جلدی ان کے جال میں پھنسنے والا نہیں ہے۔ وہ اتنی آسانی سے اسے نہیں چھوڑے گا اس لیے وہ ناخن تراشنے کے ساتھ ساتھ کوئی نئی ترکیب سوچ رہی تھی۔

''کن خیالوں میں گم ہیں بیگم صاحبہ۔'' اچانک اس کی سماعت سے چٹکی بجانے کی آواز کے ساتھ حسام کی آواز ٹکرائی تو وہ چونک پڑی۔ حسام بیڈ پر اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''ہوں..... ہاں۔'' وہ اُبھی۔ ''آپ نے کچھ کہا؟''

''ہاں۔''

''کیا کہا ہے؟'' فائقہ کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پریشان بھی ہو رہی تھی کہ کہیں حسام کو اس پر شک تو نہیں ہوگیا لیکن حسام کے رویے سے تو اسے بالکل بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ نارمل انداز میں پیش آ رہا تھا۔

''مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' حسام نے کہا۔

''ایک کپ چائے بنا دو۔''

''چائے ڈنر کے بعد نہیں پئیں گے؟'' فائقہ نے استفسار کیا۔

''ڈنر کے بعد بھی پی لوں گا۔'' حسام مسکرایا۔ ''لیکن مجھے ابھی طلب ہو رہی ہے۔''

''اچھا میں بنا لاتی ہوں۔''

فائقہ کچن میں آ گئی۔ وہ اپنا سیل فون ساتھ لانا نہیں بھولی تھی۔ کیتلی چولھے پر رکھنے کے بعد وہ احمر کو میسج کرنے لگی۔ اس نے میسج میں لکھا کہ حسام نے اپنا سیل فون آف کر دیا ہے اور اس کا اسے اوپن کرنے کا کوئی ارادہ دکھائی نہیں

دے رہا۔ جیسے ہی وہ فون آن کرے گا تو وہ اسے مطلع کر دے گی۔

احمر کو میسج بھیجنے کے بعد فائقہ نے ڈیلیٹ کر دیا تھا۔ وہ کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ جب وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو حسام ٹیرس پر موجود تھا۔ اسے چائے دینے کے بعد وہ ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ حسام کا سیل فون صوفے کی دوسری طرف رکھی میز پر پڑا تھا۔ فائقہ نے ایک نظر فون کی طرف دیکھا پھر وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ احمر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ بہ ظاہر وہ کتاب پڑھ رہا تھا لیکن اسے فائقہ کے میسج کا انتظار تھا۔ فائقہ نے اسے میسج کر کے بتایا تھا کہ جیسے ہی حسام کا سیل فون آن ہو گا تو وہ اسے میسج کر کے آگاہ کر دے گی اس لیے وہ ابھی نہ سوئے۔ لیکن رات کے گیارہ بجنے کے باوجود فائقہ کا میسج نہ آیا تو وہ سمجھ گیا کہ حسام نے ابھی تک اپنا سیل فون آن نہیں کیا۔ اسے نیند بھی زور سے آ رہی تھی۔ کتاب پڑھنے کے دوران وہ بار بار جمائیاں بھی لے رہا تھا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے جھنجلاتے ہوئے کتاب بند کر کے میز پر رکھی اور جمائی لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''فائقہ نے مجھے کن چکروں میں پھنسا دیا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

دراصل احمر، فائقہ کا اس لیے ساتھ دے رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ امیر باپ کی بیٹی ہے۔ اس سے شادی کرنے کا مطلب تھا کہ اسے فائقہ سے اچھی خاصی دولت ملے گی۔ یوں تو وہ روزانہ جاب کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا۔ اگر اس کی فائقہ سے شادی ہو جاتی ہے تو پھر اسے نوکری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ وہ فائقہ کے ڈیڈی یعنی اپنے ہونے والے سسر کے کاروبار پر قبضہ جما لے گا۔ اس طرح سب کچھ اسے بغیر محنت کے مل جائے گا۔

لمحہ بھر کے بعد احمر نے حسام کا نمبر پنچ کیا تو اسے اس کے فون کے سوئچ آف ہونے کی کمپیوٹرائزڈ آواز سنائی دی۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے سیل فون آف کر کے سائڈ پر رکھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ یہ اس کے پاس ایکسٹرا فون تھا جو اس نے ایک دوست سے کچھ عرصے کے لیے لیا تھا۔ البتہ اس کا اپنا فون آن تھا اور فائقہ اس کے نمبر پر کال یا میسج کرتی تھی۔ اسے جیسے ہی موقع ملے گا تو وہ اسے میسج کر دے گی۔ اس لیے احمر اطمینان سے سو گیا۔

صبح وہ نیند سے بیدار ہوا تو اس نے سب سے پہلے اپنا سیل فون دیکھا۔ فائقہ نے رات ڈیڑھ بجے اسے میسج کیا تھا۔ اس نے میسج اوپن کیا اور پڑھنے لگا۔ فائقہ نے لکھا تھا کہ میں تمہیں دوپہر میں فون کر کے آئندہ کے پلان کے بارے میں بتاؤں گی۔

احمر نے سیل فون میز پر رکھا اور کمرے سے نکل کر واش روم چلا گیا۔ دوپہر کے ایک بجے فائقہ کا فون آ گیا۔

''کہیں بزی تو نہیں ہو؟'' فائقہ نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''اوکے۔ علامہ اقبال پارک پہنچ جاؤ۔'' فائقہ نے کہا۔ ''میں بھی پہنچ رہی ہوں۔''

کال بند ہوتے ہی احمر علامہ اقبال پارک روانہ ہو گیا۔ فائقہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ سیاہ برقع میں تھی لیکن اس کے چلنے کے انداز سے واضح تھا کہ وہ بے حد مضطرب تھی۔ چند لمحوں کے بعد دونوں ایک بینچ پر فاصلے پر بیٹھ گئے تو احمر نے پوچھا۔

''تمہارا شوہر تو بڑا ہی ڈھیٹ ہے۔ میرے دھمکانے پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ شاید اس نے سمجھا ہو گا کہ اس کا کوئی دوست اس سے مذاق کر رہا ہے۔''

''ہاں، وہ واقعی عجیب قسم کا انسان ہے۔'' فائقہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''پھر، اب میں کیا کروں۔'' احمر نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میسج پر بتایا تھا کہ تمہارے ذہن میں کوئی نیا پلان ہے؟''

''ہاں۔'' فائقہ بولی۔ پھر اس نے احمر کو اپنے نئے پلان سے آگاہ کیا تو احمر کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات اُبھر آئے۔ جب فائقہ اپنی بات مکمل کر چکی تو وہ بولا۔

''اوہ۔ یہ تو بہت خطرناک پلان ہے۔''

''کوئی خطرناک نہیں ہے۔'' فائقہ منہ بنا کر بولی۔ ''اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو جیسا میں کہتی ہوں ویسا کرتے جاؤ ورنہ پھر ساری زندگی میرے عشق میں آنسو بہاتے رہنا۔''

''میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' احمر جلدی سے بولا۔ ''میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں فائقہ۔''

''تو پھر بہادری کا مظاہرہ کرو۔'' فائقہ بولی۔ ''مجھے بزدل مرد پسند نہیں ہیں۔''

''میں بزدلی نہیں دکھا رہا۔'' احمر نے کہا۔ ''بہرکیف تمہارے خیال میں ایسا کرنے سے حسام ڈر جائے گا۔''

''یقیناً۔ جب اسے جان خطرے میں دکھائی دے گی تو وہ یقیناً تمہاری بات مان لے گا۔'' فائقہ نے جواباً کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہتی ہو میں ویسا ہی کروں گا۔'' احمر مسکرایا۔ ''باقی تم کو... سنبھالنا ہے کہ وہ پولیس کو انوالو نہ کرے۔''

''وہ پولیس کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کی گارنٹی میں پہلے بھی دے چکی ہوں اور اب بھی دیتی ہوں۔'' فائقہ نے مطمئن انداز میں کہا تو احمر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

حسام آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد گھر جا رہا تھا۔ آج آفس میں بہت کام تھا۔ تھکاوٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ دو روز ہو گئے تھے لیکن رئیس نے دوبارہ اسے کال نہیں کی تھی۔ حسام کے خیال کے مطابق رئیس اس کے لب و لہجے سے سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کی دھونس میں آنے والا نہیں ہے اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی ہوگی۔

جس راستے سے حسام گھر جا رہا تھا وہ نسبتاً سنسان اور ویران راستہ تھا۔ اُس راستے پر قبرستان بھی تھا جہاں اس وقت اندھیرا آہستہ آہستہ ڈیرا ڈالتا جا رہا تھا۔ سردی کے موسم کی وجہ سے اِکا دُکا افراد ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی حسام قبرستان والی سڑک کے وسط میں ہی تھا کہ اچانک فائر کی آواز گونجی اور حسام کی کار کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ چونکہ حسام کار تیز رفتاری سے چلا رہا تھا اس لیے ٹائر کے برسٹ ہوتے ہی کار آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی۔ اس نے کار کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن تیز گی قسمت، کار ایک دھماکے سے قبرستان کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ کار کی فرنٹ سائڈ کا حشر ہو گیا اور ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی۔

حسام کی خوش بختی تھی کہ وہ اس حادثے میں محفوظ رہا تھا البتہ وہ معمولی زخمی ضرور ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر کانچ کے ٹکڑے لگے تھے۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا کہ معاً سائڈ سیٹ پر پڑے اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ حسام نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو رئیس کالنگ جگمگا رہا تھا۔

حسام چونک پڑا۔ اگلے ہی لمحے وہ جلدی سے کار سے باہر نکل آیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اسے یقین ہو کہ رئیس یہیں کہیں موجود ہے۔ سیل فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ پھر حسام نے دانت پیستے ہوئے کال اٹینڈ کی اور فون کان سے لگا لیا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''مسٹر حسام! یہ تو ابھی ٹریلر تھا۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو گولی تمہارے سر میں لگے گی اور تمہاری زندگی کا اینڈ ہو جائے گا۔'' دوسری طرف رئیس دھمکی آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔

''میں تمہاری بات کبھی نہیں مانوں گا۔'' حسام نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''تم اوچھے ہتھکنڈوں سے مجھے ڈرا نہیں سکتے اور نہ ہی مجھے مجبور کر سکتے ہو کہ میں تمہارا مطالبہ مان لوں۔ میں تم سے آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ اپنے مطالبے سے باز آ جاؤ ورنہ میں پولیس میں رپورٹ کروں گا۔ اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا ہوگا یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔''

''مجھے پولیس کی دھمکی دے رہے ہو؟'' رئیس تڑخا۔

''نہیں، سمجھا رہا ہوں۔''

''لیکن میں نہیں سمجھنے والا۔''

''پھر تم اپنا حشر بھی دیکھ لینا۔'' حسام نے سخت لہجے میں کہا۔

''دیکھو مسٹر حسام۔ تم مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہیں مار ڈالوں۔'' رئیس نے کہا۔ ''میں تمہیں تین دن کا مزید وقت دے رہا ہوں۔ اس کے بعد میں رعایت نہیں کروں گا۔''

''مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔'' حسام نے تیقن سے کہا۔ ''تم میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ اب دفع ہو جاؤ اور آئندہ مجھے کال نہ کرنا ورنہ.....''

اتنا کہہ کر حسام نے رابطہ منقطع کر دیا۔ سیل فون جیب میں رکھنے کے بعد وہ اپنی کار کا جائزہ لینے لگا۔ اللہ کو اس کی زندگی مقصود تھی اس لیے وہ مرنے سے بال بال بچا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ وہاں لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کسی نے پولیس کو کال کر دی تھی جو فوراً ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ انسپکٹر سعادت نے حسام سے پوچھا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ کس نے آپ کی کار پر گولی چلائی ہے؟''

حسام کا دل چاہا کہ وہ رئیس کا نام لے دے لیکن پھر وہ رک گیا۔ کیونکہ پولیس اس سے طرح طرح کے سوال شروع کر دے گی کہ..... رئیس کون ہے، کیا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے اس کی، فائقہ کی اور اس کے خاندان کی بدنامی ہوتی۔ میڈیا اس حوالے سے مرچ مسالا لگا کر خبر دیتا۔ اس لیے حسام نے کہا۔

''نہیں انسپکٹر صاحب۔ میں نہیں جانتا کہ میری کار پر کس نے گولی چلائی ہے۔''

''کیا آپ کی کسی سے کوئی دشمنی ہے؟''

''نہیں۔''

انسپکٹر سعادت نے چند اور بھی سوالات کیے اور ضروری کارروائی کر کے اپنی فورس کے ساتھ چلا گیا جبکہ حسام ایک آٹو رکشے میں سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

احمر نے حسام سے بات ہونے کے بعد فائقہ کو کال کر کے ساری بات بتا دی تھی۔ فائقہ تو حسام کی ہٹ دھرمی پر ناگن کی طرح بل کھا کر رہ گئی تھی۔ حسام تو کسی صورت بھی دھمکیوں سے نہیں ڈر رہا تھا۔ بلکہ وہ تو الٹا احمر کو دھمکا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فائقہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ ایسی کیا تدبیر کرے کہ اس کی حسام سے جان چھوٹ جائے۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی اسی ادھیڑ بُن میں مبتلا تھی کہ اس نے حسام کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی اور وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

فائقہ نے کھڑکی کے آگے پردہ برابر کیا اور خود صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد حسام کمرے میں آیا تو فائقہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اٹھی اور والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی۔

''حسام! آپ نے اپنی یہ کیسی حالت بنا رکھی ہے۔'' وہ پریشان کن لہجے میں بولی۔ ''کیا کچھ ہوا ہے؟''

''ہاں۔ اس کمینے کی وجہ سے آج ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔'' حسام نے غصیلے لہجے میں کہا اور صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔ فائقہ چونکی اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''کک..... کیا مطلب۔ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟'' وہ لہجے میں حیرت کا عنصر پیدا کرتے ہوئے بولی۔

''وہی کمینہ، رئیس۔'' حسام بہ دستور غصے میں تھا۔ ''میں جب دفتر سے گھر آ رہا تھا تو اس کمینے نے چھپ کر فائر کر کے میری کار کا ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ میں کار زیادہ رفتار سے نہیں چلا رہا تھا اور سڑک تقریباً سنسان تھی۔ ورنہ بہت بڑا حادثہ ہو سکتا تھا۔''

فائقہ کے چہرے پر بھی غصے کے تاثرات اُبھر آئے۔ وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ ''وہ کمینہ ہماری جان کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ کیا چاہتا ہے وہ آخر؟''

فائقہ کمال کی اداکاری کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے اداکاری کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔

''وہی۔ جو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں تمہیں آزاد کر دوں۔'' حسام نے رسان سے بتایا تو فائقہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''میں اسے شوٹ کر دوں گی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''اُسے شوٹ کر کے تم کیوں قاتل بننا چاہتی ہو۔'' حسام نے اسے مخمور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب ہم گندگی میں پتھر پھینکیں گے تو اس کے چھینٹے ہم پر بھی پڑیں گے۔ تم پریشان مت ہو، میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔''

فائقہ کا دل دھڑکا۔ ''کیا آپ پولیس میں رپورٹ کریں گے؟''

''بالکل۔'' حسام نے کندھے اچکائے۔ ''اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ آج اس نے میری کار کا ٹائر برسٹ کیا ہے، کل کلاں کو وہ مجھے بھی گولی مار سکتا ہے۔ اس لیے مجھے اس کے خلاف حرکت میں آنا ہی پڑے گا۔''

تعاقب

''عورت اور مرد کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟''

''غالباً ایک گھومنے والے دروازے پر تبھی سے دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

حساب

مس جینئس ایک دیہاتی عورت کو حساب کتاب سمجھا رہی تھی۔ ''دیکھو، اگر تمہارے پاس دس روپے ہوں اور تم اپنے شوہر سے دس روپے اور مانگو تو تمہارے پاس کل کتنے روپے ہو جائیں گے؟''

دیہاتی عورت نے کہا۔ ''پانچ روپے۔''

''نہیں بھئی، خوب سوچ سمجھ کر بتاؤ۔''

دیہاتی عورت نے دیر تک سوچنے کے بعد ہنس کر کہا۔ ''کچھ بھی نہیں۔''

''اُف!'' مس جینئس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''تم حساب بالکل ہی نہیں جانتیں۔''

دیہاتی عورت بولی۔ ''اور مس صاحبہ! آپ بھی میرے شوہر کو بالکل نہیں جانتیں۔''

کوٹری سے سونیا کا جواب

''اس طرح پھر میری بھی بدنامی ہوگی۔'' فائقہ نے خدشے کا اظہار کیا۔ ''میڈیا اس کمینے کو میرے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''تم پریشان مت ہو، کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' حسام نے اسے تسلی دی۔ ''میں سب سنبھال لوں گا۔ ڈونٹ وری۔''

''آپ کیسے سنبھال لیں گے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' حسام نے سکون بھرے لہجے میں کہا اور پھر وہ اٹھ کر واش روم..... چلا گیا جبکہ فائقہ انگاروں پر لوٹنے لگی۔ یہ خوف اس کے دامن گیر ہوگیا تھا کہ اگر واقعی حسام پولیس کے پاس چلا گیا تو پھر پولیس کسی نہ کسی طرح احمر کو ڈھونڈ نکالے گی۔ پھر اس کا کھیل عیاں ہونے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگے گا اور وہ حسام کی نظروں سے بھی گر جائے گی۔ یہاں تک کہ اس کے خاندان میں اس کی عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔

وہ صوفے سے اٹھی اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ حسام کو کیسے روکے۔ کیا جواز پیش کرے کہ وہ پولیس کو رپورٹ کرنے سے باز آجائے۔

''میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' بالآخر وہ جھنجھلا گئی اور صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی لیکن اس کا ذہن منتشر تھا۔ اسی منتشر ذہن کے ساتھ اس نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو حسام اسے طلاق دے دے یا پھر وہ احمر سے کہے گی کہ وہ حسام کا قصہ ہی تمام کردے۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بجے جب وہ دونوں سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں آئے تو فائقہ نے کہا۔

''حسام! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے؟''

حسام نے چونک کر سنجیدہ چہرے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں بولو۔''

فائقہ لمحہ بھر خاموش رہی پھر سنجیدگی سے بولی۔ ''مجھے..... طلاق چاہیے۔''

حسام یکدم چونک پڑا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر حیرت کے تاثرات اُبھر آئے۔

''کیا..... کیا کہہ رہی ہو فائقہ؟'' حسام ہکا بکا نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ''تم ہوش میں تو ہو؟''

''میں ہوش میں ہی ہوں حسام۔'' فائقہ اس کی آنکھوں میں بہ غور دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے لیے آپ کی زندگی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی میری وجہ سے وہ کمینہ رئیس آپ کو کوئی نقصان پہنچا دے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں آپ کی زندگی سے نکل جاؤں۔''

حسام گہری نظروں سے فائقہ کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا جیسے وہ اس کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کررہا ہو۔

''تو کیا تم..... رئیس سے شادی کرلوگی؟''

فائقہ سٹپٹائی۔ اس نے خود پر قابو پایا۔ اس لمحے وہ کسی طور خود کو حسام کی نظروں میں مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ لہجے میں ناگواریت لاتے ہوئے بولی۔

''نہیں..... میں کیوں اس سے شادی کروں گی؟''

''تو پھر طلاق کیوں لینا چاہتی ہو؟''

''آپ کو وجہ بتائی تو ہے۔'' فائقہ نے جواب دیا۔ ''وہ کمینہ آپ کی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ آج اس نے آپ کی کار کا ٹائر برسٹ کیا ہے، کل کلاں کو وہ..... آپ کو بھی مار سکتا ہے۔ ایسے میں اس کا یہی حل ہے کہ آپ مجھے آزاد کر دیں۔ آپ مجھے چھوڑ دیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو پھر کبھی تنگ نہیں کرے گا۔''

''تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟'' حسام جانچتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے، اس کمینے کا مطالبہ بھی تو یہی ہے۔''

''مطلب، تم ہمت ہار رہی ہو۔''

''نہیں۔ میں ہمت نہیں ہار رہی بلکہ آپ کی جان بچانا چاہ رہی ہوں۔'' فائقہ نے کہا اور پھر اس نے حسام کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''پلیز حسام! اس کا یہی حل ہے۔''

''سوری۔ میں تمہارا مطالبہ نہیں مان سکتا۔'' حسام نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''اور آئندہ اس ٹاپک پر بات نہ کرنا۔ رہی کمینے رئیس کی بات تو..... میں اس کا بندوبست کرلوں گا۔ ایس پی نور محمد میرے دوست کا کلاس فیلو ہے۔ میں کل اس سے مل کر بات کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ کمینہ جلد ہی پولیس کی حراست میں ہوگا۔ چلو اب سو جاؤ۔ مجھے نیند آرہی ہے۔''

اتنا کہنے کے بعد حسام نے سائڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کو آف کیا اور بیڈ پر لیٹ کر کروٹ بدل لی جبکہ فائقہ ناگوار نظروں سے اس کی پشت کو گھورنے لگی۔ وہ واقعی ہٹ دھرم ثابت ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے حسام۔ ایسے نہ تو پھر ویسے ہی سہی۔ میں چاہتی تھی کہ تمہیں کچھ نہ ہو لیکن جب تمہیں ہی اپنی جان کی

پروا نہیں ہے تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ دل ہی دل میں حسام سے مخاطب ہوئی لیکن حسام اس کے خیالات اور سازش سے بے پروا تھا۔

فائقہ نے سائڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کو آف کیا اور وہ بھی بیڈ پر لیٹ گئی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب اسے کل احمر سے مل کر اپنے نئے پلان سے آگاہ کرنا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ فائقہ اور احمر دونوں حسب معمول علامہ اقبال پارک میں موجود تھے۔ احمر نے جب فائقہ کا نیا پلان سنا تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ فائقہ ایسا خطرناک منصوبہ بنا سکتی ہے۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں تھرتھراہٹ شامل تھی۔

''یہ..... یہ کیا کہہ رہی ہو فائقہ؟''

''اس کے علاوہ حسام سے چھٹکارے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔'' فائقہ سفاکیت سے بولی۔ ''ویسے بھی روز نجانے کتنے لوگ اندھی گولیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر حسام بھی ہو جائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔''

''لیکن.....'' احمر کہتے کہتے رکا۔

''لیکن کیا؟'' فائقہ نے اسے مضطرب الحال دیکھا تو فوراً بولی۔

''میں..... میں ایسا نہیں کر سکتا فائقہ۔'' احمر خشک حلق تر کرتے ہوئے بولا۔ فائقہ کی بھویں تن گئیں۔ ''میں قاتل نہیں بننا چاہتا۔ پلیز، مجھے ایسا کرنے پر مت اکساؤ۔''

فائقہ کو احمر کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سخت ہو گئے۔ وہ نروٹھے پن سے بولی۔ ''کیا تم مجھے حاصل نہیں کرنا چاہتے؟''

''حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن..... لیکن کسی کی جان لے کر نہیں۔'' احمر نے سنجیدگی اور ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

فائقہ چند لمحے پُرغور نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ عین اسی لمحے اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے پرس سے فون نکال کر دیکھا تو ''حسام کالنگ'' جگمگا رہا تھا۔ حسام کا نام دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات نفرت میں بدل گئے۔ اس نے ایک بٹن دبا دیا تو گھنٹی بجنا بند ہو گئی۔ پھر وہ احمر کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولی۔

''احمر! اگر تم حسام کو ہلاک نہیں کر سکتے تو پھر تم مجھے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میں نے حسام سے کہا تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے طلاق دے دے لیکن..... وہ تو کوئی ڈھیٹ قسم کا انسان نکلا ہے۔ وہ مجھے طلاق دینے پر بھی راضی نہیں ہے اور اسے اپنی موت کا بھی خوف نہیں ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ کیسے اس سے چھٹکارا پاؤں؟ جانتے ہو میں کتنی اذیت میں مبتلا ہوں۔ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں جسے میں پسند ہی نہیں کرتی۔ سوچو ذرا، اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟''

فائقہ کے لہجے میں تلخی بھی شامل ہو گئی تھی۔ احمر سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا اسے فائقہ کی بات ماننی چاہیے۔

''بولو۔ اب خاموش کیوں ہو؟'' فائقہ کی آواز اسے اپنے کانوں سے ٹکراتی محسوس ہوئی۔

''میں سمجھ سکتا ہوں لیکن.....'' احمر کہتے کہتے رکا۔

''لیکن..... لیکن کیا؟'' فائقہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''اگر تم یہ کام نہیں کر سکتے تو ٹھیک ہے۔ آج سے ہم اپنی راہیں جدا کر لیتے ہیں۔ تم اپنا راستہ لو، میں اپنا راستہ لیتی ہوں۔''

فائقہ کے فیصلہ کن لہجے پر احمر گھبرا گیا۔ وہ کسی صورت فائقہ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی ناراضی کی صورت میں احمر کو فائقہ کی دولت جاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو وہ کسی صورت نہیں چاہتا تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو فائقہ؟''

''کیا غلط کہہ رہی ہوں؟'' فائقہ نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھے سوچنے کے لیے تھوڑا وقت دو۔''

''سوچنے کا بالکل وقت نہیں ہے۔'' فائقہ نے کہا۔

''لیکن جلد بازی میں کام بگڑ بھی سکتا ہے۔'' احمر نے اسے سمجھایا۔ ''اس لیے ہمیں سوچ سمجھ کر یہ کام کرنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سوچتے رہو، میں جا رہی ہوں۔'' فائقہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں بہ دستور تلخی تھی۔ ''آئندہ مجھے کال کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''

وہ جانے لگی تو احمر نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''اچھا یار، تم ناراض تو نہ ہو۔ تم جیسا کہو گی میں ویسا ہی کروں گا۔ اب تو مسکرا دو۔''

فائقہ چند لمحے تیکھی نظروں سے احمر کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''یہ کام ایک، دو روز میں ہو جانا چاہیے۔'' فائقہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہمم۔'' احمر نے ہنکاری بھری اور بادلِ ناخواستہ ہونٹ بھینچ لیے۔

''تم پریشان مت ہو، اس کام کے عوض میں تمہیں پیسے بھی دوں گی۔'' فائقہ نے کہا تو پیسوں کا سن کر احمر کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ فائقہ نے بھی اس کی آنکھوں میں ابھرتی چمک دیکھ لی تھی۔ وہ سمجھی تھی کہ احمر کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کی چمک ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کے دل میں چور تھا۔ اسے بھی فائقہ سے نہیں، اُس کی دولت سے دلچسپی تھی۔ تاہم وہ ناراض لہجے میں بولا۔

''فائقہ! کیا تم مجھے گھٹیا انسان سمجھتی ہو۔ کیا میں پیسوں کے عوض یہ کام کروں گا؟''

''میں اپنی خوشی سے پیسے دے رہی ہوں۔'' فائقہ مسکرائی۔ پھر اس نے اپنے پرس میں سے خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکال کر احمر کی طرف بڑھایا۔ احمر نے استفہامیہ نظروں سے لفافے کی طرف دیکھا۔

''یہ پانچ لاکھ روپے ہیں، رکھ لو۔'' فائقہ محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''حسام کے قتل کے بعد تم کوئی اچھا سا کاروبار کر لینا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔''

احمر چونک پڑا۔ بہ ظاہر وہ چہرے پر حیرت کے تاثرات لایا لیکن اندر ہی اندر بے حد خوش تھا۔ پانچ لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اس رقم سے وہ کوئی بھی اچھا سا کاروبار کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا، فائقہ سے شادی کے بعد بھی اسے بہت کچھ ملے گا۔

''لیکن فائقہ، میرا مقصد پیسے حاصل کرنا نہیں ہے۔'' احمر نے دکھاوے کے لیے کہا۔ ''میں تو صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے تمہاری دولت سے مطلب نہیں ہے۔''

''جانتی ہوں۔'' فائقہ بولی۔ ''محبت کے ساتھ ساتھ پیسے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہی نہیں ہوں گے تو تم کاروبار کیسے کر سکو گے۔ اب لفافہ لیتے ہو یا نہیں۔ میرا تو ہاتھ ہی تھک گیا ہے۔''

احمر نے جھجکتے ہوئے اس سے لفافہ لے لیا۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ وہ چند لمحے لفافے کو دیکھتا رہا پھر اس نے اسے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

''یعنی تم پیسے دے کر مجھے پیشہ ور قاتل بنانا چاہتی ہو۔'' احمر نے شوخ لہجے میں کہا۔ اس نے گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدل لیا تھا۔ فائقہ اس کی بات سُن کر مسکرائی۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' فائقہ نے بھی شوخ لہجے میں جواب دیا تو دونوں ہی قہقہے مار کر ہنس پڑے۔

پھر احمر نے کینٹین پر موجود ایک لڑکے کو بلا کر کولڈ ڈرنکس منگوائیں اور باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں کولڈ ڈرنک پینے لگے۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ احمر اپنے بستر پر نیم دراز لفافے میں سے ہزار، ہزار کی دو گڈیاں نکالے انہیں دیکھنے میں مصروف تھا۔ باقی تین گڈیاں خاکی لفافے میں موجود تھیں۔ اتنے سارے پیسے دیکھ کر احمر کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھر آئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فائقہ اسے حسام کے قتل کے بدلے پانچ لاکھ روپے دے سکتی ہے۔

وہ چند لمحے نوٹوں کی گڈیوں کو غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے دونوں گڈیاں خاکی لفافے میں رکھیں اور انہیں الماری میں چھپا کر نائٹ بلب جلایا اور بستر پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کے حواسوں پر حسام چھایا ہوا تھا جسے اس نے کل قتل کرنا تھا۔ وہ حسام کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن فائقہ کے مسلسل اکسانے اور محبت جتانے پر بالآخر وہ رضامند ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خدشات بھی تھے۔ اس کے پاس جو ریوالور تھا وہ اس کے دوست کا اور لائسنس یافتہ تھا۔ اس نے اپنے دوست سے یہ جھوٹ بول کر ریوالور مانگا تھا کہ وہ اپنی تصویریں بنوا کر فیس بک پر رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دوست نے اسے انکار نہیں کیا تھا۔

احمر کو یہی لگتا تھا کہ حسام کے قتل کے بعد پولیس اسے نہیں پکڑ سکے گی۔ وہ اس انداز میں حسام کو قتل کرے گا کہ پولیس اسے ڈکیتی سمجھے گی اور وہ صاف بچ جائے گا۔ پھر فائقہ کی عدت کے بعد وہ اس سے شادی کر لے گا اور یوں نہ صرف فائقہ کی جان حسام سے چھوٹ جائے گی بلکہ فائقہ کی دولت بھی اس کے حصے میں آ جائے گی۔

کافی دیر سوچتے رہنے کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو وہ سو گیا۔

اگلے روز شام کے ساڑھے پانچ بجے اس کے سیل فون پر فائقہ کی کال آ گئی۔ ''کیا تم تیار ہو احمر؟''

''ہاں۔ میں تیار ہوں۔''

''اوکے۔ اب غور سے سنو۔'' فائقہ مطمئن انداز میں بولی۔ ''آج رات آٹھ بجے ہم حسام کے کزن کی منگنی پر جا رہے ہیں۔ میں تمہیں اس گھر کی لوکیشن بھیج رہی ہوں۔ جب ہم فنکشن اٹینڈ کرنے کے بعد گھر کے لیے نکلنے لگیں گے تو میں تمہیں میسج کے ذریعے بتادوں گی پھر تم اپنا کام کرنے پہنچ جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' احمر نے جواباً کہا۔

''اور ہاں، آج میری حسام سے جان چھوٹ جانی چاہیے۔'' فائقہ نے جیسے یاد دلایا۔

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔''

''کوشش نہیں، کامیابی چاہیے۔'' فائقہ بضد بولی۔ ''اب میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں ہی کوئی غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاؤں۔''

اتنا کہنے کے ساتھ ہی فائقہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ احمر سیل فون جیب میں رکھ کر بستر پر لیٹ گیا۔ ٹھیک رات کے ساڑھے گیارہ بجے اسے فائقہ کی طرف سے ایک میسج موصول ہوا جس میں اس نے بتایا تھا کہ وہ فنکشن سے واپسی کی تیاری کر رہے ہیں اور وہ فوراً مطلوبہ جگہ پر پہنچ جائے۔ ساتھ ہی اس نے حسام کے کزن کے گھر کے اطراف کی لوکیشن بھی بھیج دی تھی۔

احمر نے ریوالور اپنی پشت کی طرف پتلون میں اڑسا اور پھر وہ اپنی موٹر بائیک لے کر اسی طرف روانہ ہو گیا جس کی لوکیشن فائقہ نے اسے بھیجی تھی۔ اسے مطلوبہ علاقے میں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگے تھے۔ وہ کافی بڑی کالونی تھی اور ایک کوٹھی کے باہر چند کاروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ احمر نے موٹر بائیک تاریک گوشے میں کھڑی کی اور کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔

موسم سرد تھا اس لیے احمر نے ایک بڑے مفلر سے اپنا چہرہ ڈھانپا ہوا تھا۔ اس حلیے میں اس کا پہچانا جانا قدرے مشکل تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ احمر کو حسام اور فائقہ کوٹھی سے نکلتے دکھائی دیے۔ حسام نے فائقہ کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور وہ ایک کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی کار لائن میں تیسرے نمبر پر کھڑی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ان کی کار انہیں لے کر سڑک پر دوڑنے لگی تو احمر اس کار کا تعاقب کرنے لگا۔

سرد موسم کی وجہ سے وہ سڑک سنسان اور ویران تھی۔ دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہ دے رہا تھا۔ کہیں کہیں کھمبوں پر لگے مرکری بلب پیلی روشنی بکھیرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ پھر جب کار بالکل سنسان راستے پر پہنچی تو احمر نے موٹر بائیک کی اسپیڈ بڑھائی اور کار سے آگے نکل گیا۔ کار سے آگے نکلتے وقت اس نے حسام اور فائقہ کو دیکھ لیا تھا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے موٹر بائیک روک دی اور نیچے اتر کر اس نے ریوالور نکالا اور کار کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ حسام نے کار اس سے کچھ فاصلے پر روک دی اور باہر نکل آیا۔ فائقہ بھی کار سے باہر آ گئی تھی۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' حسام نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''رئیس۔''

''اوہ! اچھا یہ تم ہو۔'' حسام نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''مسٹر حسام! میں نے تمہیں تین دن کی مہلت دی تھی لیکن تم تین دن گزرنے کے باوجود میری بات کو خاطر میں نہیں لائے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم مرنا چاہتے ہو سو اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' احمر نے سانپ کے مانند پھنکارتے ہوئے کہا تو حسام نے ہونٹ بھینچ لیے۔ فائقہ بھی ہراساں ہونے کی اداکاری کرنے لگی۔

''نہیں..... رک جاؤ۔ پلیز رک جاؤ۔ انہیں کچھ مت کہنا۔'' فائقہ نے جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''فائقہ! تم پیچھے رہو۔'' حسام نے اسے ڈپٹا۔

''کون ہو تم اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟'' فائقہ، حسام کی بات کسی خاطر میں نہ لائی اور احمر سے مخاطب ہوئی۔

''کیا تمہارے شوہر نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟'' احمر کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بہترین اداکاری کر رہے تھے۔

''نن..... نہیں۔''

''حیرت ہے۔'' احمر حیران ہوا۔ پھر وہ حسام سے بولا۔ ''مسٹر حسام! تم نے اپنی بیوی کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

حسام ہونٹ بھینچے خاموش کھڑا رہا۔

''چلو، کوئی بات نہیں۔ تمہارے مرنے کے بعد میں اسے سب کچھ بتا دوں گا۔'' احمر نے اتنا کہنے کے بعد ریوالور کا رخ حسام کی طرف کر دیا۔

''نہیں۔ رک جاؤ۔'' فائقہ چلائی۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ احمر نے اسے ڈرانے کی خاطر ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ عین اسی لمحے موقع کی

تاک میں کھڑے حسام نے تیزی سے آگے بڑھ کر احمر کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ یہ اتنا اچانک ہوا تھا کہ احمر کو سوچنے اور سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ البتہ جھٹکا لگنے کی وجہ سے ریوالور احمر کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر جا گرا تھا۔ اس سے قبل کہ احمر سنبھل پاتا، حسام نے اس کے منہ پر زوردار مکا جڑ دیا۔

احمر کے حلق سے کراہ نکلی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے حسام کو ایک غلیظ گالی دی اور اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا ہی تھا کہ حسام نے تیزی سے جھکائی دیتے ہوئے اس کے پیٹ میں یکے بعد دیگرے تین مکے جڑ دیے۔ اب تو احمر بے حال ہو گیا۔ لیکن پھر اس نے اپنے اندر ہمت مجتمع کی اور حسام کے پیٹ میں مکا مار دیا۔ پھر وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو مارنے لگے اور لڑتے لڑتے وہ دونوں ہی سڑک پر گر کر گتھم گتھا ہو گئے۔ فائقہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر سڑک پر پڑا ریوالور اٹھایا اور اس کا رخ اُن دونوں کی طرف کر دیا۔

''رک جاؤ حسام۔'' فائقہ کسی ناگن کی طرح پھنکاری تو حسام، جو احمر کے منہ پر مکا مارنے ہی والا تھا کہ اس کا ہاتھ فضا میں رک گیا۔ اس نے فائقہ کی طرف دیکھا۔

''فائقہ۔'' حسام کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔

''احمر تو تمہیں مار نہیں سکا لیکن میں تمہیں مار دوں گی۔'' فائقہ کے لہجے میں سفاکی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو فائقہ؟'' حسام کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' فائقہ زہرخند لہجے میں بولی۔ ''میں تمہیں مار دوں گی کیونکہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں احمر کو پسند کرتی تھی اور اس سے ہی شادی کرنا چاہتی تھی لیکن......''

''احمر......'' حسام نے اس کی بات کاٹی۔ ''کون احمر۔''

''یہی۔ یہ احمر ہے۔'' فائقہ نے احمر کی طرف اشارہ کیا۔ حسام نے ہونٹ بھینچتے ہوئے احمر کی طرف دیکھا۔ فائقہ مزید بولی۔ ''ہم دونوں نے مل کر یہ کھیل، کھیلا تھا۔ اِس نے رئیس بن کر تمہیں ڈرانے دھمکانے اور مجھے طلاق دینے کا کہا تھا لیکن تم نے اس کی بات نہیں مانی۔ بالآخر ہم نے تمہیں ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا۔ تمہارے مرنے کے بعد ہم دونوں شادی کر لیں گے۔''

حسام پُرغور نظروں سے فائقہ کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ اس دوران احمر بھی کراہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے فائقہ نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ کانپتے ہاتھوں کی وجہ سے نتیجہ یہ نکلا کہ گولی حسام کو لگنے کے بجائے احمر کے سینے میں پیوست ہو گئی اور وہ دلخراش چیخ مار کر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح سڑک پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں جیسے اسے یقین ہی نہ ہو کہ فائقہ، حسام کے بجائے اسے گولی مار سکتی ہے حالانکہ فائقہ حسام کو ہی گولی مار رہی تھی لیکن کانپتے ہاتھوں کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔

فائقہ غیر یقینی نظروں سے سڑک پر تڑپتے احمر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی عقل خبط ہو گئی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر گیا۔

''نن...... نہیں...... نہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ پھر وہ لپک کر احمر کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

''احمر...... احمر...... یہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے۔ احمر......''

وہ ہذیانی انداز میں احمر کو پکار رہی تھی لیکن احمر کی روح چند سیکنڈ پہلے ہی جسم سے پرواز کر گئی تھی۔ اب اس کا خاک کا بنا ہوا جسم موجود تھا۔ اس دوران حسام نے ایس پی نور محمد کو کال کر دی تھی جس کی ہدایت پر پولیس پندرہ منٹ کے اندر جائے وقوع پر پہنچ گئی تھی۔

فائقہ کو لیڈیز پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس میں حسام سے نظریں ملانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ حسام نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''فائقہ! تم نے شادی شدہ ہونے کے باوجود ایک غیر مرد کی محبت پانے کے لیے جو کھیل کھیلا تھا تم اس میں کامیاب تو نہیں ہو سکیں لیکن میری نظر میں اب تمہاری کوئی حیثیت نہیں رہی۔ طلاق کے کاغذات جیل میں پہنچ جائیں گے۔''

فائقہ نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی حسام کی منتیں کیں۔ وہ چپ چاپ پولیس موبائل میں بیٹھی وہاں سے روانہ ہو گئی جبکہ حسام کے چہرے پر دکھ کے گہرے تاثرات تھے۔

انسان سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے۔ یہی کچھ فائقہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے سوچا کیا تھا اور ہو کیا گیا تھا۔ اسے اپنے ہی کھیل میں شکستِ فاش ہوئی تھی۔

❖❖❖

اعتراف

فرحت جبین

دولت کا حصول اور بدلے کی آگ جسم و جاں کو جُھلسا کر رکھ دیتی ہے... ایک حُسن کی دیوی اور اُس کے دیوانے کا سنسنی خیز ملاپ...

ایک ہی تیر سے دو شکار کرنے والے شکاری کا کھیل.....

کمرے کی خنکی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے اس نے ابھی چند لمحے قبل ہی سارے سے کہہ کر اے سی بند کروایا تھا اور جاتے جاتے اپنی ٹانگوں پر کھیس اوڑھا دینے کا کہا تھا۔ سارے یہ کھیس اوڑھا کر کمرے کی لائٹ بند کر کے، نائٹ بلب جلا کر دروازہ بھیڑ گئی تھی۔ وہ اکیلا کمرے کے وسط میں بچھے جہازی سائز کے بستر پر لیٹا تھا۔ یہ اکیلا پن اب جیسے اس کا مقدر بن گیا تھا۔ پلکوں ... کی باڑھ پھلانگ کر کئی منظر لہرانے لگے تھے۔ وہ جب جب اکیلا ہوتا یہی یادیں اسے ستاتی تھیں۔

''آج مجھے سیرین کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس سے بات کرنا چاہیے۔ آخر کب تک اس گناہ کا بوجھ اٹھائے میں زندہ رہوں گا؟''

وہ ساٹھ کی دہائی میں داخل ہو رہا تھا اور پچھلے دس سال سے ... بستر سے لگا پڑا تھا۔ مزید وہ کتنا جی لیتا بھلا۔ بہت سی اَن کہی باتیں بتانا اب ضروری ہو چکا تھا۔ ابھی آج ہی کہہ دینا چاہتا تھا۔

اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا جو رات کے گیارہ بجا رہی تھی۔ اب تک وہ لوٹ آتی تھی نہ جانے آج ہی اتنا وقت کیوں ہو گیا تھا۔

سوا بارہ ہونے کو تھے کہ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ بلیک آف شولڈر ٹاپ اور ٹائٹ جینز پہنے، بالوں کو جوڑے کی شکل دیے، گہرے میک اپ میں وہ کسی اپسرا سے کم نہ لگ رہی تھی۔ وقت نے اس پر جیسے اپنا کوئی اثر چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ویسی ہی حسین تھی جیسے اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ بس معمولی سا فرق یہ آیا تھا کہ دس سال پہلے اس کے چہرے پر ایک معصومیت تھی جو اَب مفقود تھی۔

''تم اب تک سوئے نہیں ہو؟'' عمروں کے واضح فرق کے باوجود وہ اسے 'تم' کہہ کر ہی مخاطب کرتی تھی۔ ڈین نے بھی اسے ایسا کرنے سے کبھی روکا نہیں تھا۔

وہ چلتی ہوئی ڈریسنگ تک آئی۔

''میں آج تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔'' وہ ڈریسنگ کے آئینے میں اس کا خوبصورت سراپا بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

''ایسی بھی کیا باتیں کرنا کہ تم نے آج اپنی میڈیسن بھی پوری نہیں لی اور رات کے اس پہر جاگ رہے ہو جب آدھی نیند کر چکے ہوتے ہو۔'' اب وہ کاؤچ پر بیٹھی اپنے پاؤں کو چار انچ کی ہیل سے آزاد کراتے ہوئے دبا رہی تھی۔

''بس کچھ بوجھ اتارنا چاہتا تھا۔'' سیرین نے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

''تمہاری نیند پوری نہ ہوئی تو طبیعت بگڑ جائے گی۔'' وہ چاہتی تھی کہ وہ وقت سے سو جائے۔

''میں آج بھی خاموشی سے سو گیا تو میری روح بگڑ جائے گی سیرین۔ مجھے آج تو بولنے دو۔''

گہرا سانس لیتے ہوئے وہ اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے کہنے لگی۔ ''تم کہو تو کل میں آفس سے آف کر لیتی ہوں، ہم کسی پُرفضا مقام پر چلیں گے اور وہاں تم مجھ سے سب کہہ دینا لیکن ابھی نیند ضروری ہے۔ میں بھی تھکی ہوئی ہوں۔''

''میں بہت زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں جسے جان کر تم یوں بھی سو نہیں سکو گی۔'' اپنا ہاتھ وہ اس کے ہاتھ سے چھڑا چکا تھا۔

''مجھ سے شاید نفرت بھی کرنے لگ جاؤ۔'' اس کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔ شاید وہ اس کے ردعمل سے ڈر رہا تھا۔ ''اور شاید علیحدہ بھی ہو جاؤ۔'' سیرین نے کسی قسم کا تاثر نہیں دیا۔ یوں جیسے اس کی باتیں اس کے لیے نئی نہ ہوں۔

''ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ میں مرتے دم تک تم سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔'' وہ جذبوں کا اظہار بھی یوں کرتی تھی جیسے کسی روبوٹ کا بٹن دبا دیا گیا ہو اور وہ بولنے لگا ہو۔ ڈین ہولے سے مسکرا دیا۔

''نہ جانے تم نے مجھ بڈھے میں کیا دیکھا، کیا دیکھ کر اپنی زندگی کے حسین قیمتی دس سال برباد کر دیے۔'' وہ پچھلے کئی سال سے اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ سیرین اس کی ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیتی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس وقت بھی اپنی کلائی میں موجود بریسلٹ سے کھیل رہی تھی۔

''تم جانتی ہو نا کہ تمہاری آنی میری کتنی دیوانی تھی۔'' ازیکا کے ذکر پر اس کا چہرہ ہمیشہ سیاہ پڑ جاتا تھا۔ وہ اب سامنے دیوار پر دیکھ رہی تھی۔ یہ تذکرہ اس کے لیے تکلیف کا باعث تھا۔

''آج میں اپنی زندگی کے چند اہم راز تم سے کہنا چاہتا ہوں، اس بات کی پروا کیے بنا کہ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو کیا ہو گا۔'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ازیکا سے میری لو میرج تھی کیونکہ وہ بلا کی حسین تھی اور میں حُسن کا عاشق تھا۔ حسن پر جان دیتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ جان لے بھی سکتا ہوں۔ یہ مجھے تب پتا چلا جب میں تم سے ملا۔ شادی کے سال بھر بعد میں تم سے ملا تو میرے دل نے جانا کہ میں ایک بڑی غلطی کر چکا ہوں کیونکہ اس کا حسن تو تمہارے سامنے کچھ بھی نہ تھا۔'' اس کا چہرہ ہنوز بے تاثر تھا۔

''وہ مجھے اکثر بتاتی تھی کہ اس کی بھانجی بہت حسین ہے لیکن میں نے کبھی تمہیں دیکھنے کی تمنا نہیں کی کیونکہ میرے نزدیک حسین بس ازیکا تھی۔ تم پڑھنے باہر گئی ہوئی تھیں۔ سال سے پہلے واپسی ممکن نہ تھی، اسی لیے تمہاری غیر موجودگی میں ہی ہم نے شادی کر لی اور جب تم سال بھر بعد لوٹیں تو مجھے لگا میری دنیا ہی لٹ گئی ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھیں جتنا وہ کہتی تھی اور حسن میری سب سے بڑی کمزوری تھا جسے حاصل کرنا میرا پاگل پن تھا۔ اسی لیے میں نے ازیکا سے پیچھا چھڑانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ مجھ پر اتنا اعتبار کرتی تھی کہ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میں کسی اور سے محبت کرنے لگا ہوں تو وہ ہنس پڑی۔ اسے لگا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔ اسی اعتبار کی وجہ سے میں نے اسے شربت میں زہر ملا کر دیا تو وہ بھی خوشی خوشی پی گئی۔ تم سوچ سکتی ہو کہ میں نے اسے تمہاری محبت میں زہر دے ڈالا۔'' اسے لگا تھا کہ وہ چونکے گی، چیخے چلائے گی لیکن وہ بہت پُرسکون بیٹھی سب سن رہی تھی، حتیٰ کہ اس کے چہرے کے تاثرات بھی ہمیشہ کی طرح جامد تھے۔ کہیں کوئی تغیر و تبدل دکھائی نہیں دیا۔

''ازیکا کی موت کے دو ماہ بعد میں نے تم سے شادی کے لیے کہا تو تم بہ آسانی مان گئیں۔ اس کی مجھے قطعاً امید نہیں تھی۔ آج میں بس اسی ایک بات کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں سیرین کہ ازیکا کو میں نے قتل کیا تھا، وہ بھی تمہاری وجہ سے۔ تمہاری محبت میں، تمہیں پانے کے لیے مگر میں آج تک یہ نہیں جان سکا کہ تم نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ تم حسین تھیں، بے حد حسین۔ کوئی بھی مل سکتا تھا پھر میں ہی کیوں.....؟'' وہ اب کی بار اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ سیرین خاموش تھی اور جب بولی تو بس اتنا.....

''میں نے بھی آنٹی کے لیے ہی تم سے شادی کی ڈین۔''

ڈین نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"تم سے زیادہ دولتمند مجھے کہاں مل سکتا تھا بھلا۔" وہ اب اٹھ کر سامنے ڈریسنگ کی طرف چل دی تھی۔

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم جیسی کم عمر حسینہ نے مجھ سے اسی لیے شادی کی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ تمہارے نام کردیا تھا۔ یہ تمہارے حسن کا خراج تھا جو شاید بہت کم ہے۔" وہ مسکرادیا۔ سیرین اپنا میک اَپ صاف کرنے لگی۔

"ٹھیک کہا تم نے، یہ بہت کم ہے اور مجھے تو بہت زیادہ چاہیے تھا۔" اب کی بار سیرین مسکرا دی...... ایک پُراسرار مسکراہٹ جو جان نکال دیتی ہے۔ ڈین بُری طرح چونکا۔ اس سے زیادہ وہ ڈر گیا تھا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت نہیں ہوئی کہ میں قاتل ہوں وہ بھی تمہاری آنٹی کا؟" وہ آج تک اس لڑکی کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ سیرین نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے لیے جیسے یہ ایک معمول کا سوال تھا۔

"لیکن کیوں؟ میں نے تمہاری آنٹی کا قتل کیا اور تم پھر بھی اتنی پُرسکون ہو، نہ مجھ پر چلائیں نہ کچھ کہا۔"

"کیونکہ میں یہ سب پہلے سے جانتی تھی۔" وہ اتنے پُرسکون انداز میں کہہ کر اب ٹشو پر میک اپ ریمور لگا کر اپنی لپ اسٹک صاف کرنے لگی۔ ڈین ساکت رہ گیا۔ اسے لگا کہ کمرے کی خنکی نے اسے جما دیا ہے حالانکہ اے سی تو کب کا بند تھا۔

"تم یہ سب جانتی تھیں......؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"تم نے جس رات آنٹی کے گلاس میں زہر ملایا تھا اس رات یہ سب کرتے تمہیں کسی نے دیکھا تھا۔"

"تم نے؟ لیکن تم تو وہاں تھیں ہی نہیں۔" وہ کئی ساعتوں بعد بولا تھا۔ سیرین نے نفی میں سر ہلایا۔

"جونی نے۔" وہ اس کے گھریلو ملازم کی بات کررہی تھی جو سیرین کا ہم عمر ہی تھا۔

"اس نے جب تک مجھے بتایا آنٹی مشروب پی چکی تھیں۔" سیرین اٹھ کر اب اس کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے یقین نہیں آیا کہ تم ایسا کرسکتے ہو اس عورت کے ساتھ جو تمہیں پاگلوں کی طرح چاہتی تھی۔" وہ نادیدہ شکنیں ٹھیک کررہی تھی۔

"وجہ میں جاننا چاہتی تھی اور جب تم نے دو ماہ بعد مجھے شادی کی پیشکش کی تو میں نے قبول کرلی کیونکہ اس وقت وجہ میں جان چکی تھی...... وہ میں تھی جس کی وجہ سے تم نے یہ سب کیا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں تم سے شادی کرکے تمہاری ساری دولت بھی ہتھیا لوں گی اور تمہیں ایسی موت ماروں گی کہ تم مرو گے بھی نہیں اور زندہ بھی نہیں رہو گے۔" ڈین کے گلے میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ اسے پانی کی شدید طلب کا احساس ہوا۔

"اب جب تم نے اعتراف کرہی لیا ہے تو مجھے بھی چند ایک اعتراف کرنے دو۔" وہ مسکرائی۔ قاتل مسکراہٹ جس نے ڈین کو موت سے پہلے ہی موت کے حوالے کردیا تھا۔

"تم نے کہا کہ تم نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ میرے نام کیا ہے، میرے حسن کے خراج کے لیے۔ تو مجھے یہ خراج کم لگا اسی لیے چار سال قبل تم سے چیک سائن کرا کے میں نے تمہاری ساری دولت ہی اپنے نام کروالی تھی۔" ڈین نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ اب ہنس رہی تھی۔

"ایسے مت دیکھو جیسے مر گئے ہو۔ موت اتنی آسانی سے تم پر مہربان نہیں ہوسکتی۔ ابھی کچھ اور باتیں بھی باقی ہیں۔"

وہ اب اٹھ کر اپنے بیگ میں سے کچھ نکال رہی تھی۔

"انہی کاغذات میں ایک کاغذ طلاق نامہ تھا جو تم نے اپنے ہاتھوں سے دستخط کیا اور تمہاری قید سے آزاد ہوتے ہی میں نے شادی بھی کرلی۔ پچھلے چار سال سے میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔" ڈین کا سارا خون نچڑ گیا تھا۔

"جاننا چاہو گے وہ کون ہے جس سے میں نے شادی کی؟" ڈین سے سر اثبات میں ہلایا تک نہ گیا۔

"جونی...... جس نے مجھ سے قدم قدم پر وفا کی اور ایسی وفا کی، جفا نہیں بنتی نا اسی لیے اس باوفا سے میں نے شادی کرلی جو تم سے شادی کے بعد میرا رائٹ ہینڈ بن گیا تھا۔" ڈین کو لگا کہ وہ مرچکا ہے لیکن ابھی سانس چل رہی تھی۔

"یہ بھی جاننا چاہو گے کہ اس نے میرے لیے کیا اہم کام کیا؟" وہ چند ثانیے کو رکی اور پھر بولی۔

"وہ پچھلے پانچ سال سے تمہیں سلو پوائزن دے رہا ہے اور یہ جو تم بیڈ پر پڑے ہو نا اسی کی کرم نوازی سے پڑے ہو اور روز میں تمہیں پل پل مرتا ہوا دیکھنے ہی تمہارے اس گھٹن زدہ کمرے کا رخ کرتی ہوں۔" وہ ساکت سا پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب میری آنٹی کے قتل کا بدلہ ہے مسٹر ڈین۔ اُمید ہے تمہیں اچھا لگا ہوگا کیونکہ جیسے حُسن کو حاصل کرنا تمہارا پاگل پن تھا اسی طرح بدلہ لینا میرا پاگل پن ہے۔ تم سن رہے ہو نا؟" سیرین نے اس ٹھنڈے وجود کو ہاتھ لگایا تو وہ ایک طرف ڈھلک گیا۔ ایک گہری سانس اس نے لبوں سے خارج کی۔ اعتراف مکمل ہوچکا تھا اور بدلہ بھی۔

⌘⌘⌘

نقاب چہرے

مظہر سلیم ہاشمی

زندگی میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں... بچھڑ جاتے ہیں... نظروں کے سامنے کئی چہرے اُبھرتے ہیں... سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں... کسی کے چہرے پر ناراضگی ظاہر ہورہی ہوتی ہے... کسی کے چہرے پر بدمزگی کے آثار... جیسے کوئی بہت کڑوی چیز کھالی ہو... گویا پہلی ملاقات چہروں سے ملاتی ہے... چہرہ پہلا تاثر ہوتا ہے... جس سے ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ دوست ہے... محبت پرور ہے... ایسے ہی اشنا ناآشنا مہربانوں کا احاطہ کرتی تحریر... جو اپنے چہروں سے مطمئن نہ تھے... خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں تھے... مزید حسن اور دلکشی کی چاہ نے انہیں تبدیلیوں پر مجبور کر دیا تھا... سنسنی... تجسس... پُرانتقام جذبوں سے سجی ایک تیز رفتار انوکھی تحریر...

چہرہ در چہرہ جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل تھے.....

''تمہارا بیٹا ہمارے پاس ہے..... اُس کے ساتھ نتھی کی گئی تصویر جعلی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی مذاق ہورہا ہے۔ تم ہمیں کسی قیمت پر نہیں خرید سکتے۔ اگر تم اپنے بیٹے کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو اس خط کے متن کے عین مطابق ایک ایک ہدایت پر عمل کرو۔

آج سے دو دن بعد چوبیس مارچ کی سہ پہر چار بجے تم ایک چہرے کی سرجری کرنے والے ہو..... جب تمہاری خاص کلائنٹ نازنین زیرِ نشتر ہوگی، تب تمہیں اس کے چہرے کے دونوں جانب کی رگ میں پانچ سی سی آئسو پروپائل الکوحل داخل کرنا ہوگی۔ یہ اس کے اعصاب پر فالج جیسا اثر کرے گی۔ اس کے نتیجے میں اس کا چہرہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائے گا اور یہ عمل کسی طرح بھی قابلِ علاج نہیں ہوگا۔

اگر تم مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہو اور نازنین اپنی ایک ابرو کو بھی جنبش دینے کے قابل رہتی ہے تو تم اپنے بیٹے سفیان کی لاش ہی دیکھو گے۔ اسے اپنے لبوں کو حرکت دینے کے قابل بھی نہیں رہنا چاہیے۔

اس خط اور تصویر کی ایک نقل تمہاری بیوی کے لیے سفیان کے بستر پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اگر تم احمق ہو گے تو پولیس کو اس معاملے میں شامل کرنے کی غلطی کرو گے..... کسی بھی ادارے کو مطلع کرنے کا صاف مطلب یہی ہوگا کہ تم نے سفیان کی موت کے پروانے پہ مہر ثبت کر دی ہے۔''

☆☆☆

رانیہ کی آنکھ غیر متوقع طور پر کھلی تھی۔ چند لمحوں تک تو وہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے خود کو ماحول کا عادی بناتی رہی کہ وہ ہے کہاں؟

''اوہ.....'' اچانک اسے گزشتہ رات کا احوال یاد آیا تو اس نے بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی۔

ایک بار تو وہ چکرا کر ہی رہ گئی۔ اٹھنے کی کوشش ترک کرتے ہوئے اس نے اپنے سر کو تھام لیا جس میں عجیب طرز کی مسلسل دھمک جاری تھی۔

رات کی پارٹی میں منشیات و شراب کا بے دریغ استعمال کیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ خود ڈرگز جیسی خرافات سے دور ہی رہتی تھی لیکن محفل میں پینے پلانے کی حد تک ساتھ ضرور

دیتی تھی۔ اس نے کبھی اس حد سے تجاوز نہیں کیا تھا کہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھے لیکن رات کو اس کے دوستوں نے تھوڑی تھوڑی کہتے ہوئے اسے مجبور کر دیا تھا۔ وہ اتنی زیادہ پی گئی کہ ہوش ہی گنوا بیٹھی۔

بیتی رات کا حال دُھندلی یادوں کی صورت میں اس کے ذہن کی اسکرین پر چل رہا تھا۔ رانیہ اور اس کے دوست ایک انڈر گراؤنڈ کلب میں گئے تھے جہاں ہر قسم کی غیر قانونی چیز مہنگے داموں دستیاب ہوتی تھی۔ کلب ممبران کو انتظامیہ کی طرف سے ہر قسم کی حرکت کی اجازت تھی اس لیے رانیہ جیسی 'سیلیبریٹیز' بھی وہاں جا کر کھل کر کھیلتی تھیں۔ یہ کلب ایسا حمام تھا جہاں سب ہی بے لباس تھے اس لیے وہاں سے کچھ بھی میڈیا میں 'لیک' نہیں ہوتا تھا۔ اکثر اوقات تو اخلاقیات کا درس دیتے نیوز اینکرز بھی اس کلب میں ایسی موج مستی کرتے ہوئے پائے جاتے تھے جن میں اخلاقیات کا ذرہ برابر عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔

اُلجھے ذہن کے ساتھ رانیہ کو یاد آیا کہ ایک انگلینڈ پلٹ بزنس مین کو اس کے دوستوں نے گھیرا ہوا تھا اور اس کے پیسوں پر مہنگی شراب کے جام لُنڈھائے جا رہے تھے۔ وہ بھی رانیہ کے حُسن کے جال میں اُلجھا کسی چغد کی طرح پھنسا ہوا تھا اور بے دریغ رقم اُڑا رہا تھا۔

''ارے آپ کیا جانیں رانیہ تو فلموں کی رانی بنتی جا رہی ہے۔ اس کو تو انڈیا سے بھی آفرز آ رہی ہیں۔'' رانیہ کی دوست نمرہ نے انگریزی الفاظ میں پنجابی کا تڑکا لگاتے ہوئے لندن سے آئے بزنس مین کے سامنے انکشاف کیا۔

''سچ میں؟'' بزنس مین کی چُنی آنکھیں یہ سن کر کھل گئیں۔

''اور کیا..... ابھی ہفتہ پہلے ہی اسے ریتھک روشن کے ساتھ فلم آفر ہوئی ہے لیکن یہ مان ہی نہیں رہی۔'' نمرہ نے رانیہ کے بے شمار ٹہوکوں کے باوجود تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''وہ کون ہے؟'' بزنس مین کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں تو بس عامر، سلمان اور شاہ رخ کو ہی جانتا ہوں۔''

''ارے آپ ری تھک روشن کو نہیں جانتے؟ ابھی حال ہی میں اس کی فلم 'وار' نے تین سو کروڑ کا بزنس کیا

ہے۔'' نمرہ تیزی سے اپنے موبائل کی اسکرین پر اسکرولنگ کرتے ہوئے بولی اور ایک تصویر نکال کر دکھائی۔ ''یہ والا.....''

موبائل میں انڈین ہیرو کی دونوں ہاتھوں میں گن تھامے ایک تصویر نظر آرہی تھی۔ بزنس مین شاید اُسے نام سے نہیں جانتا تھا لیکن شکل دیکھ کر پہچان گیا۔

''رانیہ کو وہ پیسے بہت کم آفر کر رہے ہیں لیکن اگر انہیں ٹاپ ایکٹریس چاہیے تو معاوضہ بھی تو ٹاپ کا ہونا چاہیے۔'' نمرہ نے تعریفی لہجے میں کہا تو بزنس مین سر ہلا کر رہ گیا۔

نمرہ خود بھی ڈراموں اور فلموں میں کام کرتی تھی لیکن زیادہ کامیاب نہ تھی۔ خوبصورت تو وہ بھی تھی لیکن رانیہ جیسے حسنِ بلاخیز سے محروم تھی۔ شو بزنس میں ہونے والے 'سمجھوتوں' اور رانیہ کی سفارش کی بنا پر اب تک کی اس کی سب سے بڑی کامیابی یہی تھی کہ اسے ایک فلم میں رانیہ کے ساتھ سیکنڈ لیڈ رول میں کاسٹ کیا گیا تھا۔

اپنے بے حجاب جلووں سے اس نے فلم کو چار چاند تو لگائے تھے لیکن جہاں رانیہ ہیروئین ہو وہاں ثانوی کردار کو کس نے اہمیت دینی تھی۔ رانیہ کی اداکاری پر ناظرین و ناقدین نے جہاں تعریفوں کے انبار لگا دیے تھے وہیں پہ نمرہ کی تعریف محض ایک اچھی 'آئٹم گرل' اور ڈانسر کے طور پر ہی کی گئی تھی۔

''اب رہنے بھی دو.....'' رانیہ کو اپنی تعریف سن کر خوشی تو ہو رہی تھی لیکن اس نے شرمانے کی ایکٹنگ کرنا ضروری سمجھا۔

اداکاری اب صرف اس کا پیشہ نہیں رہ گئی تھی..... یہ اس کا اندازِ زندگی بن گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے بھی رانیہ اداکاری ہی کرتی رہتی تھی۔

''آپ اس کے لیے کوئی فلم کیوں نہیں 'پروڈیوس' کرتے؟'' رانیہ کے ہوسرے دوست ندیم لاشاری نے بزنس مین سے پوچھا۔ ''میرے پاس ایک شاندار اسکرپٹ موجود ہے اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میری ہدایت کاری میں بنی اس فلم میں رانیہ کو ایسا دکھایا جائے گا کہ عوام کھڑکی توڑ کامیابی سے نوازے گی۔''

'یہ ٹٹ پونجیا سیکنڈ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو کر بھی ایسے ہی سب کو جال میں پھنساتا رہتا ہے..... میں اب اس سیکنڈ کلاس ڈائریکٹر کے ساتھ کام کروں گی۔' رانیہ نے ناگواری سے ندیم کے بارے میں سوچا۔

وہ اپنے میک اَپ مین ساجد کی وجہ سے اسے برداشت کرتی تھی ورنہ وہ کبھی بھی اس کے دوستوں کے گروپ میں شامل نہ ہوتا۔ رانیہ کو زیادہ دیر تک ناگوار خیالات نہ سوچنے پڑے کیونکہ اسی لمحے نمرہ نے بار کاؤنٹر سے اسے اس کی پسندیدہ 'شیری' کا جام لا کر دے دیا۔

''زیادہ ہو جائے گا.....'' رانیہ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے ہی دو پیگ لگا چکی ہوں۔''

''ایک آدھ سے... کچھ نہیں ہوتا.....'' نمرہ نے ایک ادا سے بزنس مین کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا اور پھر جھک کر رانیہ کے کان میں بولی۔ ''یہ کاٹھ کا اُلّو موٹی اسامی ہے..... فلم نہ سہی کسی ٹیلی فلم یا ڈرامے کے لیے تو راضی ہو ہی جائے گا۔''

رانیہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بزنس مین فدا ہو جانے والی نگاہوں سے رانیہ کے اس نقرئی قہقہے سے حظ کشید کر رہا تھا۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا کہ خون چوسنے والی جونکوں کے مانند یہ دولت کے لالچی لٹیرے اسے کس طرح گھیرے میں لا رہے ہیں۔

''چلو آجاؤ ڈانس کریں.....'' تیز دُھن پر تھرکتے ہوئے نمرہ نے رانیہ سے کہا اور اس سمیت بزنس مین کا ہاتھ تھام کر ڈانس فلور کی جانب کھینچا۔

''اچھا ایک منٹ.....'' رانیہ نے اپنا جام ایک ہی سانس میں ختم کیا اور ڈانس فلور پر جا کر ناچنے لگی۔

مچلتے جذبات، سلگتے بدن، اور موسیقی کی تھاپ نے شراب و شباب دونوں کو ہی دو آتشہ کر دیا تھا۔ ناچتے ناچتے رانیہ مزید کتنے جام لنڈھا گئی تھی، اسے یاد ہی نہیں رہا تھا اور اب آنکھ کھلنے پر اسے گزشتہ رات کی تقریباً ساری باتیں یاد آگئی تھیں۔

''شکر ہے.....'' چکراتے سر کو تھامنے کے بعد جب رانیہ کو احساس ہوا کہ وہ اپنے ہی بیڈ روم میں ہے اور اپنے ہی بستر میں اکیلی ہے تو اس نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

'لیکن میری آنکھ کیسے کھلی؟' اس نے بے چینی سے سوچا۔

اسی وقت سائڈ ٹیبل پر رکھے اس کے موبائل فون کی بیل بجنے لگی۔

''اوہ..... تو کسی کی کال آرہی تھی۔'' اس نے خود کلامی کی۔ یہ جاننے کے بعد کہ اس کی آنکھ بلاوجہ نہیں کھلی، اس کے انداز میں اطمینان اتر آیا۔ جتنی دیر تک وہ

ہاتھ بڑھا کر فون اٹھاتی تب تک کال منقطع ہوگئی۔

''آٹھ مس کالز.....'' موبائل اسکرین کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''یہ کون جوش میں آگیا؟''

فلم اسٹار ہونے کے باعث اس کا پرسنل نمبر محدود لوگوں کے پاس ہی تھا۔ شوبز سے متعلقہ امور کے لیے لوگ زیادہ تر اس کے میک اَپ آرٹسٹ کم سیکریٹری ساجد سے ہی رابطہ کیا کرتے تھے۔

اس نے 'فنگر پرنٹ لاک' پر اپنی مرمریں شہادت کی انگلی کا لمس دیا تو فون اَن لاک ہوگیا۔

'یہ صبح صبح نمرہ کیوں اتنی کالز کر رہی ہے؟' رانیہ نے میسڈ کالز دیکھ کر سوچا جو کہ ساری کی ساری نمرہ کی جانب سے ہی تھیں۔

اگرچہ دن کے ساڑھے گیارہ کا وقت ہو رہا تھا لیکن اس 'رات کی رانی' کے لیے یہ صبح سویرے کا ہی وقت تھا۔ وہ موبائل پر سوائپ کر کے اسے کال بیک کرنے والی تھی کہ ایک بار پھر سے فون کی رِنگ ٹون بجنے لگی۔ یہ کال بھی نمرہ کی جانب سے ہی تھی۔

''کیا مصیبت آگئی؟'' رانیہ نے کال ریسیو کرتے ہی قدرے درشتگی سے پوچھا۔ رات کا خمار ابھی باقی تھا جو اس کی آواز کے بھاری پن سے نمایاں ہو رہا تھا۔

''ٹی وی آن کرو..... سب پتا چل جائے گا۔'' نمرہ نے تشویش آمیز لہجے میں ایک نیوز چینل کا نام لیتے ہوئے کہا۔

رانیہ یقیناً اس بات پر ناراض ہو کر بحث کرتی لیکن نمرہ کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس نے نیم دراز حالت میں ہی سائڈ ٹیبل سے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آن کرلیا۔

''کچھ بتاؤ گی بھی یا نہیں.....؟'' چینل اسکرول کرتے ہوئے رانیہ نے سوال کیا۔

''تم خود ہی دیکھ لو..... مجھے تو ابھی تک یقین ہی نہیں آرہا۔'' نمرہ کا لہجہ بیک وقت تاسف اور شکایت آمیز تھا۔

''اچھا ایک منٹ.....'' رانیہ کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر گڑ گئیں جہاں اس کے بارے میں ہی خبر چل رہی تھی۔ اس نے آواز کا والیم بڑھایا۔

''حُسن کی رانی..... رانیہ ملک کی خوب صورتی کا ہوا پردہ فاش.....'' اینکر سنسنی خیز لہجے میں چلّا کر بول رہا تھا۔ ''پاکستانی فلم انڈسٹری میں آکر چھا جانے والی اس حسینہ کے بارے میں حاصل ہوئی ہیں نئی معلومات..... ہمارے ذرائع کے مطابق رانیہ ملک کبھی بھی اتنی حسین نہیں تھی..... اس کا حُسن، اس کی جوانی اور اس کی دِلکشی سب کی سب جدید پلاسٹک سرجری کا نتیجہ ہے..... یہ دیکھیں سرجری سے پہلے اور سرجری کے بعد کی تصاویر.....''

اس کے ساتھ ہی 'بی فور اینڈ آفٹر' کے کیپشن کے ساتھ اس کی تصاویر ایک کے بعد ایک کر کے ٹی وی اسکرین پر گزرنے لگیں۔

رانیہ ہکا بکا رہ گئی..... فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ پھولے گال، چپٹی ناک، موٹے ہونٹ اور سونے پر سہاگا سانولی رنگت والا اپنا پرانا چہرہ دیکھ کر وہ ایک بار لرز کر رہ گئی۔

'کیسے.....؟ کیسے.....؟ کیسے.....؟'

ٹی وی اینکر اب بھی نجانے کیا کیا بول رہا تھا لیکن رانیہ کے دماغ میں بس اسی ایک لفظ کی گردش ہو رہی تھی۔

رات کا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور سر مزید چکرانے لگا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا راز نیشنل ٹی وی پر افشا ہوگیا تھا۔

'ڈاکٹر عظمان'۔ یکلخت ہی ذہن کے کسی گوشے میں ایک نام اندھیرے میں کسی جگنو کی طرح جواب بن کر ٹمٹمایا۔

شدید غصے کی ایک لہر اُس کے بدن میں اٹھی..... خوف، یاسیت اور پریشانی کے جذبات ایک دم ہی جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ اب صرف غیظ و غضب اس کے وجود میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''ڈاکٹر عظمان..... تم نے اچھا نہیں کیا۔'' وہ طیش کے مارے کانپتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں برباد کر دوں گی۔''

ٹی وی اسکرین کو گھورتے ہوئے اُس کی آنکھیں قہر اُگل رہی تھیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عظمان شیخ کا نام پلاسٹک سرجری میں اب ایک سکہ بند ماہر کے طور پر مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی پریکٹس کا آغاز اس نے کراچی سے کیا تھا اور اب اس کی شہرت پاکستان سے نکل کر مڈل ایسٹ تک پہنچ چکی تھی۔ عالمی سطح پر مقبول عرب ہیرو کے ایک سنگر کی سرجری کے بعد اسے سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں مل رہی تھی۔

ناک، ہونٹ، چہرہ 'درست' کروانے والوں کی ایک

لمبی قطار تھی اور وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہ لوگ اپنے آپ سے کتنے غیر مطمئن رہتے ہیں۔ ان کے پاس دولت تھی اور وہ اپنا ایک ایک نقش پھر سے ترشوا کر خوبصورتی کے مروجہ پیمانوں پر پورا اترنے کو بے تاب تھے۔

فی الحال وہ ان سوچوں سے دور، اپنے شاندار مکان کے قیمتی سنگ مرمر سے بنے فرش پر بیٹھا تھا اور پریشانی سے اس کا دل نہایت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تنہائی پسند ہونے کی وجہ سے وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔

صبح تڑکے کا وقت تھا اور ہوا میں خنکی تھی۔ کچھ ہی لمحوں پہلے دروازے کی گھنٹی کی مسلسل اور تیز آواز نے اسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب وہ صدر دروازے تک پہنچا اور کھولا تو گھنٹی بجانے والے کا نام و نشان تک نہیں تھا البتہ درمیانے سائز کا ایک خاکی لفافہ وہاں اس کا منتظر تھا۔ اندر موجود خط کے مندرجات اس کے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھے۔

اس کے بیٹے سفیان کو اغوا کر لیا گیا تھا۔

ای میل اور واٹس ایپ کے دور میں یہ خط اور تصویر بھیجنے کا عمل اسے عجیب تو لگا تھا لیکن صدمے کی شدت نے اسے اس بات پر زیادہ غور نہیں کرنے دیا تھا۔ ڈاکٹر عظمان ایک بار پھر سے اپنے بیٹے کی تصویر پر غور کرنے لگا۔ پچھلی ملاقات کے مقابلے میں سفیان کے بال چھوٹے ہو چکے تھے اور تھوڑا سا وزن بھی بڑھ گیا تھا۔

'شاید اپنی ماں کے کہنے پر کٹنگ کروائی ہو' عظمان نے سوچا۔ 'ایک ماہ سے تو زیادہ ہی ہو گیا ہے مجھے سفیان سے ملے۔'

تصویر میں سفیان کی ذہانت و زندگی سے بھرپور آنکھوں پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ایک لکڑی کی کرسی پر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے نیند میں ہی اغوا کیا تھا کیونکہ اسے رات کا لباس بھی تبدیل کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی اور وہ ایک سیاہ بنیان اور نیلے رنگ کے پاجامے میں ملبوس تھا۔ ڈیجیٹل کیمرے سے بنائی گئی اس تصویر کے پرنٹ میں وقت اور تاریخ کونے میں چمکتی ہوئی واضح نظر آ رہی تھی۔

بائیس مارچ۔ دو بجے۔

'دو بجے..... یعنی اب سے تقریباً تین گھنٹے پہلے یہ کارروائی مکمل ہو چکی۔' ڈاکٹر عظمان شیخ نے دیوار گیر گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے سوچا۔

'پاپا..... پاپا۔ آپ میرے ساتھ کھیلتے کیوں نہیں؟'

سفیان کی ایک پرانی بات یاد آئی تو عظمان کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے پہلو میں خنجر اتار دیا ہو۔ اپنی مصروف زندگی میں وہ کبھی بھی اپنی بیوی اور بیٹے کو وقت نہیں دے پایا تھا۔

اچھا کھانا، اچھی تعلیم اور اچھا گھر دے کر وہ سمجھتا تھا کہ اپنی ساری ذمے داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہے۔ محبت کرنے کے باوجود وہ کبھی محبت برتنے کا سلیقہ نہ سمجھ پایا تھا۔

'ماورا کا نجانے کیا حال ہوگا؟' ایک نئی سوچ نے اس کی پریشانی دوچند کر دی۔ 'پتا نہیں اسے یہ بات معلوم بھی ہے کہ نہیں؟'

''اگر اسے پتا ہوتا تو اب تک تو میرے پاس آ ہی چکی ہوتی۔'' عظمان نے بہ آواز بلند خود کلامی کی۔ اپنی ہی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

اس کے مائوف ہوتے دماغ پر ماورا کا خیال کسی بجلی کی طرح گرا تھا۔ وہ تیزی سے فرش سے اٹھا۔ ابتدائی صدمے سے وہ سنبھل چکا تھا اور اب اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ کس طرح سے اس صورتِ حال کو سنبھالا جا سکتا ہے۔ اس نے موبائل فون نکال لیا، سب سے پہلی کال اسے اپنی بیوی کو کرنی تھی۔

''سابقہ بیوی.....'' ذہن کے کسی گوشے میں موجود زہریلے ناگ نے ڈنک مارا۔ منفی خیالات کو ذہن سے نکالتے ہوئے اس نے ماورا شیخ کا نمبر ڈائل کر دیا۔

رنگ ٹون کے بجائے حکومت کا کورونا سے حفاظت کا پیغام اسے سنائی دے رہا تھا۔ وہ تیزی سے ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ماورا فون اٹھائے گی تو وہ اُسے کیا کہے گا۔

''یقیناً ماورا سمجھ جائے گی کہ میں کس اخلاقی دوراہے پر پھنس چکا ہوں۔'' اس کے ذہن میں خیال آیا۔

وہ ذہنی طور پر اب مناسب الفاظ تیار کر رہا تھا تاکہ اس سنگین صورتِ حال کو کم سے کم بُرے انداز میں ماورا سے بیان کر سکے۔ وہ سفیان کی ماں تھی اور اسے یہ بات جاننے کا پورا حق تھا کہ اس کے بیٹے کی زندگی ختم ہونے میں شاید دو دن سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔

☆☆☆

ماورا شیخ کا خوبصورت چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پسینے کی بوندیں ماتھے اور گردن سے پھسلتے ہوئے اس کی شرٹ میں جذب ہو رہی تھیں۔ ہر قدم پر اس کی پھولتی سانس میں اضافہ ہی ہو رہا تھا لیکن وہ دوڑتی ہی چلی جا رہی تھی۔

''بس تھوڑا سا اور.....'' اس نے ہانپتے ہوئے خود

سے کہا۔

طلوع آفتاب میں ابھی وقت تھا لیکن سپیدۂ سحر آسمان پر نمودار ہو چکا تھا۔ وہ تیز سانسیں لے رہی تھی اور سمندر کی نمکین ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہو کر تازگی کا احساس جگا رہی تھی۔ کراچی شہر کے باسی بھی دیگر دنیا کی طرح سمندر جیسی نعمت کے ہونے کے باوجود خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ وہ اکیلے ہی جاگنگ میں مصروف تھی۔ بھاگنے دوڑنے اور ایکسرسائز کا یہ سلسلہ اس نے چند دن پہلے ہی شروع کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ کم از کم اتنی فٹ ضرور ہو جائے کہ عنقریب ہونے والی میراتھن ریس میں حصہ لے سکے۔

وہ جوڈو کراٹے کی شوقین رہی تھی اور یونیورسٹی کی بہترین اتھلیٹس میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ شادی کے بعد ..... اس نے خود کو محدود کر لیا اور ہر قسم کے کھیل سے دور ہو گئی۔ اس کی محبت کی شادی تھی لیکن سفیان کی پیدائش کے بعد اسے احساس ہوا کہ عظمان چاہے اس سے جتنی محبت کرتا ہو لیکن بیوی بچے کبھی بھی اس کی پہلی ترجیح نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے اس کا کام ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

وقت گزارنے کے لیے ماورا نے ایم فل میں داخلہ لے لیا تھا اور اس کے بعد پی ایچ ڈی بھی کر لی تھی۔ پی ایچ ڈی کے بعد جب اسے یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جاب کی پیشکش ہوئی تو اس نے قبول کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ اس وقت وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبہ آئی ٹی کی سیکنڈ انچارج تھی اور عنقریب ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر ترقی پانے والی تھی۔ عظمان سے علیحدگی کے فیصلے پر سب گھر والوں نے اعتراض کیا تھا لیکن وہ اس ادھورے تعلق کو نبھاتے نبھاتے تنگ آ چکی تھی۔ سفیان کی خاطر کیے جانے والے سمجھوتوں سے وہ بیزار ہو چکی تھی اس لیے اسے لے کر علیحدہ ہو گئی۔

سفیان کا خیال آیا تو اس نے اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ وہ لڑکا اب بڑا ہو رہا تھا لیکن پڑھائی پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ سارا دن کمپیوٹر پر وہ میوزک ویڈیوز دیکھتا تھا اور جب اس سے فراغت ملتی تھی تو اپنا گٹار اٹھا کر ٹک ٹاک ویڈیوز بناتا رہتا۔ ماورا کو ان غیر نصابی سرگرمیوں پر قطعاً اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ فطری طور پر ذہین لڑکا تھا اور ذرا بھی پڑھائی پر توجہ دیتا تو بہترین نتائج لا سکتا تھا۔ البتہ وہ اس کی بے پروا فطرت سے چڑ جاتی تھی، عدم توجہ کی وجہ سے ہی اس کی پڑھائی متاثر ہو رہی تھی۔ شاید اسے یہ عادت اپنے باپ سے ملی تھی۔

'کاش اس چودہ سالہ لڑکے پر اس کا باپ بھی اتنی توجہ دیتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔' باپ کا خیال آتے ہی ماورا نے ناگواری سے سوچا۔

ایک جانب وہ اپنے بیٹے کے لیے مثال بننے کی کوشش کر رہی تھی کہ کس طرح محنت اور توجہ سے کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن دوسری جانب ٹک ٹاک جنریشن کی بغیر محنت والی کامیابی سے بھی خائف تھی جو چند ٹھمکے لگا کر راتوں رات لوگ مشہور ہو رہے تھے۔

'مثال بننا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے؟' ماورا کے ذہن میں خیال آیا۔ 'بیٹی ہوتی تو شاید تربیت میں اتنی مشکل نہ ہوتی۔'

ایک جوان ہوتے لڑکے کی ضروریات وہ محسوس تو کر سکتی تھی لیکن اس حوالے سے اسے سمجھانے سے قاصر تھی۔ وہ بڑی شدت سے سفیان کی زندگی میں باپ کی کمی محسوس کرنے لگی تھی کیونکہ وہ اب خود کو بالغ سمجھنے لگا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ باتیں شیئر کرنے سے گریز کرنے لگا تھا۔

بھاگتے بھاگتے اب وہ بے حال ہونے لگی تھی۔ ''بس چند منٹ کی بات ہے۔'' پھولے سانس کے ساتھ وہ خود سے بولی۔

اس نے اپنی اسمارٹ واچ کو دیکھا تو ماتھے پر تیوری نمودار ہو گئی۔ اس نے 'سائلنٹ موڈ' آن کیا ہوا تھا۔ عظمان کی جانب سے تین مسڈ کالز دیکھ کر وہ حیران تو ہوئی لیکن نظر انداز کر گئی۔ اب وہ اس فٹ پاتھ پر دوڑ رہی تھی جو اس کے گھر کی جانب جاتا تھا۔ وہ سمندر کنارے ہی ایک شاندار کالونی میں رہائش پذیر تھی۔ تین بیڈ روم کا یہ شاندار اپارٹمنٹ نما گھر بھی اسے عظمان سے ہی ملا تھا۔

گھر پہنچ کر اسے غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا لیکن اس نے توجہ نہ دی۔ یہ سب تو معمول کی بات تھی۔ اس نے موبائل فون کو چارجنگ سے ہٹایا اور اپنی اسمارٹ واچ کو چارجنگ پر لگا دیا۔

سفیان رات دیر تک جاگتا تھا اور اسے اسکول کے لیے جگانے کے لیے ماورا کو کافی کوشش کرنی پڑتی تھی۔ ابھی اسے جگانا ضروری تھا ورنہ اس کی اسکول وین نکل جاتی اور ماورا کو پھر یونیورسٹی جاتے ہوئے اسے ساتھ لے جانا پڑتا۔ اسکول اور یونیورسٹی دونوں مخالف سمت میں تھے اور وہ آج یونیورسٹی جلدی جانا چاہتی تھی۔ ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ نے ایک فیکلٹی میٹنگ طلب کی ہوئی تھی جس میں اس کی موجودگی

بہت ضروری تھی۔

اچانک اس کا فون بجا تو وہ چونک کر رہ گئی۔

''تعنتی.....'' یہ الفاظ اس نے فون پر اپنے سابقہ شوہر کا نام دیکھ کر ادا کیے تھے۔

جب سے ڈاکٹر عظمان کو پتا چلا تھا کہ وہ پلاسٹک سرجری میں غیر معمولی مہارت رکھتا ہے تب سے اس کی توجہ بیوی اور بیٹے سے بالکل ہی ہٹ گئی تھی۔ ماورا نے بھی یہ حقیقت بہت عرصہ پہلے قبول کر لی تھی کہ عظمان کی محبت اس کا پیشہ ہی ہے..... بیوی بچے اس کے لیے ہمیشہ ثانوی حیثیت رہیں گے۔ اپنے ہی گھر میں سیکنڈ کلاس شہری بن کر رہنے کے بجائے اس نے علیحدگی کو ترجیح دی تھی۔

''ہیلو عظمان..... خیریت آج صبح صبح ہی فون کر دیا؟'' ماورا نے تمام ناگوار خیالات کو پس پشت ڈالتے ہوئے پوچھا۔

دوسری جانب سے عظمان کی بات سن کر ایک بار تو وہ لڑکھڑا کر رہ گئی..... فون ہاتھ میں لیے وہ تیزی سے سفیان کے کمرے کی جانب دوڑی۔

'یہ جھوٹ ہے..... ایسا نہیں ہو سکتا۔' اس کے دماغ میں انکار چل رہا تھا۔ 'ابھی رات کو ہی تو میں نے سونے سے قبل اسے ماتھے پہ ایک بوسہ دیا تھا..... یہ ناممکن ہے۔ وہ اغوا نہیں ہو سکتا۔'

اس نے سفیان کے کمرے کا دروازہ کھولا تو دھک سے رہ گئی۔ بستر سفیان کے وجود سے خالی تھا جبکہ ایک لفافہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ نیم تاریک کمرے میں کھڑکی پر لگے پردے کسی بھوت کے مانند لہرا رہے تھے۔

''میرا بچہ.....'' ماورا نے ایک سسکی لی اور وہیں فرش پر ہی ڈھے سی گئی۔

☆☆☆

نازنین کے چہرے پر خوف و ہراس پھیلا تھا اور وہ ایسے دوڑ رہی تھی جیسے کسی سے جان بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔

''بچاؤ..... بچاؤ۔'' اس نے صدا لگائی لیکن کوئی مددگار نہیں تھا۔

وہ ایک ویران، کھنڈر نما عمارت میں بھاگ رہی تھی۔ سرمئی لباس میں اس کی شہابی رنگت دمک رہی تھی اور آف وائٹ کلر کا دوپٹا دوڑتے ہوئے لہراتا تو عجب دلکش منظر پیش کرتا تھا۔ کوئی بھی اس پر ایک نگاہ ڈالتا تو نظریں ہٹانا بھول جاتا..... وہ ایسے ہی غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔

دوڑتے ہوئے وہ ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی جہاں سے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی..... فوراً سے پیشتر وہ مڑ کر وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی کہ ایک مردانہ ہاتھ نے اسے دبوچ لیا۔ ماحول نازنین کی فلک شگاف چیخ سے گونج اٹھا۔

''کٹ.....'' ڈائریکٹر نے بلند آواز میں کہا اور جیسے ماحول پر چھایا ہوا سحر ٹوٹ گیا۔

اسٹوڈیو میں موجود لوگوں کو جیسے ایک دم ہی ہوش آیا اور انہوں نے بھرپور تالیوں سے نازنین کو داد دی جو کہ اسپاٹ بوائے کے لائے ہوئے الیکٹرک فین کے سامنے پسینہ خشک کر رہی تھی۔ پنکھے کی ہوا سے اس کے بال لہرا رہے تھے۔ اس کی ہلکی بھوری آنکھوں میں تشکر جھلک رہا تھا، کانوں میں ٹاپس کے بجائے ایک زنجیر نما جھمکا تھا جو کہ اس کے سرمئی لباس سے میچ کر رہا تھا۔ اتنا عرصہ اسے کام کرتے ہوئے ہو گیا تھا لیکن لوگوں کے اس والہانہ انداز پر وہ ہمیشہ حیران رہ جاتی تھی۔

نازنین کا شمار ملک کی بہترین اداکاراؤں میں ہوتا تھا۔ پچھلی دو دہائیوں سے وہ انڈسٹری پر چھائی ہوئی تھی۔ تئیس سال پہلے جب اس نے اپنے پہلے ڈرامے میں کام کیا تھا تب سے ہی وہ 'دلکش چہرہ' کے نام سے نواز دی گئی تھی۔ وقت نے البتہ ثابت کیا تھا کہ وہ صرف خوبصورت چہرہ نہیں تھی بلکہ اداکاری کی صلاحیت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

اپنی طرف سے تو وہ کہتی تھی کہ اس نے کام کا آغاز پندرہ سال کی عمر میں کیا تھا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ نازنین بھی عمر کے معاملے میں دیگر ایکٹریس کی طرح ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتی۔ فلموں میں وہ اتنا کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ اس نے بے حجابانہ کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن ٹیلی ویژن پر اس کا طوطی آج بھی بولتا تھا۔ کئی نوعمر اداکارائیں اس جیسا بننا چاہتی تھیں۔ عمر زیادہ ہونے کے باوجود بہرحال یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ ایک کے بعد اب دوسری نسل کی بھی پسندیدہ ترین اداکاراؤں میں شمار ہوتی تھی۔ وقت کے ساتھ اس کے حسن اور جلوؤں میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

نازنین نے مسکراتے ہوئے، نگاہوں ہی نگاہوں میں اسٹوڈیو میں موجود سب تالیاں بجانے والوں کا شکریہ ادا کیا اور ڈائریکٹر سے بولی۔

''پیک اَپ کرلیں شاد صاحب؟ مجھے نہیں لگتا کہ آپ کا ہیرو اشعر سعید آج شوٹنگ پر آئے گا۔'' اس کی آواز میں ایسا ٹھہراؤ تھا کہ سننے والا فوراً متوجہ ہوجائے۔

ڈائریکٹر اسلم شاد یہ بات سن کر گڑبڑا کر رہ گیا۔

''وہ عجیب اُلّو کا پٹھا ہے..... میں نے کل بھی اسے کہا تھا وقت پر آئے لیکن۔'' شاد نے بے بسی اور غصے سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

پچھلے دو گھنٹے سے وہ اکیلے نازنین کے ساتھ ہی شوٹنگ کر رہا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ اشعر سعید کے آنے کے بعد ایڈیٹنگ میں دونوں کے سین مکس کر دے گا لیکن اشعر نے اپنے ہیرو ہونے کا ثبوت دیا تھا اور ہمیشہ کی طرح لیٹ تھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ جب وہ آئے گا تب آپ ایسے غصہ کر پائیں گے۔'' نازنین کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ ''جب آپ سے میچ نہیں ہوتا تو آپ ایسا ہیرو ڈرامے میں کاسٹ ہی کیوں کرتے ہیں شاد صاحب؟''

''اب تمہارے ساتھ کوئی ننھو خیرا تو کاسٹ نہیں کر سکتے۔ نمبر ون ایکٹریس کے ساتھ ایکٹر بھی تو نمبر ون ہی ہونا چاہیے۔'' شاد نے نازنین کو مکھن لگانے کے لیے بات بنائی تو وہ زیرِلب مسکرانے لگی۔

''پچھلے ڈرامے میں میں تو آپ نے ارباب عباسی کو لے لیا تھا شاد صاحب؟ ڈراما بھی ہٹ ہوگیا اور ہیرو بھی، حالانکہ بالکل نیا تھا۔'' نازنین نے شکایتی انداز میں کہا تو اس کی ہلکی بھوری آنکھوں میں شرارت ہلکورے لیتی صاف نظر آرہی تھی۔

''وہ..... وہ۔'' شاد اچانک ہی گوری رنگت اور ہلکی براؤن داڑھی والے ارباب عباسی کو یاد کرتے ہوئے گڑبڑا گیا۔ ''اس کو مولوی بننے کا شوق ہوگیا تھا..... کہتا ہے کہ یہ سب فلمیں ڈرامے حرام ہیں۔ اس لیے اسے کاسٹ نہیں کیا کہیں سب کچھ بیچ میں ہی نہ چھوڑ دے۔ ورنہ تم دونوں کی جوڑی تو سپرہٹ ہوگئی تھی۔''

''میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے.....'' نازنین کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

وہ جانتی تھی کہ شاد جھوٹ بول رہا ہے۔ ارباب عباسی 'کاسٹنگ کاؤچ' جیسے گھناؤنے پھندے کا شکار ہوا تھا اور آئندہ ایسا کوئی 'سمجھوتا' کرنے سے انکاری ہونے کے باعث بہت کم کام حاصل کر پا رہا تھا۔ اداکاری کی بھرپور صلاحیت کے باوجود اسے کام اس کی 'خوب صورتی' کے سبب پیش کیا جارہا تھا جس کے لیے اب وہ بالکل بھی راضی نہیں تھا۔

''میڈم..... قیصر صاحب آپ کو لینے آگئے ہیں۔'' ایک درمیانے قد والے نوجوان نے آکر ان دونوں کی گفتگو میں دخل اندازی کی تو شاد کے ساتھ ساتھ نازنین کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات آگئے۔

''قیصر بلوچ۔ خود پک کرنے آگئے ہیں تمہیں؟'' شاد نے تیزی سے اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے حیرت سے کہا۔

اس کی حیرت بجا تھی کیونکہ قیصر بلوچ نازنین بلوچ کا شوہر ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ شناخت رکھتا تھا۔ ملک کے تین بڑے چینلز میں سے ایک کا وہ کانٹینٹ ہیڈ تھا۔ اس کے علاوہ اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس تھا جس سے پیش کیے گئے ڈرامے، فلمیں اور ٹیلی فلمیں اکثر عوامی مقبولیت حاصل کرتی تھیں۔

''انور جب تم میرے ساتھ تھے تو قیصر کو آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' نازنین کے بیزاری بھرے لہجے میں غصے کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ ''جاؤ جا کر کہہ دو کہ ابھی کچھ دیر ویٹ کریں..... میں پیک اَپ کر کے آتی ہوں۔''

انور یہ سن کر سر ہلاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

''شاید ہماری ٹیلی فلم کے حوالے سے کوئی پیش رفت ہوئی ہے اس لیے قیصر خود آگیا۔'' نازنین نے شاد سے کہا جو منہ کھولے اس کی بات سن رہا تھا۔ ''ویسے بھی جتنا ٹائم آپ نے آج کے لیے مانگا تھا، میں اس سے دو گھنٹے..... زیادہ ہی دے چکی ہوں سو میری طرف سے پیک اَپ کرلیں۔''

''نازنین اب تم زیادتی کر رہی ہو۔'' شاد نے شکایتی لہجے میں کہا تو نازنین نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''اشعر سے کہنا کہ پروڈیوسر بن گیا ہے تو وقت پر آنا جانا بھی سیکھ لے ورنہ پہلی پروڈکشن میں ہی اپنا پیسہ ڈبو بیٹھے گا۔'' نازنین کی بات پر شاد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کیونکہ یہ بات بہت کم لوگ جانتے تھے کہ اس ڈرامے کا اصل پروڈیوسر اشعر ہے ورنہ بظاہر شاد کا نام ہی بطور پروڈیوسر آرہا تھا۔

نازنین نے اپنی بات مکمل کی اور ایک ادا سے بال لہراتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اس کی چال میں ایسی سبک خرامی اور متانت تھی کہ اسٹوڈیو میں ہر کوئی ایک بار ضرور مڑ کر دیکھ رہا تھا۔

''ہائے نازنین..... تم تو میرے جیسوں کا دل بھی اتھل پتھل کر دیتی ہو۔ پتا نہیں سیدھی سوچ والوں کے دل پر کیسی بجلیاں گراتی ہو گی۔'' شاد نے نازنین کو دور تک جاتے دیکھ کر عامیانہ انداز میں خود کلامی کی۔ ''لیکن یہ قیصر بلوچ خود کیوں آ گیا.....؟ کچھ تو گڑبڑ ضرور ہے۔''

☆☆☆

ماورا کو سمجھانا کافی زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔

عظمان کو اب افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے براہِ راست ملاقات کر کے بتانے کے بجائے فون پر بات کیوں کی۔ وہ جذباتی طور پر اتنی مستحکم نہیں تھی کہ بیٹے کے اغوا کی خبر کو اتنی آسانی سے برداشت کر لیتی۔ بیٹا بھی وہ جسے اُس کی ناک کے نیچے سے راتوں رات غائب کر دیا گیا تھا اور اسے خبر تک نہیں ہوئی تھی۔

''میں آ رہی ہوں تمہارے پاس.....'' ماورا نے یہ آخری بات کرنے کے بعد فون کال کاٹ دی تھی۔ عظمان اب فون پکڑے اپنے اگلے قدم کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے موبائل فون سے کانٹیکٹس میں موجود اپنی اسسٹنٹ کم منیجر مریم مقبول کا نمبر نکال کر ڈائل کر دیا۔

''ہیلو۔'' رنگ ٹون کے بجائے کورونا سے محفوظ رہنے والے حکومتی پیغام کو بیچ میں ہی کاٹتے ہوئے ایک خمار آلود آواز سنائی دی۔

''میں بات کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر عظمان شیخ نے تیزی سے کہا۔

''گڈ گاڈ..... ہم نے نام دیکھے بغیر ہی فون اٹھایا تھا اور ہمارا اندازہ درست نکلا۔'' مریم مقبول کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ ''صبح کے سوا پانچ بجے ہمارے ڈاکٹر عظمان کے علاوہ کون ہمیں کال کر سکتا ہے؟''

مریم مقبول کی خود کو 'ہم' کہنے کی عادت تھی اور وہ ڈاکٹر عظمان کے لیے وقت بے وقت کی فون کالز اور کلائنٹس کے ساتھ ملاقتیں طے کرنے کی عادی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ یہ سب ڈاکٹر عظمان کے ساتھ کام کرتے ہوئے ڈیوٹی کا حصہ ہی ہے۔ ادھیڑ عمر مریم مقبول مسیحی فرقے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی بیشتر فیملی انگلینڈ اور کینیڈا منتقل ہو چکی تھی..... لیکن ڈاکٹر عظمان نے جس طرح اس کا خیال رکھا تھا اور جتنی پرکشش تنخواہ پر رکھا تھا اتنی آمدنی کا وہ باہر کے کسی ملک میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے تھے۔

ذاتی مصروفیات اس کی نہ ہونے کے برابر تھیں اس لیے وہ ڈاکٹر عظمان کی ہمہ وقت مدد کے لیے دستیاب رہتی تھی۔ اب بھی صبح کے سوا پانچ بجے آنے والی کال اسے کوئی ناگوار نہیں گزری تھی۔

کراچی کے مشہور ترین ایک پوش ٹاؤن میں ڈاکٹر عظمان نے رہائش رکھی ہوئی تھی اور اس سے متصل ہی اپنا کلینک بنایا ہوا تھا۔ مریم پچھلے پندرہ سال سے اس کے ساتھ کام کر رہی تھی اور اچھی طرح یہ بات جانتی تھی کہ ڈاکٹر عظمان کی شہرت اب ملک سے نکل کر عالمی طور پر ہونے لگی ہے۔ وہ اتنی بے وقوف ہرگز نہیں تھی کہ ایسے موقع پر شکایت کا اظہار کرتی۔

''مریم مجھے کچھ پوچھنا تھا۔'' ڈاکٹر عظمان کی ٹھہرے ہوئے لہجے میں آواز آئی۔

''جی ڈاکٹر پوچھو۔ ہم سن رہا ہے۔'' مریم نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ کیا ابھی حال ہی میں تم نے کسی کے ساتھ میرا اپائنٹمنٹ شیڈول شیئر کیا ہے؟'' عظمان نے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں..... ہم جانتا ہے کہ یہ سب معلومات خفیہ ہوتا ہے۔ صرف کلائنٹ کو پتا ہوتا کہ آپ سے کب ملنا ہوتا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ آپ کب، کس سے ملتا ہے؟'' مریم نے تیز لہجے میں کہا۔

''اور تمہارے آفس میں کوئی ایسا غیر متعلقہ شخص بھی نہیں آیا جو یہ معلومات تمہارے کمپیوٹر سے لے سکے؟'' ڈاکٹر عظمان نے بے تاثر انداز میں ایک اور سوال داغا۔

''نہیں.....'' مریم نے فوراً کہا۔ ''ہمارے سوا کوئی بھی لاگ ان پاس ورڈ سے واقف نہیں ہے اور ہمارے آفس کی تو چابیاں بھی ہمارے سوا کسی کے پاس نہیں ہیں جو ہماری غیر موجودگی میں آفس آئے۔'' مریم کے لہجے میں اب دکھ نمایاں تھا جیسے ڈاکٹر عظمان نے ایسی بے اعتباری والی بات کر کے اس کے جذبات مجروح کر دیے ہوں۔

''اچھا ذرا یہ بات اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ کیا کسی شخص نے تم سے کسی بھی کلائنٹ کے بارے میں کوئی معلومات لینے کی کوشش کی ہے؟'' ڈاکٹر عظمان کا اگلا سوال بھی بے تاثر تھا لیکن مریم نے اس سوال میں دبی بے چینی محسوس کر لی تھی۔

''ڈاکٹر ہوا کیا ہے.....؟ کیا آپ ہم کو کچھ بتائے گا؟'' مریم نے کہا۔ ''ہم کسی سے بھی آفس کلائنٹ کا بات نہیں کرتا اور ہم اچھی طرح جانتا ہے کہ آپ کا بیشتر کلائنٹ

آپ کے پاس اسی رازداری کی خاطر آتا۔"

"اوہ...... کچھ نہیں۔ دراصل ایمان خان کے چہرے پر کچھ کام رہتا ہے اور وہ اگلے اتوار کو ہونا ہے۔" ڈاکٹر عظمان نے تیزی سے ایک مشہور سیاستدان کی گرل فرینڈ کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "ہائی پروفائل کیس ہے اور میں نہیں چاہتا کہ بات لیک آؤٹ ہو۔"

"ہم جانتے ہیں یہ بات......" مریم کی آواز آئی۔ "ہم نے ہی سارا شیڈول ترتیب دیا ہے۔"

"دراصل ایمان کو خدشہ ہو گیا ہے کہ کوئی نیوز رپورٹر اس بات سے واقف ہے۔" ڈاکٹر عظمان نے بات بنائی۔

"ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ وہ خود ہر جگہ نیوز رپورٹرز کو ساتھ لیے پھرتی ہے پھر یہ کیسے توقع کر سکتی ہے کہ اس کا راز ہمارے کلینک سے افشا ہوا ہوگا؟" مریم نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے غصے کا اظہار کیا۔

"اچھا میری بات سنو مریم...... اس معاملے پر زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ڈاکٹر عظمان نے اس کی بات تقریباً کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ "اگر آج کوئی اپوائنٹمنٹ ہے تو اسے کسی اور دن پر منتقل کر دو۔ میں آج صرف کنسلٹنسی والے کلائنٹس سے ہی ملاقات کروں گا۔ کلینک پر ملتے ہیں۔"

ڈاکٹر عظمان نے کال کاٹ دی تو مریم سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جو کہ ڈاکٹر چھپا رہا ہے...... لیکن کیا بات تھی وہ اس کا اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔

دوسری جانب عظمان گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مریم قابلِ اعتبار ساتھی تھی۔ اس پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

"لیکن جو بھی ہے کوئی اندر کا ہی غدار ہے......" اس نے خود کلامی کی۔ "پیشنٹ کے آپریشن کا بالکل صحیح وقت جان لینا الگ بات ہے لیکن اس پر کیے جانے والے ٹریٹمنٹ کی تفصیلات کوئی کیسے جان سکتا ہے؟"

ڈاکٹر عظمان کے کلینک پر آنے والے بیشتر کلائنٹس امراء کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ ان کی 'خوبصورتی' کا راز، راز ہی رہے۔ ڈاکٹر عظمان نے یہ سہولت تمام کلائنٹس کو بہم پہنچا رکھی تھی لیکن اکثر ذاتی محفلوں یا چپقلشوں میں یہ لوگ خود ہی اپنے راز اُگل دیتے تھے۔

ڈاکٹر عظمان گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ نازنین ایک سیلیبریٹی تھی اور اس کی بہت پرانی کلائنٹ بھی۔ نازنین اس کے کیریئر کی ابتدا ہی سے اس کے ساتھ تھی...... وہ اسے اپنا 'تاج محل' کہتا تھا۔ خوبصورتی کا شاہکار...... لیکن کئی بار کے ٹریٹمنٹ کے باوجود اس نے آج تک یہ راز نہیں اُگلا تھا کہ نازنین کے 'لافانی حُسن' میں اس کا کتنا بڑا حصہ شامل ہے۔

اگرچہ نازنین کی پروفائل سیاسی کانٹیکٹ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بہت خفیہ نہیں تھی اور شوبزنس میں جیلسی کی وجہ سے ایک دوسرے پر پلاسٹک سرجری کرانے کے الزامات بھی لگتے رہتے تھے لیکن عدم ثبوت کی وجہ سے محض الزام ہی رہتے تھے۔

یہ معاملہ پروفیشنل جیلسی سے باہر نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کسی کو اتنی گہری سازش کر کے مفلوج کروانے کے لیے اقدامات کرنا مجرمانہ کارروائی تھی اور یہ سب کرنے والوں کی سوچ کا محرک کچھ اور ہی تھا۔ اندر سے کوئی جب تک معلومات فراہم نہ کرتا تب تک اتنی تفصیل جاننا ناممکن تھا۔

"مجھے سراغ لگانے کے لیے کلینک جانا ہوگا......" عظمان نے خود سے کہا اور تیار ہونے کے لیے اپنے بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔ وہ ماورا کو میسج کرنا نہیں بھولا تھا کہ اس کی آمد پر وہ رہائشی پورشن کے بجائے اپنے کلینک میں ہی ملے گا۔

☆☆☆

اندھیرے میں جیسے کوئی جگنو چمکا تھا اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سر درد سے بوجھل ہو رہا تھا۔ جسم میں بھی کھچاؤ اور ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا۔ ایسا عام طور پر اس دن ہوتا تھا جب اسکول میں کرکٹ میچ کھیل کر سارا دن ہلڑبازی ہوتی تھی۔

'لیکن کل تو ہم نے کوئی میچ نہیں کھیلا' سفیان کے دماغ میں بات آئی تو وہ چونک گیا۔

وہ رات کو اپنے بیڈ میں سویا تھا لیکن اب اسے ادراک ہو رہا تھا کہ وہ اپنے نرم گرم بستر کے بجائے کسی سخت کرسی پر براجمان ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اسے معلوم پڑا کہ اسے باندھ دیا گیا ہے۔

"نہیں......" وہ یکلخت ہی خوف زدہ ہو گیا۔ ماں باپ کی علیحدگی نے اسے وقت سے پہلے بڑا کر دیا تھا لیکن اس صورتِ حال نے یکلخت ہی اسے پھر سے بچہ بنا دیا تھا۔

'مجھے...... مجھے کون یہاں لاسکتا ہے؟' اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کا ذہن یہ حقیقت قبول کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اپنے آرام دہ گھر سے اسے اٹھا کر اس عجیب سے کمرے میں کوئی لے آیا ہے۔

سفیان نے اِدھر اُدھر دیکھا تاکہ حالات کا جائزہ لے سکے۔ وہ ایک مختصر سا کمرا تھا جس میں ملگجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ جس کرسی پر بندھا بیٹھا تھا، اس کے سامنے ہی ایک بیڈ موجود تھا جس پر پڑا میٹریس واضح طور پر بالکل نیا لگ رہا تھا۔ میٹریس پر ایک سیاہ پٹی بھی پڑی ہوئی تھی جس کا مقصد اسے سمجھ نہیں آیا۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جو کہ بند دکھائی دے رہا تھا۔ کھڑکی یا روشن دان ٹائپ کی کوئی چیز کمرے میں موجود نہ تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گھر کے اسٹور روم میں موجود ہو۔ کمرے میں بھی اس طرح کی بُو پھیلی ہوئی تھی جیسے اسے کافی عرصے سے استعمال میں نہ لایا گیا ہو۔

سفیان ابھی تک اپنے رات والے لباس میں ہی تھا۔ اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا اس لیے اسے زیادہ سوچنے پر سر میں تکلیف سی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

'یعنی مجھے سوتے میں ہی بے ہوش کر کے لایا گیا ہے۔' سفیان کے ذہن میں خیال آیا۔ 'لیکن مجھے یہاں کوئی کیوں لائے گا؟ میری تو کسی سے کوئی لڑائی نہیں ہے۔'

'مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔' ایک اور خیال نے ذہن میں جگہ بنائی اور ساتھ میں ہی اس نے ایک لمبی جمائی لی۔ 'لیکن میں ہوں کہاں؟ اور یہ مجھے اتنی نیند کیوں آ رہی ہے؟'

''کوئی ہے؟'' بالآخر کچھ دیر کی سوچ کے بعد اس نے آواز لگائی۔ جواب ندارد۔ اس نے رسیوں پر زور آزمائی کی لیکن جتنی مضبوط گرہیں لگائی گئی تھیں، ان کو زور لگا کر کھولنا کم از کم سفیان کے بس سے باہر کی بات تھی۔

''کوئی ہے؟'' وہ ایک بار پھر چلایا اور ہانپنے لگا۔ اسے بے ہوش کر دینے والی دوا کے اثرات شاید ابھی تک برقرار تھے کہ تھوڑا سا ہی زور لگانے اور چلّانے پر اس پر تھکن غالب آنے لگی تھی۔

اس نے ایک دو بار پھر آواز لگائی مگر کسی ذی نفس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔ اس کے اعصاب پر بھی تھکن طاری ہونے لگی اور کچھ ہی دیر بعد اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

وہ ایک بار پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''کون ہے وہ حرافہ؟'' ماورا نے دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی سوال کیا۔

اُس کی آمد کسی آندھی طوفان کی طرح ہوئی تھی۔ پوش ٹاؤن میں بنے ڈاکٹر عظمان کے کلینک میں اس نے داخل ہوتے ہی اس کے آفس کا رخ کیا تھا جہاں پر عظمان اپنے کلائنٹس کے ساتھ کنسلٹنسی کرتا تھا۔

ڈاکٹر عظمان اپنی ریوالونگ چیئر پر اس وقت نیم دراز تھا اور اس کے سامنے وہسکی کی ایک بوتل کھلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں ادھ بھرا جام تھا جس سے وہ گھونٹ گھونٹ حلق میں اتار رہا تھا۔ اس نے ماورا کی آمد پر سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

''میں پوچھتی ہوں کون ہے وہ جس کی خاطر ہمارے بیٹے کو اغوا کر لیا گیا ہے؟'' ماورا نے ایک بار پھر غصے سے پوچھا۔

وہ عظمان کی پینے پلانے کی عادت سے واقف تھی۔ اکثر خود کو پُرسکون کرنے کے لیے وہ ایک دو پیگ وہسکی کے لگا لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی غالباً وہ یہی کام کر رہا تھا۔ ویسے بھی جس طبقے میں اب ان کا شمار ہوتا تھا وہاں پر اس طرح کی 'سوشل ڈرنکنگ' کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

''اس کا نام نازنین ہے۔'' ڈاکٹر عظمان نے اپنا جام ختم کرنے کے بعد بات کا آغاز کیا۔ ساتھ ساتھ ہی اس نے پھر سے اپنا گلاس بوتل اٹھا کر بھرنا شروع کر دیا تھا۔ ''وہ میری بہت پرانی کلائنٹ ہے۔''

''ہمم.....'' ماورا ایک ہنکاری بھر کر رہ گئی۔

نازنین نام تو سنا ہوا لگ رہا تھا لیکن اس کے ذہن کے پردے پر کوئی تصویر نہیں ابھری تھی۔ فلموں ڈراموں میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔

''ماورا..... میری بات سنو۔'' عظمان ایک اور چسکی بھرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''سفیان کو اغوا ہوئے ابھی چند ہی گھنٹے ہوئے ہیں۔ میرا ایک بہت اچھا دوست پولیس میں ہے۔ تم کہو تو ہم اس سے رابطہ.....''

''تم نے اغوا کاروں کا نوٹس نہیں پڑھا تھا؟'' ماورا نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''کیا تمہارے نزدیک اپنی اکلوتی اولاد کی اتنی اہمیت بھی نہیں ہے کہ تم ان کی دھمکی کو ملحوظِ خاطر رکھو؟''

پھر..... پھر تم ہی بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' ڈاکٹر عظمان نے گلاس میں سے ایک طویل گھونٹ بھرتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔

''سب سے پہلے تو.....'' ماورا نے ایک گہری سانس لی اور پھر بولی۔ ''ہمیں یہ پینے پلانے والا کام بند کر دینا

چاہیے۔ غم غلط کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں ہے اور نہ ہی اپنی پریشانیوں کو ہم شراب میں ڈبو کر ختم کر سکتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ بھی تم سوچو اور اس پر عمل کرو وہ سوبر رہ کر ہی کرو۔''

''ٹھیک ہے.....'' ڈاکٹر عظمان نے گلاس فوراً ہی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''دوسری بات یہ ہے کہ تم مجھے فوراً سے پہلے اس عورت..... نازنین کی فائل دکھاؤ۔'' ماورا نے مطالبہ کیا۔

''تم جانتی ہو کہ ہم ڈاکٹروں نے رازداری کی قسم.....''

''بھاڑ میں گئی تمہاری ڈاکٹری اور تمہاری قسمیں.....'' ماورا نے ایک بار پھر عظمان کی بات کاٹ دی۔ ''خدا کا نام لو..... یہاں ہمارے بچے کی جان پر بنی ہے اور تمہیں اپنی ڈاکٹرانہ قسموں، وعدوں کی پڑی ہوئی ہے۔''

ڈاکٹر عظمان چند لمحے تک ساکت بیٹھا رہا تو ماورا پھر سے بول پڑی۔

''دیکھو اگر تم نے مجھے اس کی فائل نکال کر نہ دی تو میں اس پورے آفس میں تباہی پھیلا دوں گی۔ میں دیکھتی ہوں کہ کون مجھے روکتا ہے؟'' ماورا کا لہجہ سخت ہو چکا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے اس پر فوراً سے پہلے عمل درآمد بھی کر بیٹھے گی۔

ڈاکٹر عظمان اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھا اور ایک جانب بنی اپنی فائر پروف تجوری میں سے ایک فائل نکال کر لے آیا۔

''لو دیکھ لو.....'' فائل ماورا کے سامنے رکھ کر وہ ایک بار پھر سے اپنی کرسی پر ڈھے سا گیا۔

ماورا نے تیزی سے فائل کھولی تو اس کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ بارہ سال کے عرصے میں کوئی آٹھ نو بار نازنین زیرِ نشتر آ چکی تھی۔ خوبصورتی بڑھانے کے لیے جو جو طریقے رائج تھے وہ سب نازنین آزما چکی تھی۔ نازنین کی سرجری سے پہلے کی تصاویر بھی فائل میں لگی تھیں اور بلاشبہ وہ ایسے فطری حسن کی مالک تھی جسے پلاسٹک سرجری کا محتاج بالکل بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس کے جبڑوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں قدرتی طور پر ایسی تھیں جس کی تمنا کئی بالی ووڈ کی اداکارائیں بھی کرتی تھیں۔ بادام شکل کی اس کی ہلکی بھوری آنکھوں میں سبز رنگ کی بھی جھلک محسوس ہوتی تھی جس سے وہ اس عام دنیا کی باسی لگتی ہی نہیں تھی۔ ہر سرجری اور ٹریٹ منٹ کے بعد اس کا حُسن دو آتشہ ہوتا چلا گیا۔

یہاں پر ڈاکٹر عظمان کی مہارت بھی قابلِ داد تھی کہ نازنین کے چہرے پر کسی قسم کی سرجری کے آثار تک نظر نہیں آتے تھے۔ اگر ہر آپریشن کے بعد کی تصاویر کو ترتیب سے نہ دیکھا جاتا تو فرق معلوم کرنا کارے دارد ثابت ہوتا۔ ڈاکٹر عظمان نے اس کے حسین، عمر چور چہرے کو جیسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا تھا۔ حُسن کا ایک لافانی شاہکار جو قدرت کی کان میں تشکیل پایا تھا اور انسانی ہاتھ کی مہارت نے اسے تراش کر کوہِ نور بنا دیا تھا۔

''اسے بھی تمہاری سرجری کی ضرورت تھی کیا؟'' ماورا فائل دیکھتے دیکھتے رشک آمیز لہجے میں بولی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ کئی بار نازنین کو بل بورڈز اور اشتہارات میں دیکھ چکی ہے۔

''میرے بہت سارے کلائنٹس کی طرح.....'' ڈاکٹر عظمان بولا۔ ''نازنین کو بھی اپنے حُسن میں وہ کمیاں محسوس ہوتی ہیں جو ہم تم نہیں دیکھ سکتے۔''

ماورا نے بے یقینی میں سر ہلایا۔ وہ حیران تھی کہ اتنا حُسن اور پھر بھی اتنا ناشکرا پن؟ وہ نازنین کے مقابلے میں آدھی بھی حسین نہیں تھی لیکن شوہر کے ماہر پلاسٹک سرجن ہوتے ہوئے بھی کبھی اس چیز کا فائدہ اٹھانے کا نہیں سوچا تھا۔ وہ اپنی ذات اور چہرے سے نہ صرف مطمئن تھی بلکہ رب کی شکر گزار بھی رہتی تھی۔

''آخر کون ہو سکتا ہے اس نازنین کا دشمن جو میرے بیٹے کی جان تک لینے کے لیے تیار ہے؟'' ماورا نے پوچھا اور پھر عظمان کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ معذرت خواہانہ انداز میں تصحیح کی۔ ''آئی ایم سوری۔ ہمارے بیٹے کی۔''

''کوئی اس کے حُسن کا دشمن..... شاید۔'' ڈاکٹر عظمان نے کندھے اُچکا کر کہا۔

''کوئی تمہارا دشمن بھی تو ہو سکتا ہے؟'' ماورا نے آہستگی سے کہا۔ ''تمہاری شہرت کو داغدار کرنے کے لیے بھی تو کوئی یہ قدم اٹھا سکتا۔''

''میں نے اس بارے میں بھی غور کیا ہے۔'' عظمان نے کہا۔ تمہارا اندازہ بعید از قیاس نہیں ہے..... کراچی میں رہتے ہوئے یہ کام کرنا کسی خطرے سے کم نہیں ہے جب آپ کے ایک سے بڑھ کر ایک مقابل موجود ہوں۔''

ماورا یکلخت ہی آنکھیں سکیڑ کر عظمان کو بغور گھورنے

لگی۔

''عظمان ایک بات تو بتاؤ..... اگر ہمارے بیٹے کو بچانے کے لیے تمہیں اغوا کار کی باتوں پر عمل کرنا پڑا تو کیا تم یہ سب کر گزرو گے؟'' ماورا کی آواز امید و بیم کی آمیزش سے لرز رہی تھی۔ ''کیا تم نازنین کو انجکشن لگا دو گے؟''

ڈاکٹر عظمان نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہچکچا کر رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی منتشر سوچ کو اکٹھا کیا اور الفاظ ترتیب دینے لگا۔

''اگر میں وہ انجکشن نازنین کو لگا دیتا ہوں تو اس کا چہرہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو کر رہ جائے گا۔'' عظمان نے آہستگی سے کہا۔ ''اور اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ میرے انجکشن لگا دینے کے بعد وہ لوگ سفیان کی جان بخش دیں گے۔''

''لیکن..... لیکن ہمارے پاس اور کوئی آپشن بھی تو نہیں ہے۔'' ماورا اس کے الفاظ پر تڑپ کر بولی۔ ''کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ ابھی اغوا کاروں کی بات مان لو اور بعد میں کسی طریقے سے نازنین کا چہرہ ٹھیک کر دو؟''

''تمہیں لفظ ہمیشہ کی سمجھ نہیں آئی ہے کیا؟!!'' ڈاکٹر عظمان نے اپنے ہاتھ میز پر مارتے ہوئے کہا۔ ''ماورا ہو کیا گیا ہے تمہیں؟ اگر میں نے بات مان کر یہ سب کر بھی لیا تو میں پکڑا جا سکتا ہوں۔ میڈیکل کونسل میرا لائسنس کینسل کر سکتی ہے۔ مجھے جیل بھی ہو سکتی ہے۔''

''میں، میں اور میں۔'' ماورا غصے سے چلائی۔ ''تم جیسے رذیل اور خود غرض شخص کو اپنے علاوہ کچھ نظر بھی آتا ہے؟''

''میرا خواب تھا کہ میں ایک مشہور پلاسٹک سرجن بنوں..... اب جب میرے خوابوں کی تکمیل کا وقت آیا ہے تو تم چاہتی ہو کہ میں اپنے ہاتھوں سے ہی سب کچھ برباد کر دوں۔ جبکہ میرے بیٹے کی جان بخشی کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔'' ڈاکٹر عظمان کی آواز سفیان کے ذکر پر بھرا کر رہ گئی تھی۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ ہمیں فوراً پولیس سے رابطہ کر لینا چاہیے۔''

یہ باتیں سن کر ماورا کی آنکھوں میں ایک آتشی لہر دوڑ گئی۔

''ڈاکٹر عظمان شیخ..... میری یہ بات یاد رکھنا کہ اگر تم نے بھول کر بھی پولیس کو مطلع کرنے کی کوشش کی تو میں بذاتِ خود تمہیں برباد کر کے رکھ دوں گی۔'' ماورا کے لہجے میں غیظ و غضب پھنکاریں مار رہا تھا۔ ''اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو گیا تو تم اپنے اس کیریئر کو سمجھنا کہ اپنے ہاتھوں سے آگ میں جھونک چکے ہو۔''

ڈاکٹر عظمان خاموشی سے اس کے تیور دیکھ رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ ماورا کا یہ روپ دیکھ کر دل ہی دل میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔

''اور ہاں..... اس سے پہلے کہ تمہیں اپنی ساکھ بچانے کے لیے اپنے بیٹے کی جان قربان کرنی پڑے۔'' ماورا نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے خود ہی تلاش کر لوں گی۔''

ماورا وہاں سے غصے میں اٹھی اور جاتے جاتے عظمان کے آفس کا دروازہ اتنی زور سے بند کیا کہ اس پر لگا شیشہ ٹوٹ کر بکھر گیا۔

عظمان خالی نگاہوں سے فرش کو دیکھتا رہا جہاں اُس کے دل کی طرح کانچ کئی ٹکڑوں میں بکھرا پڑا تھا۔

☆☆☆

نازنین نے فور وہیل سے اترتے ہی اس کا دروازہ غصے سے بند کیا اور تیزی سے چلتی ہوئی عمارت میں داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع لاؤنج تھا جس میں سامنے ہی ریسپشن ڈیسک بنا ہوا تھا اور دائیں بائیں دفاتر تھے۔ وہاں موجود لڑکی کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ قیصر کے آفس کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے سارا راستہ قیصر کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ خفگی کی ضرورت نہیں تھی لیکن دفتر میں اے سی چل رہا تھا۔ وہ قیصر کی جہازی سائز کی کرسی پر براجمان ہو گئی۔

ساتھ والے کمرے کی شیشے کی دیوار تھی جس میں بیٹھی سیکریٹری نے نازنین کو دیکھ کر آفس بوائے کو کال کیا جس نے فوراً ہی پانی لا کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔

''اور کچھ لاؤں؟'' آفس بوائے نے پوچھا۔

''نہیں اور کچھ لانے کی ضرورت نہیں ہے.....'' نازنین نے اپنا غصہ اس پر نکالتے ہوئے کہا۔ ''اور خود بھی اب اپنی شکل تب تک نہیں دکھانا جب تک تمہیں بلایا نہ جائے۔''

آفس بوائے گھبرا کر باہر نکلنے لگا تھا کہ نازنین پھر بولی۔ ''یہ جاتے جاتے بلائنڈ رز بھی بند کرتے جاؤ۔ جب آؤ اس کی منحوس شکل دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔''

نازنین تب تک خشمناک نگاہوں سے قیصر کی سیکریٹری کو دیکھتی رہی جب تک آفس بوائے نے بلائنڈ رز بند نہیں کر دیے۔ وہ قیصر کے تو ایسے غصے کا عادی تھا لیکن

نازنین کو پہلی بار اس طرح دیکھ کر حیران و پریشان رہ گیا تھا لیکن کچھ بھی کہے بغیر کان دبا کر وہاں سے نکل گیا۔

نازنین نے پانی اٹھایا اور غٹا غٹ پی گئی تاکہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو سکے۔

اسی وقت قیصر بلوچ اندر داخل ہوا۔ اُس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ راستے بھر..... وہ نازنین کو مخاطب کرنے کے جتن کرتا رہا تھا لیکن اس نے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیوں کرتی ہو ایسا؟'' قیصر کے جُثے کی طرح اس کی آواز بھی بھاری تھی۔

''ہا.....'' نازنین طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''یعنی جو سوال مجھے پوچھنا چاہیے، وہ بھی اب تم پوچھو گے؟''

''چلو تم پوچھ لو۔'' قیصر نے کہا۔

''خود ہی بتا دو کہ آج اس طرح شوٹنگ پر آ کر مجھے یہاں لانے کا کیا مقصد تھا؟'' نازنین کا لہجہ ابھی بھی درشت تھا۔

''کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں نازنین۔'' قیصر نے کہا تو نازنین سر جھٹک کر رہ گئی۔

''محبت کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں سانس بھی تمہاری مرضی سے لوں۔'' نازنین نے کہا۔ ''کم از کم دنیا کے سامنے تو یہ بھرم رہنے دو کہ میں تمہاری بیوی ہوں کوئی زرخرید لونڈی نہیں۔''

قیصر کا چہرہ ان الفاظ پر ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا لیکن پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''اوڈارلنگ..... تم کب سے اس دنیا کی پروا کرنے لگیں؟ ویسے بھی میرے حساب سے شوٹنگ ٹائم ختم ہو چکا تھا سو تمہیں لینے کے لیے آ گیا۔ اس میں اتنا غصہ ہونے کی کیا بات ہے؟''

''قیصر بلوچ، میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں لیکن پلیز یہ ڈھکوسلے کرنا چھوڑ دو۔'' نازنین کی آواز اب رُندھ گئی تھی۔ ''بیس سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو اور ابھی تک تمہاری اپنی بیوی پر شک کرنے کی عادت نہیں گئی۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' قیصر نے انکار میں سر ہلایا البتہ نازنین کے الزام پر اس کے کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔

''ایسی ہی بات ہے.....'' نازنین نے اس کے انکار کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''جب جب میں نے کسی اور پروڈکشن میں کام کیا ہے تم یہی کرتے ہو۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے دیگر پروڈکشن ہاؤسز کے ساتھ کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ارباب عباسی کے ساتھ تم مجھے کسی پروجیکٹ میں کاسٹ نہیں کر رہے کہ میرا اس کے ساتھ رومانس تمہیں پسند نہیں اور وہ بیچارہ شادی جیسے بھیڑیوں کے جنگل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی یہ اشعر اور شاد کی مشترکہ پروڈکشن بھی میں تمہاری سفارش پر ہی کر رہی ہوں..... لیکن یقین مانو اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو میں بیچ میں ہی یہ پروجیکٹ چھوڑ دوں گی۔ پھر بھگتتے رہنا اپنے دوستوں کے ایگل نوٹس۔''

قیصر چند لمحوں تک اس کی دھمکی پر غور کرتا رہا کہ یہ ڈراوا ہے یا نازنین سچ کہہ رہی..... پھر وہ سر جھکاتے ہوئے بکھرے لہجے میں بولا۔

''میں..... میں نہیں برداشت کر پاتا۔ میرا خود پر اختیار ہی نہیں رہتا جب جب میں سوچتا ہوں کہ تم کسی اور کے ساتھ ہو۔''

''تم پھر کیوں مجھے مجبور کرتے ہو کہ میں دوسروں کے ساتھ کام کروں؟'' نازنین اس کے انداز پر پگھل کر رہ گئی۔ ''میں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ میں شوبزنس چھوڑ کر تمہارے لیے گھر بیٹھ جاتی ہوں لیکن یہ بھی تمہارے لیے قابلِ قبول نہیں۔''

''یہ تو سچ ہے.....'' قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے جیسا ٹیلنٹ بھی گھر بیٹھ جائے گا تو پھر گھر بیٹھے ٹک ٹاکرز ہی خود کو ٹیلنٹ کے طور پر سامنے لے آئیں گے۔''

''مت کیا کرو ایسے.....'' نازنین نے اب کی بار مسکراتے ہوئے کہا۔ ''شاد بہت عجیب نظروں سے سوال کر رہا تھا تمہاری آمد پر۔''

''لعنت بھیجو اُس پر..... میری طرف سے معذرت قبول کرو۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔'' قیصر کے لہجے میں معذرت بھری ہوئی تھی۔ ''کل رات کا ڈنر تمہارے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کریں گے۔''

''دبئی والے؟'' نازنین نے شرارت سے پوچھا۔

''نہیں..... یہیں کراچی میں۔'' قیصر نے حیرت سے کہا۔

''پھر کل کیوں؟ آج رات کیوں نہیں؟'' نازنین نے ایک ادا سے کہا تو قیصر کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''آج رات ایک بزنس میٹنگ ہے اس لیے۔'' قیصر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے..... لیکن یاد رکھنا کہ اگلی بار ایسا کچھ ہوا

تو بات ڈنر تک نہیں رہے گی۔'' نازنین کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور اس کے چہرے پر جھک گئی۔ ایک طویل بوسے کے بعد اس نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے کہا۔ ''میں گھر جارہی ہوں انور کے ساتھ..... تم کام کرو۔''

اس کے جانے کے بعد قیصر تیزی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ نازنین ریسیپشن تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کردیا۔

''ہاں انور..... تم سے جو کہا تھا، وہ ہوگیا؟'' اس نے کال ریسیو ہونے پر پوچھا۔

''جی صاحب ہوگیا۔'' دوسری جانب سے انور کی آواز آئی۔

''ٹھیک ہے.....'' قیصر نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''نازنین باہر آرہی ہے، اسے اس معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔''

یہ کہہ کر اس نے دوسری جانب سے جواب سنے بغیر کال کاٹ دی۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ نازنین بلڈنگ سے باہر نکل چکی تھی۔

☆☆☆

باہر نکل کر اپنی کار میں بیٹھتے ہی ماورا کو خیال آیا کہ یقیناً کوئی شخص اس بات کو یقینی بنانے کے لیے موجود ہوگا کہ وہ پولیس سے رابطہ نہ کریں۔ ابھی رش ٹائم شروع نہیں ہوا تھا اور سڑک پر بہت کم گاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ماورا نے ان پر ایک گہری نگاہ ڈالی لیکن کوئی بھی گاڑی اسے مشکوک دکھائی نہ دی۔

ماورا جب..... ڈاکٹر عظمان کے کلینک سے باہر نکلی تو اس کا صدمے سے بُرا حال تھا۔ اگرچہ عظمان کا رویہ اس کے سابقہ ریکارڈ کو مدِنظر رکھ کر کوئی عجیب نہیں تھا لیکن پھر بھی اکلوتے بیٹے کو یوں اپنے کیریئر..... کے لیے داؤ پر لگانے والی بات سن کر اسے دھچکا ہی لگا تھا۔

خوف اور غصے سے ماورا کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ کالونی سے نکل اس نے سڑک کے ایک جانب گاڑی روکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''یا اللہ میرا بیٹا.....'' اسٹیئرنگ وہیل سے سر ٹکائے وہ روئے جارہی تھی۔ ''یا اللہ اس کی حفاظت کرنا۔''

ایک ہی سانس میں وہ دعائیں بھی مانگ رہی تھی اور عظمان کو گالیاں بھی دیے جارہی تھی۔ اس کے نزدیک یہ سب عظمان کا قصور تھا کہ اس کا بیٹا اس مشکل میں پڑ گیا تھا۔ ماورا پڑھنے لکھنے سے تعلق رکھنے والی عورت تھی۔ شادی سے پہلے اسپورٹس وغیرہ کی دلچسپی کب کی ختم ہوچکی تھی۔ اب بھی اس نے اپنے بیٹے کے لیے مثال بننے کے لیے جاگنگ اور فٹ نیس کے اقدامات شروع کیے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ اس طرح کے عملی اقدامات سے دور ہی رہتی تھی۔ اس کا اصل کام ڈیسک اور ٹیبل پر بیٹھ کر کمپیوٹر کے ذریعے ہی ہوتا تھا۔

''مجھے بدلنا ہوگا.....'' اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے پُرعزم انداز میں خود سے کہا۔ ''مجھے اپنے بیٹے کے لیے بدلنا ہوگا۔ مجھے ہی اس کی جان بچانے کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔''

خود کو اطمینان دلانے کے بعد وہ قدرے بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ 'یقیناً وہ سفیان کے لیے کچھ کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔' اس کا وجدان اسے یہ تسلی دے رہا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو ایک سرمئی مہران کو دیکھ کر چونک گئی۔ یہ گاڑی تو عظمان کے کلینک کے باہر بھی اسے نظر آئی تھی۔ اس پوش علاقے میں ایسی چھوٹی گاڑی عجیب لگ رہی تھی۔ ماورا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

'کیا انوا کا ران پر واقعی نگاہ رکھے ہوئے ہیں؟ کیا وہ اب بھی اس کی نگرانی کررہے ہیں؟' اس کا ذہن اچانک ہی بہت سارے خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

ماورا نے تعاقب کا یقین کرنے کے لیے آہستہ سے اپنی گاڑی ٹریفک میں شامل کرلی جس میں اب اضافہ ہونے لگا تھا۔ اسکول اور کالج کے بچوں کے علاوہ آفس جانے والوں کا وقت بھی ہونے لگا تھا۔

سرمئی مہران چند گاڑیوں کا وقفہ چھوڑ کر اُس کے پیچھے آنے لگی۔ اتنے فاصلے سے نمبر پلیٹ پڑھنا ناممکن تھا۔ اپنے پرس کی تلاشی لیتے ہوئے ماورا نے فون نکالا اور ایک نمبر ڈائل کردیا۔

''ہیلو.....'' ایک جانی پہچانی آواز نے تان لگاتے ہوئے ہیلو کہا۔

''ہیکر..... شکر ہے تم نے فون اٹھالیا۔'' ماورا نے بے ساختہ کہا۔

شاکر عرف ہیکر کراچی یونیورسٹی میں ماورا کا ایک شاگرد تھا جو اپنی پی ایچ ڈی کی ریسرچ اس کے پاس کررہا تھا۔ اس کی ریسرچ کا موضوع نینو ٹیکنالوجی کا مائیکرو چپس میں استعمال تھا۔ بے پناہ صلاحیتوں کا حامل یہ نوجوان اکثر مذاق کرتا تھا کہ اگر بل گیٹس اس کی خدمات حاصل کرلیتا تو

اسے پاکستانیوں میں نیٹو چپ داخل کرنے کے لیے کم از کم ویکسین اور وبا کا ڈرامانہ کرنا پڑتا۔

اس کے دوست اکثر کہتے تھے کہ اگر شاکر اپنی حرکتوں کی وجہ سے جیل نہ گیا تو یقیناً آئی ٹی میں کوئی انقلاب ضرور لے آئے گا۔ اسے ہیکر کا نام اس کی حرکتوں کی وجہ سے ہی دیا گیا تھا۔ ماورا اکثر ہی اسے نصیحتیں کرتی رہتی تھی کہ یہ لوگوں کے سوشل میڈیا اکاؤنٹ ہیک کرنے کے بجائے اپنے کام پر توجہ دے تو کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے۔ وہ بھی ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا۔ سوشل میڈیا اکاؤنٹ ہیک کرنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا..... زیادہ تر وہ خفیہ معلومات کے حصول کے لیے 'ڈارک ویب' میں گھسا رہتا تھا اور اسے اپنی 'ریسرچ' کا نام دیتا تھا۔

''ہیکر..... میری بات توجہ سے سنو۔'' ماورا نے تیزی سے کہا۔ ''میں ابھی اس بات کی وضاحت نہیں کر سکتی لیکن میں چاہتی ہوں کہ ایک معاملے میں تم اپنی 'ریسرچ' کر کے مجھے بتاؤ۔''

''ہائیں..... یہ میں کیا سن رہا ہوں۔'' شاکر نے حیرت سے کہا۔ ''اخلاقیات پر لیکچر دینے والی میڈم ماورا آج مجھ سے 'ریسرچ' کرنے کا کہہ رہی ہیں؟''

''ہیکر فضول بحث کا وقت نہیں ہے..... پلیز میرا کام کردو۔'' ماورا نے سنجیدگی سے کہا۔

''آپ کے لیے تو کچھ بھی کر سکتا ہوں میڈم۔'' شاکر نے ایسے انداز میں کہا کہ ماورا اس کو کورنش بجالاتے ہوئے محسوس کر سکتی تھی۔ ''آپ بس مجھے کام بتائیں۔''

ماورا نے اسے نازنین کا نام، پتا اور تاریخ پیدائش دی اور کہا۔

''اس عورت کے بارے میں جو جو کچھ معلوم کر سکتے ہو وہ معلوم کرو۔ گرفتاری، مقدمہ، سوشل ورک..... جو کچھ اس کے بارے میں جان سکتے ہو وہ معلوم کرو اور مجھے بتاؤ۔ اور ہاں..... اگر اس کے لیے تمہیں کہیں سسٹم بھی ہیکنگ کرنے پڑے تو گریز نہیں کرنا۔ یہ بہت ارجنٹ کام ہے۔''

''تو آپ مجھ سے آج یہ نہیں کہیں گی کہ اپنا خیال رکھنا؟'' شاکر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''جو دل میں آئے وہ کرو.....'' ماورا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ ایک بار پھر سے عقبی آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ سرمئی مہران ابھی بھی اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا لیکن ابھی تک روشنی ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنے فاصلے سے تعاقب کرنے والے کو دیکھ سکتی۔ آگے جا کر ایک سرخ بتی پر اس نے کار روک دی۔ وہ بے تابی سے اسٹیئرنگ وہیل پر انگلیاں تھرکا رہی تھی۔ اس کے پورے وجود میں اضطراب کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

''اتنے قریب ہو کر بھی میں انجان رہ جاؤں؟'' اس نے خود کلامی کی۔ ''نہیں..... ایسا نہیں ہونا چاہیے۔''

اس نے اپنا فون اٹھایا اور ویڈیو ریکارڈنگ آن کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی پھر باہر نکل آئی۔ اسی لمحے ٹریفک لائٹ سبز ہو گئی۔ اس حرکت پر کئی کار سواروں نے غصے میں ہارن بجائے لیکن وہ بے پروا کیے بغیر ہی پیچھے کی جانب دوڑی جہاں سرمئی مہران تھی۔ اسے ڈرائیور کا خاکہ نظر آ رہا تھا لیکن وہ ایک ٹوپی اور سن گلاسز سے زیادہ کچھ نہ دیکھ پائی۔

جیسے ہی وہ مہران کے پاس پہنچی اس کے ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ فضا میں گونجی اور مہران آگے ٹھہری ایک ہنڈا کار سے ٹکرا گئی جو اس دھچکے کے زیر اثر آگے موجود ایک ایس یو وی میں جا لگی۔

ماورا اس کی اس حرکت پر سکتے میں ہی رہ گئی۔ مہران کے ڈرائیور نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور گاڑی ریورس کرتے ہوئے گھما دی اور اپنے پیچھے والی گاڑی سے جا ٹکرایا۔ لوہے اور اسٹیل کے ٹکراؤ کی آوازیں گونج رہی تھیں اور اس میں اب باقی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کی غصے میں دی جانے والی گالیاں بھی شامل ہونے لگی تھیں۔

مہران والے نے چھوٹی گاڑی ہونے کا فائدہ اٹھایا اور اسے موڑ کر تیز رفتاری سے نکل گیا۔ ماورا ہکا بکا تھی لیکن اس نے فوراً ریکارڈنگ بند کی۔ ویڈیو کوئی بہت اچھی کوالٹی میں نہیں بن سکی تھی کیونکہ بھاگتے دوڑتے اس کا کیمرا بہت زیادہ ہل رہا تھا۔

اس نے فوراً کال ملائی جو تیسری رنگ پر وصول کر لی گئی۔

''ہیکر آپ کی مزید کیا خدمت کر سکتا ہے؟'' شاکر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ایک سرمئی مہران ہے..... میں نمبر صحیح طرح نوٹ نہیں کر پائی ہوں لیکن ویڈیو بنائی ہے وہ ابھی تمہیں واٹس ایپ کرتی ہوں۔ اس کو فوراً سے پہلے تلاش کرو۔'' ماورا نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی اور فون بند کر دیا۔

پولیس سائرن کی آواز سن کر ماورا نے فوراً اپنے دماغ

میں اپنی گاڑی کا انجن بند ہونے کی کہانی تیار کرلی۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ باقی سب مہران کے ڈرائیور پر جتنا غصہ کریں گے اس بیچ میں کسی کو مادرا کی گاڑی روکنے کی حرکت شاید ہی یاد رہے۔

☆☆☆

نمرہ دروازہ کھولنے سے پہلے رک گئی۔ ادھ کھلے دروازے کے اندر سے رانیہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ساجد اب سب تمہارے ذمے ہے.....'' رانیہ کے لہجے میں غصہ بھرا ہوا تھا۔ ''اُسے بچ کر نہیں جانا چاہیے۔''

''ایسا ہی ہوگا رانیہ.....'' ساجد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بس تم یہ رونا دھونا بند کرو۔ میں نے نمرہ کو بھی کال کر دی ہے، وہ آتی ہی ہوگی۔ اُس کے ساتھ کہیں آؤٹنگ پر جاؤ۔ پریس کو میں سنبھال لوں گا۔''

نمرہ نے مزید گفتگو دروازے کے باہر سے سننے کے بجائے اندر جانے کا فیصلہ کرلیا اور دستک دیتے ہوئے بولی۔ ''میں اندر آجاؤں؟''

''ہاں ہاں نمرہ آجاؤ.....'' رانیہ نے کہا تو وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ رانیہ اپنے بستر پر ہی نیم دراز تھی جبکہ ساجد ایک جانب کرسی پر بیٹھا تھا۔ رانیہ کی آنکھیں سوجی ہوئی لگ رہی تھیں جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو۔

''اف..... یہ تم نے اپنا کیا حشر کیا ہوا ہے؟'' نمرہ اس کی حالتِ زار پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

''یہی تو میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ ایسے سکینڈل تو شوبزنس کا حصہ ہیں.....'' ساجد نے گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔ ''یہ چل کرنے کے بجائے روئے جارہی ہے۔''

''اب اتنی بھی معمولی بات نہیں ہوئی ہے۔'' نمرہ نے غصے سے کہا۔ ''کل تک جو پریس رانیہ کو حسن کی رانی اور بیوٹی کوئین کے خطاب دیتے تھے، آج وہ اسے 'پلاسٹک باربی' کے نام سے پکار رہے ہیں۔''

رانیہ اپنے بارے میں یہ کلمات سن کر سسک کر رہ گئی۔

''اوہو..... پتا نہیں تم لڑکیاں کب یہ بات سمجھو گی؟'' ساجد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''شوبزنس میں کیسی ہی پبلسٹی کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ گڈ پبلسٹی ہی کہلاتی ہے۔ جب مفت میں شہرت مل رہی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے کہ دنیا اسے بدنامی کہے؟''

''عجیب ہی سوچ ہے تمہاری.....'' نمرہ نے ناگواری سے کہا۔

''عجیب نہیں ہے..... یہی دنیا کی حقیقت ہے۔'' ساجد نے کہا۔ ''سب ہی جانتے ہیں کہ پری وش ثبات نے کس طرح کئی درجن پلاسٹک سرجریز کرائی ہیں..... لیکن آج کوئی بھی یہ بات یاد نہیں رکھتا بلکہ سب ہی اس کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔ حال ہی میں اسے نمبر ون بیوٹی سوپ کی برانڈ ایمبیسڈر کا کانٹریکٹ بھی مل گیا ہے۔''

رانیہ کے چہرے پر پہلی بار اطمینان کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ نمرہ بھی پری وش کی مثال سن کر خاموش ہو گئی..... پلاسٹک سرجری کے باوجود اس وقت وہ سب سے مشہور ماڈل تھی، حتیٰ کہ اسے حال ہی میں صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔

''پھر میں کیا کروں؟'' رانیہ نے پوچھا۔ اُس کا لہجہ ابھی بھی سوگواری کا غماز تھا۔

''سب سے پہلے تو یہ رونا دھونا بند کرو.....'' ساجد نے کہا۔

''ہاں اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔ رونے کا اب کیا فائدہ؟ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔'' نمرہ نے ساجد کی تائید کی۔

''گھومو پھرو..... باہر نکلو۔ اپنی شوٹنگز میں حصہ لو۔'' ساجد نے کہا۔ ''جن لوگوں نے تمہارے خلاف یہ سازش کی ہے جب تمہیں ہنستا کھیلتا دیکھیں گے تو خود ہی جل کر خاک ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے.....'' رانیہ نے قدرے بیزاری سے کہا۔ وہ ساجد کی ایک ہی بات سن کر تنگ آگئی تھی۔ وہ اسے یہ سمجھانے سے قاصر تھی کہ جب دل کا موسم اچھا نہ ہو تو گھومنے پھرنے کا کہاں مزہ آئے گا۔ ''تمہیں میں نے جو کام کہا ہے، تم وہ کرو۔ میں نمرہ کے ساتھ کہیں شاپنگ وغیرہ کرآؤں گی۔''

''اوکے.....'' ساجد نے کہا اور سلام دعا کرنے کے بعد نکل گیا۔

''کیا کام بتایا ہے تم نے اِسے؟'' نمرہ نے ساجد کے جاتے ہی پُراشتیاق لہجے میں دریافت کیا۔

''کچھ خاص نہیں.....'' رانیہ نے کندھے اُچکائے۔ ''اتنی دیر سے دماغ چاٹ رہا تھا کہ میں اس سکینڈل کو سر پر سوار نہ کروں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بھی جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا کہ چینل میں اپنے رابطوں سے معلوم کرے کہ میرے بارے میں اتنی پرسنل معلومات آخر اُن تک پہنچیں

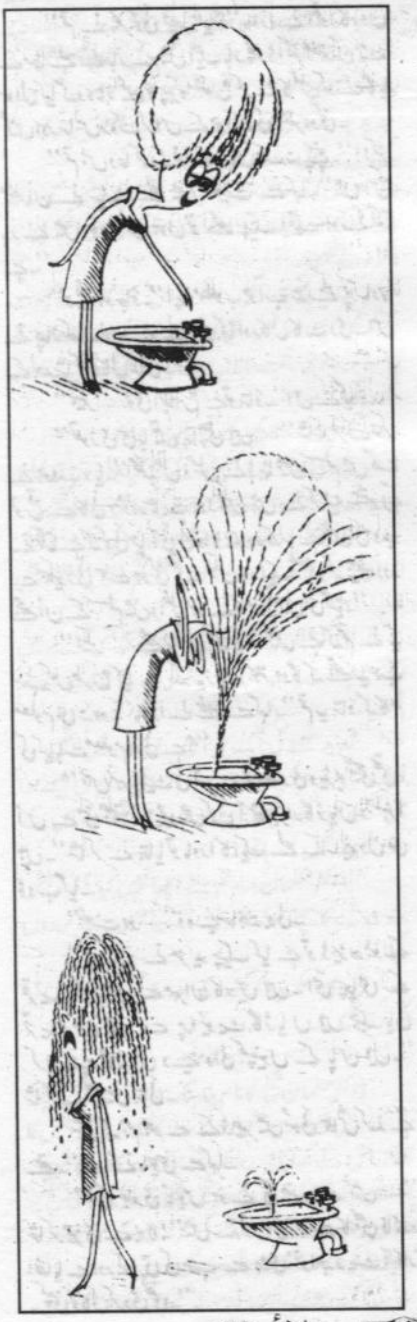

کیسے؟''

''اوہ.....'' نمرہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

رانیہ نے جب کوئی بات نہ کی تو تھوڑی دیر بعد وہ بولی۔ ''کہیں باہر جانے کا ارادہ ہے؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' رانیہ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں یہ بات لیک کیسے ہوگئی۔''

اُس کی سوئی ابھی تک اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔

''تمہیں کسی پر شک ہے؟'' نمرہ نے پوچھا۔

''نہیں.....'' رانیہ بولی۔ ''مجھے شک نہیں ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ سب ڈاکٹر عظمان کا کیا دھرا ہے..... میں اُس سے اس بات کا ایسا بدلہ لوں گی کہ اس کی نسلیں تک میرے نام سے کانپیں گی۔''

رانیہ غصے سے لرزتے ہوئے اپنے قاتلانہ عزائم کا اظہار کر رہی تھی اور نمرہ حیرت سے اپنی سہیلی کا یہ روپ دیکھتی رہی..... جس انداز میں وہ بول رہی تھی، اُسے دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔

☆☆☆

ماورا مہران کار والے واقعے کے بعد کئی گھنٹوں تک اسی وہم میں مبتلا رہی کہ ابھی تک اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔ اس دوران اس کی یہی کوشش رہی کہ کسی طرح اسے پتا چل جائے کہ اُس کا پیچھا کون کر رہا ہے؟ کوئی سراغ نہ ملنے کے باوجود اس نے بہتر یہی سمجھا کہ کہ اپنے گھر جانے کے بجائے کسی ہوٹل میں کمرا حاصل کرلے۔

سفیان کے اغوا کے بعد اب اُسے اپنا گھر غیر محفوظ لگ رہا تھا۔ ایسا بھی ممکن تھا کہ مجرموں نے اس کی نگرانی کے لیے گھر میں کوئی 'بگ سسٹم' لگا دیا ہو۔ اُس نے واٹس ایپ پر عظمان کو ایک پیغام بھیج دیا کہ وہ کسی سے بھی اپنے آفس یا گھر کے لینڈ لائن فون سے بات نہ کرے۔

''مجھے بھی کال کرنی ہو تو واٹس ایپ پر ہی کال کرنا۔'' ماورا نے عظمان کو تفصیل بتانے کے بعد ایک صوتی پیغام چھوڑتے ہوئے کہا۔

شاید وہ واقعی میں ضرورت سے زیادہ اوہام کا شکار ہو رہی تھی۔

شام کو ڈاکٹر عظمان کی کال آئی لیکن اُس کے پاس ماورا کے لیے کوئی نئی خبر نہیں تھی۔ اپنے آفس میں تفتیش کرنے کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ وہ ابھی تک اپنی ٹیم میں موجود غدار کو تلاش کرنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔

''تم نے پھر کوئی فیصلہ کیا؟'' ماورا نے اغوا کاروں کے مطالبے کے بارے میں ایک بار پھر ڈاکٹر عظمان سے سوال کیا کہ وہ نازنین کا چہرہ مفلوج کرنے کا عمل کرے گا یا نہیں اور سانس روک کر اس کے جواب کی منتظر ہوگئی۔

''تم بس دعا کرو کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچے۔'' ڈاکٹر عظمان نے سپاٹ لہجے میں قطعیت سے کہا۔ ''میں اس بارے میں سوچنا ہی ہوں تو مجھے پینک اٹیک ہونے لگتا ہے۔''

''دفع ہو جاؤ۔'' اپنا مطلوبہ جواب نہ ملنے پر ماورا نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔ اس کے بعد شاکر کو کال ملائی۔

''ہیکر..... کوئی اطلاع ہے تو بتاؤ۔'' اس نے کہا۔

''تھوڑی سی باتیں پتا چلی ہیں.....'' شاکر عرف ہیکر نے جواب دیا۔ ''محکمہ نقل و حمل کے ڈیٹا بیس سسٹم میں گھسنا توقع سے کافی دشوار ثابت ہوا لیکن میں نے کر لیا۔ انہوں نے لگتا ہے کہ کوئی نیا آئی ٹی والا بندہ رکھ لیا ہے جس کی وجہ سے سیکورٹی سخت ہوگئی تھی۔ لیکن وہ ایک غلطی کر بیٹھے اور مجھے اُن کے سسٹم میں داخل ہونے کا موقع مل ہی گیا۔''

''ہیکر..... مجھے بالکل بھی پروا نہیں ہے کہ تم نے یہ سب کس طرح کیا..... بلکہ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ مجھے یہ سب معلوم ہی نہ ہو۔'' ماورا نے غصے سے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ کام کی کیا بات معلوم ہوئی ہے؟''

''جس نمبر پلیٹ کی آپ نے دھندلی ویڈیو بھیجی تھی، اُس سے ملتی جلتی کراچی میں کوئی آٹھ ہزار گاڑیاں رجسٹرڈ ہیں۔'' شاکر نے بتایا تو ماورا کا ایک لمحے کے لیے دل ہی ڈوب گیا۔

''لعنت ہو.....'' وہ بے ساختہ بولی۔

''خیر میں نے مزید چیک کیا ہے تو ڈیڑھ سو کے قریب اُن میں سے مہران کاریں ہیں۔ اسّی پچاسی کے قریب ان میں سے پرائیویٹ گاڑیاں ہیں جبکہ باقی کرائے پر گاڑیاں دینے والی کمپنیوں کے پاس ہیں۔'' شاکر نے تفصیل بتائی۔

یعنی کہ ہم بھوسے کے ڈھیر میں سُوئی تلاش کر رہے تھے۔'' ماورا نے مایوسی سے کہا۔

''اتنی جلدی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں.....'' شاکر تیزی سے بولا۔ ''میں نے فون کی سہولت کا بھی فائدہ اٹھایا ہے اور کراچی کی سب سے بڑی 'خواجہ رینٹ آکار' کمپنی کو کال کر دی تھی۔''

''اوہ..... پھر کیا نتیجہ نکلا؟'' ماورا کے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

''ویسے تو شاید وہ قابو میں نہ آتے لیکن میں نے پولیس کا تفتیشی افسر بن کر بات کی تو فوراً ہی سیدھے ہو گئے۔'' شاکر نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا کہ ایک گاڑی ایکسیڈنٹ کر کے غائب ہوگئی ہے اور ہمیں اس کی تلاش ہے تو اتفاق کی بات ہے کہ انہوں نے بتایا کہ 'بلیک روز پروڈکشن ہاؤس' نے کل ہی ان سے کرائے پر ایک گرے کلر کی مہران حاصل کی ہے۔''

''بلیک روز؟'' ماورا نے ایک بار پھر سے فلموں ڈراموں سے اپنی عدم دلچسپی و عدم معلومات کا اظہار کیا۔

''بلیک روز پروڈکشن ہاؤس قیصر بلوچ کی ملکیت ہے..... اور اتفاق سے یہ شخص اس نازنین کا شوہر..... ہے جس کے بارے میں آپ نے مجھے معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی تھی۔'' شاکر نے وضاحت کی۔

''شکریہ میرے ہونہار ہیکر.....'' ماورا بولی تو اس کی آواز سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ ''مزید معلومات بھی حاصل کرو۔ میں آگے کا پلان بنا کر پھر تمہیں کال کرتی ہوں۔''

''وہ مارا.....'' کال کاٹنے کے بعد ماورا نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا۔ پریشانی کے عالم میں اسے آگے بڑھنے کے لیے ایک سراغ مل گیا تھا۔

''قیصر بلوچ کیوں اپنی بیوی کا دشمن ہو گیا ہے؟ کیا بے وفائی؟ یا پھر نازنین نے اسے چھوڑ کر جانے کی دھمکی دی ہے؟ ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہ سلوک کرنا چاہتا ہے؟ اور اس سب کے لیے وہ سفیان کی جان کے درپے ہو گیا ہے..... کیا وہ اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر سفیان کی جان لے سکتا ہے یا پھر یہ خالی خولی دھمکی ہی ہے؟'

خیالات کی رو تھی جس میں وہ بہتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اُس نے تیزی سے اپنا اگلا لائحہ عمل طے کرنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

ماورا پودوں کی باڑ کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ خوبصورتی سے تراشی اس باڑ کے عقب سے اُس نے بلوچ ہاؤس کا دوربین کی مدد سے بغور جائزہ لے لیا تھا۔

'مجھے پولیس کو مطلع کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟' وہ ابھی تک اسی سوچ میں مبتلا تھی۔

ایک پورا دن اور پوری رات گزارنے کے بعد اس

نے یہ پلان بنایا تھا لیکن اب جب عمل کا وقت آیا تھا تو شبہات میں پڑ گئی تھی۔

بلوچ ہاؤس بہت وسیع و عریض احاطے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ مرکزی شاہراہ سے ہٹ کر یہ بالکل ہی علیحدہ پراپرٹی تھی جہاں پر عام لوگوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ ماورا وہاں سورج غروب ہونے کے بعد پہنچی تھی اور وہاں کی غیر معمولی خاموشی اسے مزید کوئی قدم اٹھانے سے روک رہی تھی۔ اُسے امید تھی کہ سفیان شاید اسے اس عمارت میں مل جائے گا۔ اگر نہ بھی ملتا تو اسے امید بندھی تھی کہ کم از کم وہ اس کی برآمدگی کے لیے کوئی سراغ ضرور تلاش کر لے گی۔

پتھر سے بنی وہ عمارت کسی قلعے کا تاثر دیتی تھی۔ پرانے زمانے کی کسی حویلی کو تزئین و آرائش کے بعد اسے خوبصورت مکان میں تبدیل کیا گیا تھا۔ ایک جانب تین تین گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے گیراج بنا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ قدیم حویلی کے اصطبل کو گیراج میں تبدیل کیا گیا تھا۔

شاکر نے ماورا کو قیصر بلوچ کے بارے میں مختلف حوالوں سے حاصل ہونے والی کافی قیمتی معلومات دی تھیں۔ قیصر نے یہ شاہانہ زندگی اور دولت شوبز نس میں آمد کے بعد ہی کمائی تھی۔ نازنین سے شادی کے بعد تو اس کی قسمت کا ستارہ کچھ زیادہ ہی چمکنے لگا تھا۔ ڈرامے، سیریل، ٹی وی شو، فلمیں اُس نے ہر چیز پر ڈویوں کی تھی اور اس کی کمپنی کی بنائی ہر پروڈکٹ کسی نہ کسی چینل پر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی تھی۔

تازہ اطلاعات کے مطابق اس نے نا صرف اپنے کئی پرانے سیریل انڈین چینل کو فروخت کیے تھے بلکہ آج کل وہ ملک کی نامور خواتین لکھاریوں کے اسکرپٹ پر ویب سیریز بھی بنا کر بھارت میں فروخت کر رہا تھا۔ انٹرنیٹ کے دور نے جہاں دنیا کو گلوبل ویلج بنایا تھا وہاں پر پاکستانی اداکاروں کی رسائی بھی عالمی منڈیوں تک پہنچا دی تھی اور وہ خوب دولت و پرستار بنا رہے تھے۔

ماورا کو شاکر نے جو فائل دی تھی، اس کے مطابق نازنین قیصر کی پہلی بیوی تھی جبکہ وہ خود نازنین کا دوسرا شوہر تھا۔ ان دونوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

'تمہارا بیٹا ہمارے پاس ہے۔' ماورا کو سفیان کے اغوا کا اطلاعی خط یاد آیا۔

اغوا کاروں نے خود کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ کیا اس بات کی کوئی اہمیت ہو سکتی تھی؟ قیصر اکیلا ہی یہ سب کر رہا تھا یا اس کا کوئی محرم راز بھی تھا؟ اس نے کسی گینگ کو تو اس کام کے لیے ہائر نہیں کر لیا تھا؟' ماورا کے ذہن میں سوچیں لگاتار آ رہی تھیں اور ان کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بے وقوفوں کی طرح سوچ رہی ہے۔

'قیصر بلوچ کو ایک پورا گینگ اس طرح فضول میں کیوں جھونک دینا تھا؟ وہ چاہتا تو کسی بھی کرائے کے قاتل سے نازنین کا کام تمام کروا سکتا تھا۔'

پھر ماورا کے ذہن میں ایک نئی سوچ آئی کہ شاید نازنین اصل ہدف نہیں تھی بلکہ قیصر کے نشانے پر ڈاکٹر عثمان تھا۔

جھاڑیوں میں چھپی ماورا کبھی اپنی زندگی میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسے وہ کبھی کسی کے گھر میں نقب لگا سکتی ہے۔ لیکن یہ اولاد شاید چیز ہی ایسی ہے کہ جس کے لیے والدین ہر حد سے گزرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اچانک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے اندھیرے کو چیرتے ہوئے روشنی پھیلا دی۔ یہ دیکھ کر ماورا باؤنڈری میں کچھ مزید دبک گئی۔ ہیکر نے اسے کچھ ایسے آلات دیے تھے جن کی بدولت وہ گھر کے سیکیورٹی سسٹم کو بیکار کر کے اندر داخل ہو سکتی تھی لیکن شاید اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ماورا تیزی سے باڑ کے عقب میں دوڑتی ہوئی گیراج کے پاس والی جھاڑیوں تک پہنچ گئی۔ چند لمحوں بعد گیراج کا دروازہ کھلا اور ایک سیاہ مرسیڈیز اندر داخل ہوئی۔ گیراج کا دروازہ جب تقریباً بند ہونے والا تھا تب ہی وہ لڑھک کر اس کے نیچے سے اندر داخل ہو گئی۔ وہ تیزی سے کار کے عقب میں ہو گئی تا کہ کار سوار اسے دیکھ نہ سکیں۔

ایگزاسٹ پائپ کی گرمائش سے اس کا بازو تقریباً جل گیا لیکن اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی سسکی دبائی۔

مرسیڈیز کے دروازے کھلے اور اسے دو بندوں کی ٹانگیں نظر آئیں۔

''ڈنر اچھا رہا۔'' نازنین کی آواز آئی۔

''یہ پہن کر تیار ہو جاؤ.....'' آواز حاکمانہ اور غصے میں ڈوبی ہوئی تھی، اس نے نازنین کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

ماورا نہ دیکھ سکی کہ کیا پہننے کو کہا گیا تھا۔

''اچھا قیصر.....'' دوسری آواز کسی سرگوشی کے مانند سنائی دی تھی۔

ماورا دم سادھے بیٹھی رہی جب تک اُسے یقین نہ ہو گیا کہ وہ لوگ اندر چلے گئے ہیں۔ تب وہ اندرونی

دروزے تک گئی اور ہینڈل گھمایا۔

''شکر ہے.....'' اس کے حلق سے بے ساختہ نکلا۔ اندرونی دروازہ مقفل نہیں تھا ورنہ اسے اپنے ساتھ لائے گئے کسی گیجٹ کا استعمال کرنا پڑتا۔

اندر داخل ہونے پر وہ ایک نیم تاریک راہداری میں پہنچ گئی جس کے ایک جانب بڑا لیونگ روم تھا جبکہ دوسری جانب سیڑھیاں اوپر کی منزل کی جانب جارہی تھیں..... وہاں شاید بیڈ روم تھے۔ لیونگ روم کے ساتھ ہی ڈائننگ روم تھا جہاں ایک اوپن کچن بھی بنا ہوا تھا۔

کسی نے فریج کھولا ہوا تھا جس کی روشنی میں اُس کا سایہ نظر آرہا تھا۔ یہ قیصر تھا جس نے برف اور پانی نکالنے کے بعد اوپری منزل کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔ ماورا کچن میں داخل ہوگئی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک اندھیرے میں صحیح طرح دیکھنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں۔ گھر پر چھائی ہوئی غیر معمولی خاموشی حیران کن تھی لیکن جب شاکر نے اسے بتایا تھا کہ یہ دونوں گھر میں بالکل اکیلے رہتے ہیں تو وہ حیران رہ گئی تھی۔ ان دونوں نے کمپیوٹر سسٹم کے ذریعے گھر کو محفوظ کیا ہوا تھا اور کوئی ملازم رکھنے کے روادار نہیں تھے۔ انہی باتوں نے ماورا کو حوصلہ دیا تھا اور وہ اکیلے ہی سفیان کی تلاش میں یہاں آگئی تھی۔

وہ دبے قدموں لیونگ روم میں داخل ہوئی جس کی چھت پر لگے فانوس سے مدھم روشنی نے کمرے میں ملگجا سا اُجالا کیا ہوا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جب نازنین اور قیصر گہری نیند سو جائیں گے تبھی وہ حرکت میں آئے گی۔ ابھی اُسے اپنے لیے چھپنے کی کوئی مناسب جگہ تلاش کرنی تھی تاکہ اچانک اسے دیکھ نہ لیا جائے۔ اگر وہ ان کی غیر موجودگی میں داخل ہوتی تو..... اسے ایک گیجٹ آن کرنا پڑتا جو کسی بھی قسم کے موشن سینسر الارم کو جام کردیتا تھا۔

اچانک ہی کسی کے سیڑھیوں سے اترنے کی آواز آئی تو ایک لمحے کے لیے ماورا کے ہوش ہی اُڑ گئے۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ فوراً صوفے کی آڑ میں ہوکر تقریباً لیٹ ہی گئی۔

وہ قیصر تھا..... اُس نے آگے بڑھ کر مصنوعی آتش دان پر لگی لائٹ روشن کی تو ماورا لمحاتی وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قریبی پردے کے پیچھے چھپنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ نمایاں نہ ہو۔ مدھم روشنی اس معاملے میں اس کی مددگار ثابت ہورہی تھی۔

قیصر مڑ کر جب آگے بڑھا تو وہ اب صوفے کے پیچھے دیکھ سکتا تھا۔ ماورا نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ تبدیل کرلی تھی ورنہ اب تک پکڑی جاچکی ہوتی۔

ماورا اب ڈائننگ روم اور لیونگ روم دونوں دیکھ سکتی تھی۔ بڑی ڈائننگ ٹیبل پر پڑے کپڑے نے اس کے تقریباً آدھے نچلے بدن کو چھپایا ہوا تھا اور باقی کسر فینسی پردے نے پوری کردی تھی۔

''نازنین..... نیچے آؤ۔'' قیصر بلند آواز میں چلّایا۔ اسے واقعی اس بات کی پروا نہیں تھی کہ کوئی اسے سن سکتا ہے۔

قیصر سیڑھیوں کے پاس پہنچا ہوا تھا اور ماورا کی جانب پشت تھی۔ اُس نے خود کو تھوڑا سا کھسکا کر بالکل ہی میز کے عقب میں کرلیا۔ اب کوئی پردے کو بغور بھی دیکھ لیتا تو اس کی موجودگی محسوس نہیں کرسکتا تھا۔

قیصر ننگے پاؤں تھا۔ نازنین نے بھی جوتے اتار دیے تھے۔

''تو اِس نائٹی میں کوئی آوارہ عورت لگ رہی ہے۔'' قیصر نے اوباشانہ انداز میں کہا تو ماورا چونک گئی۔ ''ایسی عورتوں کو میں سیدھا کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔''

'ایسے کون اپنی بیوی سے بات کرتا ہے؟' ماورا نے سوچا۔

چٹاخ کی ایک زوردار آواز گونجی تو اس کے سارے خیالات دھرے کے دھرے رہ گئے۔ قیصر نے نازنین کے ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا تھا۔

''نہیں قیصر نہیں.....'' نازنین گڑگڑائی۔ ''آج رات نہیں..... میں یہ سب مزید نہیں کرسکتی۔''

''میں جانتا ہوں کتیا.....'' قیصر غرایا۔ ''تجھے بھی یہ سب اچھا لگتا ہے.....''

ایک اور تھپڑ..... یہ پہلے والے سے زیادہ زوردار تھا۔ نازنین نیچے گر گئی۔ ماورا یہ نظارہ چند فٹ کے فاصلے سے دیکھ رہی تھی اور اس کی حالت ایسی ہورہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ نازنین کی حالت بھی خراب تھی اور وہ خوف سے لرز رہی تھی۔

''کھڑی ہوجاؤ.....'' قیصر نے اپنی شرٹ اتارتے ہوئے حکم دیا۔ ''اور میرے پاس آؤ۔''

''قیصر پلیز..... آج نہیں۔'' نازنین کا آنسوؤں بھرا چہرہ بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

ماورا کا دل کررہا تھا کہ وہ اِس وحشی کے ہاتھوں

نازنین کو مزید مار کھانے سے بچا لے لیکن وہ اپنی جگہ پر ساکت ٹھہری رہی۔

''تم بہت خوبصورت ہو نازنین..... سب سے حسین، سب سے جدا..... تم جیسی نہ کوئی ہے اور نہ ہی کبھی آئے گی۔ تم حُسن کا شاہکار ہو۔'' قیصر نے نازنین کو ڈائننگ ٹیبل پر لٹا دیا تھا اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

''کل اپنی سرجری کے بعد تم مزید حسین ہو جاؤ گی۔'' قیصر بولتا ہی جا رہا تھا۔

ماورا نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا تاکہ اس وحشیانہ منظر کو دیکھتے ہوئے اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل جائے۔ نازنین کے انکار کی آواز گونج رہی تھی لیکن قیصر پہ اس کی کسی درخواست کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہر گزارش اس کو مزید وحشی ہونے پر مجبور کر رہی تھی۔ ماورا کی مزید دیکھنے کی تاب نہ رہی تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں تو بند ہو گئی تھیں لیکن اپنے کان وہ بند نہیں کر سکتی تھی۔ آہوں، کراہوں کا یہ سلسلہ پتا نہیں کتنی دیر تک چلتا رہا۔ ماورا نے شاید ایک دو بار نازنین کی چیخ بھی سنی اور قیصر کا طویل قہقہہ بھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر عظمان کی آنکھ بار بار فون کی بیل بجنے سے کھلی تھی۔

ایک تو پہلے ہی پریشانی کی وجہ سے اس کی آنکھ دیر سے لگی تھی اوپر سے رات کے دو بجے ایک انجان نمبر سے آنے والی بار بار کی کال نے اس کا موڈ آف کر دیا۔

''کون ہے؟'' اس نے روایتی سلام دعا اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے سخت لہجے میں پوچھا۔ پھر ایک دم ہی اسے احساس ہوا کہ یہ اغوا کار کی کال بھی ہو سکتی ہے تو فوراً نرم لہجے میں بولا۔ ''ہیلو..... کون؟''

''عظمان صاحب میں شاکر بات کر رہا ہوں۔'' ایک نوجوان کی آواز سنائی دی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

''کون شاکر؟'' عظمان نے پوچھا۔

''میں میڈم ماورا کا اسٹوڈنٹ ہوں.....'' دوسری جانب سے آواز آئی لیکن اس کے لہجے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ شش و پنج کا شکار ہو کہ کچھ بتائے یا نہیں۔

عظمان کو اُلجھن ہونے لگی۔ ''ماورا کے شاگرد ہو تو اُسے کال کرو..... مجھے رات کے اس پہر کیوں تنگ کر رہے ہو؟''

''بات ہی ایسی ہے سر.....'' شاکر تیزی سے بولا مبادا عظمان کال ہی نہ ڈس کنیکٹ کر دے۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے میڈم ماورا مشکل میں ہیں..... اور اس کی وجہ میں ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' عظمان نے پوچھا۔ ''جو کہنا ہے کھل کر کہو۔ وہ تو ہوٹل میں رہ رہی تھی۔''

''نہیں..... کل وہاں تھیں لیکن آج رات وہ قیصر بلوچ کے گھر میں تفتیش کرنے پہنچی ہوئی ہیں.....'' شاکر کی پریشان آواز سنائی دی۔ ''اگرچہ انہوں نے مجھے تفصیل نہیں بتائی تھی لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ سفیان کے ساتھ کچھ ہوا ہے اور وہ اسے تلاش کر رہی ہیں۔''

''اوہ..... لیکن اس بے وقوف کو قیصر کے گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ سفیان کو گود میں لے کر تو نہیں بیٹھا ہو گا۔'' عظمان نے روانی میں کہہ تو دیا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ یہ بات شاکر کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھی۔

''عظمان صاحب..... میڈم ماورا نے کہا تھا کہ وہاں جا کر وہ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہیں گی..... لیکن اب ان کا موبائل فون آف جا رہا ہے..... مجھے خدشہ ہے کہ وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گئی ہوں۔''

''تو کیا پولیس کو کال کرنی چاہیے؟'' ڈاکٹر عظمان نے پوچھا۔ اس کا دماغ یہ ساری معلومات سن کر ہی گھوم گیا تھا۔

''نہیں..... پولیس سے رابطہ کرنے سے انہوں نے نہایت سختی سے منع کیا ہوا ہے..... میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ اپنا کوئی لنک نکال کر معاملہ سلجھا سکیں۔'' شاکر نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''میں کوشش کرتا ہوں..... اطلاع کا شکریہ۔'' عظمان نے یہ کہہ کر کال کاٹ دی۔

سفیان کے بعد اب ماورا بھی غائب تھی..... عظمان کی پریشانیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

ماورا نے جو دیکھا تھا، اس کے بعد اگر وہ قیصر کی جان بھی لے لیتی تو کم ہوتا۔ اگر سفیان کی جان خطرے میں نہ ہوتی تو وہ شاید ایسا کر بھی گزرتی۔ اپنی ہی بیوی کا ریپ کرنے کے بعد وہ اوپری منزل پر اپنے بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ نازنین کچھ دیر وہیں اپنے ہی آنسوؤں میں بھیگتی رہی اور پھر خود کو سمیٹتی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ماورا کو اس کا درد

اپنے دل میں محسوس ہو رہا تھا۔ کوئی اتنا ظالم آخر کیسے ہو سکتا تھا؟ نازنین اور ماورا، دونوں کو ہی اس رذیل شخص نے تکلیف پہنچائی تھی۔

وہ اب اچھی طرح جان گئی تھی کہ یہ دونوں اتنے بڑے گھر میں اکیلے کیوں رہتے تھے۔

نازنین کے جانے کے کوئی آدھے گھنٹے بعد ماورا اپنی جگہ سے باہر نکلی۔ وہ ابھی تک شاک میں تھی۔ اس نے اپنی سُن ہوتی ٹانگوں کو مسلا..... ایک ہی جگہ پر اتنی دیر ساکت ٹھہرے رہنے کی وجہ سے اس کے پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔

اُس نے نچلے حصے کی اچھی طرح تلاشی لی لیکن یہ سب بے فائدہ ہی رہا۔ اس نے تہ خانے کا بھی جائزہ لیا لیکن وہ بھی ویران ہی پڑا تھا۔ سیمنٹ کنکریٹ والے اس بڑے سے تہ خانے میں رنگ و روغن بھی نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی کوئی فرنیچر موجود تھا۔ پرانا کاٹھ کباڑ البتہ ڈبوں میں بند کر کے ایک جانب رکھا ہوا تھا۔

سفیان..... جس کی تلاش میں وہ یہاں آئی تھی، اس کا کوئی نام و نشان تک نہیں تھا۔

مایوس ہو کر ماورا کو خیال آیا کہ سفیان شاید اوپری منزل پر بھی نہ ہو۔ ظاہری بات تھی کہ قیصر نے ایک اتنے بڑے تہ خانے میں جب اپنے اغوا شدہ بندے کو نہیں پہنچایا تو وہ اسے اپنے بیڈ روم میں کیسے رکھ سکتا تھا؟

بے دل ہو کر وہ وہاں سے جانے ہی لگی تھی کہ اسے تہ خانے کے آخری کونے میں ایک دروازہ دکھائی دیا۔ ماورا کی امید پھر سے جاگ اٹھی لیکن جھانکنے پر پتا چلا کہ یہ ایک نامکمل واش روم تھا۔ اس میں ابھی ٹائل لگنے کا کام باقی تھا۔

وہاں کی کیبنٹ میں اسے کئی خواب آور اور سکون آور دوائیں نظر آئیں۔ ساتھ میں ڈاکٹر کا نسخہ بھی موجود تھا۔ زینکس اور ایفلکسر کی بڑی مقدار دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اپنی طلاق کے دوران اس نے بھی سکون آور ادویات کا کافی استعمال کیا تھا اس لیے بھاری مقدار میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ پہلے پہل تو یہ ادویات اسے دنیا کے غم بھلانے کے لیے اچھی محسوس ہوئی تھیں لیکن جب وہ ان کی لت میں مبتلا ہونے لگی تو اس نے فوراً ہی سائیکاٹرسٹ کے ذریعے ان سے چھٹکارا حاصل کیا۔

نشہ کوئی بھی ہو وہ بالآخر انسان کے لیے زہر ہی بن جاتا ہے اس لیے اس نے ان دواؤں کے نشے سے نجات حاصل کرنے کو ہی ترجیح دی تھی۔

یہ ادویات دیکھ کر ماورا کے ذہن میں خیال آیا کہ نازنین بھی شاید سائیکاٹرسٹ کے پاس جاتی ہو۔ وہ یقیناً پھر قیصر کے بارے میں بھی جانتا ہوگا۔ ڈاکٹر واجد نسیم کا نام اسے نسخے پر لکھا ہوا مل گیا۔

'شاید وہ اس سے مزید معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔' یہ سوچ کر اس نے نسخہ جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

ماورا نے اپنی گھڑی دیکھی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ سرجری میں صرف گیارہ گھنٹے باقی تھے اور وہ بہت کم وقت تھا اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے۔ خاص طور پر اس لیے کیونکہ وہ ابھی تک اس کا سراغ لگانے میں ناکام ثابت ہوئی تھی۔ وہ تہ خانے سے نکلی اور گیراج سے ہوتی ہوئی صبح کی پھیلی ہوئی خنک ہوا میں اگلی منزل کے لیے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

سفیان کی آنکھ اچانک کھلی تو اُسے لگا کہ جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ نرم بستر نے یہ بات یقینی بنائی تھی لیکن کمرے کا جائزہ لینے پر وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ ابھی تک اسی مختصر سے اسٹور نما کمرے میں تھا۔ ہاں فرق یہ پڑ گیا تھا کہ اب وہ کرسی سے بندھا ہوا نہیں تھا اور بستر پر محوِ استراحت تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اُسے آوازیں سنائی دے رہی تھیں تو وہ اٹھ کر دروازے کے پاس آ گیا۔

''کوئی ہے؟'' اس نے آواز لگائی تو دروازے کے پیچھے خاموشی چھا گئی پھر اچانک ہی کوئی اونچی آواز میں بولنے لگا۔

''کون ہے اندر؟'' ایک مدھم سی آواز سفیان کے کانوں میں پڑی۔

''کوئی نہیں.....'' ایک مردانہ آواز آئی۔ ''بابا آپ اپنے کمرے میں جائیں۔''

سفیان کو یہ آوازیں جانی پہچانی سی لگ رہی تھیں لیکن وہ فوکس نہیں کر پا رہا تھا کہ انہیں پہچان پائے۔ تھوڑی دیر بعد بالکل ہی خاموشی چھا گئی۔

سفیان کافی دیر تک انتظار کرتا رہا لیکن کوئی بھی نہیں بول رہا تھا۔ اُسے اب بھوک بھی لگ رہی تھی اور اس کا جسم حوائج ضروریہ کا تقاضا بھی کر رہا تھا۔ اس مختصر کمرے میں ایسی ضرورت پوری کرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

سفیان نے اٹھ کر دروازہ بجانا شروع کر دیا۔

''کوئی ہے؟ دروازہ کھولو..... مجھے واش روم جانا ہے۔'' وہ چلّایا۔

سفیان کی اس حرکت کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک نقاب پوش نے دروازہ کھولا اور اسے ایک سیاہ پٹی دی۔

''اسے اپنی آنکھوں پر پہن لو۔'' نقاب پوش بھاری آواز میں بولا۔

سفیان کوئی احتجاج کرتا لیکن اس وقت اسے فوراً واش روم جانا تھا۔ اس لیے چپ چاپ نقاب پوش کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ واش روم پہنچ کر اس نے پٹی اتار دی، نقاب پوش باہر ہی رک گیا تھا۔ اپنی ضروریات سے فارغ ہونے کے دوران اُس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔

واش روم میں صرف ایک روشن دان تھا لیکن وہ اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی بلی ہی اس میں سے گزر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر حفاظتی جالی بھی لگی ہوئی تھی۔ صابن سے ہاتھ دھونے کے بعد اس نے نقاب پوش کی ہدایت پر پھر سے پٹی پہنی اور باہر آیا۔

اپنے زندان میں وہ پہنچا تو نقاب پوش نے دروازہ پھر سے لاک کر دیا۔ اس کی غیر موجودگی میں کمرے سے کرسی ہٹا دی گئی تھی اور اس کی جگہ ایک میز رکھ دی گئی تھی۔ میز پر سفیان کے پسندیدہ ریسٹورنٹ کا پسندیدہ ترین برگر اور فرائز کے ساتھ ونیلا ملک شیک بھی موجود تھا۔

بھوک کے مارے اس کی آنتیں قل پڑھ رہی تھیں اس لیے وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

''واہ یہ اغوا کرنے والے تو بڑے اچھے ہیں..... انہیں تو سب پتا ہے مجھے کھانے میں کیا کیا پسند ہے۔'' سفیان نے خود کلامی کی اور پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ رک گیا۔

حیرت اور صدمے سے اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

اسے جانی پہچانی آوازوں کا سراغ مل گیا تھا..... وہ جان گیا تھا کہ اُسے اغوا کرنے والے کون ہیں؟

☆☆☆

''بڑے ہی بے وقوف ہو تم.....'' ماورا نے غصے سے کہا۔ ''کیا ضرورت تھی عظمان کو کال کرنے کی؟ وہ پہلے سفیان کی وجہ سے کم پریشان ہوگا کہ جو تم نے اُسے میرے حوالے سے بھی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔''

شاکر اس وقت اس کی ہدایات پر ہوٹل کے کمرے میں اس کا مطلوبہ سامان لے کر آ گیا تھا۔ دُبلا پتلا یہ خوش شکل نوجوان اپنے اندر ایک نروس انرجی رکھتا تھا۔ ابھی بھی وہ اپنے ہاتھ میں فجٹ اسپنر گھما رہا تھا۔ بچوں کا یہ کھلونا پورے پاکستان میں بہت مقبول ہو چکا تھا اور بیشتر بچے اسے ہاتھ میں گھماتے نظر آتے تھے۔

''آپ سے اتنی دیر تک رابطہ نہیں ہوا تو میں نے سوچا.....''

''فضول ہی سوچا.....'' ماورا نے اس کی بات کاٹ دی اور اس کے لائے ہوئے باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''دکھاؤ مجھے ذرا یہ..... دیکھیں کہ کتنے کام کے بندے ثابت ہوتے ہو تم۔''

ڈبے میں ایک اعشاریہ تین، آٹھ پستول موجود تھا۔ ماورا نے اسے فوراً اٹھا کر اپنی لیدر جیکٹ میں ڈال لیا۔ سفیان کے بارے میں شاکر جان گیا تھا۔ جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے، وہ پورے دل و جان سے ماورا کی مدد پر تیار ہو گیا تھا۔ شاکر ڈارک ویب پر اکثر پنگے لیتا رہتا تھا اس لیے اپنی حفاظت کے

لیے اس نے گنز بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اب بھی وہ اپنے خزانے سے ایک آسان استعمال والا پستول ماورا کے لیے لے آیا تھا۔

قیصر بلوچ کے بارے میں وہ کچھ مزید معلومات بھی لے کر آیا تھا۔ اس کے ذاتی نام پر بہت کم جائداد موجود تھی۔ ایسا ناممکنات میں سے تھا کہ وہ سفیان کو اپنے اسٹوڈیو میں رکھتا۔ اس کے گھر پر ماورا پہلے ہی ہو آئی تھی اس لیے وہاں جانا نری بے وقوفی ہوتی۔

''یہ ایڈریس دیکھیں.....'' شاکر نے کراچی کے مضافات میں واقع ایک قصبے کی نشاندہی کرتے ہوئے ماورا کو کہا۔ ''یہاں کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ قیصر اپنے بچے کے ساتھ رہتا ہے۔''

''کیا؟'' ماورا حیرت سے چلّائی۔ ''اس کا بچہ کہاں سے آ گیا؟''

پتا نہیں..... لیکن نازنین کے ریکارڈز سے پتا چلا ہے کہ تقریباً پندرہ سال پہلے اس نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ایک آپریشن کروایا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس آپریشن سے پہلے اس نے کئی فلموں اور ڈراموں کی آفر بھی ریجیکٹ کر دی تھی۔ اور تقریباً ایک سال تک کوئی نیا پروجیکٹ نہیں کیا تھا۔''

''ہمم..... یہ تو سوچنے والی بات ہے۔'' ماورا نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں وہاں جا رہی ہوں..... تم اس ڈاکٹر واجد نسیم کا سراغ لگاؤ۔ یہ سائیکاٹرسٹ اپنا کلینک پتا نہیں کیوں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔''

ماورا ہوٹل سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھی اور قیصر کے مضافاتی پتے کی جانب روانہ ہو گئی۔ ڈاکٹر واجد نسیم کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ اب وہ اس کلینک میں پریکٹس نہیں کرتا تھا جس کا ایڈریس اسے نازنین کے لیے لکھے نسخے سے ملا تھا۔

عظمان نے اس کی خیریت معلوم ہونے کے بعد اس کی کال یا میسج کا جواب دینا ہی بند کر دیا تھا۔ وہ اس کے اس قسم کے ایڈونچر سے سخت ناراض ہوا تھا۔ اب وہ جب بھی اسے کال کر رہی تھی تو وہ دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ نازنین کی سرجری میں صرف سات گھنٹے رہ گئے تھے..... شاید وہ بھی ماورا کی طرح بہت زیادہ نروس ہو چکا تھا۔

ماورا نے بہت سارے دھمکی آمیز میسجز عظمان کو واٹس ایپ کر دیے تھے کہ اگر سفیان کو کچھ ہوا تو وہ اسے بخشے گی نہیں۔ ماورا نے ایک پیٹرول پمپ سے ٹینکی فل کروائی اور پوری رفتار سے اس قصبے کی طرف چل پڑی۔

ٹریفک کے رش سے بچتے ہوئے اور گوگل میپ کے استعمال کے بعد وہ تقریباً ڈھائی گھنٹے ضائع کر کے ایک چھوٹے سے فارم ہاؤس پر پہنچ چکی تھی۔ فارم ہاؤس کی حالت سے بالکل بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ قیصر جیسے کامیاب بزنس مین کی جائداد ہو سکتی ہے۔ ماورا نے گاڑی پارک کی اور پودوں کی کیاریاں پھلانگتی ہوئی عمارت کی جانب بڑھی۔

اُس نے پستول نکال لیا تھا۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس نے اندر جھانکنے کی کوشش ہی کی تھی کہ ایک بندوق کی نال اس کی پشت سے آن لگی۔

''پستول نیچے پھینک دو۔'' کوئی بھاری آواز میں غرایا۔ ''اور آرام سے مڑو۔''

وہ نال ایک شکاری رائفل کی تھی۔ رائفل بردار ایک بھاری بھرکم چھ فٹ کا داڑھی والا مرد تھا۔ ماورا منہ کھول کر اُسے دیکھنے لگی۔

''میرا بیٹا، سفیان کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو خاتون..... پتا نہیں تم کہاں سے آئی ہو اور کیوں اپنے بیٹے کا پوچھ رہی ہو۔ لیکن یہاں پر صرف میرا بیٹا موجود ہے جس کا نام علی ہے۔'' داڑھی والے نے رائفل نیچے کرتے ہوئے کہا۔

اسی دوران شور سن کر ایک فربہی مائل عورت بھی باہر نکل آئی جس نے کوئی ڈھائی تین سالہ بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔

''قیصر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' وہ چلّائی۔

ماورا کی امیدوں پر جیسے کسی نے گھڑوں پانی انڈیل دیا تھا۔

''تمہارا نام بھی قیصر ہے۔'' وہ شکستہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''ہاں قیصر بلوچ۔ میں یہاں قصبے کا نمبر دار ہوتا ہوں۔'' رائفل بردار اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔ ''اب ذرا تم اپنا تعارف بھی کرا دو کہ یوں پستول لے کر میرے گھر پر کیا کرنے آئی ہو؟''

ماورا اس طرح اپنا وقت ضائع ہونے پر سر پیٹ کر ... رہ گئی۔

☆☆☆

نمرہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''کیوں آخر کیوں؟'' رانیہ غرائی۔ ''آخر ایسی کیا موت پڑی تھی تمہیں؟''

''میں..... میں تمہاری کامیابی سے جیلس ہو گئی تھی۔'' نمرہ نے بمشکل کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''پلیز مجھے معاف کر دو۔''

ساجد نے یہ دیکھ کر آنکھیں گھمائیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ نمرہ ابھی بھی ڈراما کر رہی ہے۔ اس نے چینل پر اپنے سورس لڑائے تھے اور یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ کس نے آخر انہیں رانیہ کے بارے میں سب معلومات فراہم کی تھیں۔

اگرچہ نمرہ نے خود کو چھپانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ اتنی ماہر نہیں تھی کہ صرف سم بدل کر تصاویر بھیج دیتی اور کوئی اس سراغ نہ لگا پاتا۔

''مجھے پہلے ہی تم پر شک ہو گیا تھا..... ڈاکٹر عظمان کو کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنا کلائنٹ خراب کرتا۔ اس کی پہلے ہی اتنی شہرت ہے، اسے کیا پڑی ہے اس طرح اپنے پروفیشنل راز لیک کرنے کی۔'' رانیہ غصے میں بول رہی تھی۔

نمرہ آنکھوں میں آنسو لیے اس کی بات سن رہی تھی۔

''مجھے یہ تو بتاؤ تمہیں اس حرکت کا آخر فائدہ کیا ہوا؟'' رانیہ نے پوچھا۔

نمرہ نے بزبانِ خاموشی جواب دیا۔

''تم جانتی ہو نا یہ بات کہ ہم کسی کو نیچا دکھا کر کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے.....'' رانیہ نے ناصحانہ انداز میں بات شروع کی۔ ''جس کا رزق جہاں لکھ دیا گیا ہے اسے وہیں سے مل جائے گا۔ ہماری کوششوں سے کوئی نیچے گر بھی جائے تو ہمارا مقام بلند نہیں ہوتا بلکہ شاید ہم مزید پستی میں چلے جاتے ہیں۔''

ساجد یہ بات سن کر تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

''تم جانتی ہو تمہاری وجہ سے میں نے اپنے محسن ڈاکٹر عظمان پر شک کیا۔ وہ مجھے یہ خوبصورتی عنایت نہ کرتے تو شاید میں آج بھی اس بازار میں دو دو ٹکے کے لیے جسم فروشی کر رہی ہوتی جہاں سے تمہارا اور میرا تعلق ہے۔'' رانیہ نے کہا تو نمرہ کے حلق سے ایک سسکی خارج ہو گئی۔

''مجھے معاف کر دو..... پلیز۔'' نمرہ تڑپ کر بولی۔

''تم جانتی ہو میں نے ریتھک روشن کے ساتھ فلم سائن کر لی ہے.....'' رانیہ اس کی معافی کی درخواست نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے شرط رکھی ہوئی تھی کہ تمہیں بھی میرے ساتھ اس فلم میں چانس دیا جائے..... اور مزے کی بات ہے کہ انہوں نے میرا یہ مطالبہ مان بھی لیا۔''

''کیا سچی.....؟'' نمرہ کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ ''تم..... تم نے میرے لیے یہ سب کیا؟''

''ہاں..... اور دیکھو تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟'' رانیہ کا لہجہ شکایتی سے زیادہ اب غصے والا ہو رہا تھا۔ ''میرے پرائیویٹ فون تک اگر تمہاری رسائی ہو ہی گئی تھی تو میری پرانی فوٹوز ایسے لیک کرنا ضروری تھا کیا؟''

''نن..... نہیں۔'' نمرہ اب واقعی شرمندہ محسوس ہو رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ ''پلیز مجھے معاف کر دو۔''

''شوبزنس کا اصول ہے کہ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کیا جائے.....'' رانیہ نے کہا۔ ''یہاں دوست بہت کم ملتے ہیں لیکن اگر آپ کو صحیح دوست مل جائیں تو کامیابی یقینی طور پر قدم چومتی ہے۔ نمرہ میں داد دیتی ہوں تمہاری چوائس کی کہ تم نے واقعی مجھے دوست چن کر بہترین فیصلہ کیا۔''

نمرہ کو اب رانیہ کا لہجہ عجیب لگ رہا تھا۔ خوفزدہ کر دینے والا..... جیسے انتقام کی آگ میں ڈوبا ہوا۔

''میں تمہیں معاف کر چکی ہوں..... لیکن میں کبھی تمہاری یہ حرکت بھول نہیں سکتی۔ مجھے بھی تو اچھے دوست چاہئیں..... ہیں نا؟''

نمرہ خوفزدہ نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

''تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ میری زندگی میں تمہارا کوئی دخل نہیں ہو گا..... دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔'' رانیہ کی زبان اب قہر اُگلنے لگی تھی۔ ''تم جیسے آستین کے سانپوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میں نے انڈین فلم میں بھی تمہاری شمولیت کی شرط ختم کر دی ہے اور میں اب دیکھتی ہوں کہ تمہیں یہاں انڈسٹری میں بھی کیسے کام ملتا ہے۔''

''نہیں..... ایسا مت کرو۔'' نمرہ اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگی۔

''ساجد اِسے میری نظروں سے دور لے جاؤ۔'' رانیہ نے اسے ایک لات مار کر خود سے دور کیا۔ ساجد نے نمرہ کو اس سے دور کیا اور باہر کا راستہ دکھایا اور وہ روتے

ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

رانیہ نفرت سے اُسے رخصت ہوتے دیکھتی رہی۔ حُسن کی رانی اس وقت قہر کی رانی دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

صرف ایک گھنٹا باقی تھا.....

ماورا اتنا وقت ضائع ہوجانے پر خود کو کوس رہی تھی۔ رش سے ہوتے ہوئے اب وہ واپس کراچی پہنچ چکی تھی۔ گن اس کی جیکٹ کی جیب میں تھی اور مایوسی کی انتہا اس کے دل میں۔

مختلف نمبروں پر کوشش کرنے کے باوجود ابھی تک عظمان نے اس کی کسی کال کا جواب نہیں دیا تھا۔ کلینک پر کال کرنے پر اسے مریم مقبول نے کہا۔

''میڈم آپ شاید بھول رہی ہیں کہ ڈاکٹر عظمان جب سرجری کر رہے ہوتے ہیں تو وہ کسی کی کال موصول نہیں کرتے۔''

ماورا اُسے زیرِلب چند شاندار خطابات سے ہی نواز سکی۔ عظمان کی یہ پالیسی تھی کہ وہ ہر پیشنٹ کے ساتھ ایسے پیش آتا تھا کہ جیسے وہی اس کا اکلوتا پیشنٹ ہو اور اس دوران وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا تھا۔ یہ پالیسی نہایت کامیاب تھی کیونکہ بدلے میں اس کے کلائنٹس بھی اپنی تجوریوں کا منہ کھول کر عظمان کو نوازتے تھے۔

ماورا نے عظمان کی سیکریٹری کو کوئی جواب دیے بغیر اپنی گاڑی کا رخ ڈاکٹر سیم واجد کے کلینک کی جانب موڑ لیا جس کا ایڈریس اسے شاکر نے بھیجا تھا۔ شاکر بھی کئی گالیاں ماورا سے کھا چکا تھا کیونکہ وہی اسے 'غلط' قیصر بلوچ کے پاس بھیجنے کا موجب بنا تھا۔

''اب کی بار ایڈریس غلط ہوا تو میں نے تمہارے ہی پستول سے تمہاری جان لے لینی ہے۔'' ماورا نے شاکر کو ایسی دھمکی دی تھی کہ اس نے ڈبل چیک کرنے کے بعد ہی پتا ماورا کو نفرم کیا تھا۔

جب وہ ڈاکٹر واجد نسیم کے کلینک پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ وہ عظمان کے کلینک سے کوئی بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت تھی جس میں کئی ڈاکٹرز کے کلینک تھے۔ وہاں ریسپشن پر ہی سب ڈاکٹرز کے آفس کے نمبر ایک بورڈ پر لکھے ہوئے تھے۔ وہ سیدھی پہلی منزل پر پہنچی جہاں ڈاکٹر واجد نسیم کا آفس تھا۔ ایک نیم گنجا، مہربان شکل والا شخص اپنے آفس کو مقفل کر رہا تھا۔

''آپ ڈاکٹر واجد نسیم ہیں؟'' ماورا نے تیزی سے پوچھا۔

''ہاں.....'' وہ بولا۔ ''لیکن اب میں اپائنٹمنٹ نہیں لے رہا۔''

''میرے پاس گن ہے.....'' ماورا نے جیکٹ کی آڑ سے اپنے پستول کی نمائش کی۔ ''کیا اب بھی مجھے اپائنٹ منٹ نہیں ملے گی؟''

''کیا؟'' ڈاکٹر واجد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

''پلیز ڈاکٹر..... اپنا آفس کھولیں اور اندر داخل ہوں ورنہ آپ یقین کریں میں گولی چلا دوں گی۔'' ماورا نے تیز لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر واجد نسیم اگر اس حرکت سے ڈر بھی گیا تھا تو اس نے اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے چابی سے دروازہ کھولا اور ماورا کو اندر آنے کا کہا۔

''پہلے آپ اندر چلو۔'' ماورا نے اسے آفس میں دھکیلا اور پھر خود داخل ہو کر دروازہ لاک کر دیا۔

صرف آدھا گھنٹا رہ گیا تھا.....

''میں آپ کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی.....'' ماورا نے کہا۔ ''لیکن مجھے آپ کی فوری مدد کی ضرورت ہے۔''

''میرے پاس کوئی نشہ آور ادویات نہیں ہوتیں..... اگر تمہیں کوئی پرسکرپشن چاہیے تو وہ میں لکھ دیتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اسے کوئی نشئی سمجھتے ہوئے کہا۔

''اوہ ایسا کچھ نہیں ہے ڈاکٹر.....'' ماورا نے تیزی سے کہا اور اغوا کاروں سے موصول ہونے والا خط نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر نے پوری تفصیل اور غور سے وہ خط پڑھا۔

''میں نازنین کے گھر میں گھس گئی تھی اور وہاں سے مجھے آپ کے لکھے ہوئے نسخے ملے..... لیکن اس سے قبل میں نے قیصر بلوچ کو اپنی ہی بیوی کا ریپ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس سب کے پیچھے اس کا ہی ہاتھ ہے۔ وہ یا تو اپنی بیوی کو شدید نقصان پہنچانا چاہتا ہے یا پھر ڈاکٹر عظمان کے پیچھے ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں نازنین کی سرجری ہونے والی ہے۔ اُف..... پتا نہیں میرا بیٹا کدھر ہے؟''

ماورا کے اعصاب جواب دے گئے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''پلیز..... یہ گن پہلے نیچے کرلو۔'' ڈاکٹر واجد نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے پولیس کی مدد لی؟''

''انہوں نے کہا تھا کہ ایسا کرنے پر وہ سفیان کی جان لے لیں گے۔'' ماورا نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ ''مجھے لگا تھا کہ میں شاید اُسے پہلے ہی تلاش کرلوں۔''

''اور تمہیں کیا لگتا ہے کہ ڈاکٹر عظمان واقعی نازنین کے چہرے کو مفلوج کرنے کا عمل کردے گا؟''

''مم..... میں نہیں جانتی۔ اسے اپنے آدرش زیادہ عزیز ہیں۔ اسے کوئی بہت نیک نام پلاسٹک سرجن بننے کا بہت شوق ہے۔'' ماورا کے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔ ''بیٹے کی ویسے بھی اُس کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں..... وہ ہمیں چھوڑ چکا ہے۔''

''مجھے لگتا ہے کہ میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں.....'' ڈاکٹر واجد نے کہا تو ماورا کی نگاہوں میں امیدوں کے دیپ جل اُٹھے۔ ''لیکن پہلے تمہیں یہ سرجری رکوانی ہوگی۔ تم عظمان کے کلینک میں مجھے کتنی دیر میں لے کر پہنچ سکتی ہو؟''

☆☆☆

ماورا جانتی تھی کہ ڈاکٹر عظمان وقت کا بہت پابند ہے۔ وہ سرجری پورے وقت پر شروع کرتا تھا جس طرح سے اسے زندگی میں ہر کام وقت پر کرنے کی عادت تھی۔ ڈاکٹر واجد نے اسے مختصر وقت میں جو کچھ بتایا تھا تو وہ تین تین سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری تھی۔ ڈاکٹر واجد البتہ اس کی اس تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکے تھے اس لیے وہ انہیں ان کی گاڑی میں آنے کا کہہ کر، ٹریفک کی پروا کیے بغیر گاڑی دوڑاتی ہوئی عظمان کے کلینک پہنچ گئی۔

چار بج کر پانچ منٹ ہورہے تھے جب وہ سرجیکل سینٹر پہنچی۔

''اُف..... کہیں مجھے دیر نہ ہوجائے۔'' ماورا کے وجود سے اضطراب نمایاں تھا۔ اندر داخل ہونے پر اسے احساس ہوا کہ پہلے کے مقابلے میں کلینک کم روشن تھا۔ وہ ہچکچائے بغیر کلینک کے عقبی حصے کی جانب دوڑی جہاں پر آپریشن تھیٹر بنایا گیا تھا۔ اس کے باہر سرخ بتی جل رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ آپریشن جاری ہے۔

''میڈم آپ وہاں نہیں جاسکتیں۔'' اسے مریم مقبول کی آواز سنائی دی لیکن ماورا پروا کیے بغیر آندھی طوفان کی طرح آپریشن تھیٹر میں داخل ہوگئی۔

چار بج کر دس منٹ.....

نازنین بلوچ آنکھیں موندے، ایک سفید چادر میں لپٹی آپریشن ٹیبل پر لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ جراثیم کش دوا کے ساتھ صاف کیا جارہا تھا۔

ڈاکٹر عظمان اپنا آپریشن گاؤن، ماسک اور دستانے پہن کر ایک جانب ٹھہرا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سرنج دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے ملتی جلتی ایک اور سرنج اسٹیل کی ٹرے میں ساتھ ہی رکھی ہوئی تھی۔

اُن میں سے ایک میں تو یقیناً عُن کردینے والی دوا تھی..... لیکن دوسری میں کیا تھا؟

''ماورا.....؟'' ڈاکٹر عظمان حیرت سے چلّا اٹھا۔ ''تم یہاں کیا کررہی ہو؟''

وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے نازنین کی جانب بڑھی۔ آپریشن سے پہلے استعمال ہونے والی ادویات کے زیرِ اثر نازنین اپنی آنکھیں پوری طرح نہیں کھول پا رہی تھی۔

''ماورا..... تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔'' عظمان نے تیزی سے کہا۔

ماورا نے پروانہ کی اور نازنین کے چہرے پر جھک گئی۔

''تم کتنی بیچاری ہو..... مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔'' ماورا نے سرگوشی کی۔ ''تمہارے ساتھ بہت بُرا سلوک ہورہا ہے..... میں سب جان گئی ہوں اور میں تمہاری اس مشکل سے نکلنے میں مدد کروں گی۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''ہاں..... میں سمجھ رہی ہوں۔'' نازنین نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی جواری اپنی ساری پونجی جوئے میں ہار گیا ہو۔

''چلو ٹھیک ہے..... اب پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ سفیان کو کہاں رکھا ہے؟'' ماورا نے کہا تو نازنین آہستہ آہستہ اسے سب بتانے لگی۔

اُس کے پاس اب ہارنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر عظمان وہاں کھڑا حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ نازنین نے یہ سب کچھ خود کیا ہے؟'' ڈاکٹر عظمان کے لہجے میں ابھی تک حیرت تھی۔

پولیس نے ایلیٹ فورس کو استعمال کرتے ہوئے سفیان کو برآمد کرالیا تھا۔ نازنین نے اسے اپنے باڈی گارڈ انور کے ذریعے اغوا کرایا تھا اور اپنے ہی ایک مکان میں رکھا تھا۔

سفیان کا اس مکان میں آنا جانا تھا کیونکہ وہ اس کے دوست اسجد کا گھر تھا۔ اسجد بلوچ، نازنین اور قیصر کی اولاد تھی لیکن قیصر اپنی 'نفسیاتی وجوہات' کی بنا پر اسے نازنین سے علیحدہ رکھتا تھا۔ نازنین ایک جانب اولاد کی محبت کے لیے ترستی تھی لیکن دوسری جانب قیصر کے ہاتھوں بلیک میل بھی ہوجاتی تھی۔

اسجد اور سفیان کی دوستی کو دیکھ کر ہی نازنین کے دماغ میں یہ آئیڈیا آیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ اگر وہ اپنے دوست کے ہی گھر میں ہوگا تو اس بات کو اغوا نہیں سمجھا جائے گا۔ پولیس کی سوچ البتہ مختلف تھی۔ انہوں نے انور کو اغوا کے جرم میں گرفتار کرلیا تھا۔ نازنین پر بھی کیس ہوا تھا لیکن اس نے ضمانت قبل از گرفتاری کرالی تھی۔ ڈاکٹر واجد کے بیان کے بعد امید تھی کہ نازنین پر سے یہ کیس خارج کردیا جائے گا۔

''ڈاکٹر واجد کا کہنا ہے کہ نازنین اسٹریس ڈس آرڈر کا شکار تھی۔'' ماورا نے عظمان سے کہا۔ ''شادی کے بعد سے ہی... اس کا اپنے شوہر کے ساتھ محبت و نفرت کا عجیب رشتہ استوار ہوگیا تھا۔ قیصر بلوچ ایک اذیت رساں شخص تھا جو تشدد سے جنسی لذت کشید کرتا تھا..... جبکہ نازنین ایسی تھی جو مار کھا کر یہ لذت حاصل کرتی تھی۔''

''یعنی دونوں پرفیکٹ کپل تھے؟'' عظمان نے استہزائیہ انداز میں تبصرہ کیا۔

''ہاں..... بڑی حد تک.....'' ماورا نے کہا۔ ''لیکن گڑبڑ تب ہوئی جب نازنین امید سے ہوگئی۔ دونوں نے اس بات کو پہلے تو اس لیے خفیہ رکھا کہ کہیں بطور ہیروئین اس کا کیریئر خراب نہ ہوجائے..... بعد میں قیصر نے اسے بلیک میلنگ کا ذریعہ بنالیا۔ انور کو انہوں نے اس کا گارڈین.... بنا دیا تھا اور وقتاً فوقتاً نازنین کو اسجد سے ملوانے لے جاتا۔''

''جب نازنین اس نفسیاتی عارضے میں مبتلا رہ کر خوش تھی تو پھر اسے یہ سب کرنے کیا ضرورت پیش آگئی؟'' عظمان نے پوچھا۔

''شاید اس کی برداشت جواب دے گئی تھی..... یا پھر اولاد کی محبت غالب آگئی ہو۔ اولاد کے لیے تو انسان کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔'' ماورا نے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ ڈاکٹر واجد کے زیر علاج رہ کر اسے کچھ عقل آگئی ہو کہ وہ اپنی زندگی کیسے برباد کررہی ہے۔''

''ماورا..... تمہیں یاد ہے کہ طلاق کے بعد تم نے جاتے جاتے مجھے کیا کہا تھا؟'' عظمان اچانک سے بولا تو ماورا چونک گئی۔

''کیا کہا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''تم نے کہا تھا کہ جو لوگ آپس میں محبت کرتے ہیں انہیں شادی کرلینی چاہیے..... ورنہ ان کی محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔'' عظمان نے کہا تو ماورا نے سر جھکا لیا۔ ''میں نے کبھی تمہیں اس کا جواب نہیں دیا تھا لیکن یہ نازنین اور قیصر کے حالات دیکھ کر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ محبت کبھی ختم نہیں ہوتی..... چاہے طلاق ہی کیوں نہ ہوجائے۔ ہاں ہماری راہیں ضرور جدا ہوجاتی ہیں۔''

ماورا خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ عظمان کی ایک ایک بات سے متفق تھی لیکن اس کا اظہار کرکے اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرسکتی تھی۔ طلاق کا فیصلہ اس کا تھا اور وہ اس کے تمام اچھے بُرے نتائج کے ساتھ ہی اسے قبول کرچکی تھی۔

ایک پولیس والا دستک دے کر عظمان کے دفتر میں داخل ہوا تو دونوں کی محویت ٹوٹی۔

''ڈاکٹر صاحب..... ہمیں آپ کا بیان بھی تفتیش کا حصہ بنانا ہوگا۔''

''آپ چلیں میں آرہا ہوں.....'' عظمان نے اسے جانے کا کہا اور خود اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھ کر باہر نکلنے لگا تو ماورا نے اسے روک لیا۔

''عظمان.....'' وہ بولی۔ ''ایک بات تو بتاؤ..... میں جب آئی تھی تو تمہارے ایک ہاتھ میں سرنج تھی جبکہ ایک اور سرنج ٹرے میں بھی رکھی تھی۔ کیا تم سفیان کی خاطر وہ سب کرنے والے تھے جس کا مطالبہ کیا گیا تھا؟''

عظمان اس کی بات سن کر مسکرا اٹھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے ماورا..... کیا میں ایسا کر دیتا؟''

وہ عظمان کو جاتے ہوئے دیکھنے لگی..... اس کے ذہن میں اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے کہ انسان اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔

❖❖❖

کشتۂ احسان

غلام قادر

منزل تک پہنچنے کے لیے اَن تھک محنت اور جذبوں کی شدت کلیدی کردار ادا کرتے ہیں... ہر کردار میں کچھ خامیاں ہوتی ہیں اور کچھ خوبیاں ہوتی ہیں... خوش رنگ اور بے رنگ... اس کی زندگی میں بھی ایسے ہی مہربان جمع ہو گئے تھے... جو اسے منزل تک پہنچانے کے لیے اس کی راہ کے کانٹے چن کر پھول بچھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے...

ایک محسن کے احسانات..... وقت کی گردشوں نے اسے اپنے محسن کے سامنے کھڑا کر دیا.....

ائرپورٹ پر اترا تو میر صاحب کا ڈرائیور موجود تھا۔ اس نے میرا سامان اٹھایا اور میں اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ''صاحب نے کہا تھا کہ آپ کو لے کر سیدھے حویلی لاؤں۔'' ڈرائیور نے کہا لیکن میں خاموش رہا جانتا تھا کہ ڈرائیور وہی کرے گا جس کا اسے حکم دیا گیا۔ وہ میر صاحب کے وفاداروں میں سے تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میر صاحب کے حکم پر ان کے کئی دشمنوں کو قتل کر چکا ہے۔ ان میں کچھ وہ بھی تھے جنہوں نے میر صاحب کی حکم عدولی کی

تھی۔ ان میں سرفہرست میر صاحب کے چاچا اور ان کے دو بیٹے بھی شامل تھے جن سے میر صاحب کا وراثت کا جھگڑا چل رہا تھا اور معاملہ عدالت میں تھا۔ میر صاحب نے متعدد بار صلح کی کوشش کی تھی لیکن بات نہیں بنی تھی پھر ایک بار جب میر صاحب صلح کے لیے جا رہے تھے ان پر فائرنگ ہوئی تھی جس میں ان کے گارڈ کے ساتھ ڈرائیور بھی ہلاک ہو گیا تھا۔ اس وقت اس شخص نے جو اس وقت میر صاحب کا گارڈ تھا جوابی فائرنگ کی تھی۔ اس وقت یہ سرکاری ملازم تھا اور حکومت کی طرف سے جو دو گارڈ ملے تھے یہ ان میں سے ایک تھا۔

میر صاحب نے اسے ملازمت کی آفر کی تو اس نے قبول کر لی جبکہ وہ شہر کا رہائشی تھا اور گاؤں کی رہائش اس کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ میر صاحب نے اسے حویلی کے ایک حصے میں جگہ دی تھی .... یہ جگہ حویلی سے متصل تو تھی لیکن اس کا حویلی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میر صاحب نے اسے موبائل فون بھی لے دیا تھا جس کے ذریعے وہ ہر وقت میر صاحب سے رابطے میں رہتا تھا۔ میر صاحب جب بھی گھر سے باہر نکلتے، یہ شخص جسے لوگ باری شاہ کہتے تھے ڈرائیور کے فرائض انجام دیتا تھا۔

باری شاہ، میر صاحب کا معتمدِ خاص تھا۔ اتنا خاص کہ میرے کالج اور ہاسٹل کی فیس میر صاحب اسی کے ذریعے بھجواتے تھے۔ اب جب میں انگلستان سے بیرسٹر بن کر واپس آیا تھا تب بھی میر صاحب نے اسے ہی مجھے ائرپورٹ سے لینے بھیجا تھا۔

''اور سناؤ شاہ جی کیا حالات ہیں قصبے کے؟'' راستہ طویل تھا اس لیے میں نے وقت گزاری کے لیے گفتگو شروع کر دی۔

''جس قصبے کے حالات سو سال سے نہیں بدلے، ان میں پانچ برس میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟'' باری شاہ نے کہا اور میں مسکرا کر چپ ہو گیا۔ بات وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔

''ان پانچ برسوں میں تم کتنی بار شہر گئے؟'' میں نے سوال کیا۔

''شہر جانے کی غلطی میں نے ایک بار بھی نہیں کی یہاں تک کہ میں ابا کی میت پر نہیں گیا۔'' باری شاہ نے جواب میں کہا۔

''کیوں کیا میر صاحب نے اجازت نہیں دی؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''میر صاحب کو تو میں نے بتایا ہی نہیں۔'' باری شاہ نے کہا۔

''بیگم صاحبہ کو بتایا تھا لیکن انہوں نے بھی شاید میر صاحب سے ذکر نہیں کیا۔'' باری شاہ نے کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی ہو۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے اپنی جانب سے تبصرہ کیا اور جواب میں وہ صرف مسکرا دیا۔

''ان پانچ برسوں میں ان دونوں کے درمیان فاصلے کچھ اور بڑھ گئے ہیں۔'' باری شاہ نے کہا۔

ان کے درمیان پہلے بھی فاصلے تھے۔ میرے ذہن میں تاباں کی وہ تصویر ابھری تھی جب پانچ برس پہلے میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں بی اے میں ڈسٹرکٹ میں پوزیشن لینے کے بعد پہلی بار قصبے آیا تھا۔ گھر پہنچا تو والدہ نے اطلاع دی کہ میر صاحب نے شادی کر لی ہے۔ کس سے ان کی شادی ہوئی ہے، اس بارے میں وہ لاعلم تھیں۔

''تمہیں گھر آنے سے پہلے حویلی جا کر انہیں مبارک باد دینی چاہیے تھی۔'' والدہ نے میری غلطی کی نشاندہی کی۔

''آخر کو ان کا تم پر احسان ہے۔'' والدہ نے کہا اور مجھے یاد آیا کہ جب میں نے میٹرک میں پورے ڈسٹرکٹ میں ٹاپ کیا تھا اور حویلی گیا تھا تو میر صاحب نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟' ان کا سوال سن کر میں تو خاموش رہا تھا مگر بابا جو اس وقت وہیں موجود تھے، انہوں نے کہا تھا۔ ''آپ سفارش کریں گے تو اس کی نوکری لگ جائے گی۔''

''اس نے ڈسٹرکٹ میں ٹاپ کیا ہے اور تم اسے کلرک بنانا چاہ رہے ہو؟'' میر صاحب نے اپنے کمدار یعنی بابا سے سخت لہجے میں کہا۔

''تم بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟'' میر صاحب نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

''میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں۔'' میں بمشکل کہہ پایا تھا۔

''پاگل ہو گیا ہے۔'' بابا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''اس میں پاگل پن والی کیا بات ہے؟'' میر صاحب نے بابا سے کہا۔ اس بار ان کا لہجہ زیادہ سخت تھا۔

''میر صاحب گاؤں میں تو کالج ہے نہیں۔'' بابا نے کہا۔

''اس کے کالج کی فیس اور ہاسٹل کے اخراجات اٹھانے کے لیے میرے پاس رقم نہیں ہے۔'' بابا نے اپنی مجبوری بتائی۔

''تم ایسا کرو کل میری کار لے کر شہر چلے جاؤ اور وہاں داخلہ لے لینا اور ہاسٹل کا انتظام بھی کر لینا۔'' میر صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔

اگلے روز میں میر صاحب کے ڈرائیور کے ساتھ شہر

گیا۔ ڈرائیور مجھے کالج کے باہر اتار کر کالج میں گیا اور دو گھنٹے بعد آیا۔ اندر اس نے نہ جانے کیا چکر چلایا لیکن جب باہر آیا تو کالج کے ایک ٹیچر اس کے ساتھ تھے۔

''چلو میں تمہیں ہاسٹل میں تمہارا کمرا دکھا دیتا ہوں۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اب میں وہ ٹیچر اور ڈرائیور دوبارہ سے کار میں بیٹھ گئے اور پھر اس ٹیچر نے جس کا نام بعد میں معلوم ہوا کہ عنصر محمود تھا، ہاسٹل گئے اور مجھے میرے روم میٹ سے ملوایا۔

پھر جب ہم ہاسٹل سے نکل کر دوبارہ کار میں بیٹھے تو سر عنصر نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میں ہاسٹل کا پرووسٹ ہوں اور یہ کمرا میں نے اس لیے منتخب کیا ہے کہ یہ لڑکا اور اس کے ساتھ والا لڑکا دونوں بڑے وڈیروں کے بیٹے ہیں، تمہیں ان سے کوئی دوستی نہیں رکھنی۔'' سر عنصر کا انداز نصیحت کرنے والا تھا۔

''سر یہ کس طرح ممکن ہے ایک کمرے میں ساتھ رہتے ہوئے.....؟'' میں نے کہا اور سر عنصر مسکرا دیے۔

''ان دونوں کا پڑھنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دونوں اپنے اپنے والدین کے پیسے ضائع کر رہے ہیں۔'' سر عنصر نے کہا۔

''سر آپ صحیح کہہ رہے ہوں گے لیکن دو سال ایک کمرے میں رہ کر میں کس طرح ان سے الگ رہ سکتا ہوں؟'' میں نے کہا اور سر عنصر ہنس دیے۔

''یہ دونوں اس سال پاس تو نہیں ہو سکتے اور کالج کی پالیسی یہ ہے کہ جو پہلے برس کسی ایک پرچے میں بھی فیل ہو اسے اگلے سال داخلہ نہیں دیا جاتا۔'' سر عنصر نے بتایا۔

''آپ کہیں یہ تو نہیں کہہ رہے کہ ان دونوں کو صرف ایک برس برداشت کرنا ہوگا؟'' میں نے باادب لہجے میں سوال کیا۔

''اگلے سال یہ پورا کمرا تمہارے قبضے میں ہوگا۔'' سر عنصر کا جواب تھا۔

مجھے سر عنصر کی بات سمجھنے میں تین دن لگے تھے۔

دونوں کے شوق یہ تھے کہ وہ کالج سے آنے کے بعد شراب پیتے اور ساتھ میں چرس کے سگریٹ جلا لیتے۔ جس سے کمرے میں اتنا دھواں ہو جاتا کہ سانس لینا دوبھر ہو جاتا۔ دونوں یعنی صفدر اور ریاض اکثر رات میں کمرے میں آتے ہی نہیں تھے، کہاں ہوتے تھے اس کا پتا مجھے اُس روز چلا جب ایک رات سر عنصر نے رات تین بجے پرووسٹ کی حیثیت سے چھاپا مارا۔ اس رات..... یہ دونوں کمرے سے غائب تھے جبکہ ہاسٹل کے قواعد کے مطابق اگر کسی کو رات میں دیر سے آنا ہوتا تو وہ پرووسٹ سے لیٹ پاس لے کر جاتا تھا۔ سر عنصر جب ہمارے کمرے میں آئے تو مجھے پڑھتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے مگر کمرے میں چرس کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا۔ ''یہ بُو کیسی ہے؟'' اور میں نے جواب میں وہ کہہ دیا جو سچ تھا۔ سر عنصر ایک، ایک کمرے کی تلاشی کے بعد اپنے پرووسٹ کے کمرے میں بیٹھ گئے اور ساتھ ہی چوکیدار کو ہدایت دی کہ صفدر اور ریاض جب بھی آئیں، انہیں لے کر ان کے پاس آئیں۔

صفدر اور ریاض صبح آئے تھے جب کالج میں کلاسیں شروع ہو چکی تھیں اور سر عنصر پرنسپل کے پاس تھے۔ سر عنصر، پرنسپل صاحب کو پہلے ہی رپورٹ کر چکے تھے۔

دونوں احتیاطی طور پر ریاض کے ہاتھوں میں پلاستر بندھوا کر آئے تھے۔ پرنسپل صاحب نے جب سوال کیا کہ ''رات کہاں تھے؟'' تو انہوں نے جواب میں کہا۔ ''سر ریاض کی بائیک سلپ ہو گئی تھی اور ہم دونوں اسپتال میں تھے جہاں ریاض کے ہاتھ پر پلاستر چڑھتا رہا تھا۔''

''کس اسپتال میں تھے؟'' پرنسپل صاحب نے اگلا سوال کیا۔

''سر..... وہ..... میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔''

''ٹھیک ہے مجھے اس ڈاکٹر کا فون نمبر دے دو۔'' پرنسپل صاحب نے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سر فون نمبر تو یاد نہیں۔'' صفدر کا جواب تھا۔

''ٹھیک ہے جب یاد آجائے تو کالج آنا لیکن اپنے ساتھ اپنے اپنے والد کو ضرور لانا۔'' پرنسپل صاحب نے کہا اور دونوں وہاں سے نکل آئے لیکن جب کلاسیں ختم کر کے میں ہاسٹل پہنچا تو وہ دونوں ہاسٹل کے گیٹ پر میرے انتظار میں تھے۔

''تو نے مخبری کی تھی؟'' صفدر خطرناک ارادے سے میری طرف بڑھا تھا۔

''مجھے کیا ضرورت تھی مخبری کرنے کی؟'' میں نے جواب دیا۔

''صفدر، چھوڑ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' ریاض نے درمیان میں آتے ہوئے کہا۔

''اس بار تو تجھے اس نے بچا لیا لیکن میں تیرا وہ حشر کروں گا جو تو پوری زندگی یاد رکھے گا۔'' صفدر نے پیچھے ہٹتے ہوئے دھمکی دی تھی۔

اس واقعے کے چوتھے روز پرنسپل صاحب نے مجھے طلب کیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ دونوں اپنے اپنے والد کے ساتھ وہاں موجود تھے۔

''یہ ہے ان دونوں کا روم میٹ فرجاد۔'' پرنسپل صاحب نے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''کیوں بیٹا یہ اُس رات کمرے میں نہیں تھے؟'' ریاض کے والد نے آگے بڑھ کر مجھ سے سوال کیا۔

''اس رات تو سر عنصر نے خود دیکھ لیا لیکن یہ تو اکثر رات میں غائب ہوتے ہیں۔'' میں نے وہی کہا جو حقیقت تھی۔

''تم نے کبھی پوچھا نہیں کہ رات میں یہ کہاں ہوتے ہیں؟'' ریاض کے والد نے اگلا سوال کیا۔

''مجھے کیا ضرورت تھی ان سے پوچھنے کی، مجھے تو ایک طرح سے آرام ہی تھا کیونکہ ان کے نہ ہونے سے میں آسانی کے ساتھ پڑھائی کرسکتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس سے کیوں سوال کررہے ہیں میں بتاتا ہوں کہ ان کی راتیں کہاں بسر ہوتی ہیں۔'' سر عنصر نے کہا اور اب تمام نظریں سر عنصر کی جانب اٹھ گئیں۔

''جی عنصر صاحب بتایئے۔'' پرنسپل صاحب نے سر عنصر کو مخاطب کیا۔

''تم خود بتاتے ہو یا میں بتاؤں کہ تم دونوں راتیں کہاں گزارتے ہو۔'' سر عنصر نے صفدر اور ریاض کو مخاطب کیا اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں نے سر عنصر کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''سر ہمیں معاف کردیں آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔'' ان دونوں نے کہا۔

''مجھے تو بتادیں۔'' پرنسپل صاحب نے کہا۔

''سر یہ معافی مانگ رہے ہیں اور وعدہ کررہے ہیں کہ آئندہ یہ غلطی نہیں کریں گے تو میں سفارش کرتا ہوں کہ انہیں معاف کردیں۔'' سر عنصر نے پرنسپل صاحب سے کہا۔

''آپ کے کہنے پر انہیں معاف کردیتا ہوں ورنہ میں نے تو اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ ان دونوں کو کالج سے نکال دیا جائے۔'' پرنسپل صاحب کا فقرہ ختم ہوتے ہی دونوں نے باہر کی جانب قدم بڑھائے لیکن ریاض کے والد نے روکا۔

''اپنے استاد کا تو شکریہ ادا کرو جن کی سفارش پر تم دونوں.... بچ گئے۔''

''اس بار تو بچ گئے ہیں مگر انہیں بتادیں کہ اگر یہ ایک پرچے میں بھی فیل ہوگئے تو اگلے برس کوئی دوسرا کالج ڈھونڈ لیں کیونکہ کالج کی پالیسی یہ ہے کہ کوئی اسٹوڈنٹ اگر تمام پرچے پاس نہ کرے تو ہم اگلے سال اسے داخلہ نہیں دیتے۔'' پرنسپل صاحب نے وہی بات کی جو سر عنصر مجھے پہلے ہی بتا چکے تھے۔

''سن لیا تم دونوں نے؟'' ریاض کے والد نے اُن دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ ان دونوں کو ٹیوشن پڑھانے کی ذمے داری لے لیں۔'' صفدر کے والد نے سر عنصر سے کہا۔

''میں نہ پرائیویٹ ٹیوشن پڑھاتا ہوں نہ کسی ٹیوشن سینٹر کو جوائن کیا ہے۔'' سر عنصر کا جواب تھا۔ ''مجھے سرکار سے جو تنخواہ ملتی ہے، وہ میرے گزارے کے لیے کافی ہے۔ ہم ہیں کتنے دو میاں بیوی ہیں اور ایک ہماری بیٹی۔'' سر عنصر بولے۔ کہا۔

میں بھی ان دونوں کے پیچھے پرنسپل کے کمرے سے نکل آیا۔

اس روز وارننگ ملنے کے بعد ان دونوں میں کافی تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ شراب اور چرس تو پیتے تھے لیکن کمرے میں نہیں بلکہ ہاسٹل میں ہی انہوں نے اپنے جیسا ایک اور تلاش کرلیا تھا اب یہ عیاشیاں اس کے کمرے میں ہوتی تھیں۔ ہمارے کمرے کی طرح اس کمرے میں بھی تین لڑکے ہوتے تھے۔ وہ دونوں مجھے تو اپنے رنگ میں نہیں رنگ سکے لیکن اس نئے کمرے کے تینوں لڑکے آہستہ آہستہ ان کے رنگ میں رنگ گئے، اس حد تک نہیں کہ شراب پینے لگے یا راتوں کو ہاسٹل سے غائب ہونے لگے لیکن چرس کا نشہ ضرور کرنے لگے تھے۔ مہینہ بھر بعد جب پردوست نے چھاپا مارا تو کوریڈور میں چرس کی اتنی بُو تھی کہ وہ سیدھا اسی کمرے میں گئے تھے۔ غنیمت تھا کہ ریاض اور صفدر اس وقت کمرے میں نہیں تھے۔ البتہ وہ تینوں کمرے میں تھے جنہیں وہ کمرا الاٹ ہوا تھا۔ سر عنصر نے بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھا بلکہ ان تینوں کو اپنے دفتر میں لے گئے اور انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر واپس کردیا لیکن ان تینوں نے وہ کچھ بتادیا جو سر عنصر جاننا چاہتے تھے۔ امتحان میں زیادہ وقت نہیں رہا تھا اس لیے بھی سر عنصر نے مزید کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔

امتحان ہوئے تو سر عنصر کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی تھی۔ صفدر اور ریاض کو اگلی کلاس میں داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ ریاض دو پرچوں میں فیل ہوا تھا جبکہ صفدر پانچوں پرچوں میں فیل ہوا تھا اب پورے کمرے پر میرا قبضہ تھا لیکن پندرہ دن بعد ایک نیا لڑکا کالج میں آگیا تھا۔ وہ بھی میری طرح

تھا۔ مجھے اس سے صرف ایک شکایت تھی کہ وہ رات بھر پڑھتا رہتا تھا جبکہ مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ ہمارے درمیان ایک مقابلہ شروع ہوگیا۔ وہ محنتی بہت تھا لیکن ذہانت میں کچھ کم تھا اس لیے انٹر کے امتحان میں وہ مجھ سے کم نمبر لاسکا۔ میری انٹر میں بھی پوزیشن آئی تھی پہلی نہ سہی تیسری پوزیشن تو آئی تھی۔ پہلی پوزیشن کسی لڑکی کی تھی جو شہر کے گرلز کالج کی طالبہ تھی۔ میری اپنے کالج میں پہلی پوزیشن تھی۔ میرا... روم میٹ ندیم بھی اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا لیکن کوئی پوزیشن نہیں لے سکا تھا۔

انٹر کے بعد چھٹیوں میں گھر آیا تو بابا کو بیساکھیوں پر دیکھا۔ میر صاحب کے کسی نے کان بھرے تھے کہ کمدار اپنے بیٹے کے لیے زمینوں کے حساب میں گڑبڑ کررہا ہے۔ میر صاحب نے حساب چیک کیا تو اسّی ہزار کم تھے۔ میر صاحب نے بابا سے پوچھا تو بابا نے کہا۔ 80 ہزار تو ان سے بڑے میر صاحب نے لیے تھے لیکن بڑے میر صاحب شہر گئے ہوئے تھے اس لیے بابا کی گواہی نہ دے سکے اور میر صاحب نے ڈنڈوں سے مار مار کر بابا کو اپاہج کردیا تھا۔

دو روز بعد جب بڑے میر صاحب شہر سے واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ کمدار صحیح کہہ رہا ہے۔ میں نے تمہارا رشتہ طے کردیا ہے۔

میر صاحب اسی روز ہمارے چھوٹے سے گھر میں آئے۔ انہوں نے بابا اور امی دونوں سے معافی مانگی تھی کہ انہوں نے طیش میں آکر وہ غلطی کردی تھی۔

ابا کے خون میں وفاداری تھی اس لیے وہ یہی کہتے رہے۔ ''میر صاحب آپ کے اتنے احسانات ہیں ہم پر آپ معافی مانگ کر ہمیں شرمندہ کیوں کررہے ہیں۔'' مگر اماں نے دبی زبان میں احتجاج کیا تھا۔ ''میر صاحب آپ غور کریں تو آپ نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔'' اماں نے احتجاج کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

''میرا نقصان..... وہ کس طرح؟'' میر صاحب نے سوال کیا۔

''پہلے تو یہ موٹر سائیکل پر جاکر زمینوں کی دیکھ بھال کر لیتے تھے اب ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ موٹر سائیکل چلاسکیں گے کیا؟'' اماں جب احتجاج کررہی تھیں تو بابا انہیں خاموش رہنے کو کہہ رہے تھے۔ اماں چونکہ اس قصے کی نہیں تھیں اس لیے ان کا احتجاج اسی طرح جاری رہا۔ اس وقت تو بابا انہیں خاموش نہ کروا سکے لیکن اگلے ہی روز میر صاحب معذوروں والی کار لے کر گھر آئے تو اماں نے ان کا شکریہ بھی ادا کیا اور اس احسان کو بھی یاد کیا جو میر صاحب نے ان پر کیا تھا۔

''کل میں کچھ زیادہ ہی بول پڑی تھی اور آپ کا وہ احسان بھی بھول گئی تھی جو آپ نے ہم پر کیا تھا۔'' اماں بولیں۔

''کون سا احسان؟'' میر صاحب نے کہا۔

''ہمارا بیٹا جو کالج میں پڑھ رہا ہے، یہ بھی آپ کا احسان ہے۔'' بابا کے لہجے میں ہر طرح کی خوشامد تھی۔

''یہ نہ کہو۔'' میر صاحب نے کہا۔ ''تمہارا بیٹا خود بھی قابل ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔ ''جس لگن سے وہ پڑھائی کررہا ہے، تم دیکھنا ایک روز تمہارا ہی نہیں میرا بلکہ ہمارے علاقے کا نام روشن کرے گا۔'' میر صاحب نے کہا۔

انٹر کے بعد کی چھٹیوں میں مجھے ایک نیا شوق پیدا ہوا تھا اور وہ شوق ورزش کا تھا۔ اب میرا وقت بابا کے ساتھ زمینوں پر گزرتا تھا یا ورزش کرتا تھا۔ گاؤں کی فضا میں پلنے کی وجہ سے میرا جسم پہلے ہی اپنی عمر کے باقی جوانوں سے بہتر تھا لیکن کسرت نے میرے جسم کو مزید نکھار دیا تھا۔ ماں کی جانب سے مجھے رنگت ملی تھی اور میں سرخ و سپید تو تھا ہی لیکن ورزش نے اس میں مزید نکھار پیدا کردیا تھا۔ بابا نے میرا شوق دیکھ کر گھر میں گائے بھی پال لی تھی جس کا دودھ صرف میں پیتا تھا۔

بابا کے ساتھ زمینوں پر جانے کی وجہ سے مجھ میں یہ احساس بھی پیدا ہوگیا تھا کہ گھر کے ساتھ کی زمینیں ضائع ہورہی ہیں۔ میں نے بابا سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے پہلے تو غور سے دیکھا پھر کہا۔ ''کیا اُگائے گا یہاں؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''کچھ بھی سبزیاں بھی اُگ سکتی ہیں۔ باغ بھی بن سکتا ہے۔'' میں نے کہا اور بابا مسکرادیے۔

''مجھے تو اعتراض نہیں مگر زمین کے مالک تو میر صاحب ہیں، ان سے ایک بار پوچھ کر اپنا شوق پورا کرلینا۔''

بابا نے مشورہ دیا تھا لیکن میں نے اس مشورے پر عمل کرنے سے پہلے ہی وہ کرنا شروع کردیا جو میرے دل میں آیا تھا۔ اب صبح سویرے اٹھ کر میں سبزیوں کی کیاریوں میں گوڈی کرتا اور اس کے ساتھ ہی میں نے گھر کے پچھلے حصے میں آم کے پودے لگا لیے تھے۔ جنہیں میں روز پانی دیتا تھا۔ چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے ہی سبزیاں اُگ آئی تھیں۔ اماں نے اب ان ہی سبزیوں کو پکانا شروع کردیا تھا۔ ابا کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے بہت سی توریاں ایک ٹوکرے میں بھر کر حویلی پہنچادی تھیں۔ اماں نے پوچھا بھی کہ وہ ایسا

کیوں کر رہے ہیں تو بابا نے جواب دیا کہ ''میر صاحب کو یہ سبزی بہت پسند ہے۔'' اور اماں خاموش ہو گئیں۔ اسی شام میر صاحب ہمارے گھر آئے تھے۔ انہوں نے گھر کے باہر سبزیوں اور پھولوں کی کیاریاں دیکھیں تو بہت خوش ہوئے۔

''یہ سب فرجاد کا شوق ہے۔'' بابا نے منمناتے لہجے میں کہا۔ میں پاس ہی موجود تھا۔ میر صاحب نے مجھ پر نظر ڈالی تو میں نے گردن ہلا کر تائید کر دی۔

''کب جا رہے ہو واپس؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''بس اگلے ہفتے کالج کھل رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اب تو بی اے میں داخلہ لو گے؟'' میر صاحب نے سوال کیا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''شہر جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''جی ضرور۔'' میں نے مختصر جواب دیا تھا۔

''میں نے تو اس سے کہا تھا کہ بیچ ڈالنے سے پہلے میر صاحب سے اجازت لے لینا۔'' بابا نے کہا۔ ''مگر پتا نہیں کیوں اس نے ضروری نہیں سمجھا۔'' بابا نے کہا۔

میر صاحب مسکرا دیے۔ ''کمدار صاحب یہ نئی نسل کے لوگ ہیں لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ اپنے اصل کی جانب لوٹ رہا ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔ ''شہر نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ بڑے لوگ سچ کہہ گئے ہیں، کسان کا بیٹا کسان ہی ہوتا ہے۔'' میر صاحب یہ کہتے ہوئے گھر کے پچھلے حصے میں گئے تھے جہاں میں نے آم کا باغ لگانا شروع کیا تھا۔

''یہ کون سے پودے ہیں؟'' میر صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔

''آم کے پودے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہماری طرف کے آم پورے پاکستان میں پسند کیے جاتے ہیں۔'' میر صاحب نے کہا۔

''کمدار صاحب جب یہ پھل دینا شروع کریں تو حویلی ضرور بھجوا دیں۔'' میر صاحب نے چلتے چلتے کہا۔

''یہ تم نے باڑی بنانا کب سے شروع کی؟'' میر صاحب نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''وہ میر صاحب چھٹیوں میں اور کوئی کام نہیں تھا تو میں نے ورزش شروع کر دی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''بہت خوب، اچھا شوق ہے یہ بھی۔'' میر صاحب یہ کہتے ہوئے اپنی کار میں بیٹھ گئے۔

''شہر جا کر اس شوق کو ترک نہ کر دینا۔'' کار روانہ ہونے سے پہلے میر صاحب نے کہا اور ڈرائیور نے ان کے اشارے پر کار آگے بڑھا دی۔ میں نے گاؤں میں رہتے ہوئے شہر سے اپنا رابطہ نہیں توڑا تھا۔ چھٹیوں پر آتے ہوئے میں نے سر عنصر کا نمبر لے لیا تھا اور انہوں نے اجازت دی تھی کہ ہفتے میں ایک بار انہیں فون کر لیا کروں۔ اس کے لیے انہوں نے دن بھی مقرر کر دیے تھے کہ ہفتے کی شام یا اتوار کے دن میں کسی وقت فون کر لیا کروں۔ میں ہر ہفتہ انہیں فون کر لیا کرتا تھا اور وہ بات کر لیتے تھے۔ آخری بار میں نے ان سے بات کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''مجھے بی اے میں داخلہ تو مل جائے گا؟'' تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''تمہیں نہیں ملے گا تو کسے ملے گا۔ میں نے کل ہی تمہارے لیے وظیفے کے لیے پرنسپل صاحب سے بات کی تھی اور وہ بھی اس پر مجھ سے متفق تھے کہ سرکار کی طرف سے جو وظیفے آتے ہیں، ان میں سے تمہیں بھی ملنا چاہیے آخر تم نے ہمارے کالج کا نام روشن کیا ہے۔''

''تھینک یو سر۔'' میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

میں ان سے یہ معلوم نہیں کر سکا تھا کہ وہ وظیفہ کتنا ہو گا۔ میں نے اس گفتگو کے سلسلے میں نہ بابا سے کوئی بات کی نہ اماں سے اس کا ذکر کیا۔ اب کی بار جب میں نے ہفتے کو فون کیا تو سر عنصر کی جگہ ایک سُریلی سی آواز سنائی دی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے جھجکا مگر جب اس سُریلی آواز نے کہا کہ ''میں سکینہ ہوں، عنصر صاحب کی بیٹی۔'' تو مجھے حوصلہ ہوا۔

''میں فرجاد ہوں آپ کے والد کا شاگرد۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے اپنا تعارف کروایا۔

''میں جانتی ہوں والد صاحب اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں بلکہ آپ نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔''

''میں نے ایسا کیا کر دیا کہ آپ کا جینا دوبھر ہو گیا؟'' میں نے کہا اور ایک سُریلی سی ہنسی کی آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا۔

''میں پڑھائی میں بہت اچھی ہوں لیکن اتنی اچھی نہیں جتنے کہ آپ ہیں۔'' سکینہ نے بے تکلف ہونے والے انداز میں کہا۔ ''میں محنت بھی بہت کرتی ہوں مگر ابا ہر وقت آپ کی مثالیں دیتے ہیں کہ دیکھو فرجاد کتنی محنت کر کے اس پوزیشن میں آیا ہے۔'' سُریلی آواز نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس نے جو جینا دوبھر کی اصطلاح استعمال کی تھی، اس سے کیا مطلب تھا۔

''آپ کس کلاس میں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں سائنس کی اسٹوڈنٹ ہوں اور اس سال انٹر سائنس کا امتحان دوں گی۔''

''سائنس کے طالب علموں کے لیے یہ سال سب سے اہم ہوتا ہے۔''

''آخر ہیں نا آپ ابا کے شاگرد، وہ بھی یہی کہتے رہتے ہیں۔'' سکینہ نے کہا۔

''کیا سر عنصر گھر پر نہیں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔ جاتے ہوئے تو بہت خوش تھے اب دیکھیں واپسی پر کیا خبر لاتے ہیں۔''

''خوش کیوں تھے؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''ان کا نام کالج کے پرنسپل کے لیے گیا ہوا ہے۔'' سکینہ کا جواب تھا۔

''دیکھنا واپسی میں وہ اچھی خبر کے ساتھ آئیں گے۔'' میں نے کہا اور کانوں میں ایک بار پھر مندر کی گھنٹیاں بج گئیں۔ سکینہ بہت آہستگی سے ہنسی تھی۔

''سنیارٹی میں وہ باقی دو سے آگے ہیں لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ میں اردو کا استاد ہوں اور اردو کے استاد کو آج تک پرنسپل نہیں بنایا گیا ہے۔'' سکینہ نے کہا۔

''باقی دو نام کس کے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

سکینہ نے نام بتائے۔ وہ دونوں ہمارے ہی کالج کے تھے۔ ''ابا کہہ رہے تھے کہ فواد صاحب کو ایک ایم پی اے بہت سپورٹ کر رہا ہے۔'' سکینہ نے کہا۔

''سر فواد خود بھی سیاسی تھے اور اس جماعت کی حمایت کرتے تھے جس کی صوبے میں حکومت تھی۔ اس جماعت کے اسٹوڈنٹ ونگ میں بھی سر فواد بہت مقبول تھے اور وہ لڑکے اکثر سر فواد کو گھیرے رہتے تھے جبکہ پرنسپل صاحب سر فواد کی ان حرکتوں پر اکثر نالاں رہتے تھے۔ انہوں نے ایک دو بار سر فواد کو اس پر تنبیہ بھی کی تھی مگر سر فواد نے جواز دیا تھا کہ ''سر استاد اور شاگرد میں بہترین انڈر اسٹینڈنگ ہونی چاہیے۔''

انہی وجوہات کی وجہ سے میں نے میر صاحب سے بات کی کہ سر عنصر ہی اس عہدے کے مستحق ہیں۔

میر صاحب نے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن شہر جاتے ہوئے میں صبح ان کے پاس گیا اور یاد دہانی کروانی چاہی تو... انہوں نے کہا۔ ''میری سیکریٹری تعلیم سے کل رات ہی بات ہوئی تھی۔'' میر صاحب نے کہا۔ ''میں نے جب پوری صورتِ حال بتائی تو اس نے کہا۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں کل ہی عنصر صاحب کے پرنسپل بننے کا نوٹیفکیشن نکلوا دیتا ہوں حالانکہ جس ایم پی اے کے بارے میں آپ بتا رہے ہیں وہ ایک ہفتہ سے کراچی میں بیٹھا ہوا ہے اور چار بار میرے دفتر میں آ کر سفارش کر چکا ہے بلکہ وزیرِ تعلیم سے مل کر بھی وہ فواد کے لیے سفارش کر چکا ہے۔ مجھ سے وزیر صاحب نے سفارشات مرتب کرنے کے لیے کہا تھا تو میں نے عنصر صاحب کے نام کی سفارش کر دی تھی کیونکہ فواد کی سالانہ رپورٹ میں پرنسپل صاحب متعدد بار یہ لکھ چکے تھے کہ فواد اپنا ٹیوشن سینٹر چلا رہا ہے اور کبھی کرپشن میں ملوث ہے۔''

میر صاحب کی زبان سے میں یہ سن کر خوش، خوش شہر کی جانب روانہ ہو گیا اس بار بھی میر صاحب نے اپنا ڈرائیور اور کار میرے ساتھ کر دی تھی۔ ساتھ ہی اپنا موبائل فون بھی مجھے دے دیا تھا۔ ''کئی بار میرا دل چاہا تھا کہ تم سے بات کروں مگر پھر یہ سوچ کر نہیں کرتا تھا کہ تم نہ جانے کہاں ہو گے اور کالج کے نمبر پر فون کروں تو تم نہ جانے کتنی دیر میں آ سکو۔''

''ہم نے ابھی شہر کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ میں نے سر عنصر کے نمبر پر ڈائل کر دیا۔ دوسری جانب سر عنصر نے فون اٹھایا تھا۔

''سر میں فرجاد بول رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ نمبر کس کا ہے؟'' سر عنصر نے سوال کیا۔

''سر! یہ میر صاحب کا نمبر ہے۔ انہوں نے اپنا موبائل مجھے دے دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کس لیے فون کیا تھا؟'' انہوں نے ایک اور سوال کیا۔

''سر میں شہر آ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ آپ سے بات کر لوں۔'' میں نے فون پر انہیں پرنسپل بننے کی مبارک باد دینا مناسب نہیں سمجھا۔

''تم ایسا کرو پہلے میرے گھر آ جاؤ بلکہ رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا۔'' سر عنصر نے آفر کی۔

میں انکار نہ کر سکا لیکن اس آفر نے ایک نئی راہ سُجھا دی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار کسی بیکری پر روک دے مجھے کیک لینا ہے۔ ڈرائیور کو ساتھ ہی میں نے سر عنصر کے گھر کا پتا سمجھایا۔

''یہ پتا تو میرے پرانے محلے کا ہے۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''تم ہر روز شہر سے قصبے میں آتے رہے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں جناب، پہلے آتا تھا اس کے لیے میر صاحب

نے مجھے موٹر سائیکل دی ہوئی تھی۔ اب تو میر صاحب نے حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں مجھے جگہ دے دی ہے فیملی میری البتہ ابھی شہر میں رہتی ہے۔'' ڈرائیور کا جواب تھا۔

''پھر تو تم سر عنصر کو جانتے ہو گے جو کالج میں لیکچرار ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''جی میں اس پورے خاندان کو جانتا ہوں۔ ان کی ایک بیٹی ہے جو عورتوں کے ہر میلاد میں نعتیں پڑھتی ہیں۔'' ڈرائیور نے جواب میں کہا۔

یہ ڈرائیور وہی تھا جو بعد میں میر صاحب پر ہونے والی فائرنگ میں مارا گیا تھا جس کے بعد میر صاحب نے گارڈ کو ڈرائیور بنا دیا تھا۔

ہم نے ایک بیکری سے کیک لیا اور سر عنصر کے گھر پہنچ گئے۔ گیٹ سر عنصر کے ملازم نے کھولا تھا۔ اس نے میرا نام پوچھا اور میرے سوال کا جواب دیے بغیر بولا۔ سر عنصر گھر پر ہیں اور اندر چلا گیا۔ میں برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں سر عنصر اندر سے آتے ہوئے نظر آئے.....

''باہر کیوں کھڑے ہو؟'' انہوں نے باہر آنے سے پہلے سوال کیا۔

''رحیم الدین۔'' سر عنصر نے ملازم کو آواز دی۔ ''کتنی بار کہا ہے کہ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا کرو۔'' سر عنصر نے ملازم کو ڈانٹ پلائی اور وہ منہ بناتا ہوا اپنی جگہ پر چلا گیا اور سر عنصر مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ یہ اتنی ہی بڑی بیٹھک تھی جتنی ایک سو بیس گز کے مکان میں ہو سکتی ہے۔

''چائے پیو گے؟'' میرے بیٹھتے ہی انہوں نے سوال کیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''سر یہ کیک ہے۔'' میں نے اپنے ہاتھ کا شاپر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیوں؟'' سر عنصر سوال کیے بغیر نہیں رہ سکے۔

''اس کی دو وجوہات ہیں۔'' میں نے کہا اور سر عنصر مجھے اس انداز میں دیکھنے لگے، جیسے وہ وجوہات جاننا چاہتے ہوں مگر اس سے پہلے کہ میں وجوہات بیان کرتا، انہوں نے اپنی بیٹی کو آواز دے دی۔

''جی ابا۔'' اندر سے وہی سُریلی آواز آئی جو پہلے بھی سن چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھلتے ہوئے رنگ کی ایک دبلی پتلی سی لڑکی بیٹھک کے اندر کی جانب کھلنے والے دروازے پر نمودار ہوئی تھی۔

''ہاں تو کیا ہیں وہ دو وجوہات؟'' سر عنصر نے مجھ سے سوال کیا اور پھر بیٹی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا یہ کیک اندر لے جاؤ اور دیکھو جلدی سے دو کپ چائے بھجوا دو۔'' سر عنصر نے بیٹی سے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''تم نے اب تک وہ دو وجوہات نہیں بتائیں؟'' سر عنصر نے مجھے مخاطب کیا۔

میں کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ نے مجھے موقع ہی کب دیا لیکن میں نے وہ کہنے کے بجائے وجوہات بیان کرنا شروع کر دیں۔

''پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اماں نے کہا ہے کسی کے بھی گھر جاؤ تو خالی ہاتھ نہ جاؤ۔'' میں اتنا کہہ کر رکا تھا تو سر عنصر نے فوراً سوال کر دیا۔

''اور دوسری وجہ کیا ہے؟''

میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا لیکن میں نے کہا۔ ''سر مبارک ہو آپ پرنسپل ہو گئے ہیں۔'' میں نے کہا اور سر عنصر کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

یہ بات سر عنصر نے اتنے زور سے کہی تھی کہ سکینہ جو ڈرائنگ روم سے باہر جا چکی تھی، پلٹ آئی۔ ''کیا ہوا؟'' سکینہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ بتا رہا ہے کہ میں کالج کا پرنسپل ہو گیا ہوں۔'' سر عنصر نے بیٹی کو جواب دیا۔

''انہیں کس طرح معلوم ہوا؟'' سکینہ نے براہِ راست مجھ سے سوال کرنے کے بجائے باپ سے سوال کیا۔

''تمہیں یاد ہے کہ میری تم سے بات ہوئی تھی تو تم نے مجھے کچھ بتایا تھا۔'' سر عنصر کے کچھ کہنے سے پہلے میں نے کہنا شروع کیا تھا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ ابا کا نام پرنسپل کے لیے گیا ہوا ہے اس لیے وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔'' سکینہ نے کہا تھا۔

''تم نے کہا تھا کہ دیگر نام بھی ہیں جس میں سب سے اہم سرفراز کا نام تھا۔'' میں نے وہی کہا جو سکینہ مجھے بتا چکی تھی۔

''میں نے کل شام میر صاحب سے پورا احوال بیان کیا اور انہوں نے سیکریٹری تعلیم کو فون کر دیا۔ اس وقت تو سیکریٹری نے فون ریسیو نہیں کیا مگر رات میں انہوں نے فون کر کے میر صاحب کو بتایا کہ سر عنصر کے پرنسپل ہونے کا نوٹیفکیشن آج وہ نکال دیں گے۔'' میں نے وہ تفصیل بیان کی جو میر صاحب نے مجھے بتائی تھی۔

''اس کا مطلب ہے آج میں کالج نہ جاؤں۔'' سر عنصر نے کہا تو میں نے اور سکینہ نے اس کی بھرپور مخالفت کی۔

''آپ کالج ضرور جائیں لیکن اپنا برتاؤ اس طرح کا رکھیں جیسے آپ کچھ نہیں جانتے۔'' میں نے رائے دی اور سکینہ نے اس کی تائید کی۔

''مجھے فواد سے توقع ہے کہ وہ کوئی بدتمیزی کر سکتا ہے۔'' سرعنصر نے کہا۔

''سر فواد ایک ہفتے سے کراچی میں ہیں اور سیکریٹری سے چار بار اور وزیر سے ایک بار مل چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ حکومتی بینچوں پر بیٹھنے والے ایم پی اے کی بات رد ہو جائے اور مجھے پرنسپل بنا دیا جائے جو ان کا حامی بھی نہیں ہے۔''

''اگر آپ اسے کرشمہ سمجھ رہے ہیں تو سمجھ لیں کہ یہ کرشمہ ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا مجھے میر صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔'' سر عنصر نے سوال کیا۔

''میر صاحب سے پہلے آپ کو فرجاد کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس کی کوشش سے یہ ممکن ہو سکا۔'' سکینہ نے اپنی رائے دی۔

''میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے دو رکعت نفل ادا کرنا چاہیے کہ اس کی قدرت نے یہ سب ممکن بنایا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی ماں نے تو سو رکعت نفل کی منت مانی ہوئی تھی۔'' سرعنصر نے کہا۔ ''ویسے وہ محترمہ ہیں کہاں؟'' سرعنصر نے بیٹی سے سوال کیا تھا۔

''اماں صبح اسکول جاتے ہوئے کہہ گئی تھیں کہ آج ان کے اسکول میں پرنسپل صاحبہ کی الوداعی پارٹی ہے اس لیے انہیں واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔'' سکینہ نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج دوپہر کے کھانے میں کچھ نہیں ہے؟'' سرعنصر نے کہا۔

''اماں نے کل رات جو آلو گوشت بنایا تھا، اس کا آدھا حصہ فریج میں رکھ دیا تھا۔ میں وہی گرم کر کے لے آتی ہوں۔'' سکینہ نے کہا۔

''پھر تم جلدی سے جا کر وہ آلو گوشت گرم کرو مگر اس سے پہلے دو کپ چائے بنا دو۔'' سرعنصر نے کہا۔

''دو نہیں تین کپ۔'' میں نے کہا۔

''تیسرا کپ کس کے لیے؟'' سرعنصر نے سوال کیا۔

''وہ سر میر صاحب کا ڈرائیور میرے ساتھ آیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اسے بھی اندر بلا لیتے۔'' سرعنصر نے کہا۔

''سر وہ کبھی بھی اندر نہیں آئے گا۔ یہ لوگ اتنی ہی بات مانتے ہیں جتنا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں گھر تلاش کرنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟'' سرعنصر نے ایک اور سوال کر دیا۔

''بالکل بھی نہیں سر۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ڈرائیور آپ کا پرانا محلے دار ہے بلکہ اس کی فیملی شاید اب بھی یہیں رہتی ہے۔'' میں نے اپنا جواب مکمل کیا۔

اتنے میں سکینہ ایک ٹرے میں تین کپ چائے لے آئی۔ سرعنصر نے ایک کپ میری جانب بڑھایا اور ٹرے لے کر باہر چلے گئے۔ ایک کپ انہوں نے درمیان کی میز پر رکھ دیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ واپس آئے۔ ''تم واقعی صحیح کہہ رہے تھے یہ واقعی ہمارا محلے دار تھا مگر کئی ہفتوں سے غائب تھا۔''

''وہ میر صاحب نے اسے اپنے سرونٹ کوارٹر میں جگہ دے دی ہے۔''

''اب تم ایسا کرو کہ کالج جاؤ اور بی اے میں داخلے کا فارم لے آؤ۔'' سرعنصر نے کہا۔ ''میرا تمہارے ساتھ جانا صحیح نہیں ہوگا۔'' انہوں نے اپنا کپ ختم کرتے ہوئے کہا۔

میں کالج جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ سکینہ کمرے میں داخل ہوئی..... ''ابا میں نے سالن گرم کر لیا ہے اور روٹیاں ڈال رہی ہوں۔'' سکینہ نے کہا۔

''میں اب چلوں گا۔'' میں نے سکینہ سے کہا۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟'' سکینہ نے کہا تھا۔

''پہلے میں نے سوچا تھا کہ کھانا کھا کر اس کے ساتھ ہی کالج چلا جاؤں گا لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اس کے ساتھ جاؤں گا تو لوگ پتا نہیں کیا، کیا باتیں کریں اس لیے میں نے ہی اس سے کہا ہے کہ کالج جائے اور بی اے کے داخلہ کی معلومات حاصل کرے اور داخلہ فارم لے آئے۔''

''مگر ابا اتنی بڑی خوش خبری لانے والے کا اس طرح چلے جانا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔'' سکینہ نے کہا۔

''ابھی رات کا کھانا بھی باقی ہے تمہاری ماں آ کر تازہ کھانا بنا لے گی تو ہم رات کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔'' سرعنصر نے گویا معاملہ نمٹا دیا تھا۔

''مجھے جانے دیں کالج سے واپسی پر آجاؤں گا۔'' میں نے سکینہ سے کہا تھا۔

''جیسا آپ دونوں مناسب سمجھیں۔'' میرے کانوں

میں ایک بار پھر سے جلترنگ بجی اور میں اسی جلترنگ کی آواز میں کھویا ہوا اس گھر سے باہر آ گیا۔

''کالج لے چلو۔'' میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا اور ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔

کالج پہنچا تو پرانے ساتھیوں نے مجھے ڈویژن میں پوزیشن لینے پر مبارک باد دینی شروع کر دی۔ کچھ استاد بھی آ گئے تھے اور وہ بھی مبارک باد دے رہے تھے۔ ابھی ہم کالج کے لان میں ہی تھے کہ پرنسپل کا چپراسی آ گیا۔

''صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔'' اس نے میرے قریب آ کر کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ میرے وہ استاد جو مجھے مبارک باد دے رہے تھے، وہ بھی ساتھ آ گئے تھے۔

ہم ایک جلوس کی شکل میں پرنسپل صاحب کے کمرے میں پہنچے تھے۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے تھے لیکن مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے اپنی سیٹ چھوڑ دی تھی اور آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔

''فرجاد! مائی پراؤڈ۔'' انہوں نے گلے لگاتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ایڈمیشن لینے آئے ہو؟'' انہوں نے سوال کیا اور میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میری گردن ہلی ہی تھی کہ انہوں نے گھنٹی بجا دی۔

''اسلم سے جا کر ایک داخلہ فارم لے آؤ۔'' انہوں نے چپراسی سے کہا تھا۔

اسلم کالج کا کلرک تھا۔

کچھ ہی دیر میں چپراسی فارم لے آیا تھا۔

''کل اسے فل کر کے آ جانا۔'' پرنسپل صاحب نے کہا۔

''سر اگر پرسوں آ جاؤں؟'' میں نے سوال کیا۔

''پرسوں میری سیٹ پر کوئی اور بیٹھا ہوگا۔'' پرنسپل صاحب نے کہا۔

''کیوں سر؟ کیا آپ ریٹائر ہو رہے ہیں؟'' اسلامیات کے شبیر سر نے سوال کیا۔

''تیس سال بہت ہوتے ہیں شبیر صاحب درس و تدریس سے وابستہ رہنے کے لیے۔'' پرنسپل صاحب کا جواب تھا۔

''سر نیا پرنسپل کون آ رہا ہے؟'' ایک اور سوال کیا۔

''جو بھی ہوگا آپ میں سے ہی ہوگا۔'' پرنسپل صاحب نے گول مول سا جواب دیا تھا۔

''فواد صاحب پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' شبیر سر نے کہا۔ ''بارہ دن سے وہ کالج بھی نہیں آئے اور کراچی میں بیٹھے ہیں۔'' شبیر سر نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا تھا۔

''میں جانتا ہوں وہ مجھ سے ہی چھٹی لے کر گئے ہیں کہ ان کی بیگم کی طبیعت خراب ہے۔'' پرنسپل صاحب نے کہا۔ میں اس دوران ایک کونے میں خاموش کھڑا رہا تھا۔

''ان کی بیگم سے تو آج صبح مارکیٹ میں ملاقات ہوئی تھی بھلی چنگی تھیں۔'' ایک اور استاد نے کہا تھا۔

''فرجاد سر کار نے اگلے برس تمہیں اسکالرشپ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس بار پرنسپل صاحب نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

''شکریہ سر۔'' میں نے کہا۔

''شکریہ ادا کرنا ہی ہے تو اپنی محنت کا ادا کرو۔'' پرنسپل صاحب نے کہا۔

''سب سے پہلے شکریہ اس مالک حقیقی کا ادا کرو جس نے تمہیں اس قابل کیا کہ تم نے یہ پوزیشن حاصل کی۔'' سر شبیر نے مشورہ دیا۔

میں فارم لے کر کالج کے ساتھ کی مسجد میں گیا اور دو رکعت نفل ادا کرنا شروع کر دی۔

میں مسجد سے نکل رہا تھا کہ میں نے سر عنصر کو کالج کے گیٹ سے اندر آتے دیکھا۔ سر عنصر مجھ سے ملے اور انہوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ ہماری صبح ملاقات ہو چکی ہے۔ میرے کچھ ساتھی دوبارہ سے قریب آئے اور انہوں نے سر عنصر سے ہاتھ ملائے اور مجھے دوبارہ سے مبارک باد دی۔ سر عنصر کچھ دیر ہمارے ساتھ رہے اور پھر پرنسپل صاحب کے دفتر کی طرف بڑھ گئے اور ہم نے کینٹین کا رخ کیا۔ کینٹین میں زوردار بحث چل رہی تھی کہ اگلا پرنسپل کون ہوگا، کچھ لڑکے سر فواد کے حق میں زوردار دلائل دے رہے تھے کہ انہیں حکومت کی حمایت حاصل ہے۔

''یہ ان کی قابلیت ہے یا انگلیٹو پوائنٹ ہوگا۔'' میں نے کچھ دیر بحث سننے کے بعد سوال کیا اور سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے تھے۔

''ہم میں سے کوئی بھی تمہارا سوال نہیں سمجھ سکا ہے۔'' سر فواد کی حمایت کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''دیکھو، ہم اس کالج میں پڑھنے آئے ہیں اور ہمارا کام صرف تعلیم حاصل کرنا ہے۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''کون پرنسپل بنتا ہے اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہونا

چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''سرفواد کے علاوہ اگر کسی کو پرنسپل بنایا گیا تو ہم احتجاج کریں گے۔'' اسی لڑکے نے کہا جو سب سے تیز آواز میں دلائل دے رہا تھا۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہم مظاہرے کریں گے۔'' اسی لڑکے نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔'' وہ لڑکا اپنی ضد پر اڑا رہا تھا۔

''مظاہرے میں شریک ہونے والوں کو پولیس پکڑ لے گی اور ایف آئی آر کاٹ کر جیل بھیج دے گی اور ان کے والدین پیسے خرچ کر کے وکیل کریں گے لیکن پرنسپل نہیں بدلے گا۔''

''یہ صحیح کہہ رہا ہے۔'' بہت سی آوازیں اُبھریں۔

کلاس سے فارغ ہو کر میں ایک بار پھر سرعنصر کے یہاں پہنچا تھا۔ سرعنصر ابھی کالج میں ہی تھے۔ میں وہاں پہنچا تو ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ ابھی مجھے بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سکینہ ایک پختہ عمر کی خاتون کے ساتھ نمودار ہوئی تھی اور اسی نے خاتون سے میرا تعارف کروایا تھا۔ ''امی یہ فرجاد ہیں' انہوں نے ہی صبح جب آپ اسکول میں تھیں ابا کو وہ خوش خبری سنائی تھی اور فرجاد یہ میری امی ہیں۔''

تعارف مکمل ہوا تو مسز عنصر نے کہا۔ ''تم دونوں بیٹھو' میں چائے بناتی ہوں۔''

''جی شکریہ میں کالج کی کینٹین سے چائے پی کر ہی آرہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''گھر کی چائے میں اور کینٹین کی چائے میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''چائے میں بنا لوں گی امی آپ ڈنر تیار کریں۔'' سکینہ نے ماں سے کہا۔

کمرے سے وہ ماں کے ساتھ ہی گئی تھی لیکن کچھ ہی دیر میں ٹرے میں دو کپ لے کر آئی اور میرے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ میلاد میں نعتیں پڑھتی ہیں؟'' میں نے بات شروع کرنے کے لیے کہا۔

''آپ کو کس نے بتایا؟'' اس نے جلترنگ بجائی تھی۔

''میں نے سرعنصر کو بتایا تھا کہ میر صاحب کا ڈرائیور پہلے آپ کے محلے میں رہتا تھا۔ جب سے میر صاحب نے اسے حویلی میں سرونٹ کوارٹر دیا ہے یہ وہاں شفٹ ہو گیا ہے لیکن اس کی فیملی اب بھی یہیں رہتی ہے۔ ابھی بھی مجھے اتار کر وہ شاید اپنی فیملی سے ملنے گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے؟'' میں نے سوال کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔'' اس نے میرا ہاتھ دیکھنا شروع کیا۔

''ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟'' میں نے کہا اور سکینہ نے پھر سے جلترنگ بجا دیے۔

''میں اصل معنوں میں کہہ رہی ہوں۔'' اس نے اپنے جلترنگ کو روکتے ہوئے کہا۔

''مجھے دولت کے بارے میں بتاؤ میرے ہاتھ میں پیسا ہے بھی یا نہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''دولت، شہرت اور محبت کے بارے میں آپ بہت لکی ہیں۔'' سکینہ نے کہا۔

''اب سے دو سال کے اندر آپ شہرت کی اور دولت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں گے اور اتنی بلندیوں پر پہنچ جائیں گے کہ لوگوں کے لیے مثال بن جائیں گے لیکن ایک غلط بات بھی ہے۔'' سکینہ نے کہا۔

''اور وہ کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''آپ قتل کریں گے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''قتل..... مگر کس کا؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ میں ابھی کس طرح کہہ سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

ابھی گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ سرعنصر کمرے میں داخل ہوئے۔

''اس نے تمہیں بھی اپنے جادو ٹونے میں پھنسا لیا؟'' سرعنصر نے ایک نظر دیکھتے ہی سوال کیا۔

''ابا آپ تو یہ نہ کہیں۔'' سکینہ کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''کیوں نہ کہوں؟'' سرعنصر نے کہا۔

''کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ پرنسپل بن جائیں گے؟'' سکینہ نے اپنا شکوہ جاری رکھا۔

''ایک دو تکے تو لگ ہی جاتے ہیں۔'' سرعنصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، اسے دیکھنا ہے کہ کس حد تک صحیح ہے یا صرف تکے ہیں۔'' میں نے کہا اور سرعنصر میری جانب متوجہ ہو گئے۔

''یہ کیا بتایا ہے اس تُکّے باز نے؟'' سر عنصر نے سوال کیا۔

''میں نے انہیں بتایا ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ انتہائی دولت مند ہوں گے اور شہرت کی بلندیوں پر ہوں گے۔'' سکینہ نے کہا۔

''یہ کون سی بڑی بات ہے اس کا ریکارڈ دیکھ کر تو میں بھی یہ پیش گوئی کر سکتا ہوں۔'' سر عنصر نے کہا۔

''یہ تو برسوں بعد کی بات ہے ابھی آپ کی آمد سے کچھ دیر پہلے میں نے امی کو بتایا تھا کہ وہ پرنسپل بن جائیں گی۔'' سکینہ نے کہا۔

''یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔'' سر عنصر نے کہنا شروع کیا۔ ''موجودہ پرنسپل آج ریٹائر ہو گئی ہیں اس لیے کسی نہ کسی کو تو پرنسپل بنایا ہی جائے گا۔''

''آپ کالج کے تمام ٹیچرز میں سب سے سینئر تھے شاید اسی لیے آپ کو پرنسپل بنا دیا گیا ہے لیکن اماں کے ساتھ ایسا نہیں ہے دو ٹیچرز اُن سے بھی سینئر ہیں۔'' سکینہ نے کہا۔

''چلو دیکھ لیتے ہیں اب زیادہ دن تو نہیں ہیں۔ تمہاری اماں پرنسپل بنتی ہیں یا نہیں۔'' سر عنصر نے کہا۔

''آجائیں آپ لوگ میں نے ڈائننگ ٹیبل سجا دی ہے۔'' مسز عنصر نے آکر کہا اور ہم تینوں کھانے کی میز پر آگئے۔ ابھی ہم کرسیاں سیدھی کر کے بیٹھے ہی تھے کہ میر صاحب کا فون اس موبائل پر آگیا جو میر صاحب نے مجھے دیا تھا۔

''کہاں رہ گئے فرجاد؟'' میر صاحب نے کہا۔

''میر صاحب سر عنصر نے کھانے پر روک لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے تم آرام سے کھانا کھاؤ۔'' میر صاحب نے کہا۔

''دراصل تمہاری ماں چار چکر لگا چکی ہیں۔'' میر صاحب نے کہا۔

''میری بھی بات کرواؤ۔'' سر عنصر نے کہا اور میں نے موبائل ان کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''میر صاحب، سر عنصر آپ سے بات کرنا چاہ رہے تھے۔'' میں نے موبائل سر عنصر کو دینے سے پہلے کہا۔

''یہ فرجاد صبح میرے پاس آیا تھا اور اسی نے اطلاع دی تھی کہ آپ نے سیکریٹری تعلیم کو فون کیا تھا۔'' سر عنصر نے کہا۔

''فرجاد تو رائی کا پہاڑ بنانے کا عادی ہے۔'' میر صاحب کی آواز آئی۔ ابھی ان دونوں کے درمیان گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ سکینہ نے باپ کی جانب ہاتھ بڑھا دیے تھے اور سر عنصر نے یہ کہتے ہوئے موبائل اس کی جانب بڑھا دیا تھا کہ میری بیٹی بھی آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔'' سکینہ نے فون ہاتھ میں لیا اور کہنے لگی۔ ''میر صاحب، فرجاد کی سفارش پر سیکریٹری کو فون کر کے ابا کو پرنسپل بنوا دیا اب میری بھی سفارش کر دیں۔'' سکینہ یہ کہتے ہوئے ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کس سے کرنی ہے سفارش؟'' میر صاحب نے سوال کیا۔

''میری ماں سے سفارش کر دیں کہ مجھے میوزک سیکھنے کی اجازت دے دیں۔''

''کہاں ہیں تمہاری والدہ؟'' میر صاحب کی آواز کمرے میں گونجی تھی شاید سکینہ نے مائیک کا بٹن آن کر دیا تھا۔

''لیں اماں بات کریں۔'' سکینہ نے موبائل ماں کی طرف بڑھایا تھا۔

''میر صاحب یہ اس کی بلاوجہ کی ضد ہے۔'' مسز عنصر نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ کافی نہیں ہے کہ میں نے اسے نعتیں پڑھنے کی اجازت دی ہوئی ہے ویسے بھی ہم سید لوگ ہیں۔ یہ میراثیوں والے کاموں کی اجازت کیسے دیں؟'' مسز عنصر نے کہا اور موبائل فون سکینہ کی جانب بڑھا دیا۔

''میں تمہاری والدہ سے متفق ہوں۔'' میر صاحب کی آواز کمرے میں گونجی۔ ''ویسے تم کس کلاس میں ہو؟''

''میں اس سال انٹر سائنس کا امتحان دوں گی۔'' سکینہ نے کہا تھا۔

''جب تم میڈیکل کالج میں آجاؤ گی تب مجھ سے پھر بات کرنا۔'' میر صاحب نے کہا تھا۔

''بہت معقول آدمی ہیں میر صاحب۔'' فون بند ہوتے ہی سکینہ کی والدہ نے کہا۔

''آپ نے معقول ہونے کا فتویٰ اس لیے جاری کیا کہ انہوں نے آپ کی بات مان لی ورنہ وہ اسی درجہ نامعقول ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ مجھے سکینہ کا فقرہ پسند آیا نہ اس کے الفاظ اچھے لگے تھے۔

''سکینہ اپنی ماں سے اچھے انداز سے بات کیا کرو۔'' سر عنصر نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بیٹی کو ڈانٹ دیا۔

''سر یہ بتائیں کلاسیں کب سے شروع ہوں گی؟''

میں نے سرعنصر کی توجہ بٹانے کے لیے کہا۔
''تم کلاسوں کو چھوڑو یہ کوفتے لو۔'' مسز عنصر نے کہا تھا۔
''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ کوفتے میری فیورٹ ڈش ہے؟'' میں نے ایک کوفتہ اپنی پلیٹ میں ڈال دیا تھا۔
''ہماری پسند کتنی ملتی ہے کوفتے تو مجھے بھی بہت پسند ہیں خاص طور پر اگر امی نے بنائے ہوں۔'' سکینہ نے کہا تھا۔
''کلاسیں شروع جب بھی ہوں تم انگریزی کی کلاسوں میں داخلہ لے لینا۔'' سرعنصر نے کہا۔
''وہ کیوں سر؟'' میں نے سوال کیا۔
''بی اے کے بعد تمہیں سی ایس ایس کا امتحان جو دینا ہے۔'' سرعنصر نے کہا۔
''مگر وہ تو بہت سخت ہوتا ہے پھر میرا ایم تو بیرسٹر بننے کا ہے۔'' میں نے کہا۔
''اس کے لیے تو انگلینڈ جانا ہوگا۔'' سرعنصر نے کہا۔
ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو سرعنصر کا ملازم آ گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''وہ آپ کا ڈرائیور آ گیا ہے۔''
یہ سنتے ہی میں اٹھ گیا، سرعنصر بھی میرے ساتھ باہر کی طرف آئے۔
''کہاں چلے گئے تھے؟'' سرعنصر نے میر صاحب کے ڈرائیور سے سوال کیا۔
''میں بچوں سے ملنے گیا تھا۔'' ڈرائیور نے کہا۔
''فرجاد نے بتایا تھا کہ تمہاری فیملی اسی محلے میں رہتی ہے۔''
میں نے کار میں بیٹھنے میں دیر نہیں کی تھی اور نہ ہی ڈرائیور نے کار آگے بڑھانے میں وقت لگایا تھا۔
''کبھی کبھار چکر لگا لیا کرنا۔'' مسز عنصر نے کار آگے بڑھنے سے پہلے کہا۔
میں جواب میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ کار آگے بڑھ گئی۔ مجھے صرف سکینہ کا ہلتا ہوا ہاتھ نظر آیا تھا جو ماں کے پیچھے سے مجھے خدا حافظ کر رہی تھی۔
''میر صاحب کے چار فون آ چکے تھے کہ کہاں رہ گئے ایک بار تو انہوں نے آپ کی والدہ سے بھی بات کروائی تھی۔'' ڈرائیور نے کار جب مین روڈ پر آئی تو کہا۔
''ہمیں اتنی دیر تو نہیں ہوئی کہ اماں سب کو پریشان کرتیں۔'' میں نے کہا اور ڈرائیور ہنس دیا۔
''آپ ماں کے دل کو نہیں جانتے...'' ڈرائیور نے کچھ توقف کے بعد کہا۔
''تمہاری بیوی بھی پریشان ہو جاتی ہے جب تمہارا کوئی بچہ دیر سے گھر آئے۔'' میں نے سوال کیا۔
''وہ تو خود اسکول چلی جاتی ہے اور بچے کو لے کر گھر آتی ہے اور پھر اس کی خوب پٹائی کرتی ہے۔'' ڈرائیور کا جواب تھا۔
کار تیزی سے شہر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی ہم قصبے سے دس منٹ کے فاصلے پر تھے کہ میر صاحب کا فون آ گیا۔
''کہاں ہو؟'' انہوں نے رابطہ ہوتے ہی سوال کیا۔
''قصبے سے گزر رہے ہیں۔ پیٹرول پمپ کراس کر لیا ہے۔'' میں نے کہا۔
''فرجاد گھر پہنچ تو میں تیری خوب پٹائی کرتی ہوں۔'' اماں کی آواز میرے موبائل پر آئی۔
''اگر آپ حویلی میں ہیں تو مجھے گھر کیوں بھجوا رہی ہیں؟'' میں نے کہا۔
''یہاں حویلی میں تجھے بچانے والے بہت ہیں اس لیے۔'' اماں کی آواز آئی۔
''اماں میں سیدھا حویلی.... آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''امید ہے کہ جو خبر میرے پاس ہے، اس کے بعد مجھے گلے سے لگا لیں گی۔''
''ایسا کون سا تیر مار آیا ہے؟'' اماں کی آواز آئی۔
''پہنچ کر بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔
''چل جلدی سے پہنچ ہم سب تمہارے اس تیر کا انتظار کر رہے ہیں۔'' میر صاحب کی آواز آئی اور ہم اسی وقت حویلی پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے ہارن دیا اور کار حویلی کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور میں سیدھا حویلی کی بیٹھک کی طرف بڑھ گیا کیونکہ مجھے وہیں سے آوازیں آ رہی تھیں۔
''ہاں اب بتاؤ کیا تیر مار کر آئے ہو؟'' سب سے پہلے میر صاحب نے پوچھا۔
''وہ میر صاحب اگلے سال کے لیے سرکار نے میرا اسکالرشپ منظور کر لیا ہے۔'' میں نے کہا اور میر صاحب نے اماں سے پہلے مجھے گلے لگایا پھر اماں آگے بڑھی تھیں۔ میں اماں سے فارغ ہو کر ابا کی طرف بڑھا تھا جو اس وقت تک اپنی بیساکھیاں صحیح کرنے میں مصروف تھے۔ مجھے گلے لگاتے ہوئے ابا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
''بابا، آج کے دن بھی آنسو؟'' میں نے سوال کیا۔

''بیٹا یہ خوشی کے آنسو ہیں۔'' اور بابا اپنے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگے۔

☆☆☆

بی اے کی کلاسیں شروع ہوئیں تو میں ہاسٹل شفٹ ہو گیا۔ میرا کمرا وہی پرانا تھا اور روم میٹ ندیم ہی رہا تھا۔ سر عنصر اب پرنسپل تھے۔ ان کا عہدہ سنبھالنے کے ابتدائی چند دن سخت تھے۔ سرفواد کے حامی طالب علموں نے چند دن شور شرابا کیا۔ کچھ اخبارات نے ان کا ساتھ دیا لیکن یہ ہنگامہ چائے کی پیالی میں طوفان ثابت ہوا تھا۔ وہی ہوا تھا جو میں نے کہا تھا۔ انتظامیہ نے ریلی پر کریک ڈاؤن کیا، کچھ گرفتار ہوئے جن کو بعد میں ان کے والدین نے حلف نامے دے کر چھڑوایا۔ سرفواد نے اس دوران میں نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور پوری طرح کوچنگ سینٹر کا کنٹرول سنبھال لیا۔

تین مہینے گزر گئے تھے۔ ایک روز سر عنصر نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ''تمہیں آج رات کا کھانا میرے گھر پر کھانا ہوگا۔'' انہوں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

''کس خوشی میں سر؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ دعوت میری وائف کی جانب سے ہے۔'' سر عنصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں سر؟'' میں نے کہا کیونکہ مجھے میرا جواب نہیں ملا تھا۔

''میری بیگم اسکول کی پرنسپل ہوگئی ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''یعنی سکینہ کی ایک اور پیش گوئی پوری ہوگئی۔'' میں نے کہا اور سر عنصر کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''مگر سر یہ ہوا کیسے؟'' میں نے سوال کیا۔ ''مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ وہ سینئر نہیں ہیں بلکہ تیسرے نمبر پر تھیں۔'' میں نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

''وہ جو سب سے سینئر تھی اس کا ہارٹ اٹیک میں انتقال ہوگیا۔ اب جو سینئر موسٹ تھیں، ان کے بیٹے نے انہیں کینیڈا بلوا لیا اور وہ اب کینیڈا میں اپنے بیٹے اور بہو کے پاس ہیں۔'' سر عنصر نے کہا۔

میں نے احتیاط کے طور پر میر صاحب کو فون کیا کیونکہ مجھے توقع تھی کہ ڈنر میں گیا تو واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ پہلی تین کالوں میں کسی نے کال ریسیو نہیں کی لیکن چوتھی کال کے جواب میں جس نے کال ریسیو کی، اس نے اپنا نام عمران بتایا تھا۔ اسی نے اطلاع دی کہ میر صاحب کی کار پر فائرنگ ہوئی ہے جس میں ان کا ڈرائیور اور ایک گارڈ شہید ہو گئے ہیں اور ان پر حملہ کرنے والوں میں دو مار دیے گئے ہیں اور ایک زخمی ہمارے قبضے میں ہے۔

یہ خبر میرے اوسان اُڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ میں فوراً ہی سر عنصر کے پاس گیا اور ان سے ڈنر پر آنے کی معذرت کے ساتھ انہیں خبر بھی سنا دی۔

''تم کس طرح جاؤ گے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''رکو۔'' انہوں نے ہدایت کرنے والے انداز میں کہا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں آخر ان کا بھی مجھ پر احسان ہے۔'' میں اور سر عنصر ان کی کار میں سوار ہوئے۔ ڈرائیونگ سیٹ سر عنصر نے ہی سنبھالی تھی لیکن ان کی کار اتنی پرانی تھی کہ اسپیڈو میٹر ساٹھ سے اوپر جا ہی نہیں رہا تھا۔ بمشکل ہم قصبے تک پہنچے تھے۔ میں نے قصبے میں داخل ہونے سے پہلے پیٹرول پمپ پر گاڑی رکوائی۔ یہ پیٹرول پمپ بھی میر صاحب کی ملکیت تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں سے کوئی خبر مل جائے گی۔ میں دوڑتا ہوا پیٹرول پمپ پر گیا جہاں پمپ کا منیجر اپنی کرسی پر موجود تھا، اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بول پڑا۔ ''بیٹا خیریت ہے میر صاحب کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ حویلی میں ہیں اور آرام کر رہے ہیں۔'' اس کی بات سنتے ہی اطمینان ہوا۔ میں دوبارہ کار میں آ کر بیٹھ گیا اور سر عنصر کو حویلی کا راستہ بتانے لگا۔ اگلے دس منٹوں میں ہم حویلی میں تھے۔ گیٹ پر کارکور کا گیا لیکن مجھے دیکھ کر حویلی کا گیٹ کھل گیا۔ میں اور سر عنصر ان کے بیڈ روم میں پہنچے تو وہ مسہری پر آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔

''سائیں یہ کیا ہو گیا؟'' مجھ سے پہلے سر عنصر نے سوال کیا۔ میر صاحب نے انہیں جواب دینے سے پہلے تشویش انداز سے میری جانب دیکھا۔

''میر صاحب، یہ سر عنصر ہیں ہمارے پرنسپل۔'' میں نے سر عنصر کا تعارف کروایا۔

''اچھا، اچھا۔'' میر صاحب نے کہا۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے انہیں سب یاد آ گیا ہو۔

''آپ نے بڑی تکلیف کی۔'' میر صاحب نے سر عنصر کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔

''کچھ معلوم ہوا حملہ آور کون تھے؟'' میں نے سوال کیا۔

''پولیس کی تفتیش جاری ہے جس زخمی کو گرفتار کیا گیا ہے، وہ پولیس کی حراست میں ہے۔'' میر صاحب نے کہنا شروع کیا ''لیکن مارے جانے والوں کو میں نے پہچان لیا

ہے۔ان میں سے ایک چاچا کا گارڈ تھا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''وہ ایسا کیونکر کر سکتے ہیں آپ اُن کے بھتیجے ہی نہیں بلکہ ان کے ہونے والے داماد بھی ہیں۔'' میں نے کہا اور میر صاحب کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

''تم ابھی بچے ہو، تمہاری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں گی۔'' میر صاحب کی وہ معنی خیز مسکراہٹ اب بھی ان کے چہرے پر تھی۔

میر صاحب کی گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ ملازم نے ایس ایس پی اور ڈی آئی جی کی آمد کی اطلاع دی۔ میں اور عنصر صاحب نے وہاں سے اٹھنا چاہا لیکن میر صاحب نے ہمیں رکنے کے لیے کہا۔ ہم رک گئے تھے۔ ڈی آئی جی اور ایس ایس پی کے لیے کرسیاں منگوائی گئیں پھر ڈی آئی جی نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

''زخمی نے سب کچھ اُگل دیا ہے۔''

''جو کچھ اس نے بتایا ہوگا، میں وہ سب جانتا ہوں۔'' میر صاحب نے کہا تھا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ حملہ آپ کے چاچا نے کروایا تھا؟'' ایس ایس پی نے کہا۔

''آپ کے آنے سے چند لمحے پہلے میں ان دونوں کو یہی بتا رہا تھا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''ان دونوں کا تعارف۔'' ڈی آئی جی نے سوال کیا۔

''یہ فرجاد ہیں۔'' میر صاحب نے میری جانب اشارہ کیا۔ ''ویسے تو لوگ اسے میرے کمدار کے بیٹے کے طور پر جانتے ہیں لیکن میں اسے اپنا ہی بیٹا سمجھتا ہوں۔'' میر صاحب نے کہا۔

''اور یہ صاحب؟'' ایس ایس پی نے سر عنصر کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ فرجاد کے کالج کے پرنسپل ہیں۔ عنصر نام ہے ان کا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔ ''اتنی شدید فائرنگ ہوئی آپ کی گاڑی پر آپ کا ڈرائیور ہلاک ہو گیا لیکن آپ بچ گئے؟'' ڈی آئی جی نے سوال کیا۔

''آپ کو افسوس ہوا ان کے بچنے پر یا ڈرائیور کے مارے جانے پر خوشی ہوئی؟'' میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے نہ مجھے ان کے زندہ رہنے پر افسوس ہوا نہ ڈرائیور کے ہلاک ہونے پر خوشی ہوئی۔'' ڈی آئی جی کا جواب تھا۔

''مگر مجھے ڈرائیور کے شہید ہونے کا دکھ ہے اتنا ہی جتنے اپنے بھائی کی ہلاکت پر ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''آپ اُس سے بہت قریب تھے؟'' ایس ایس پی نے سوال کیا۔

''وہ میر صاحب کا ڈرائیور تھا لیکن مجھے کالج لے جانا وہاں داخلہ کروانا اسی کی ذمے داری تھی۔''

''یہ صحیح کہہ رہا ہے۔'' سر عنصر نے کہا۔ ''جب یہ فرسٹ ایئر میں داخلہ لینے آئے تھے تو وہی میرے پاس آئے تھے حالانکہ اس وقت میں پرنسپل بھی نہیں تھا۔''

''آپ نے جو مجھ سے سوال کیا کہ میں کیسے بچ گیا تو اس کا ذمے دار یہ میرا کمدار ہے۔'' میر صاحب نے بابا کی جانب اشارہ کیا جو کچھ دور اپنی بیساکھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

''آپ وضاحت کریں گے؟'' ایس ایس پی نے سوال کیا۔

''یہ کوئی تین ماہ سے مجھے کہہ رہا تھا کہ میر صاحب آپ کی دشمنیاں ہیں اس لیے بہتر ہے کہ آپ بلٹ پروف کار لے لیں لیکن میں اس کی بات ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔'' میر صاحب کہے جا رہے تھے۔

''دو دن پہلے میرا دوست کراچی سے آیا ہوا تھا، اس کا کراچی میں گاڑیوں کا شوروم ہے۔ اس کے سامنے بھی اس نے یہی بات کی تھی تو اس نے بھی اس کا ساتھ دیا بلکہ کہا کہ ''میر صاحب بلٹ پروف کافی نہیں ہے آپ کو بم پروف کی ضرورت ہے۔'' میں نے قیمت پوچھی تو اس نے ساڑھے تین کروڑ بتائی۔'' میر صاحب کہتے کہتے رک گئے۔

''ساڑھے تین کروڑ میں آپ کی اربوں کی جان تو بچ گئی۔''

''ابھی پیسے دیے کہاں ہیں۔'' میر صاحب نے کہا۔

''لیکن کار تو آپ کے پاس ہے۔ کیا اس نے گفٹ کر دی تھی؟'' ایس ایس پی کا سوال تھا۔

''کل رات اس کا ملازم کار پہنچا گیا تھا اور میں نے اسے چیک دے دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ صبح اس نے چیک کیش کروا لیا ہوگا مگر صبح گھر سے نکلتے ہوئے میں نے بینک فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ ایسا کوئی چیک ان کے پاس نہیں آیا۔''

''آپ نے تو ہمارا کام بڑھا دیا۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' میر صاحب نے کہا۔

''اگر یہ سچ ہے کہ وہ کار آپ کو کل رات ملی تھی تو دشمنوں کو یہ خبر کس نے پہنچائی کہ آپ کس رنگ کی کار میں گھر سے نکلے ہیں؟'' ڈی آئی جی نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

''ہمیں آپ کے ملازمین سے تفتیش کرنی ہوگی۔''

''ضرور کریں۔'' میر صاحب نے کہا۔ ''لیکن حویلی کے تمام ملازم میرے وفادار ہیں۔''

''میں تمام ملازمین کی بات نہیں کر رہا بلکہ اس گندی مچھلی کو تلاش کرنا چاہتا ہوں جسے کار کا رنگ تو معلوم تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ کار بم پروف ہے۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

بات میر صاحب کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انہوں نے بابا سے کہا۔ ''ایک علیحدہ کمرے میں تمام ملازموں کو جمع کرو اور دوسرے کمرے میں ان دونوں کے لیے کرسیاں ڈلوا دو اور ایک، ایک کر کے تمام ملازمین کو ان کے کمرے میں بھیجنا۔''

پھر نہ جانے ڈی آئی جی کو کیا سوجھی کہ اس نے کہا۔ ''دو نہیں تین کرسیاں ڈلوانا۔'' تیسری کرسی کے بارے میں ہر شخص کے ذہن میں سوال ابھرا تھا۔

''فرجاد تم ہمارے ساتھ آؤ۔'' اور میں حیران ہوتا ہوا ڈی آئی جی کے حکم پر ان کے ساتھ چل پڑا۔

ایک ایک کر کے بابا مرد ملازموں کو بھیجتے رہے اور میں ان سے سوال جواب ہوتے دیکھتا رہا۔ ڈی آئی جی اور ایس ایس پی سب کو کلیئر کرتے رہے۔ سب سے آخر میں عمران پیش ہوا۔

''تو تم نے فائر کر کے ان دو بندوں کو مارا تھا؟''

''سر کار نے مجھے گارڈ کے طور پر بھیجا تھا اور میں میر صاحب کے ساتھ ہی تھا جب میں نے ڈرائیور کو شہید ہوتے دیکھا تو خود پر قابو نہ رکھ سکا کیونکہ اگلا نشانہ میر صاحب ہی ہو سکتے تھے۔''

''یعنی تم بھی نہیں جانتے تھے کہ کار بم پروف ہے؟'' ڈی آئی جی نے سوال کیا۔

''سر میرے علم میں یہ ہوتا تو میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کر کار اُن پر چڑھا دیتا۔'' اس کا جواب تھا۔

''تمہیں کار چلانا آتی ہے؟'' ایس ایس پی نے سوال کیا۔

''سر یہاں آنے سے پہلے میں پولیس موبائل کا ڈرائیور تھا۔'' عمران کا جواب تھا۔

''جا کر اپنے والد سے پوچھو اور کوئی ملازم رہ گیا ہے۔'' ایس ایس پی نے مجھ سے کہا تھا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو بابا دروازے کے ساتھ ہی کرسی ڈال کر بیٹھے تھے۔ میں نے ایس ایس پی کا سوال دہرایا تو بابا نے کہا۔

''کچھ خواتین ملازمائیں ہیں لیکن وہ حویلی تک محدود ہیں اور میرے اندر میں نہیں ہیں۔'' میں نے بابا کا جواب ان دونوں کے سامنے دہرایا تو انہوں نے کہا۔

''خاتون ہے یا مرد ہمیں سب سے تفتیش کرنی ہے۔''

میں نے یہ جواب بابا تک پہنچایا تو انہوں نے خواتین کو بھیجنا شروع کر دیا جو پہلی خاتون آئی تھی، وہ حویلی کی پرانی ملازمہ تھی اور اس وقت کچن کی انچارج تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

''ہاں بھئی کیا نام ہے تیرا؟'' ایس ایس پی نے تیز لہجے میں سوال کیا تھا لیکن وہ خاموش رہی تھی۔

''ایس ایس پی صاحب کچھ پوچھ رہے ہیں تجھ سے۔'' ڈی آئی جی کا لہجہ ایس ایس پی سے زیادہ تیز تھا۔

''بشیراں نام ہے اس کا۔'' میں نے آہستگی سے کہا لیکن آواز اتنی آہستہ بھی نہیں تھی کہ بشیراں تک پہنچ جاتی۔

''رنگوں کی پہچان ہے تجھے؟'' ایس ایس پی نے سوال کیا۔

''جی صاحب جی۔'' بشیراں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔

''رو کیوں رہی ہے؟'' ڈی آئی جی کی گونج دار آواز اُبھری۔

''صاحب جی غلطی ہو گئی تھی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں لالچ میں آ گئی تھی۔'' اس نے ایک طرح سے اپنا جرم قبول کر لیا تھا۔

بشیراں کا رونا اور ایس ایس پی کی تیز آوازوں نے بابا کو کمرے میں آنے پر مجبور کر دیا۔

''کتنے میں بکی تھی تو حرام خور؟'' بابا نے سوال کیا۔

''آپ پلیز باہر رکیں ابھی ہماری تفتیش جاری ہے۔'' ایس ایس پی نے بابا سے کہا۔

بابا کمرے سے تو نکل گئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی بیساکھیوں کی آوازیں دور ہوتی جا رہی ہیں۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ یہ اطلاع دینے کہاں جا رہے ہوں گے۔

میں وہاں سے نکلنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے لیے ان دونوں کی اجازت ضروری تھی۔ میں جانتا تھا کہ ڈی آئی جی اور ایس ایس پی مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔

پھر کچھ دیر بشیراں سے سوالات ہوتے رہے اور وہ جواب دیتی رہی۔

''اور کون کون تھا تمہارے جرم میں شریک؟'' ڈی آئی جی نے سوال کیا۔

''کوئی بھی نہیں۔''

''تم نے کس کے کہنے پر یہ کیا؟'' ڈی آئی جی نے سوال کیا اور اس کا جواب سن کر میں بھی ہکا بکا رہ گیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا ہوگا یہ جھوٹ بول سکتی ہے۔'' میں نے کہا اور وہ دونوں پولیس والے ہنس پڑے۔

''تم بی اے کے طالب علم ہمارے تجربوں کو چیلنج کررہے ہو؟'' ڈی آئی جی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میرے پاس ثبوت ہیں کہ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔'' بشیراں نے کہا۔

''دکھاؤ وہ ثبوت۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

بشیراں نے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک چھوٹا سا موبائل نکال کر ایس ایس پی کے حوالے کردیا۔

''ان دونوں نمبروں میں تمہارا نمبر کون سا ہے؟''

بشیراں نے اپنا نمبر بتانے میں دیر نہیں کی۔ ایس ایس پی نے وہ نمبر ڈائل کیا جو موبائل بشیراں نے دیا تھا۔ اس کی بیل بجنے لگی تھی۔

''شام تک مجھے اس نمبر کا ریکارڈ نکلوا دو۔'' ڈی آئی جی نے ایس ایس پی سے کہا۔

ایس ایس پی نے اس کا حکم ماننے میں تاخیر نہیں کی۔ اس نے اپنے موبائل سے کوئی نمبر ڈائل کیا اور کہا مجھے اس نمبر کی پوری تفصیل چاہیے۔

اس کے بعد ہم میر صاحب کے بیڈ روم میں آئے تھے۔ بشیراں بھی ہمارے ساتھ تھی۔ وہیں پر بابا بھی میر صاحب کے بیڈ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ شاید وہ میر صاحب کو تفصیل سے آگاہ کرچکے تھے کیونکہ میر صاحب نے بشیراں کو دیکھتے ہی سوال کیا تھا۔ ''کیوں کی تم نے یہ غداری؟'' اور بشیراں نے رونا شروع کردیا۔

''میر صاحب میں لالچ کا شکار ہوگئی تھی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''کتنی رقم کی آفر ہوئی تھی اور کس نے کی تھی؟'' میر صاحب کا وہ لہجہ میں نے پہلی بار سنا تھا۔ ورنہ تو وہ اپنے ادنیٰ ملازم سے بھی بہت ہلکی آواز میں بات کرتے تھے لیکن غداری کے معاملے میں وہ بہت سخت تھے۔

''میر صاحب آپ کی منگیتر نے مجھے پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔''

''پانچ لاکھ روپے پانے کے لیے تو نے میری زندگی داؤ پر لگا دی؟'' میر صاحب کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت ہو گیا۔

''آپ کی اجازت سے ہم اسے اپنی تحویل میں لے رہے ہیں اور مزید تفتیش کے بعد جو نتائج برآمد ہوں گے، ان سے آپ کو آگاہ کردیں گے۔'' ڈی آئی جی نے کہا اور بشیراں کا رونا اور زیادہ ہوگیا تھا۔

''اس کا خیال رکھیں کہ یہ قانون کی گرفت سے بچنے نہ پائے۔'' بابا نے کہا۔

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا۔'' ڈی آئی جی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے ہمیں اسے بھی گرفتار کرنا ہوگا جس نے اسے اس کام پر اکسایا تھا۔''

''تو اس میں کیا قباحت ہے؟'' بابا نے کہا۔

''یہ عورت میر صاحب کی منگیتر کا نام لے رہی ہے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

ابھی ڈی آئی جی کا فقرہ مکمل ہی ہوا تھا کہ ایس ایس پی کے موبائل کی گھنٹی بج گئی۔

ایس ایس پی نے فون سنا، کچھ سوال کیے اور ڈی آئی جی سے کہا۔ دوسری پارٹی تھانے پہنچ گئی ہے اور ایف آئی آر کاٹنے کی ضد کررہی ہے۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

''کس کے خلاف ایف آئی آر کٹوانا چاہتے ہیں؟'' ڈی آئی جی نے سوال کیا۔

''وہ میر صاحب کو ملزم نامزد کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے گارڈز نے ان کے دو بندے مار دیے ہیں۔'' ایس ایس پی نے کہا تھا۔

''کیا بکواس ہے؟'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''یہ تو اوپن اینڈ شٹ کیس ہے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''حملہ ان کی طرف سے ہوا تھا جس میں میر صاحب کا ڈرائیور اور ایک گارڈ مارا گیا ہے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''اور وہ ملزمہ بھی حراست میں ہے جس نے میر صاحب کے گھر سے نکلنے کی مخبری کی تھی۔ ہم یہ بھی معلوم کرچکے ہیں کہ اسے کس نے اس بات پر اکسایا تھا۔'' ڈی آئی جی نے اپنی بات مکمل کی۔

''سر میں تھانے والوں کو کیا جواب دوں؟'' ایس ایس پی نے سوال کیا۔

''ان سے کہو کہ انہیں تھانے میں ہی بٹھائے رکھے، ہم آتے ہیں تو دیکھ لیں گے۔''

''سر میں کچھ کہوں؟'' میں نے ڈی آئی جی کو مخاطب کیا۔

''ہاں بولو۔'' ڈی آئی جی نے اجازت دی۔

''وہ لوگ صلح کے لیے پریشر بنانا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ایس ایس پی نے میری بات کی تائید کی تھی۔

''فی الحال ہم اس عورت کو یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔ ''یہ عورت ان کے سامنے آئی تو معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔'' اور ساتھ ہی انہوں نے بابا سے کہا۔ ''آپ ہمارے ساتھ چلیں گے تاکہ ان کے سوالات کے جواب میں کچھ کہہ سکیں۔'' ڈی آئی جی نے کہا مگر میر صاحب نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

''آپ فرجاد کو ہماری طرف سے لے جائیں۔'' میر صاحب نے کہا۔

''یہ بچہ.....'' ایس ایس پی نے اپنا اعتراض بیان کیا۔

''آپ اسے بچہ کہہ رہے ہیں جبکہ ابھی اس نے وہ بات کی ہے جو میرے ذہن میں تھی۔'' میر صاحب نے کہا۔ میں ایس ایس پی اور ڈی آئی جی کے ساتھ جانے کے لیے آگے بڑھا تو میر صاحب کی آواز آئی۔ ''فرجاد! میری بات سنتے جاؤ۔'' میں نے اپنے بڑھتے قدم روک لیے اور میر صاحب کی طرف بڑھ گیا۔ میر صاحب تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور میرے کان میں ہدایات دینی شروع کیں۔ درمیان میں میرے سوالات کے جواب بھی دیتے رہے۔ یہ عمل پندرہ منٹ تک جاری رہا اور پھر میر صاحب نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

''دیکھ اب اس حویلی کی عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔

''آپ نے مجھے اپنا بیٹا کہا ہے، اب مجھ پر لازم ہے کہ میں آپ کو بیٹا ثابت کروں۔'' میں نے کہا اور ایس ایس پی اور ڈی آئی جی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں اس دوران اپنی جیپ میں بیٹھ چکے تھے تبھی عمران میرے ساتھ چلنے لگا۔ جب ہم میر صاحب کی پرانی ڈبل کیبن میں آکر بیٹھے تو عمران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنی چاہی لیکن میں نے کہا ڈرائیونگ میں کروں گا جس کے جواب میں اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''تم ڈرائیو کر لیتے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''شہید نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی۔ آج اُن کے دیے اسباق کو دہرانے کا وقت آگیا ہے۔'' میں نے کہا اور عمران پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار کے اسٹارٹ سے پہلے عمران نے کچھ مزید گارڈز کو اشارہ کیا اور وہ بھی کار میں سوار ہو گئے۔ میں ڈی آئی جی کی جیپ کو فالو کرتا رہا پھر ہم تھانے پہنچ گئے جہاں ایس ایچ او کے کمرے میں دوسری پارٹی یعنی میر صاحب کے چاچا اور ان کے کچھ حواری موجود تھے۔

''وہ خود نہیں آیا؟'' میر صاحب کے چاچا نے کہا۔

''میر صاحب کی نمائندگی یہ کریں گے۔'' ڈی آئی جی نے میری جانب اشارہ کیا۔

''یہ لڑکا ہماری برابری کرے گا؟'' میر صاحب کے چاچا طیش میں آگئے۔

''ابا! انہیں۔'' چاچا کے ساتھ کرسی پر بیٹھے شخص نے کہا ــــ ''میں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔'' وہ اٹھا اور اس نے دروازے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ ڈی آئی جی صاحب کی آواز نے اسے روک دیا۔

''آپ پر ایف آئی آر درج ہے۔ دو افراد کو قتل کرنے کی۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''تم نے انہیں عزت سے کرسیاں دی ہوئی ہیں۔'' ڈی آئی جی نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ ''ایسے لوگوں کو تو حوالات میں ہونا چاہیے۔'' ڈی آئی جی نے کہا اور اپنی بے عزتی پر کھولنے والا شخص جھاگ کی طرح دوبارہ آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''تو ہے کون؟'' میر صاحب کے چاچا نے مجھ سے سوال کیا۔

''یہ فرجاد ہیں اور میر صاحب اِسے بیٹا تسلیم کر چکے ہیں۔'' میرے کچھ کہنے سے قبل ایس ایس پی نے کہا۔

''تو یہ باس کا لے پالک ہے۔'' چاچا نے کہا اور میں بھڑک اٹھا۔

''میں لے پالک سہی لیکن تم وہ ہو جو اپنے ہونے والے داماد پر حملہ کرواتے ہو۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میر صاحب بم پروف میں جا رہے تھے اور تمہاری مخبر یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ میر صاحب جس گاڑی میں روانہ ہوئے ہیں، وہ بم پروف ہے۔'' میں نے غصے سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہماری مخبر؟'' چاچا نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ڈی آئی جی صاحب جب تک ان کے گھر پر چھاپا مار کر اصل سازشی کو گرفتار نہیں کریں گے، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا یہ اسی طرح کاؤنٹر ایف آئی آر درج کروانے کے بہانے پریشر بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔''

''اپنی اوقات میں رہ لڑکے۔'' میر صاحب کے چاچا کے بیٹے نے کہا۔

''جب تمام ثبوت آپ کے پاس ہیں تو آپ ان سب کو گرفتار کیوں نہیں کرتے؟'' میں نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ ہمیں مزید ثبوت شام سے پہلے مل جائیں گے پھر ہی ہم ان پر ہاتھ ڈال سکیں گے۔'' ایس ایس پی نے کہا۔

''کون سے ثبوت؟'' چاچا نے سوال کیا۔

''آپ کی مخبر اعتراف کر چکی ہے اور ہم نے اس کی کال ٹریس کرنے والا ریکارڈ منگوا لیا ہے۔ اس کے آتے ہی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کا کیا حشر ہوگا۔'' ڈی آئی جی کے لہجے میں موجود دھمکی بہت واضح تھی۔

''کیا کوئی درمیانی راستہ نہیں نکل سکتا ہے؟'' چاچا نے سوال کیا۔

''اس کا اختیار فرجاد کے پاس ہے۔'' ڈی آئی جی نے میری جانب اشارہ کیا۔

''کیا ہم دو منٹ اس کمرے کے باہر اکیلے میں بات کر سکتے ہیں؟''

''جو کچھ ہوگا وہ یہیں سب کے سامنے ہوگا۔'' میں نے تقریباً انکار کر دیا۔

''تم جو معاوضہ مقرر کرو گے ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔''

''آج پیر ہے جمعہ کو میر صاحب برات لے کر آپ کے گھر آئیں گے اور قاضی کا بندوبست روایات کے مطابق آپ کریں گے اور اسی روز نکاح بھی ہوگا اور رخصتی بھی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں یہ اضافہ کر لیں کہ ایک ایک کروڑ روپے دونوں شہیدوں کے خاندانوں کو بھی دینا ہوگا۔'' میں نے وہی شرائط پیش کی تھیں جو میر صاحب نے میرے کان میں کہی تھیں۔

''دو کروڑ والی بات تو ہم مان لیتے ہیں لیکن یہ نکاح والی شرط ہم نہیں مان سکتے۔'' میر صاحب کے چاچا نے کہا۔

''منگنی آپ کی پسند سے ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو بڑے بھائی نے مجبور کیا تھا تو ہم نے مان لیا تھا۔''

''شرفا میں منگنی کے بعد لڑکی امانت ہوتی ہے اور لڑکے کا جب جی چاہے برات لے کر آسکتا ہے۔'' میں نے کہا اور چاچا کوئی جواب نہیں دے سکے۔ البتہ ایس پی اور ڈی آئی جی نے اس انداز میں گردنیں ہلائی تھیں جیسے وہ مجھ سے متفق ہوں۔

''تم وہی فرجاد ہو نا جو کمدار کے بیٹے ہو اور میر صاحب تمہاری تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے رہے ہیں؟'' میر صاحب کے چاچا نے کہا۔

''اور آپ وہی ہیں نا جن کا اپنے بڑے بھائی سے برسوں سے زمینوں پر کیس چل رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا اور میر صاحب کے چاچا صرف بل کھا کر رہ گئے۔

''بابا کیوں اپنی بے عزتی کروانے یہاں رکے ہوئے ہیں؟'' میر صاحب کا کزن ایک بار پھر جوش میں آگیا اور اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا اس کے ہاتھ میں چند پرچے تھے جسے ڈی آئی جی صاحب نے دیکھا اور پھر چاچا کی جانب بڑھا دیے۔

''ان میں سے کون سا نمبر ہے جس سے آپ کی واقفیت نہیں ہے۔'' ڈی آئی جی نے چاچا سے کہا۔

''انہیں تو ابھی حوالات میں شفٹ کرو باقی ملزمان کو میں پہلے میر صاحب کی حویلی اور پھر ان کے بنگلے پر جا کر حراست میں لیتا ہوں۔'' ڈی آئی جی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور ساتھ ہی ایس ایس پی اور ایس ایچ او نے بھی اپنی اپنی جگہیں چھوڑ دی تھیں۔ ایس ایچ او نے بیل بجائی اور ایک اے ایس آئی نے آکر سیلوٹ کیا۔

''ریڈ کی تیاری کرو ڈی آئی جی صاحب کمانڈ کریں گے۔'' ایس ایچ او نے اے ایس آئی کو حکم دیا اور وہ جو حکم کہتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ مگر ڈی آئی جی نے اسے آواز دے کر واپس بلوا لیا تھا۔ ''پہلے ان باپ بیٹے کو حوالات میں بند کرو۔''

''یہ نہ بھولیں ڈی آئی جی صاحب کہ میرے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔'' چاچا نے کہا۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں نکلا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور میر صاحب کا کزن مجھے مارنے کے لیے آگے بڑھا مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتا..... عمران جو میرے دائیں طرف کھڑا تھا اس کا مکا سینے پر سہنا پڑا۔ ''اس پر ایک اور ایف آئی آر کا ٹوٹین سوسات کی۔'' ایس ایس پی نے ایس ایچ او سے کہا۔

''چلیں؟'' ڈی آئی نے ایس ایس پی سے سوال کیا۔

''سر گاڑیاں تیار ہیں۔'' اے ایس آئی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے گاڑیاں تو تیار کرلیں لیکن انہیں حوالات میں بند نہیں کیا؟''

''ہم حوالات میں ہوں گے تو جمعے کی تیاری کون کرے گا؟'' چاچا نے منمناتے ہوئے کہا۔

''آپ دونوں آپس میں طے کرلیں کہ گھر کون جائے گا اور حوالات میں کون بند ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اگر ہم دونوں نہیں گئے تو.....'' چاچا نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر ایس ایس پی کی طرف دیکھا۔

''ایک شخص کو دیکھ کر آپ کے باقی خاندان کی سمجھ میں آجائے گا بلکہ ان کی عقل بھی ٹھکانے پر آجائے گی۔'' میں نے کہا اور باپ، بیٹے کے درمیان مذاکرات شروع ہو گئے پھر بیٹے کو حوالات میں جانا پڑا اور باپ باہر کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کے گارڈز اور گاڑیاں موجود تھیں۔ ان کے جانے کے پانچ منٹ بعد میں نے بھی رخصت چاہی۔ ''آپ بھی جائیں لیکن میر صاحب کو بتا دیجیے گا کہ جمعے کو ہمیں دعوت دینا نہ بھولیں۔''

میں اور عمران اپنی گاڑی میں سوار ہوئے اور میں نے کار حویلی کی جانب بڑھا دی۔

ہم حویلی پہنچے تو ملازم نے اطلاع دی کہ میر صاحب کئی بار آپ کے بارے میں معلوم کر چکے ہیں۔ میں سیدھا میر صاحب کے بیڈ روم میں پہنچا تو میر صاحب تکیوں سے ٹیک لگائے اسی انداز میں بیٹھے تھے جس طرح میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ بابا بھی ان کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''تم لوگوں نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟'' میر صاحب نے پہلا سوال کیا۔

''کھانا تو کھا ہی لیں گے لیکن پہلے وہ خوش خبری سن لیں جس کے لیے آپ نے ہمیں بھیجا تھا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''کیا چاچا تیار ہو گئے؟'' میر صاحب یہ سوال کرتے ہوئے کچھ اور اٹھ آئے تھے۔

''تیار کیسے نہ ہوتے فرجاد نے انہیں اس انداز میں گھیرا تھا کہ انہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔'' یہ عمران تھا جو اس وقت میرے ساتھ ہی تھا جب میری اور میر صاحب کے چاچا کی تکرار جاری تھی اور اس کے ساتھ ہی عمران نے تمام تفصیلات بیان کرنی شروع کر دیں۔ میں میر صاحب سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن عمران نے گفتگو ختم کی تو میر صاحب نے اشارہ کیا۔ میں آگے بڑھا تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔

''میں نے ایسے ہی اسے اپنا بیٹا نہیں کہا تھا۔'' میں نے کن انکھیوں سے دیکھا تو بابا اپنی آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ شاید اس بار بھی ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے تھے۔

کچھ دیر تک میر صاحب نے مجھے یونہی گلے لگائے رکھا پھر اچانک بولے۔ ''کمدار صاحب کھانا لگواؤ میں بھی کھاؤں گا۔''

''سرکار اس غدار حرام زادی کا کیا کرنا ہے؟'' بابا نے پوچھا۔

''اسے اسی طرح بند رہنے دو۔'' میر صاحب نے جواب میں کہا۔

بابا اپنی بیساکھی پر کمرے سے نکل ہی رہے تھے کہ میر صاحب نے انہیں واپس بلوالیا۔

''بشیراں کے بیٹے کا کیا ہوا؟'' میر صاحب نے سوال کیا۔

''سرکار اسے بھی اس کی ماں کے ساتھ بند کر دیا ہے۔'' بابا نے کہا۔

''وہ تو آپ نے کر دیا لیکن پرنسپل نے جو کہا تھا، اس پر کتنا عمل ہوا؟'' میر صاحب نے بابا سے سوال کیا۔

''شہر سے میں نے ای سی ٹی وی والے کو بلوایا تھا اور اب اس کیمرے کی ریکارڈنگ ہو رہی ہے جہاں وہ ماں بیٹے موجود ہیں۔''

''میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟'' میں نے اجازت مانگی۔

''اس ریکارڈنگ کو عدالت نہیں تسلیم کرے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہ ریکارڈنگ ہمارے گلے پڑ جائے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' میر صاحب کا سوال تھا۔

''جمعے کو نکاح اور رخصتی کے بعد آپ کی منگیتر اس گھر میں ہوں گی اور انہیں وہی آزادی ہوگی جو آپ کی والدہ کو تھی اگر یہ ریکارڈنگ ان کے ہاتھ لگ گئی تو ہمارے گلے کا پھندا بھی بن سکتی ہے۔'' میں نے کہا اور میر صاحب کے ساتھ سر عنصر کی گردن بھی اس کی حمایت میں ہل گئی تھی۔

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس ریکارڈنگ کو روک دیا جائے؟'' میر صاحب نے سوال کیا۔

''نہیں، ابھی اسے جاری رکھیں کیونکہ وہ ماں بیٹے کوئی ایسی بات ضرور کریں گے جو انہیں مزید پھنسا سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جمعے کے بعد اس ریکارڈنگ کو ضائع کر دیں

بلکہ جلادیں تاہ وہ ہمارے خلاف ثبوت نہ بن سکیں۔''

''میں نے بشیراں سے پوچھا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس کا اکلوتا بیٹا دبئی جانے کی ضد کررہا تھا اور ایجنٹ چار لاکھ روپے مانگ رہا تھا۔''

''وہ کُتیا اگر مجھ سے کہتی تو میں بغیر رقم لیے اسے دبئی روانہ کروادیتا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''اب تم ایسا کرو کہ کھانا لگوادو۔ میں بھی کھاؤں گا اور پرنسپل صاحب کی بھی ہم نے کوئی خاطر نہیں کی۔'' میر صاحب نے بابا سے کہا اور بابا نے ہمیشہ کی طرح مختصر جواب دیا۔ ''جی اچھا۔''

''کھانے کے بعد تم اور پرنسپل صاحب اسپتال چلے جانا۔ پوسٹ مارٹم ہو چکا ہو تو باری شاہ کی لاش اس کے گھر پہنچا دینا اور گارڈ کی لاش حویلی لے آنا۔'' میر صاحب نے کہا۔

اس کے بعد بابا نے میر صاحب کے بستر کے ساتھ ہی میز لگائی اور ہم سب نے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے دوران میں نے اماں کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ دروازے کے ساتھ آڑ میں کھڑی تھیں اور کھانے کی ٹرے بابا کو دے رہی تھیں۔

''ایسے کوفتے تو میں نے زندگی میں نہیں کھائے۔'' سر عنصر نے چند لقموں کے بعد تبصرہ کیا۔

''یہ کمدار صاحب کی بیوی نے بنائے ہیں۔ حویلی میں تو صبح سے ماتم جاری ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔

''اپنی بیگم سے کہیے گا کہ کھانا بہت ہی مزیدار تھا۔'' سر عنصر نے بابا سے کہا۔

''آپ براہِ راست ان سے کہہ دیں۔'' بابا نے جواب میں کہا اور ساتھ ہی دروازے کی جانب بڑھے جہاں سے واپسی پر اماں ان کے ساتھ تھیں۔

''واقعی مزہ آگیا آپ کے ہاتھ کا کھانا کھا کر۔'' سر عنصر نے اماں سے کہا تھا اور اماں شکریہ کہہ کر خاموش رہی تھیں۔

''مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنے اچھے کھانے بناتی ہو تو میں بشیراں کو کب کا فارغ کر چکا ہوتا۔'' میر صاحب نے کہا اور اماں صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

''میر صاحب آپ کے پہلے ہی بہت احسانات ہیں۔'' اماں نے بہت آہستگی سے کہا۔

''جو کچھ میں نے کیا، آج تمہارے بیٹے نے وہ سب برابر کر دیا ہے۔ آج کے بعد ہم .... دونوں خاندانوں کا حساب برابر ہو گیا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''کمدار صاحب تدفین کے تمام انتظامات بھی کرتے ہیں۔ باری شاہ کی فیملی سے معلوم کر لیجیے گا اور انہیں رقم کی ضرورت ہو تو وہ بھی دے دینا۔''

اگلے روز پورا دن ہمارا تدفین میں گزرا تھا۔ باری شاہ کے جنازے میں میری توقع سے زیادہ لوگ شریک تھے۔ سر عنصر اپنے گھر سے شریک ہوئے تھے اور میں اور میر صاحب بابا کے ساتھ حویلی سے آئے تھے۔ ڈی آئی جی اور ایس ایس پی بھی بہت سے پولیس والوں کے ساتھ آگئے تھے۔ باری شاہ کی تدفین اس کے آبائی قبرستان میں ہوئی۔ میر صاحب تو قبرستان چلے گئے اور میں اور بابا سر عنصر کے اصرار پر ان کے گھر آگئے۔ مسز عنصر کی ایک جھلک میں نے باری شاہ کے گھر پر دیکھی تھی لیکن سر عنصر کے گھر پہنچے تو سکینہ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ سر عنصر نے بیٹی سے بابا کا تعارف کروایا اور سکینہ نے ادب سے سلام کیا۔

''آیئے میں آپ کو اپنی لائبریری دکھاؤں۔'' یہ کہتے ہوئے سر عنصر اندر کے کمروں کی جانب بڑھے تھے۔

''یہ میرا بیڈ روم ہے۔'' ایک کمرے میں انہوں نے رکتے ہوئے کہا۔

کمرے میں ایک سنگل بیڈ تھا اور باقی کمرے میں الماریاں تھیں جو کتابوں سے بھری ہوئی تھیں، کچھ ایک دو کتابوں کے علاوہ تمام کتابیں اردو میں تھیں۔ بابا اس دوران ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ وہ وہیں ڈرائنگ روم میں سکینہ کے ساتھ رک گئے تھے ہم واپس ہوئے تو بابا نے سکینہ کی تعریفیں شروع کر دیں۔ ''پرنسپل صاحب آپ کی بیٹی تو بہت اونچی اُڑان اُڑنے کے موڈ میں ہے۔'' اور سر عنصر اس پر مسکرا دیے تھے۔

''خواب تو سب ہی اونچے دیکھتے ہیں لیکن ان کی تکمیل کے لیے محنت درکار ہوتی ہے جو اس سے نہیں ہوتی۔'' سر عنصر نے کہا۔

سر عنصر نے مجھے اپنی لائبریری سے چند کتابیں دی تھیں۔ سکینہ نے وہ کتابیں دیکھیں اور باپ سے مخاطب ہوئی۔

''ابا آپ انہیں یہ دے تو رہے ہیں مگر یہ اپنی کورس کی کتابیں کب پڑھیں گے اور اگر انہوں نے اس پر توجہ دی تو یقین کریں اس بار ان کی پوزیشن نہیں آئے گی۔'' یہ کہتے ہوئے سکینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''پوزیشن بھی لے گا اور اگر سنجیدگی سے ان کتابوں کو پڑھا اور سمجھا تو پندرہ روز میں شاعری بھی شروع کر دے گا۔'' سرعنصر نے کہا۔

میر صاحب کے گارڈ کی تدفین ان کے ..... اپنے آبائی قبرستان میں ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جمعے کی برات میں میری بھی شرکت ہو لیکن میر صاحب نے کہا تھا تم کالج جاؤ۔ میں تمہارا رسک نہیں لے سکتا اور میں بغیر کچھ کہے کالج واپس آ گیا جہاں میرے سابق ہم جماعتوں نے استقبال کیا۔ میرا روم وہی تھا اور روم میٹ بھی ندیم ہی تھا مگر ایک تبدیلی یہ تھی کہ اب میں کلاس کے بعد جمنازیم جایا کرتا تھا اور مسلز کو طاقتور بناتا تھا۔ جمنازیم میں کراٹے کی کلاسیں بھی ہوتی تھیں، میں نے کراٹے کی کلاس بھی جوائن کر لی تھی۔

جمنازیم سے واپسی کے بعد میں ہوتا تھا اور کتابیں ہوتی تھیں۔ رات گئے تک میں کتابوں میں الجھا رہتا تھا۔

پندرہ دن بعد میر صاحب نے مجھے موبائل پر کال کی۔ ''کب آ رہے ہو؟'' انہوں نے سوال کیا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ ''جب آپ گاڑی بھیجیں گے۔'' میرا جواب تھا۔

''میں جمعے کو گاڑی بھیجوں گا تم عمران کے ساتھ آ جانا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ سرکاری گارڈ عمران کو میر صاحب نے باری شاہ کی جگہ دے دی ہے۔'' میں نے سوچا لیکن میر صاحب سے کوئی سوال نہیں کیا۔

جمعہ کو عمران آیا تب میں پیکنگ کرنے کے ساتھ نماز بھی پڑھ چکا تھا۔ بابا بھی عمران کے ساتھ تھے۔ میں کار کی جانب بڑھا تو عمران نے ڈرائیونگ سیٹ خالی کر دی۔

''کیا حالات ہیں قصبے کے؟'' میں نے کار آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

''ویسے ہی ہیں جیسے آپ چھوڑ کر آئے تھے۔''

''اس بار فصل بہت بہتر ہوئی ہے۔'' بابا نے پچھلی نشست سے جواب دیا۔

ہم قصبے میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ بابا نے کہا۔ ''پہلے گھر کی طرف چلو تمہاری والدہ نے خاص طور پر کہا تھا۔'' اور میں نے کار اپنے گھر کی جانب موڑ دی تھی۔ کار رکی تو اماں نے گھر سے باہر آ کر میرا استقبال کیا..... اماں سے مل کر میں اپنی لگائی ہوئی کیاریوں کی طرف گیا..... ان سب میں جیسے بہار آئی ہوئی تھی پھر میں گھر کے پچھلے حصے میں گیا جہاں پودے اب زمین سے باہر آ چکے تھے۔ میں ابھی وہیں تھا کہ بابا بھی وہاں بیساکھیاں ٹیکتے ہوئے آ گئے۔

''بابا یہ پھل کب دیں گے؟'' میں نے بابا سے پوچھا۔

''پانچ سال تو لگ جائیں گے۔''

میں پودوں کے پاس سے واپس ہوا تو انگور کی بیل پر نظر پڑی۔ ''یہ تو میں نے نہیں لگائی تھی۔'' میں نے کہا۔

''تو نے میرا کام بڑھا دیا ہے۔'' اماں نے قریب آ کر کہا۔

''یہ تو اب روزانہ تمہاری کیاریوں کی گوڈی بھی کرتی ہے اور پانی بھی دیتی ہے بلکہ اس نے تو اب سبزیوں کو بیچنا بھی شروع کر دیا ہے۔ گاؤں والوں کو اسی قیمت میں دیتی ہے جس پر منڈی والے بیچتے ہیں .....'' ابا نے کہا تھا۔

''تب تو قصبے والے سبزیاں یہیں سے لے لیتے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''منڈی کے بیوپاری جھولی اٹھا اٹھا کر بددعائیں بھی دیتے ہیں۔'' بابا نے کہا۔

''مجھے فرق نہیں پڑتا ان کی بددعاؤں سے جن گھروں میں میرے لیے دعائیں ہوتی ہیں، وہ ان بددعاؤں کو برابر کر دیتی ہیں۔'' اماں نے کہا۔

''تم تو قصبے والوں کو اپنے بیٹے کے لیے دعا کرنے کو کہتی ہو۔'' بابا نے کہا۔

''ایک ہی بات ہے دعا میرے لیے ہو یا میرے بیٹے کے لیے۔'' اماں نے کہا۔

''کھانا کھا کر حویلی چلے جانا۔'' اماں نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ ''میر صاحب اور ان کی دلہن کو مبارک باد بھی دینا ہے۔'' اماں نے کہا۔

''میں تو برات کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر میر صاحب نے مجھے کالج جانے کے لیے کہہ دیا۔''

''میر صاحب سے میں نے اس پر بات کی تھی۔'' بابا نے کہنا شروع کیا۔ ''میر صاحب کا جواب تھا فرجاد ان کی نظروں میں آ چکا ہے۔ اب میں اسے ساتھ لے جانے کا رسک کیونکر لے سکتا تھا۔''

''کیا عمران کو بھی یہیں حویلی میں چھوڑ گئے تھے؟'' میں نے سوال کیا تھا۔ ''عمران نے تو ان کے دو آدمی مار دیے تھے۔''

''عمران ساتھ گیا تھا لیکن وہ میر صاحب کے گارڈز کے ساتھ رہا تھا اور رخصتی کے بعد کار اسی نے چلائی تھی۔'' بابا نے کہا۔

ہم تینوں کھانے سے فارغ ہوئے تو مساجد سے عصر کی

اذانیں ہونے لگی تھیں۔ میں عمران کے ساتھ حویلی پہنچا تو ملازموں نے بتایا کہ میر صاحب اپنی دلہن کے ساتھ لان میں موجود ہیں۔ ہم دونوں اس طرف بڑھ گئے۔ میر صاحب نے مجھے دیکھا اور اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی سے میرا تعارف کروایا۔

''یہ فرجاد ہے۔ تم اسے میرا بیٹا ہی سمجھو، ویسے یہ کمدار صاحب کا بیٹا ہے اس کا نام تو تم نے اپنے باپ اور بھائی سے سن لیا ہوگا۔'' میر صاحب نے کہا اور اس بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

وہ خوب صورتی کا شاہکار تھی بلکہ یوں کہہ لیں کہ وہ نغمہ جو جاوید اختر نے لکھا اور نصرت فتح علی نے گایا تھا۔ ''حسن جاناں کی تعریف ممکن نہیں'' وہ مکمل طور پر اس کی تصویر تھی۔ بڑی آنکھوں کے ساتھ لانبی گردن اور آنکھوں پر سایہ دار بھویں اُسے لاکھوں میں ممتاز کرتی تھیں۔

''یہ ہیں جو کچھ دن پہلے تک میری کزن اور منگیتر تھیں اور اب میری بیوی اور تمہاری نئی مالکن ہیں۔'' میر صاحب نے کہا تھا۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد میں نے دوبارہ اس کی جانب نظر نہیں اٹھائی تھی۔ لیکن وہ ایک ہی نظر میرے لیے کافی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی پوری طرح اسے اپنے دل میں بسا چکا تھا۔

''تمہارے پرنسپل بتا رہے تھے کہ تم نے جمنازیم جوائن کیا ہوا ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔ ''مگر مجھے تو تمہاری باڈی میں کوئی فرق نظر نہیں آرہا۔'' میر صاحب نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''ابھی چند دن ہوئے ہیں جم جوائن کیے ہوئے۔'' میں نے کہا اور میر صاحب ہنس دیے لیکن ان کی بیوی اسی انداز سے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔

''عمران، ملازم سے کہو کہ ہم تینوں کے لیے چائے لے آئے۔'' میر صاحب نے عمران سے کہا۔

''میں کافی پیوں گی۔'' بڑی بڑی آنکھوں والی نے کہا۔

اس کی آواز ایسی تھی جیسے قریب ہی کوئی جھرنا بہہ رہا ہو۔ میر صاحب نے حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے عمران کو آواز دی اور ''ایک کافی'' کے لیے کہا تھا۔

''یہ کافی کی عادت تم نے کہاں سے ڈالی؟'' میر صاحب نے سوال کیا۔

''ہمارے کالج میں دو عرب لڑکیاں تھیں۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے بھی کافی کی عادت ہوگئی۔'' اس کا جواب تھا۔

''ہوسکتا ہے تمہارے ساتھ رہتے ہوئے مجھے بھی کافی کی عادت ہوجائے۔''

میں نے میر صاحب سے پوچھنا گوارا نہیں کیا لیکن بابا سے ضرور معلوم کیا کہ بشیراں اور اس کے بیٹے کا کیا حشر ہوا اور بابا مسکرا دیے۔

''وہی ہوا جو کسی بھی غدار کا ہوسکتا ہے۔'' بابا نے کہا۔

میں نے تو نہیں پوچھا تھا لیکن بابا نے بتایا کہ میر صاحب نے ماں بیٹے کو گارڈز کے ساتھ دریا پر جانے کی اجازت دی تھی جہاں بیٹے کو گارڈز نے دریا میں ڈبویا اور پھر بشیراں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

''ان کی لاشیں ملی ہوں گی تو پولیس حویلی تو آئی ہوگی؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہی ایس ایس پی آیا تھا جس کی موجودگی میں بشیراں نے اعتراف کیا تھا۔ ایس ایس پی نے ملازمین سے بہت سے سوال کیے لیکن ہر ایک نے وہی سبق دہرایا جو انہیں پڑھایا گیا تھا۔

''ایس ایس پی کو شک تو ہوا ہوگا؟'' میں نے کہا اور بابا مسکرا دیے۔

''شک تھا تبھی تو آیا تھا۔'' بابا نے جواب میں کہا۔

''لیکن پچاس سے زیادہ لوگوں کی گواہی کیسے مسترد کرسکتا تھا۔ خود میر صاحب نے کہا تھا کہ بشیراں ان کی پرانی ملازمہ تھی اور اس نے اپنے بیٹے کو دبئی بھجوانے کی بات کی تھی اور اس کا پاسپورٹ بھی وہ بنوا چکے تھے مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔'' بابا نے کہا۔

''اگر اس پولیس والے میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو ملازموں کی گواہی پر اعتبار نہ کرتا بلکہ گاؤں کے لوگوں بلکہ بشیراں کے پڑوسیوں سے معلوم کرتا کہ بشیراں اور اس کا بیٹا کتنے دنوں سے غائب ہیں؟'' میں نے کہا۔

''تم ایسا کرنا کہ بی اے کے بعد پولیس میں چلے جانا۔'' بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس سے اگلے روز میں کالج آگیا لیکن اب میری حالت عجیب سی رہنے لگی تھی۔ کتاب کھولتا تو اس کی تصویر آجاتی۔ کچھ سکون ملتا تو شاعری میں ملتا تھا۔ میں نے پہلی غزل لکھی تو سرعنصر کو دکھائی، انہوں نے خوب تعریف کی اور وہ غزل اپنے پاس ہی رکھ لی۔ ایک ماہ بعد آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک ادبی پرچہ تھا۔ ''اس کا صفحہ نمبر ستاون دیکھو۔'' انہوں نے وہ پرچہ میری جانب بڑھایا تھا۔ اس میں میری غزل چھپی ہوئی تھی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ یقینی طور پر اصلاح سرعنصر

نے ہی کی تھی۔

''سر آپ بھی شاعری کرتے ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''کرتا ہوں لیکن میری شاعری نوحوں اور مرثیوں تک محدود ہے۔''

اس کے ایک ہفتے بعد میں نے اپنی زندگی کی پہلی نعت لکھی۔ سر عنصر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔

بی اے پارٹ ون کا پورا سال اسی طرح گزر گیا۔ غزلیں چھپواتے اور نعتیں لکھتے ہوئے۔ سر عنصر میری غزلیں چھپواتے رہے تھے۔

''سر آپ کے علم میں ہوگا کہ کل سے کالج بند ہو رہے ہیں اور میں میر صاحب کو فون کر چکا ہوں کہ وہ کار بھجوا دیں۔ میں امتحانوں کے لیے تیاری کرنے آنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

اگلی صبح عمران، میر صاحب کی کار لے کر آ گیا تھا۔ میں اپنا سامان جس میں کتابیں زیادہ تھیں اٹیچیوں میں بھر چکا تھا۔ میں سال بھر بعد گاؤں لوٹ رہا تھا۔ اس لیے سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا اماں اس وقت کچن میں تھیں اور بابا اپنے کام سے نکلے ہوئے تھے۔

''میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تو آج ضرور آئے گا۔'' میں نے اماں کو کچن میں جا کر پکڑا اور ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے تو انہوں نے کہا تھا۔

''ماں کے دل کی آواز کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتی۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے تو انہوں نے رونا شروع کر دیا۔

''اب تم یہ نہ کہنا کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں۔''

''سال بھر بعد بیٹے نے شکل دکھائی ہے تو ماں خوشی کے آنسو نہیں بہائے گی تو اور کیا کرے گی؟''

''اماں اتنا مصروف رہا ہوں کہ مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''وہ تاباں بتا رہی تھی کہ رسالوں میں تیری شاعری چھپ رہی ہے۔'' اماں نے کہا۔

''یہ تاباں کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میر صاحب کی بیوی اور کون، تجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم۔'' اماں کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اس نے کہاں سے پڑھ لی میری شاعری؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس نے مجھے بھی پڑھوائی ہے تیری شاعری۔'' اماں نے کہا۔

''تاباں کو چھوڑ تو یہ بتا کہ تو نے پکایا کیا ہے؟''

''دال چاول بنا رہی تھی۔'' اماں نے کہا۔

''تو جلدی سے بنا سال بھر سے تیرے ہاتھ کے بنے کھانے سے محروم رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

ہم ماں بیٹے ابھی کچن میں تھے کہ عمران آ گیا۔

''وہ میر صاحب اس طرف آنے کے لیے گھر سے نکل پڑے ہیں۔ ان کے ساتھ بیگم صاحبہ بھی ہیں۔'' عمران نے جلدی جلدی اپنی بات پوری کی تھی۔

''مگر گاڑی تو تمہارے پاس ہے۔'' میں نے کہا۔

''میر صاحب نے دو اور گاڑیاں لی ہیں۔ ایک بیگم صاحبہ کے استعمال میں رہتی ہے اور دوسری صاحب کے پاس ہے۔'' عمران نے اطلاع دی تھی۔

''میر صاحب نے کوئی اور ڈرائیور بھی رکھا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''بیگم صاحبہ خود ڈرائیو کرتی ہیں لیکن جب بھی وہ حویلی سے نکلتی ہیں کوئی گارڈ ان کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

ہم تینوں کچن سے نکل کر صحن میں آئے تھے کہ ایک کار ہمارے دروازے کے پاس آ کے رکی اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے وہ حسینہ نکلی تھی جس کے تصور میں پہلی غزل لکھی تھی جس کے بعد میری شاعری شروع ہوئی تھی۔ پسنجر سیٹ سے میر صاحب کو اترتا دیکھ کر میں ان کی طرف بڑھ گیا۔

وہ جس کے تصور میں نہ جانے کتنی ہی غزلیں لکھی تھیں، اسے میں نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور یہ میری مجبوری بھی تھی۔ میر صاحب قطعی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی منکوحہ پر کوئی بری نظر ڈالے اگر انہیں رتی برابر بھی شک ہو جاتا تو میرا حشر بھی بشیراں اور اس کے بیٹے سے مختلف نہ ہوتا۔

''واہ بھئی واہ خوب باڈی بنائی ہے۔'' میر صاحب نے میرے کسرتی جسم پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اب آپ انہیں نظر نہیں لگا رہے۔'' اس حسینہ نے کہا جسے میں نے مکمل طور پر نظر انداز کیا ہوا تھا۔

''کیا بنایا ہے جلدی سے لے آئیں۔''

''مسور کی دال چاول ہیں بس کباب تلنے جا رہی تھی۔''

''خالہ ساتھ میں اچار ضرور ہونا چاہیے۔'' تاباں نے کہا۔

''کیوں نہیں گھر کا اچار ہے۔'' اماں نے جواب دیا۔

''میں مدد کروں؟'' تاباں نے آواز لگائی۔

''مجھے یہ کام کرنے کی عادت ہے۔'' اماں یہ کہتے ہوئے کچن میں گھس گئی تھیں۔ پھر شاید کباب فرائی پین میں

ڈال کر وہ باہر نکلیں اور تاباں کی طرف دسترخوان بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم تب تک اسے تخت پر بچھادو۔''

تاباں نے دسترخوان بچھانا شروع کر دیا تب ہی اماں نے کچن سے آواز لگائی۔ ''کیا ہی اچھا ہوتا کہ فرجاد کے ابا بھی اس وقت آجاتے۔'' اور میر صاحب نے فوراً موبائل پر نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیے۔ ''کہاں ہیں کمدار صاحب؟'' انہوں نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔

ابا نے جواب میں کچھ کہا تھا جو ہمیں سنائی نہیں دیا تھا۔

''میں اور تاباں آپ کے گھر پر ہیں اور آپ کی بیگم کہہ رہی تھیں کہ کیا اچھا ہوتا کہ فرجاد کے ابا بھی آجاتے۔''

بابا نے پھر کچھ کہا جو ہم تک نہیں پہنچا۔

''دو منٹ میں آرہے ہیں آپ کے شوہر۔'' میر صاحب نے بلند آواز میں اماں کو مخاطب کیا تھا۔ میں نے تخت پر میر صاحب کے دائیں طرف والی جگہ پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ تاباں میر صاحب کے سامنے بیٹھی تھی۔ میر صاحب کی نظریں بیوی پر جمی ہوئی تھیں لیکن میں نے کن انکھیوں سے دیکھا تو وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی مگر مجھے اس کی آنکھوں میں زیادہ دکھ نظر آئے تھے۔

''آخر یہ سمجھتی کیوں نہیں ہے۔'' میں نے سوچا۔

''جس انداز میں وہ مجھے دیکھ رہی ہے اس سے میر صاحب کو شک ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر بعد بابا بھی آگئے۔

''خالہ اچار۔'' تاباں نے آواز لگائی۔

''صبر سے کام لے لڑکی۔'' اماں نے کہا تھا جس پر مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ ابا کو یہ بے تکلفانہ انداز اچھا نہیں لگا تھا اور اس کا اظہار انہوں نے کچھ دیر بعد میر صاحب اور ان کی بیگم کے جانے کے بعد کر دیا۔

''اپنی ماں سے کہنا مالکوں سے اس انداز میں بات نہیں کرتے جیسے ابھی اس نے کی تھی۔''

میں چاہتا تھا کہ بابا سے کہوں ایسا کیا کہہ دیا انہوں نے لیکن میں کہہ نہ سکا۔ پورا مہینہ میں تھا اور میری کورس کی کتابیں تھیں جو وقت میں دیگر مشاغل میں ضائع کر چکا تھا مجھے اس کی تلافی کرنی تھی۔ پھر امتحان کی ڈیٹ شیٹ آگئی اور میں شہر واپس آگیا تھا اور ہاسٹل میں اپنے کمرے میں آگیا۔

پورے مہینے میں نے کتابوں اور اپنی ورزش کے علاوہ کیاریوں کی طرف دھیان دیا تھا۔ میں ہاسٹل پہنچا تو ایک گھنٹے کے اندر ہی پرنسپل صاحب کے دفتر سے بلاوا آگیا۔ وہاں ایک صاحب اور بھی تھے۔

''یہ فرجاد ہے اور یہ وہ بینک منیجر صاحب ہیں جہاں تمہارا اکاؤنٹ کھلنا ہے۔'' منیجر صاحب نے کچھ فارمز پر میرے دستخط لیے اور مجھے بتایا کہ دو دن بعد مجھے چیک بک مل جائے گی۔ میرا اکاؤنٹ دس لاکھ پچاس ہزار کی رقم سے کھلا تھا۔

''یہ دس لاکھ تو سمجھ میں آگئے لیکن پچاس ہزار؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا تھا۔

''وہ رسالے جو تمہاری غزلیں شائع کرتے رہے ہیں کیا ان سے معاوضہ تم کو نہیں لینا۔'' عنصر صاحب نے جواب دیا تھا۔

''شروع شروع میں تو انہوں نے انکار کیا لیکن میرے اصرار پر وہ رضامند ہو گئے مگر معاوضہ اتنا کم رکھا تھا کہ مجھے تمہیں بتاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی کسی کو اعتراض تھا کہ مشہور نہیں ہے کوئی کہتا تھا ہماری سرکولیشن بہت کم ہے۔ دراصل ہمارے معاشرے کی بہت سی برائیوں میں سے ایک برائی یہ بھی ہے کہ لوگ سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ شاعر کے ساتھ بھی پیٹ ہے، اس کا بھی خاندان ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لوگ اگر مشاعروں میں بھی بلاتے ہیں تو شاعر کو کھانا کھلا کر سمجھتے ہیں کہ بڑا احسان کیا ہے۔''

دس لاکھ روپے ریکارڈنگ کرنے والوں نے دیے تھے۔ سکینہ کی آواز میں میری نعتیں ریکارڈ ہو رہی تھیں۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ میرے تمام پرچے بہت اچھے ہوئے تھے سوائے انگریزی کے پرچے کے۔'' میں نے سرعنصر سے اس کا ذکر کیا۔

''اب کے سال تم نے انگلش کی کلاسوں میں داخلہ لینا ہے۔'' انہوں نے مشورہ دیا تھا لیکن یہ بات میں نے دماغ میں بٹھالی تھی۔ کسی ایک مضمون میں کم نمبر میری پوزیشن لانے پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

آخری پیپر دے کر واپس آرہا تھا تو ایک دکان پر وہ کیسٹ بج رہا تھا جس میں آواز تو سکینہ کی تھی لیکن اشعار میرے تھے۔ میں دکان کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

''جی فرمایئے، کوئی کام ہے؟'' دکان دار نے مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر کہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے کہا۔

''میں فرجاد ہوں۔'' میرے منہ سے میرا نام ادا ہوا ہی تھا کہ وہ کاؤنٹر چھوڑ کر باہر نکل آیا تھا اور میری طرف ایک چھوٹا سا پیکٹ بڑھا دیا۔

''اس میں آپ کے کیسٹ اور سی ڈیز ہیں آج ہی آئی ہیں اور بارہ بجے سے اب تک میں سیکڑوں بیچ چکا ہوں۔''

میں ہوسٹل پہنچا تو ندیم وہاں موجود تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے شاپر اس کی طرف بڑھا دیا۔

ندیم نے شاپر میں سے پیکٹ نکالا جس پر میری اور سکینہ کی تصویر اور نام درج تھے۔ ''یہ کب ہوا؟'' ندیم نے ایک کیسٹ نکالا اور مجھ سے سوال کیا۔

''یہ سب سرعنصر کا کمال ہے۔'' میں نے کہا اور ندیم نے کیسٹ ریکارڈر میں کیسٹ لگا دی اور کمرے میں سکینہ کی آواز گونجنے لگی۔ ہاسٹل کے وہ لڑکے جو ہمارے کمرے کے پاس تھے۔ ندیم نے ان سب میں وہ کیسٹ بانٹ دیے۔

وہ پورا مہینہ جو میں نے گاؤں میں کتابوں کے ساتھ گزارا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں تمام پرچوں میں پاس ہی نہیں ہوا بلکہ میرے نمبر اتنے تھے کہ دوسرے نمبر پر جو لڑکی تھی وہ مجھ سے سولہ فیصد مارکس پیچھے تھی۔ اگلے سال کی اسکالرشپ کے لیے مجھ کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ سرکار نے خود سے تو سیع کر دی تھی۔ بی اے پارٹ ٹو شروع ہونے سے پہلے ایک بار پھر کالج بند ہوئے۔ اسکالرشپ کے پیسوں سے میں نے اگلے سال کی کتابیں لیں اور گاؤں آ گیا۔ میں حویلی پہنچا تو میر صاحب لان میں تھے ان کے ساتھ وہی حسن کا مجسمہ موجود تھا۔

بابا مجھے بتا چکے تھے کہ تاباں کے باپ اور بھائی کو اس وقت قتل کر دیا گیا تھا جب وہ عدالت میں پیشی بھگتا کر آ رہے تھے۔ باری شاہ کے بھائی کو پولیس نے موقع سے ہتھیار سمیت گرفتار کر لیا تھا۔ باری شاہ کے بھائی نے اعتراف تو کر لیا تھا اور قتل کی وجہ اس نے بتائی تھی کہ اس نے اپنے بھائی کا بدلہ لیا ہے۔ اب میر صاحب کے دیے گئے وکیل اس کا مقدمہ لڑ رہے تھے۔ بابا نے یہ بھی بتایا تھا کہ تاباں چاہتی تھی کہ اس کے باپ اور بھائی کی میت حویلی لائی جائے لیکن میر صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ البتہ عمران اور مجھے تاباں کے ساتھ اس کے میکے بھیج دیا تھا جہاں وہ باپ اور بھائی کے سوم تک رہی تھیں۔

''آپ نے مجھے اطلاع نہیں دی؟'' میں نے شکایت کی تو بابا نے کہا۔ ''میر صاحب نے منع کیا تھا کہ اس کی پڑھائی ڈسٹرب ہو گی۔'' میں لان میں پہنچا تو اس کی آنکھوں میں گہرے غم کے بادل تھے اور میر صاحب اس سے بے پروا نظر آئے تھے۔ بابا مجھے بتا چکے تھے کہ میر صاحب نے اپنے چاچا کی تمام زمینوں بلکہ ان کے بنگلوں پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ اب چھٹی کے دن وہ بیوی کو لے کر اس کے میکے جاتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ میر صاحب اسی صبح واپس آئے تھے۔ میں نے میر صاحب کے سامنے تاباں کو پرسہ دیا اور دعا کی۔ دعا میں میر صاحب بھی شریک ہوئے لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ دل سے شریک نہیں ہیں، صرف رسم نبھا رہے تھے۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' میر صاحب نے دعا ختم ہوتے ہی مخاطب کیا۔

''ابھی تو میں پہلے بی اے مکمل کروں گا۔'' میں نے کہا تھا۔

''میری پرنسپل صاحب سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اس بار تمہاری پہلی پوزیشن آئے گی۔'' میر صاحب نے کہا۔

''امید تو یہی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ تفصیل بھی بتا دی کہ دوسرے نمبر پر جو لڑکی ہے اس کے نمبر مجھ سے بہت کم ہیں۔'' میں نے کہا تھا اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ تاباں کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے غم کے سائے کم ہوئے تھے۔

''میں اس کے بعد کی بات کر رہا ہوں۔'' میر صاحب نے کہا۔

''میری خواہش ہے کہ میں بیرسٹر بنوں۔'' میں نے کہا۔

''اس کے لیے تو تمہیں انگلینڈ جانا ہوگا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''میں بی اے فائنل کے امتحانوں کے دوران ہی اپلائی کرنا شروع کر دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''اس کی فیس وغیرہ۔'' میر صاحب نے ایک اور سوال کیا تھا۔

''نعتوں کے کیسٹ سے دس لاکھ روپے ملے تھے وہ اسی طرح بینک میں ہیں بلکہ اب تو اس میں کافی اضافہ ہو گیا ہو گا کیونکہ میں نے اسے سال بھر کے لیے فکسڈ ڈپازٹ کر دیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''چلو اب بات اگلے برس پر گئی۔'' میر صاحب نے کہا۔

''بیرسٹر بننے کے بعد واپس آ جاؤ گے؟'' میر صاحب نے کہا۔

''وہاں رہ کر کیا کروں گا؟'' میں نے جواب دیا۔

''کسی انگریز لڑکی سے شادی کر کے وہاں کی شہریت حاصل کر لینا اور مزے کرنا۔'' میر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میر صاحب مجھے اپنے وطن سے پیار ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہاں کی کسی لڑکی سے وعدہ کر رکھا ہے۔'' تاباں نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔

''فرجاد اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔'' میرے بجائے میر

صاحب نے جواب دیا تھا۔

''ہمارا کالج لڑکوں کا کالج ہے۔ میری کُل مصروفیات کالج سے ہاسٹل اور وہاں سے جمنازیم تک محدود ہیں۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اور وہ لڑکی جس کا کیسٹ آیا ہے اور جس نے تمہاری نعتیں پڑھی ہیں؟'' تاباں اس بار براہِ راست مجھ سے مخاطب تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ حسن کی دیوی مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

''وہ میرے محسن کی بیٹی ہے اور میں احسان فراموش نہیں ہوں۔'' میں نے کہا اور میر صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''وطن سے پیار ہے تو اب تک قومی نغمہ تو ایک بھی نہیں لکھا۔'' تاباں نے ایک اور سوال کیا۔

''موقع نہیں ملا، موقع ملا تو ضرور لکھوں گا۔'' میں نے کہا لیکن تاباں کے سوال ختم نہیں ہوئے تھے۔

''تمہاری غزلوں میں جو محبوبہ ہے، اس کا وجود بھی ہے یا صرف تصوراتی ہے؟'' تاباں کا اگلا سوال تھا۔

یہ بہت خطرناک سوال تھا۔ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ میں کہوں۔ وہ کوئی اور نہیں آپ ہیں لیکن میں نے خود پر قابو پالیا۔ ایسا کہہ دیتا تو میر صاحب مجھے اپنے ہاتھوں سے وہیں قتل کردیتے۔

''اس کا وجود تو ہوگا کہیں نہ کہیں لیکن فی الحال آپ اسے تصور ہی سمجھیں۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے پرنسپل صاحب نے کہا تھا کہ وہ تمہارے کلام کا مجموعہ چھپوانا چاہ رہے ہیں۔''

''سر عنصر بھی عجیب ہی آدمی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں عجیب کیوں ہیں؟'' میر صاحب نے سوال کیا۔

''مجھ سے بات کی نہیں اور چل دیے مجموعہ چھپوانے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ نعتوں کے ساتھ غزلوں کا مجموعہ بھی چھپوا دیں۔'' میر صاحب نے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں تم سے بات نہیں کی جبکہ مجھ سے تو انہوں نے کہا تھا کہ ان کی کسی پبلشر سے بات چل رہی ہے۔''

''سر عنصر اسی طرح کے شخص ہیں۔ اسکالرشپ کے سلسلے میں بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا تھا بلکہ سب کچھ خود ہی کرلیا تھا۔''

شرمندگی

ایک دوپہر کو ایک بہت ہی پرانی پھٹیچر سی کار ایک ریستوران کے سامنے آکر رکی۔ کار چلانے والا اتر کر قریب کھڑے ایک شخص سے بولا۔ ''بھائی ذرا کار کا دھیان رکھنا، میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

کار کا مالک اپنا کام کر کے واپس آیا تو اس نے کار کا خیال رکھنے والے شخص کے ہاتھ پر دس روپے انعام کے طور پر رکھ دیے۔ اس آدمی نے بگڑ کر کہا۔

''پچاس روپے دیجیے جناب۔''

کار کے مالک نے حیران ہو کر کہا۔ ''پچاس روپے! یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ میں نے تو ریستوران میں پانچ منٹ بھی نہیں لگائے۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جناب، میں وقت کی بات نہیں کر رہا ہوں، اس شرمندگی کا معاوضہ طلب کر رہا ہوں جو مجھے اس کار کے پاس کھڑے ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ ادھر سے گزرنے والے بھی لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ میری کار ہے۔''

منڈی بہاؤالدین سے عمار احمد کاعذر

''اس سے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' میر صاحب نے کہا۔

''میں نے انہیں اپنا محسن کیوں کہا تھا؟'' میں نے سوال کے جواب میں سوال کیا اور میر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''آج میں جس مقام پر ہوں، وہاں تک پہنچانے میں دو شخصیات کا بڑا ہاتھ ہے۔ پہلے آپ ہیں میر صاحب اور دوسرے سر عنصر ہیں۔'' میں نے کہا۔

اچانک بابا بول پڑے۔ ''مجھے تو تم نے بالکل ہی فارغ کر دیا۔'' بابا نے کہا اور میری ہنسی میں میر صاحب بھی شامل ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی میر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عمران سے کہا۔ ''گاڑی نکالو اور گارڈز کو بھی ساتھ لے لو۔'' میر صاحب کے ساتھ بابا بھی اٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں عمران نے گاڑی ریڈی ہونے کی اطلاع دی اور بابا بھی میر صاحب کے ساتھ چل دیے۔ تاباں ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور پھر وہ ہوا جس کی مجھے توقع ہی نہیں تھی۔

''تم نے کہا کہ تمہاری غزلوں میں کوئی تصوراتی لڑکی

ہے مگر مجھے یہ کیوں محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے تصور میں میری ذات ہے؟'' تاباں نے کہا۔

''اگر ہے بھی تو میں اس کا اظہار نہیں کر پاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں اظہار کے لیے نہیں کہوں گی صرف اس بات کا جواب دے دو کہ کیا میرا یہ خیال درست ہے؟'' تاباں نے کہا تھا۔

''اگر میں ہاں کہوں تو آپ کے کس جذبے کی تسکین ہو گی اور اگر میں انکار کروں تو آپ کے کس جذبے کو ٹھیس پہنچے گی۔'' میں نے کہا تو تاباں کے چہرے پر ایک رنگ آ کر چلا گیا۔

''تم سے بہتر تو عمران ہے۔'' تاباں نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں کہ وہ ڈرائیور مجھ سے کیونکر بہتر ہے؟'' میں نے کہا تو تاباں کچھ دیر سوچتی رہی۔

''تمہیں یہ تو معلوم ہو چکا ہو گا کہ میرے باپ کی تمام زمین و جائداد میر صاحب کے کنٹرول میں ہے۔'' تاباں نے سوالیہ انداز میں کہا اور میں نے کوئی جواب دیے بغیر صرف گردن ہلا دی تھی۔

''تمہیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ میر صاحب مجھے لے کر میرے باپ کے گھر جاتے رہے ہیں۔'' تاباں نے کہا اور میں نے ایک بار پھر سے گردن ہلا دی۔

''وہیں پر ایک بار جب میر صاحب نہیں تھے، عمران نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنی سرکاری نوکری چھوڑ کر میر صاحب کے پاس اس لیے آ گیا ہے کہ اسے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔'' تاباں نے کہا۔

''اس کی اتنی جرأت؟'' میں نے سوال کیا۔

''اسے یہ جرأت اس لیے ہوئی جو اس نے خود بتایا کہ اس نے ہمارے بیڈ روم میں ایک سی سی ٹی وی کیمرا فکس کیا ہوا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے وہ یہ جان گیا تھا کہ میرے اور میر صاحب کے درمیان میاں بیوی والے تعلقات نہیں ہیں۔'' تاباں نے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ایسا ہی ہے۔'' تاباں نے کہا اور میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے سُن ہو گیا۔

''اب تو بتا دو میں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز تم پر کھول دیا ہے۔'' تاباں نے کہا۔

''آپ نے صحیح سمجھا ہے لیکن میں آپ کو حاصل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ یہ گندہ خیال کبھی میرے ذہن میں آیا ہے۔'' میں نے کہا اور جیسے ہی میرا فقرہ مکمل ہوا میر صاحب کی کار حویلی میں داخل ہوتی ہوئی نظر آئی جسے دیکھتے ہی تاباں آگے بڑھی تھی۔ اس نے میر صاحب کا استقبال کیا اور لگاوٹ سے باتیں کرتے ہوئے اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' بابا نے آتے ہی سوال کیا۔

''بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں تم بیرسٹر بننے کے بجائے سی ایس ایس کر لو اور ڈی ایم جی گروپ جوائن کر لو۔'' میں نے اصل بات چھپاتے ہوئے کہا۔

''بات تو صحیح کر رہی تھیں۔'' بابا نے تاباں کی حمایت کی تھی جبکہ اس پر ہماری بات ہی نہیں ہوئی تھی۔

''کمد ار صاحب تو فرجاد کو میٹرک کے بعد ہی نوکری پر لگوا رہے تھے۔'' میر صاحب نے کہا۔

☆☆☆

بی اے فائنل سے ..... کلاسوں سے پہلے میرا زیادہ وقت کتابوں میں گزرتا تھا۔ کچھ وقت میں اپنے پودوں اور کیاریوں کو دیتا تھا جو وقت بچ جاتا وہ شاعری میں صرف کر دیتا تھا۔

میرا کئی بار دل چاہا کہ سر عنصر سے مجموعوں کی اشاعت پر بات کروں لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں۔ اُس روز کے بعد جب تاباں سے بات ہوئی تھی حویلی بھی نہیں گیا۔ البتہ عمران سے میری روز ملاقات ہوتی تھی کیونکہ عمران روز ہی آ جاتا تھا کبھی کسی بہانے اور کبھی بابا سے ملنے کا کہہ کر۔ اس سے میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہ میر صاحب کا گارڈ بننے سے پہلے کس شہر میں تھا اور کس تھانے میں تھا۔ بی اے فائنل میں داخلہ لینے شہر آیا تو کالج میں داخلہ ہونے کے بعد میں نے ڈی آئی جی کو فون کیا۔ ''سر، فرجاد بول رہا ہوں۔ آپ سے کچھ کام پڑ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''دفتر آ جاؤ بیٹھ کر بات کر لیں گے۔'' ڈی آئی جی نے خوش دلی سے کہا تھا۔

میں اسی روز ڈی آئی جی کے دفتر گیا اور ان سے عمران کے بارے میں مزید معلوم کرنے کو کہا اور وہ ہنس دیے۔

''یہ بھی کوئی کام ہے۔ میں سمجھ رہا تھا تم باری شاہ کے بھائی کے بارے میں بات کرو گے۔''

''میرا اُس سے کیا تعلق؟'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا تھا۔

''تم شاید معلوم کرنا چاہو گے کہ میر صاحب نے باری شاہ کے نام پر کروڑ روپے لیے تھے، ان کا کیا ہوا؟''

''میرا اس سے بھی براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

اس دوران ڈی آئی جی صاحب کراچی میں اپنے ہم پیشہ لوگوں سے رابطے کرتے رہے تھے اور ساتھ ہی کاغذ پر کچھ لکھتے بھی رہے تھے۔ ''یہ عمران تو بہت بڑا مفرور ہے بھئی۔'' ڈی آئی جی نے میرے اٹھنے سے قبل کہا تھا۔ ''یہ تھانے میں نہیں تھا بلکہ کراچی کے ڈسٹرکٹ ویسٹ کے ایک وزیر کی موبائل کا ڈرائیور تھا۔''

''مفرور کیوں کہا تھا آپ نے؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ وزیر کی سالی کو بازار لے گیا تھا لیکن راستے میں اس کی نیت خراب ہوئی تو یہ ایک ویرانے میں اسے لے گیا جہاں اس کے دو دوست پہلے سے موجود تھے۔ ان تینوں نے اس کا گینگ ریپ کیا اور جب لڑکی نے کہا کہ وہ اپنے بہنوئی سے کہہ کر انہیں بند کروا دے گی تو انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ وہ دونوں ساتھی تو گرفتار ہوئے اور دونوں کو عمر قید ہوگئی۔''

''اس نے تو میر صاحب کو سرکاری خط دیا تھا جس میں یہ تحریر تھا کہ میر صاحب نے اپنی حفاظت کے لیے جو گارڈ مانگا تھا، وہ سرکار عمران کو بھیج رہی ہے۔''

''میرے خیال میں تو وہ خط جعلی ہوگا جو اس نے اپنے تعلقات استعمال کر کے یا رشوت دے کر حاصل کر لیا ہوگا۔ تم ایک دو دن انتظار کرو، میں خود کراچی جا کر اس معاملے کی تحقیقات کروں گا۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ عمران اتنا بڑا کرمنل بھی ہو سکتا ہے۔ دو دن بعد جب میں جمنازیم میں تھا تو ڈی آئی جی وہاں پہنچ گئے ان کے ساتھ ایک صاحب اور خاتون بھی تھے۔

''یہ ہیں فرحاد انہوں نے مجھے اس عمران کے بارے میں بتایا۔''

''بیٹا میں تمہاری احسان مند ہوں کہ تم نے میری معصوم بہن کے قاتل تک ہمیں پہنچایا۔'' خاتون نے کہا۔

ڈی آئی جی اور ان صاحب نے بہت ضد کی کہ میں ان کے ساتھ ملزم کو گرفتار کرنے چلوں لیکن میں نے ڈی آئی جی سے درخواست کی کہ میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔

''جہاں تک میرا عمل دخل ہے، وہاں سے تو میں نام غائب کر دوں گا لیکن اس کی گرفتاری پر پانچ لاکھ کا انعام کے دلاؤں گا؟''

''آپ ان کے کسی بچے کے نام پر بینک میں جمع کروا

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

دیں تاکہ اس کی تعلیم کا خرچ نکل آئے۔'' میں نے ڈی آئی جی سے کہا۔

''مرحومہ کی ایک ہی بیٹی ہے اسے شاید اگلے برس میڈیکل میں داخلہ مل جائے۔'' ڈی آئی جی نے کہا۔

''تو اسی کے نام بینک اکاؤنٹ کھلوا کر اس کے نام پر رکھوا دیں۔'' میں نے کہا اور ڈی آئی جی نے یوں گردن ہلائی جیسے وہ مجھ سے متفق ہوں۔ میں ان کے آفس سے نکل ہی رہا تھا کہ ڈی آئی جی نے آواز دی اور میں پلٹ آیا۔

''تم اس مجرم سے نہیں ملو گے؟'' ان کا سوال تھا۔

''آپ چاہیں تو ملوا دیں۔'' میں نے جواب دیا۔

ڈی آئی جی صاحب نے حوالات کھلوائی اور سپاہی سے کہا۔ ''اسے اس سے ملواؤ جس نے رات اپنے جرائم قبول کیے ہیں۔''

سپاہی مجھے لے کر حوالات میں آیا جہاں عمران کرسی سے اس طرح بندھا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ پولیس والوں نے جو تواضع کی تھی، اس کے بعد وہ صحیح طرح سے بولنے کے قابل بھی نہیں تھا۔

''کیسے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''دیکھ ہی رہے ہو کہ کیسا ہوں۔'' اس نے جواب میں کہا لیکن یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

''تم دیکھنا یہاں تو میں نے وہ کچھ مان لیا ہے جو پولیس نے کہا ہے لیکن عدالت میں صاف مکر جاؤں گا۔'' عمران نے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کیوں تھی۔ یقینی طور پر اس کے وکیل نے یہ سمجھایا ہوگا۔

میں قصبے میں واپس آیا اور سیدھا حویلی گیا جہاں میر صاحب نے بتایا کہ پولیس عمران کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ کچھ بتایا جو میں جانتا تھا۔

''بی اے کے بعد کیا ارادے ہیں؟'' میر صاحب نے سوال کیا۔

''میں بتا چکا ہوں۔'' میں نے میر صاحب کو یاد دلایا۔

''کہاں اپلائی کیا ہے؟'' انہوں نے دوسرا سوال کیا۔

''اسی کالج میں جہاں سے قائداعظم نے تعلیم حاصل کی تھی۔''

''کوئی جواب آیا؟'' اس بار اس حسینہ نے سوال کیا تھا جو میر صاحب کی بیوی اور میری محبوبہ تھی۔

''کون سا کالج ہے جو ٹاپ کرنے والے کو انکار کرے گا۔'' میر صاحب نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے بیگم صاحبہ کہ میں نے آپ کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔'' میں نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔

''عورت کی بات پر کبھی عمل نہ کرنا، یہ کم عقل ہوتی ہیں اور الٹے مشورہ دیتی ہیں۔'' میر صاحب نے کہا اور اپنی بات پر خود ہی ہنس دیے تھے..... میں اور تاباں دونوں میں سے کسی نے اس ہنسی میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔

''صبح میں برٹش قونصل خانے فون کر دوں گا لیکن ویزے کے لیے تمہیں اسلام آباد جانا ہوگا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے میر صاحب۔''

ایک ہفتے بعد میرا بی اے کا رزلٹ آ گیا۔ توقع کے مطابق میری پہلی پوزیشن آئی تھی اور میں نے لنکنزان میں اپلائی کر دیا تھا۔ میں مبارک باد وصول کرنے حویلی گیا لیکن وہاں میر صاحب سے پہلے تاباں سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے ایک پرچہ میری جانب بڑھا دیا۔ یہ میرے لنکنزان میں داخلے کا لیٹر تھا۔

''یہ کب آیا؟'' میں نے تاباں سے سوال کیا۔

''تمہاری آمد سے پانچ منٹ پہلے یہ میں نے ڈاؤن لوڈ کیا ہے۔'' تاباں نے کہا۔

''میر صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہارے بابا کو لے کر زمینوں پر گئے ہیں۔''

''آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ اکیلی ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''اکیلی نہیں ہوں، ملازم موجود ہیں۔'' تاباں نے کہا پھر بولی۔ ''تم اکیلے میں ملنا چاہتے ہو؟''

''شاید ہاں..... شاید نہیں۔'' میں نے جواب میں کہا اور تاباں کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔

''میں سمجھی نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' تاباں نے کہا۔

''صاف صاف کہو۔'' اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

''صاف بات یہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہیں گلے لگا کر پیار کروں لیکن تم میر صاحب کی بیوی ہو اور میر صاحب کو میرے دل کا حال معلوم ہوا تو وہ مجھے چھوڑیں گے نہیں اس لیے دماغ یہ کہتا ہے کہ میں اس سے گریز کروں۔'' میں نے کہا۔

''میں اُن کی ایسی بیوی ہوں جسے انہوں نے آج تک چھوا بھی نہیں۔ ہمارے درمیان میاں بیوی والا رشتہ بالکل بھی نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے تاباں کی آنکھوں سے دو آنسو نکل

پڑے۔ مجھے اس کی حالت پر..... ترس بھی آیا لیکن میں کچھ بھی کر نہیں سکتا تھا۔

ابھی ہم یہیں تک پہنچے تھے کہ میر صاحب کی گاڑی حویلی کے گیٹ سے آتی ہوئی نظر آئی تھی۔

''تمہارا پرسوں کا ٹکٹ ہو گیا ہے۔'' میر صاحب نے ہمارے قریب آتے ہوئے کہا تھا۔ ''صبح دس بجے کی فلائٹ ہے تم کراچی جاؤ گے اور وہاں سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گے جہاں پرسوں تمہارا انٹرویو ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔

''کوئی ڈائریکٹ فلائٹ نہیں تھی؟'' تاباں نے سوال کیا۔

''ہفتے میں دو فلائٹس ہیں ڈائریکٹ اور قریب ترین فلائٹ بھی پرسوں کی تھی اس لیے میں نے یہی بہتر سمجھا۔'' میر صاحب نے کہا۔

''اسلام آباد میں کہاں رہوں گا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرے دوست ہیں وہاں مختار صاحب وہ خود یا اُن کا ملازم تمہیں ائرپورٹ سے لے لیں گے اور تم رات وہاں قیام کرنا اور وہی تمہیں برطانیہ کے قونصل خانے لے جائیں گے۔'' میر صاحب نے کہا اور میں مطمئن سا ہو گیا تھا۔

دس بجے کی فلائٹ کے لیے میں صبح سات بجے گھر سے نکلا تھا۔ تاباں ڈرائیو کر رہی تھی لیکن پچھلی سیٹ پر میر صاحب کا گارڈ موجود تھا۔ اس لیے ہمارے درمیان کوئی زیادہ بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ تاباں نے کہا کہ ''لندن میں تمہاری رہائش کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ ملیحہ میرے ساتھ کالج میں تھی مگر اب لندن میں ہے امید ہے تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اس کے والد کی وہاں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے، ان کے گیسٹ روم میں تمہارا قیام ہو گا۔''

تاباں کہتی رہی اور میں سنتا رہا۔ میرے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ جو کہنا چاہتا تھا وہ گارڈ کی موجودگی میں کہنا ممکن نہیں تھا۔

ہم ائرپورٹ پہنچے اور میں نے بورڈنگ کارڈ لیا اور جہاز میں سوار ہو گیا۔ میرا وہ پہلا ہوائی سفر تھا لیکن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ائرہوسٹس بہت اچھی تھی۔ دس بجے کی فلائٹ پندرہ منٹ دیر سے چلی تھی۔ میری پریشانی یہ تھی کہ کراچی سے فلائٹ ایک بجے کی تھی۔ میں سوا بارہ بجے کراچی ائرپورٹ پر تھا۔ میں ائرپورٹ سے باہر نہیں نکلا اور دوبارہ سے بورڈنگ کارڈ لیا اور اسلام آباد والے جہاز میں سوار ہو گیا۔

اسلام آباد ائرپورٹ پر نہ میر صاحب کے دوست آئے

مایوسی تو گناہ ہے

صرف بے اولاد

گھرانے متوجہ ہوں۔

انسان کو کسی بھی صورت رب تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ اکثر گھرانوں میں صرف اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اُداسی، پریشانی، ہر وقت کے گھریلو جھگڑے اور پھر علیحدگی تک بات پہنچ جاتی ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں انشاء اللہ آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں ہم نے کستوری عنبر و دیگر ہربلز سے ایک ایسا خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے کہ جس کے استعمال سے انشاء اللہ آپ کے ہاں بھی ایک صحت مند خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آپ آج ہی فون کریں اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوالیں۔

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

ضلع حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

نہ اُن کا ملازم بلکہ اُن کی صاحب زادی آئی تھیں۔ وہ دُبلی پتلی لیکن قدرے طویل قامت لڑکی تھی۔ میری تصویر میر صاحب نے اپنے دوست کو واٹس ایپ کو دی تھی اس لیے اسے پہچاننے میں تکلیف نہیں ہوئی تھی۔

''تم تو اپنی تصویر سے بہت زیادہ ہینڈسم ہو۔'' ہم ائرپورٹ سے نکل رہے تھے تو اس نے کہا۔

''کیا مجھے شکریہ کہنا چاہیے۔'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''نہ بھی کہو تو فرق نہیں پڑتا بس پہلا فقرہ جو تمہیں دیکھتے ہی میرے ذہن میں آیا تھا، وہ میں نے کہہ دیا۔'' اس نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔

''آپ کو کس نام سے مخاطب کیا جائے؟'' کار ائرپورٹ سے نکل رہی تھی تو میں نے سوال کیا۔

''میں شمع ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تھا۔

اس کا نام شمع تھا لیکن نام کی حد تک ہی وہ شمع تھی۔ ایسی شمع جس کا کوئی پروانہ نہیں تھا۔

''مجھ سے کہا گیا تھا کہ آپ کے والد خود آئیں گے یا ان کا ملازم مجھے لینے ائرپورٹ آئیں گے۔'' کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس خاموشی کو توڑا۔

''پاپا ضرور آتے لیکن انہیں لاہور طلب کر لیا گیا اور وہ ڈرائیور کو لے کر چلے گئے اور مجھ سے کہا کہ میں آپ کو ائرپورٹ سے لے لوں حالانکہ مجھے شام میں پارٹی میں جانا تھا۔''

''تب تو میری آمد آپ کے لیے زحمت کا باعث بنی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، پارٹی تو رات نو بجے ہے تب تک میں آپ کو گھر چھوڑ کر بھی جا سکتی ہوں بلکہ آپ چلنا چاہیں تو آپ بھی چلیں۔'' شمع نے دعوت دیتے ہوئے کہا۔

''ہم دیہاتی لوگ ہیں۔ نو بجے تک تو ہماری آدھی رات ہو جاتی ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''حلیے سے تو دیہاتی نظر نہیں آ رہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ ڈریس تو بیگم صاحبہ نے میرے لیے خریدا تھا دو روز قبل اور انہوں نے ہی مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ پینٹ کیسے پہنتے ہیں۔'' میں نے وہی کہا جو حقیقت تھی لیکن شمع کے چہرے سے ظاہر ہوا جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔

''لندن میں تو آپ کو یہی پہننا ہو گا۔'' شمع نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں بغیر کچھ کہے خاموش رہا۔

''پینٹ قمیص تو الگ بات ہے۔ آپ کی انگریزی بھی بہت بہتر ہے۔'' شمع کا انداز ستائشی تھا۔

''میں نے پورے ڈویژن میں ٹاپ کیا ہے بی اے میں۔'' میں نے کہا اور شمع نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اُسے یقین ہی نہ آیا ہو۔

اسی طرح کی گفتگو کرتے ہوئے ہم اس بنگلے تک پہنچے تھے جو ہماری منزل تھی۔ وہ کار اندر لے آئی اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا پھر ایک کمرے کے باہر وہ رکی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

''یہ ہے آپ کا کمرا جو ہے تو میرے بھائی کا لیکن دس سال پہلے وہ امریکا ایسے گیا کہ والدہ کی موت پر بھی نہیں آیا۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے تو اس کمرے میں ضرورت کی ہر چیز ہے لیکن پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بیل ہے، اسے بجا دیں ملازم آ جائے گا ورنہ یہ سامنے والا کمرا میرا ہے اور میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔'' اس نے عجیب پُراسرار لہجے میں کہا۔ اس کے انداز سے مجھے اچانک تاباں یاد آ گئی۔ ڈبل بیڈ پر ڈھیر ہونے سے پہلے میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھے ٹی وی ریموٹ کو دیکھ لیا تھا۔

''تو آپ نے پارٹی میں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' شمع یہ کہتے ہوئے کمرے سے چلی گئی اور میں ٹی وی دیکھتے ہوئے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ ابھی میں نیند کی وادیوں میں اترا ہی رہا تھا کہ شمع ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو میں چوکنا ہو گیا۔

یہ شمع اُس شمع سے بہت مختلف تھی جس نے مجھے ائرپورٹ پر ریسیو کیا تھا۔ ائرپورٹ پر وہ روایتی شلوار قمیص میں تھی مگر اب اسکرٹ اور بغیر آستینوں کی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اسکرٹ میں سے اس کی لمبی ٹانگیں نمایاں تھیں۔ اس طرح بغیر آستینوں کی ٹی شرٹ میں سے اس کی سانولی بانہیں عجیب سی دکھائی دے رہی تھیں۔ کالی اسکرٹ اور سرخ ٹی شرٹ اس پر کچھ زیادہ سج نہیں رہی تھی۔

''تو آپ واقعی پارٹی میں نہیں چلیں گے؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں اتنی جلدی اپنے فیصلے تبدیل نہیں کرتا۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اگر چلتے تو بہت مزہ آتا۔'' شمع نے اصرار کیا۔ ''وہاں

کافی لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ ہوں گی۔'' شمع نے جاتے جاتے لالچ دیا۔

''آپ جائیں اور مزے کریں۔'' میں نے کہا اور وہ بغیر کچھ کہے چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی میں ایک بار پھر تاباں کے خیالوں میں کھو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کس وقت نیند نے حملہ شروع کیا اور میں نیند کی وادیوں میں قدم بڑھانے لگا تھا مگر خوابوں میں بھی تاباں ہی تھی۔ ات کے چار بج رہے تھے جب کار کے ہارن سے آنکھ کھل گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے مقابل والے کمرے سے آوازیں آنے لگیں۔ ایک آواز تو شمع کی تھی لیکن دوسری آواز کسی مرد کی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا جو چار بجا چکی تھی۔ 'تو یہ شمع بغیر پروانے کے نہیں ہے۔' میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی تھی۔

صبح کے اس وقت نو بج رہے تھے جب ملازم نے مجھے اٹھایا۔ ''صاحب لاہور سے آگئے ہیں اور آپ کو ناشتے کی میز پر بلا رہے ہیں۔'' ملازم نے کہا۔

''تم چلو میں فریش ہو کر آرہا ہوں۔'' میں نے کہا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

میں نے زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ ناشتے کی میز پر شمع بھی موجود تھی۔ میں رات پارٹی سے واپس آئی تو آپ سو رہے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے کمرے میں آگئی۔'' شمع نے کہا۔

''کب آگئی تھیں پارٹی سے واپس۔'' شمع کے ڈیڈی نے سوال کیا۔

''میں بارہ بجے تک واپس آگئی تھی۔'' شمع نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''پھر تو شارٹ پارٹی ہوئی ورنہ تو تمہاری واپسی تین بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔'' شمع کے ڈیڈی نے کہا۔ بلاشبہ والدین اپنے بچوں کو بہتر جانتے ہیں۔

''کس وقت جانا ہے قونصل خانے؟'' میں نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''ایک بجے کا وقت دیا ہے انہوں نے۔'' شمع کے ڈیڈی نے کہا۔ ''میرے پاس تمہارے لیے ایک آفر ہے۔'' انہوں نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ آفر کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''آفر تو ایسی ہے کہ عام حالات میں تم انکار نہ کرتے مگر چونکہ تمہیں دو دن میں کراچی پہنچنا ہے جہاں سے تمہیں لندن جانا ہوگا تو شاید تم قبول نہ کرو۔'' انہوں نے آفر بتانے کے بجائے اپنی رائے دے دی۔

''ڈیڈی انہیں آفر تو بتائیں۔'' شمع نے باپ کی غلطی کی نشاندہی کی۔

''میں انہیں اپنے اگلے ایڈ میں ماڈل لینا چاہتا ہوں۔'' شمع کے ڈیڈی نے کہا۔ ''اس طرح تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی ماڈلنگ کی۔'' انہوں نے فقرہ مکمل کیا۔

''فرجادر رک جاؤ نا پندرہ روز۔'' شمع نے اس بار مجھے مخاطب کیا۔

''واپسی پر دیکھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''تمہاری واپسی تو چار برس بعد ہوگی۔'' شمع نے کہا۔

''اڑتالیس ماہ یوں آنکھ جھپکتے گزر جائیں گے۔'' میں نے اپنی طرف سے موضوع ختم کر دیا تھا۔

گیارہ بجے ہم گھر سے نکلے اور اگلے دس منٹ میں ہم برطانیہ کے قونصل خانے پہنچ گئے تھے۔ ایک بجے انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور ایک بج کر پانچ پر میں اسٹوڈنٹ ویزا مل گیا۔ واپسی پر میں نے سوال کیا۔ ''آج شام کی فلائٹ نہیں مل سکتی اور وہ ہنس دیے۔

''لگتا ہے تمہیں اسلام آباد پسند نہیں آیا۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' میں نے بات بنائی۔ ''مجھے ہفتے بعد سیمسٹر اٹینڈ کرنا ہے۔'' میں نے کہا اور انہوں نے موبائل پر کسی سے رابطہ کیا۔

''کراچی کی فلائٹ ہے رات گیارہ بجے کی۔'' انہوں نے کہا۔

''اس کے بعد؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''صبح پانچ بجے تمہارے علاقے کی فلائٹ مل سکتی ہے۔'' انہوں نے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے سات بجے تک گھر پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور انہوں نے موبائل پر او کے کر دیا۔

صبح ائرپورٹ چھوڑنے شمع کے ڈیڈی خود گئے تھے۔ کراچی پہنچ کر میں نے چار گھنٹے فلائٹ کا انتظار کیا اور جب میں اپنے ائرپورٹ پر اترا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میر صاحب خود مجھے لینے آئے تھے۔

''کیا فرق پڑ جاتا اگر تم دو تین روز وہیں رک جاتے؟'' انہوں نے ائرپورٹ سے کار نکالتے ہوئے کہا۔

''پورے ہفتے بعد میری کلاسیں شروع ہونے والی ہیں۔'' میں نے وہی بہانہ کیا جو اسلام آباد میں کیا تھا۔

''انٹرویو میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟'' میر صاحب نے

سوال کیا۔

''پانچ منٹ میں انہوں نے اسٹوڈنٹ ویزا دے دیا۔'' میں نے کہا۔

''ہمارا بچہ ہے ہی اتنا قابل۔'' میر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آٹھ بجے مجھے میر صاحب میرے گھر پر اتار کر چلے گئے۔ بابا اور اماں دونوں مجھے وہاں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر اماں نے ناشتا بنایا اور ہم تینوں نے ساتھ ناشتا کیا۔ ہم ناشتا کر ہی رہے تھے کہ تاباں آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ گارڈ تھا پھر وہ بھی ناشتے میں شریک ہوگئی۔ بابا کام پر نکل گئے اور اماں باورچی خانے کی طرف چلی گئیں تو میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا مگر تاباں میرے پیچھے آ گئی۔ موقع اچھا تھا۔ اس سے بہتر موقع مل نہیں سکتا تھا۔ اماں کے برتنوں کی تعداد میں نے دیکھ لی تھی اور بابا کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اپنی بانہیں کھولیں تو تاباں اس میں سما گئی اور میں نے اسے بھینچ لیا۔

''فرجاد یہ لمحے مجھے چار سال زندہ رکھیں گے اور میں تمہاری واپسی کا انتظار آسانی سے کرلوں گی۔'' تاباں نے سرگوشی کی۔

''لندن میں تمہارے جسم کا یہ لمس مجھے یاد رہے گا اور وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ ہم کچھ اور دیر ایک دوجے میں کھوئے رہتے کہ باہر سے میر صاحب کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ تاباں ایک جھٹکے سے مجھ سے دور ہوئی اور باورچی خانے میں اماں کے پاس چلی گئی۔

''تم نے مجھے پاسپورٹ تو دیا نہیں جس پر ویزا لگا ہے۔'' میر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''وہ ٹریولنگ ایجنٹ کو میں نے فون کیا تو اس نے کہا کہ ویزے کی کاپی چاہیے تو میں یہاں چلا آیا۔'' میر صاحب نے کہا۔

میں نے اٹیچی میں سے پاسپورٹ نکال کر انہیں دے دیا۔

''میر صاحب! لندن کے ٹکٹ کے پیسے میں دوں گا۔'' میں نے کہا اور میر صاحب ہنس دیے۔

''بڑا آیا ہے ٹکٹ کے پیسے دینے والا۔'' میر صاحب نے کہا اور پھر ہنستے ہوئے چلے گئے۔

جاتے ہوئے وہ تاباں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

شام میں جب میں حویلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ میر صاحب نے اپنے اور تاباں کے ساتھ ابا اور اماں کے بھی کراچی کے ٹکٹ لیے ہیں۔ ''کل ہم کراچی جائیں گے اور پرسوں تم لندن جاؤ گے۔'' میر صاحب نے تمام ٹکٹ میری جانب بڑھا دیے تھے۔

''ایک روز ہم کراچی میں کہاں رہیں گے؟'' میں نے اٹھتے ہوئے سوال کیا۔

''کراچی میں ہوٹل بہت ہیں۔ کسی نہ کسی ہوٹل میں جگہ تو مل جائے گی۔''

ہم ائرپورٹ پہنچے تو ابا اور اماں کے علاوہ تاباں بھی قافلے میں شامل تھی۔

کراچی ائرپورٹ پہنچے تو میریٹ ہوٹل کی گاڑی ہمیں لینے آئی ہوئی تھی۔ ہوٹل پہنچے تو میر صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر بکنگ کے بارے میں بتایا تھا۔ وہاں تین کمرے بک تھے ایک میں اماں اور ابا چلے گئے دوسرے میں میر صاحب اور تاباں جبکہ تیسرے کمرے میں اکیلا میں تھا۔ ابھی بارہ بھی نہیں بجے تھے کہ تاباں میرے کمرے میں آ گئی۔

''کیا میر صاحب سو گئے؟'' میں نے اُسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

وہ رات سونے سے پہلے دودھ کے عادی ہیں مگر آج وہ نیند کی دو گولیوں کے اثر میں ہیں صبح تک کی خبر لائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور میرے سینے سے لگ گئی۔

''فرجاد مجھے اس جہنم سے نکالو۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

''کچھ دن اور برداشت کرلو۔'' میں نے اسے بھینچتے ہوئے کہا۔

''فرجاد کیا وقت یہیں پر تھم نہیں سکتا؟'' اس نے میرے کان کے پاس سرگوشی کی۔

''وقت تھم گیا تو بیرسٹر بننے کا خواب بھی ادھورا رہ جائے گا۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''میں تمہاری ملیحہ سے بات کروا دوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ملیحہ کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو ہوئی تو میں نے ملیحہ کی آواز سنی۔ ''کب آ رہے ہیں ہمارے مہمان؟'' اس نے سوال کیا۔

''پرسوں صبح سات بجے یہاں کے وقت کے مطابق فلائٹ چلے گی۔''

''مجھے فلائٹ نمبر بتا دو۔'' یہ سنتے ہی تاباں نے موبائل میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے جیب سے ٹکٹ نکالا اور اسے ائرلائن اور فلائٹ نمبر بتا دیا۔

''یہ فلائٹ تو شام تک بیتھرو پر اترے گی۔'' ملیحہ نے کہا۔

''اتنی دیر سے؟'' میں نے کہا۔

''ٹکٹ پر دیکھو دو گھنٹے ابوظہبی میں رکنا ہے۔'' ملیحہ نے کہا اور میں نے ٹکٹ پر دیکھا تو وہ صحیح کہہ رہی تھی۔

ہم صبح تک باتیں کرتے رہے تھے۔ تاباں اپنے دکھ بتاتی رہی اور میں اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اچھے دن آنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں نے اس سے کہا اور یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ تاباں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ فجر کی اذانیں ہونی شروع ہوئیں تو تاباں مجھے چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ صبح میر صاحب اس وقت میرے کمرے میں آئے تھے جب میں فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔

''چلو آج میں تم سب کو کراچی کا ناشتا کرواتا ہوں۔'' میر صاحب نے کہا۔

''مگر میر صاحب ہوٹل میں ناشتا تو فری ہے۔'' میں نے کہا۔

''جو ناشتا میں کرواؤں گا وہ ان فائیو اسٹار ہوٹل والوں کا باپ بھی نہیں بنا سکتا۔'' میر صاحب نے کہا اور کمرے سے چلے گئے پھر کچھ دیر بعد میرے موبائل پر ان کی کال آگئی۔ ''میں نیچے پارکنگ میں موجود ہوں، چاروں جلدی سے آجاؤ۔'' میر صاحب نے کہا۔ میر صاحب رینٹ کی کار کے ساتھ پارکنگ میں موجود تھے۔ میں پسنجر سیٹ پر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابا، اماں اور تاباں پچھلی سیٹ پر تھے۔ میں پہلی بار کراچی آیا تھا۔

میر صاحب ہمیں لے کر صابر ہوٹل والی گلی میں گئے اور صابر ہوٹل کے ساتھ کے فیملی روم میں جاتے ہی انہوں نے .... نہاری اور حلوہ پوریوں کا آرڈر دیا۔ میں نے اپنا زور نہاری اور روٹی پر رکھا جبکہ ان چاروں نے اپنا زور حلوہ پوری پر رکھا تھا۔ ناشتے سے واپسی پر ہم دوبارہ ہوٹل میں اپنے اپنے کمروں میں آگئے۔ رات میں جب سب سونے کے لیے جا رہے تھے تو میر صاحب پھر میرے پاس آئے اور میری جیب میں ڈالر ٹھونس کر چلے گئے..... میں کہتا رہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے مگر میر صاحب نے ہنسی میں میری بات اڑا دی تھی۔ ''ہفتے بعد تو تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اپنا خرچ خود اٹھا لو گے لیکن پہلے ہفتے کا خرچ تو لے لو۔'' میر صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔

دوپہر میں ہم نے برنس روڈ پر کھانا کھایا اور رات میں اسٹوڈنٹ بریانی کھائی تھی۔

وقت ہوتا تو میں تم سب کو سمندر بھی دکھا دیتا لیکن صبح سات بجے کی فلائٹ ہے اور پانچ بجے تک ائرپورٹ پہنچنا ہے۔''

شام میں تاباں اور میر صاحب نے مجھے صدر سے ڈھیروں شاپنگ کروائی۔ صدر سے انہوں نے نئی اٹیچی بھی خریدی تھی جس میں تالا نمبروں سے کھلتا تھا پھر تین بجے کے قریب ہم سب سو گئے لیکن فجر کی اذانوں کے ساتھ اٹھ گئے۔ مجھے ائرپورٹ چھوڑنے وہ تمام لوگ آئے تھے۔ لندن تک کا سفر آرام سے کٹ گیا۔ میرے پاس بزنس کلاس کا ٹکٹ تھا اور میں اکیلا مسافر اس کلاس میں تھا۔ جہاز نے اڑان بھری تو ائرہوسٹس نے اجازت لے کر میرے ساتھ کی کرسی پر ایک لڑکی کو بٹھا دیا۔ ''آپ کی شکل کچھ جانی پہچانی ہے۔'' میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھے ٹی وی پر دیکھا ہوگا، میں ٹی وی ایکٹریس ہوں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''اور آپ کا نام؟'' اس نے سوال کیا۔

''میں فرجاد ہوں اور بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے لندن جا رہا ہوں۔''

''آپ شاعر بھی ہیں نا؟'' اس نے سوال کیا۔

''شاعری بھی میرا ایک شوق ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے دونوں مجموعے میں نے خریدے ہیں بلکہ اب بھی میرے ہینڈ بیگ میں ہوں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور اپنا ہینڈ بیگ لے آئی اور اسے کھول کر میرے مجموعۂ کلام نکالے۔

''اس پر کچھ لکھ دیں تو میری عزت افزائی ہوگی۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے غزلوں کا مجموعہ ''لبِ دریا'' میری جانب بڑھا دیا۔

''خاص اس کے لیے جس نے پہلی ملاقات میں مجھے متاثر کیا۔'' میں نے لکھ دیا۔

ہم ابوظہبی ائرپورٹ پر اترے تو وہ میرے ساتھ ہی تھی۔

''ویسے تم کہاں جا رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''لندن میں ایک شوٹ ہے۔ اس کے بعد ہوسٹن میں ایک شو ہے اور پھر واپس۔'' اس نے جواب دیا تھا۔

''اتنی مصروفیات میں گھر کو کتنا وقت دیتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے ابھی شادی نہیں کی۔'' اس نے جواب دیا۔

''کوئی خاص وجہ؟'' میں نے فری ہونے والے انداز

میں کہا۔

''اب تک کوئی ایسا ملا ہی نہیں اور جب ملا ہے تو وہ شاعری میں مگن ہے۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے مگر انجان بنا رہا۔

ہم ہیتھرو پر اترے تو ملیحہ خود لینے آئی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف آرہی تھی کہ اس ایکٹریس نے اسے درمیان سے اُچک لیا۔ ''ملیحہ مائی لور۔'' اس نے ملیحہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''منظور صاحب نے تمہیں بھیجا ہے مجھے لینے۔'' ایکٹریس نے کہا۔

''مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ تم بھی اس فلائٹ سے آرہی ہو۔ میں تو فرجاد کو لینے آئی ہوں۔'' ملیحہ یہ کہتے ہوئے میری طرف آگئی۔

''تو تم بھی فرجاد کی فین ہو۔'' ایکٹریس نے سوال کیا۔

''میں نہیں، میرے والدان کے فین ہیں۔'' ملیحہ نے فوری جواب دیا۔

''خدا کا شکر ہے کہ میں وقت پر آگیا اور یہ بھی کہ تم دیے ہوئے وقت پر آگئیں ورنہ میرا بڑا نقصان ہوجاتا۔''

''ڈیڈی، یہ فرجاد ہیں۔'' ملیحہ نے اس شخص کو مخاطب کیا۔

''وہ فرجاد جسے تاباں نے ہمارے گھر رہنے کے لیے بھیجا ہے۔'' ملیحہ کے ڈیڈی نے کہا۔

''جی وہی فرجاد جس کی کتابیں آپ کی لائبریری میں موجود ہیں۔''

''مجھے اس پر حیرت نہیں ہے کہ یہ اتنی جواں عمری میں ایسے شعر کہتے ہیں۔ حیرت اس پر ہے کہ اتنا خوبرو جوان ہوکر یہ شاعری کرتا ہے۔'' ملیحہ کے والد نے میری تعریف کی تھی اور میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا تھا۔

''تم نے ان کا کمرا تو سیٹ کردیا تھا نا؟'' ادھیڑ عمر شخص نے سوال کیا تھا۔

''میں نے انیکسی کی کل ہی صفائی کروادی تھی اور تاباں نے جو کچھ بتایا تھا وہ سب وہاں رکھوادیا ہے۔''

''مثلاً تاباں نے کیا بتایا تھا میری ضرورت کے بارے میں؟'' میں نے سوال کیا اور ملیحہ مسکرانے لگی۔

''تاباں کی ہدایت کے مطابق میں نے جائے نماز اور تسبیح تو رکھی ہی ہے ساتھ میں اپنی ٹریڈمل وہاں شفٹ کردی ہے کیونکہ تاباں نے کہا تھا کہ آپ ورزش کے بہت شوقین ہیں۔''

''تمہارے لیے میں نے تمہارے پسندیدہ ہوٹل میں بکنگ کروادی ہے۔'' منظور صاحب نے ایکٹریس سے کہا۔

''آپ کے گھر میں مجھے جگہ نہیں مل سکتی؟'' ایکٹریس نے بڑے ناز سے کہا۔

''فرجاد تو چار برس اس گھر میں قیام کریں گے آپ چاہیں تو انیکسی ان کے ساتھ شیئر کرلیں۔'' ملیحہ نے جواب دیا۔

''انیکسی گراؤنڈ پلس ون ہے۔ اوپر بیڈروم ہے اور نیچے سٹنگ روم ہے۔'' ملیحہ کے والد نے وضاحت کی۔

''اس سے تو بہتر ہے کہ میں ہوٹل میں ہی قیام کروں۔'' ایکٹریس نے کہا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

ہم ہیتھرو سے ملیحہ کے گھر کی جانب روانہ ہوئے جو شہر کے نواح میں تھا۔ ہم پینتالیس منٹ میں وہاں پہنچے جہاں مجھے قیام کرنا تھا۔

ملیحہ نے مجھے پوری انیکسی دکھادی تھی۔

''کل صبح ہم آپ کے کالج جائیں گے کیونکہ دو روز بعد آپ کی کلاس شروع ہونے والی ہے۔''

''تو آپ نے تمام معلومات جمع کر رکھی ہیں۔'' میں نے کہا اور ملیحہ مسکرادی۔

''آپ کا داخلہ بھی میری کوششوں سے ہوا تھا۔'' ملیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم انیکسی کے بیڈروم سے نیچے آئے تو ملیحہ کے والد کار پارک کررہے تھے۔

''عجیب بے ہودہ عورت ہے۔'' ہمارے قریب آتے ہی منظور صاحب نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

''آپ کس کا ذکر کررہے ہیں؟'' ملیحہ نے باپ سے سوال کیا۔

''اسی کا جس نے پہلے اشتہار میں کام کرنے کی ہامی بھری تھی اب شرطیں لگا رہی ہے۔'' منظور صاحب کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔

''کیسی شرطیں؟'' میں نے سوال کردیا۔

''وہ کہتی ہے کہ یا تو میرا معاوضہ دگنا کریں یا فرجاد کو میرے ساتھ اشتہار میں لیں۔'' منظور صاحب نے کہا۔

''یہ تو معاہدے سے مکرنے والی بات ہے۔ آپ نے اس سے کہا نہیں کہ آپ اس پر ہرجانے کا کیس بھی کرسکتے ہیں۔'' ملیحہ نے کہا۔

''وہ ایسی ہی ہے۔ اگر ایسی نہ ہوتی تو تجھ کو شوہر کے حوالے کرکے خلع نہ لیتی۔'' منظور صاحب نے کہا۔

''مگر اس نے تو کہا تھا کہ اسے آج تک کوئی شخص اس کے معیار کا ملا نہیں، اس لیے شادی نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''بکواس کرتی ہے۔'' منظور صاحب بولے۔ ''پہلے کورٹ میرج کی اور ماں باپ کی ناراضگی مول لی پھر اس سے بھی خلع لے لیا اور بچے کو بھی چھوڑ دیا۔'' منظور صاحب بولے جارہے تھے۔

''آپ نے کیا جواب دیا؟'' ملیحہ نے پوچھا۔

''میں نے کہا ہے کہ فرجاد میرے اشتہار میں کام کرتا ہے یا نہیں، یہ اس کا فیصلہ ہوگا۔ معاوضہ دگنا کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں کیونکہ اس طرح میرا بجٹ آؤٹ ہو جائے گا اور مجھے ہزاروں یورو کا نقصان ہوگا۔'' منظور صاحب نے کہا۔

''اگر میں اشتہار میں کام کرنے پر تیار ہو جاؤں؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔'' منظور صاحب کے لہجے میں احسان مندی تھی۔

''کب سے شوٹنگ شروع ہوگی؟'' ملیحہ نے سوال کیا۔

''پرسوں سے شیڈول ہے۔'' منظور صاحب نے کہا۔

''کل مین کالج جاؤں گا اور پرسوں آپ کی شوٹنگ پر پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے منظوری دی۔

''تم نے مجھے ایک بڑی تباہی سے بچالیا ہے۔'' منظور صاحب نے کہا۔

''تو کل آپ مجھے کالج لے جارہی ہیں۔'' میں نے ملیحہ سے کہا۔

''اب تو لے جانا ہی پڑے گا۔'' ملیحہ نے کہا۔ ''یوں بھی تمہارا لندن میں پہلا دن ہے، کہاں بھٹکتے پھرو گے۔'' ملیحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر ویسا ہی ہوا جیسا کہ طے ہوا تھا۔ ہم کالج سے واپس آئے تو بیڈ کے سرہانے میری اور تاباں کی سیلفی ایک فریم میں موجود تھی۔

''یہ کہاں سے آئی؟'' میں نے سوال کیا اور ملیحہ مسکرادی تھی۔ ''یہ تاباں نے اپنے کمپیوٹر پر بھیجی تھی۔''

''یہ تو وہ تصویر ہے جب میں اور تاباں کمرے میں تھے اور تاباں نے سیلفی کھینچی تھی۔'' میں نے کہا تو ملیحہ مسکرانے لگی۔

''تاباں پوری تفصیل مجھے بتا چکی ہے۔'' ملیحہ نے کہا۔

اگلے روز سے شوٹنگ شروع ہوئی اور دو دن تک چلی۔

ماڈلنگ میں ڈائیلاگ نہیں ہوتے لیکن منظور صاحب کی اشتہاری فلم میں ایسا نہیں تھا۔ ایک ڈائیلاگ مجھے بولنا تھا اور ایک اُسے۔ میں نے تو پہلے ٹیک میں او کے کروالیا لیکن تجربہ کار ہونے کے باوجود اُس نے متعدد ری ٹیک کروائے۔ ہم دونوں کے مکالمے عشقیہ تھے۔ میں نے تو تاباں کا تصور کیا اور ٹیک او کے ہوگیا اور پوری ٹیم نے خوب داد دی۔

اس رات جب ہم ڈنر پر تھے تو ملیحہ نے اطلاع دی کہ اس نے تاباں کو اشتہاری فلم بھیج دی ہے۔

''یہ کیا غضب کردیا۔'' میں نے کہا اور ملیحہ ہنس دی۔

''آج رات وہ آپ کو فون کرے گی۔'' ملیحہ نے کہا۔

پھر رات میں دیر تک جاگتا رہا مگر اس کا فون نہیں آیا پھر رات گئے فون آیا تو پہلا فقرہ اتنا خطرناک تھا کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔

''لندن پہنچتے ہی یہ کیا شروع کردیا؟'' تاباں نے کہا اور جواب میں مجھے پوری تفصیل بتانی پڑی۔

''اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔'' تاباں نے اپنی ناراضگی ختم ہونے کا اشارہ دیا۔

''اتنی دیر سے فون کیوں کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''میر صاحب کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اب فجر کی اذانیں ہوئیں تو میں نماز کے بہانے باہر آئی ہوں اور تمہیں فون کرنے کے بعد نماز پڑھوں گی۔'' تاباں نے کہا۔

''تم نے کب سے نماز پڑھنا شروع کردی؟'' میں نے ایک اور سوال کیا۔

''میں نے سوچا کہ جب تمہارے ساتھ زندگی گزارنی ہے تو تمہارے رنگ میں کیوں نا خود کو ڈھال لوں۔'' تاباں کا جواب تھا۔

''عام طور پر لوگ خدا کے خوف سے نماز کی پابندی کرتے ہیں لیکن تم نے ایک نئی لاجک نکالی ہے۔'' میں نے کہا اور تاباں کی ہنسی شروع ہوگئی۔

اس کے بعد چار برس یوں گزر گئے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ ملیحہ روز صبح مجھے کالج لے جاتی اور شام میں لینے بھی آجاتی۔ اس دوران اس کا ایک پوسٹ گریجویشن مکمل ہوا تو اس نے دوسرے پوسٹ گریجویشن کی تیاری شروع کردی۔ میرا روٹین صرف اس قدر تبدیل ہوا تھا کہ منظور صاحب نے ایک کے بعد دوسری اشتہاری فلم میں چانس دینا شروع کردیا تھا۔ وہ مجھے بہت اچھا معاوضہ بھی دے رہے تھے جو یورو میں ہوتا تھا۔

آخری سال کے امتحان شروع ہوئے تو میں نے پہلی بار منظور صاحب سے معذرت کرلی پھر جب میں نے اس امتحان میں بھی ٹاپ کیا اور واپسی کے لیے اصرار شروع کیا تو انہوں نے میرا کنٹریکٹ ارینج کردیا۔

''کچھ دن اور رک جاتے۔'' انہوں نے ٹکٹ مجھے

تھماتے ہوئے کہا۔

''چار برس کافی نہیں تھے کیا؟'' میں نے سوال کیا اور باپ بیٹی ہنس دیے۔

''ڈیڈی کوئی اِن کا وہاں پاکستان میں انتظار کر رہا ہے۔'' ملیحہ نے مسکراتے ہوئے باپ سے کہا اور منظور صاحب نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

میں نے اپنی آمد کی اطلاع بابا اور میر صاحب کو دے دی تھی مگر مجھے حیرت اس وقت ہوئی تھی جب کراچی ائرپورٹ پر بابا، اماں، میر صاحب اور تاباں مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ ہم ائرپورٹ سے باہر نکلے تو میر صاحب نے کار سپر ہائی وے کی طرف موڑ لی۔

''اس بار ہم ہائی روڈ سفر کریں گے۔'' راستے میں تینوں ان چار برسوں میں ہونے والی رُوداد سناتے رہے۔ باری شاہ کے بھائی کو سزا ہو گئی دس برس کی لیکن عمران کا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے اور معاملہ سپریم کورٹ تک پہنچ گیا ہے۔ اگلی ایک دو پیشیوں میں معاملہ نمٹ جانے کی توقع ہے۔ اماں نے بتایا کہ میری کیاریاں اب بہت کچھ دے رہی ہیں اور پودے پورے درخت بن چکے ہیں اور پھل دینے شروع کر دیے ہیں۔

ہم قصبے پہنچے تو میر صاحب نے اماں اور بابا کو گھر پر اتارا اور مجھے لے کر حویلی پہنچے۔

''مجھے تم سے وہ بات کرنی ہے جس کے لیے میں نے برسوں انتظار کیا ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں تاباں کو قتل کرنا ہے۔'' میر صاحب نے کہا اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنا پستول میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے پستول تو تھام لیا لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے جسم سے روح الگ کر دی ہو۔

''میں آج ہی تمہارے بابا کو فارغ کر کے تمہیں ان کی جگہ نامزد کرنے کا اعلان کر دوں گا پھر کل میں تم اور تاباں اس کی زمینوں پر جائیں گے۔ نہر پر پہنچ کر تم اسے نشانہ بناؤ گے اور ہم اس کی لاش نہر میں بہا دیں گے۔'' میر صاحب نے پورا پلان سمجھایا تھا۔ انہیں یہ بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تاباں اس دوران حویلی کے اس دروازے تک پہنچ چکی تھی جہاں سے لان شروع ہوتا ہے پھر اسی شام ابا گھر پر آئے تو شدید غصے میں تھے۔

''یہ صلہ دیا ہے میری وفاداریوں کا۔'' بابا ناراض تھے کیونکہ میر صاحب نے انہیں عہدے سے ہٹا دیا تھا اور ان کی جگہ میری نامزدگی کا اعلان کر دیا تھا۔

اگلی صبح مجھے زمینیں دکھانے میر صاحب، تاباں کو لے کر حویلی سے نکلے تھے۔ مجھے تاباں کی آنکھوں میں حسرت نظر آئی تھی پھر جب ہم نہر کے کنارے اترے تو میر صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے ان کے حکم پر عمل کیا لیکن میرا نشانہ تاباں نہیں میر صاحب تھے۔ یہ مشکل مرحلہ میں نے آسانی سے سر کر لیا تھا۔ پھر میں نے اور تاباں نے کھینچ کر ان کی لاش نہر میں ڈال دی تھی۔ وہ سیلاب کا زمانہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں پانی نے میر صاحب کی لاش کو ہماری ..... آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

میر صاحب کی لاش بہانے کے بعد میں اور تاباں تھانے پہنچے تھے جہاں تاباں کی مدعیت میں میر صاحب کی خودکشی کی رپورٹ درج ہوئی۔ تھانے دار نے بہت سے سوال کیے جس کے تاباں نے وہی جواب دیے تھے جو میں نے نہر سے تھانے تک کے راستے میں سمجھائے تھے۔ پھر مجھے اور تاباں کو جانے کی اجازت دے کر پولیس نے تفتیش شروع کر دی اور وہ تفتیش اب تک جاری ہے۔ تاباں نے عدت پوری کرنے کے بعد کہا۔ ''فرجاد اب ہمیں نکاح کر لینا چاہیے۔'' لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''پہلے تم ملیحہ کو فون کرو، ہم لندن پہنچ کر نکاح کر لیں گے کیونکہ میرے کانوں تک کچھ ایسی سرگوشیاں پہنچی ہیں کہ ''ہم دونوں میں چکر تھا اور میر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے خودکشی کر لی۔ فی الحال تو یہ سرگوشیاں ہیں لیکن ہم نے نکاح کر لیا تو معاملہ کچھ اور رنگ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ فی الحال تو پولیس اس پر تفتیش کر رہی ہے لیکن یہ امر اُن کی سمجھ سے باہر ہے کہ میر صاحب اگر کنفرم تھے تو انہوں نے مجھے اپنا کمدار کیوں بنایا اور تمہیں طلاق دے کر معاملہ کیوں نہیں نمٹا دیا۔''

☆☆☆

آج ہمارے پانچ بچے ہیں تین لڑکے اور دو بیٹیاں مگر ان آٹھ برسوں میں ہیں اور... تاباں نے اپنے قصبے کا رخ نہیں کیا۔ بابا کو تاباں نے عہدہ پر بحال کر دیا تھا۔ اب بھی وہی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ہر فصل پر ہمارا حصہ ہمیں پہنچ جاتا ہے لیکن میں رات کو آرام کی نیند نہیں سو پاتا کیونکہ میر صاحب اکثر خواب میں آتے ہیں اور غصے کے عالم میں سوال کرتے ہیں۔ ''یہ دیا ہے تو نے میرے احسانوں کا بدلہ۔'' اور میں نیند سے بیدار ہو جاتا ہوں۔ جانے یہ سلسلہ کب ختم ہو گا۔ ہو گا بھی یا نہیں۔ تاباں البتہ مجھ سے بہت خوش ہے کہ میں نے اُس کی برسوں کی قید ہی ختم نہیں کی بلکہ اس کے والد اور بھائیوں کی موت کا بدلہ بھی لے لیا ہے۔

❖❖❖

تھماتے ہوئے کہا۔

''چار برس کافی نہیں تھے کیا؟'' میں نے سوال کیا اور باپ بیٹی ہنس دیے۔

''ڈیڈی کوئی اِن کا وہاں پاکستان میں انتظار کر رہا ہے۔'' ملیحہ نے مسکراتے ہوئے باپ سے کہا اور منظور صاحب نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

میں نے اپنی آمد کی اطلاع بابا اور میر صاحب کو دے دی تھی مگر مجھے حیرت اس وقت ہوئی تھی جب کراچی ائرپورٹ پر بابا، اماں، میر صاحب اور تاباں مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ ہم ائرپورٹ سے باہر نکلے تو میر صاحب نے کار سپر ہائی وے کی طرف موڑ لی۔

''اس بار ہم ہائی روڈ سفر کریں گے۔'' راستے میں تینوں ان چار برسوں میں ہونے والی رُوداد سناتے رہے۔ باری شاہ کے بھائی کو سزا ہو گئی دس برس کی لیکن عمران کا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے اور معاملہ سپریم کورٹ تک پہنچ گیا ہے۔ اگلی ایک دو پیشیوں میں معاملہ نمٹ جانے کی توقع ہے۔ اماں نے بتایا کہ میری کیاریاں اب بہت کچھ دے رہی ہیں اور پودے پورے درخت بن چکے ہیں اور پھل دینے شروع کر دیے ہیں۔

ہم قصبے پہنچے تو میر صاحب نے اماں اور بابا کو گھر پر اتارا اور مجھے لے کر حویلی پہنچے۔

''مجھے تم سے وہ بات کرنی ہے جس کے لیے میں نے برسوں انتظار کیا ہے۔'' میر صاحب نے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں تاباں کو قتل کرنا ہے۔'' میر صاحب نے کہا اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنا پستول میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے پستول تو تھام لیا لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے جسم سے روح الگ کر دی ہو۔

''میں آج ہی تمہارے بابا کو فارغ کر کے تمہیں ان کی جگہ نامزد کرنے کا اعلان کر دوں گا پھر کل میں تم اور تاباں اس کی زمینوں پر جائیں گے۔ نہر پر پہنچ کر تم اسے نشانہ بناؤ گے اور ہم اس کی لاش نہر میں بہا دیں گے۔'' میر صاحب نے پورا پلان سمجھایا تھا۔ انہیں یہ بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تاباں اس دوران حویلی کے اس دروازے تک پہنچ چکی تھی جہاں سے لان شروع ہوتا ہے پھر اسی شام ابا گھر پر آئے تو شدید غصے میں تھے۔

''یہ صلہ دیا ہے میری وفاداریوں کا۔'' بابا ناراض تھے کیونکہ میر صاحب نے انہیں عہدے سے ہٹا دیا تھا اور ان کی جگہ میری نامزدگی کا اعلان کر دیا تھا۔

اگلی صبح مجھے زمینیں دکھانے میر صاحب، تاباں کو لے کر حویلی سے نکلے تھے۔ مجھے تاباں کی آنکھوں میں حسرت نظر آئی تھی پھر جب ہم نہر کے کنارے اترے تو میر صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے ان کے حکم پر عمل کیا لیکن میرا نشانہ تاباں نہیں میر صاحب تھے۔ یہ مشکل مرحلہ میں نے آسانی سے سر کر لیا تھا۔ پھر میں نے اور تاباں نے کھینچ کر ان کی لاش نہر میں ڈال دی تھی۔ وہ سیلاب کا زمانہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں پانی نے میر صاحب کی لاش کو ہماری ..... آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

میر صاحب کی لاش بہانے کے بعد میں اور تاباں تھانے پہنچے تھے جہاں تاباں کی مدعیت میں میر صاحب کی خودکشی کی رپورٹ درج ہوئی۔ تھانے دار نے بہت سے سوال کیے جس کے تاباں نے وہی جواب دیے تھے جو میں نے نہر سے تھانے تک کے راستے میں سمجھائے تھے۔ پھر مجھے اور تاباں کو جانے کی اجازت دے کر پولیس نے تفتیش شروع کر دی اور وہ تفتیش اب تک جاری ہے۔ تاباں نے عدت پوری کرنے کے بعد کہا۔ ''فرجاد اب ہمیں نکاح کر لینا چاہیے۔'' لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''پہلے تم ملیحہ کو فون کرو، ہم لندن پہنچ کر نکاح کر لیں گے کیونکہ میرے کانوں تک کچھ ایسی سرگوشیاں پہنچی ہیں کہ ''ہم دونوں میں چکر تھا اور میر صاحب کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے خودکشی کر لی۔ فی الحال تو یہ سرگوشیاں ہیں لیکن ہم نے نکاح کر لیا تو معاملہ کچھ اور رنگ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ فی الحال تو پولیس اس پر تفتیش کر رہی ہے لیکن یہ امر اُن کی سمجھ سے باہر ہے کہ میر صاحب اگر کنفرم تھے تو انہوں نے مجھے اپنا کمدار کیوں بنایا اور تمہیں طلاق دے کر معاملہ کیوں نہیں نمٹا دیا۔''

☆☆☆

آج ہمارے پانچ بچے ہیں تین لڑکے اور دو بیٹیاں مگر ان آٹھ برسوں میں ہیں اور... تاباں نے اپنے قصبے کا رخ نہیں کیا۔ بابا کو تاباں نے عہدہ پر بحال کر دیا تھا۔ اب بھی وہی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ہر فصل پر ہمارا حصہ ہمیں پہنچ جاتا ہے لیکن میں رات کو آرام کی نیند نہیں سو پاتا کیونکہ میر صاحب اکثر خواب میں آتے ہیں اور غصے کے عالم میں سوال کرتے ہیں۔ ''یہ دیا ہے تو نے میرے احسانوں کا بدلہ۔'' اور میں نیند سے بیدار ہو جاتا ہوں۔ جانے یہ سلسلہ کب ختم ہو گا۔ ہو گا بھی یا نہیں۔ تاباں البتہ مجھ سے بہت خوش ہے کہ میں نے اُس کی برسوں کی قید ہی ختم نہیں کی بلکہ اس کے والد اور بھائیوں کی موت کا بدلہ بھی لے لیا ہے۔

❖❖❖